قرآن سے قرآن تک

علامہ محمد حسین عرشی

دوست ایسوسی ایٹس
پرنٹرز۔ پبلشرز۔ سپلائرز
الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: 7122981

جملہ حقوق محفوظ

1998ء
محمد شاہد عادل نے
زاہد بشیر پرنٹرز سے چھپوا کر
دوست ایسوسی ایٹس اردو بازار لاہور
سے شائع کی۔

قیمت -/320

بہ نستعین

دُعائے درویش

عزیز محترم علامہ خالد اسحاق کراچی سلمہ، اللہ تعالیٰ کی تحریک و ترغیب سے اس تالیف کا آغاز ہوا اور انہی کے دولت کدہ پر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

حوالوں اور کتابوں کی تحقیق و تلاش میں عزیز گرامی مولانا طاہر سلمہ کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔

محترم ماسٹر کریم بخش۔ جن کو میں ماں جائے بھائی سے زیادہ اپنے دل سے قریب محسوس کرتا ہوں۔ میرے بہت سے کراچوی تعلقات کی اساس ہیں۔ فقیر سے ان کا تعاون تمام شعبہ ہائے ضروریات پر منحصر رہا ہے اور رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ عزیز گرامی خواجہ عبد الحفیظ امرتسری (فلیور ملز کمپنی کراچی) تو گویا فقیر ہی کی آغوش کے پروردہ ہیں۔ اگر ان کا فراخدلانہ دستِ تعاون آگے نہ بڑھتا تو یہ اوراقِ فقیر کے متعدد اہم مخطوطات کی طرح نذرِ اجل ہو جاتے۔

اے اللہ ان عزیزوں کو اپنی رحمتِ خاص، اپنے احسانات، عفو و کرم اور اجرِ غیر ممنون سے بہرہ مند فرما۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

عرشی

تعارف

حضرت خواجہ احمد دین امرتسریؒ نے قیامِ پاکستان سے کئی برس پہلے بیان للناس کے نام سے قرآن مجید کی ایک مبسوط تفسیر لکھی تھی، جسے اُمّتِ مسلمہ (ہند) امرتسر نے سات جلدوں میں شائع کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے موقع پر نہ صرف تفسیر کے تمام مجلدات بلکہ اُمّتِ مسلمہ کی دوسری مطبوعات کا سٹاک بھی امرتسر ہی میں رہ گیا۔ بیان للناس ایک عرصے سے نایاب ہے اور کسی قیمت پر دستیاب نہیں۔

کاغذ اور دوسرے سامانِ طباعت کی ہوشربا گرانی کی وجہ سے اس ضخیم کتاب کو دوبارہ طبع کرنا ممکن نہ ہوا، لیکن یکساں طور پر اس امر کی بھی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ قرآن مجید کے طالب علموں کے لیے عصرِ حاضر کی اس عظیم الشان تفسیر سے استفادے کی کوئی صورت نکل آئے۔ اسی احساس کی بناء پر علامہ عرشی امرتسری نے پیرانہ سالی کے باوجود، بڑی محنت اور عرق ریزی سے بیان للناس کی ایک تلخیص تیار کی ہے، جو "قرآن سے قرآن تک" کے نام سے، آپ کے سامنے ہے۔ تلخیص کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اصل کتاب کے تمام مطالب، کم سے کم الفاظ میں اس طرح سمیٹ لیے گئے ہیں کہ اس سے اتنا ہی استفادہ کیا جا سکتا ہے، جتنا اصل کتاب کے مطالعے سے ممکن تھا۔

علامہ عرشی کا ذاتی مطالعہ بھی بہت وسیع ہے اور انہیں خواجہ علیہ الرحمہ سے بھی سالہا سال کسبِ فیض کا موقع ملا ہے ان خصوصیات کے پیشِ نظر بیان للناس کی تلخیص کے لیے اُنہی کا قلم موزوں ترین قلم تھا اور جیسا کہ زیرِ نظر کتاب کا مطالعہ خود ظاہر کرے گا، اُن کی یہ کاوش ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔

تلخیص کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ علامہ عرشی نے تقریباً تمام قدیم و جدید تفسیروں سے ایسے مطالب بھی حواشی[2] کی شکل میں لے لیے ہیں، جن سے خواجہ احمد الدینؒ کی تشریح و تعبیر کی تائید نکلتی ہے۔ خواجہ صاحب چونکہ غیر معتبر روایات و اسرائیلیات سے استناد کے قائل نہیں تھے اور تفسیر القرآن بالقرآن کا عقیدہ رکھتے تھے، اس لیے بعض روایات پرست حلقے اُن کے بعض مطالب کو انہی سے مخصوص سمجھتے تھے، لیکن علامہ عرشی نے دوسری قدیم و جدید تفسیروں کے حوالے دے کر یہ عام غلط فہمی بڑی حد تک دور کر دی ہے۔ تاہم جہاں کہیں خواجہ صاحب کسی تشریح و تعبیر میں منفرد ہیں، تو جیسا کہ زیرِ نظر کتاب کا مطالعہ ثابت کرے گا، اُن کی

---

[1] محترم محمد اقبال صاحب سلاؔن نے مسودات کو بہ نظرِ غائر دیکھا اور کتاب کی تشکیل و تکمیل میں جو حصہ لیا ہے وہ بھی کم اہم نہیں۔ عاجز عابدؔ کے لیے بصمیمِ قلب دستِ بدعا ہے۔ اَیَّدَھُمُ اللہ تعالیٰ بِرُوْحٍ مِّنْہُ۔ عابدؔ

[2] بے شک ایسے تمام مطالب حواشی ہی کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ لیکن کچھ سوچ کر انہیں متن میں شامل کر لیا گیا۔ (عابد)

انفرادیت پوری طرح مدلّل ہے۔ کہیں کہیں مناسب موقع پر تقابل واختلاف کی نشاندہی کے لیے اہل سنّت والجماعت کی مروجہ متفقہ تفاسیر کے ملخص بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ علامہ عرشی کی محنت کو شرفِ قبول عطا کرے اور قرآن حکیم کے طالب علموں کو اس سے استفادے کی توفیق بخشے۔

یارانِ طریق کی آرزوؤں اور امنگوں کا یہ جہاز مشکلاتِ کتابت وطباعت اور کاغذ کے گردابوں میں گھِر چکا تھا، ضعیف و نحیف، کہن سال ملاح ہمت ہار چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو اس میں لائے ہوئے جواہرات کا ضیاع منظور نہ تھا۔ پردۂ غیب سے ایک جواں ہمت وجواں سال کھویا نمودار ہوا۔ جس کے عمیق وصحیح عشقِ قرآن اخلاص وایمان اور حرکت وعمل کی قوت نے اس کو سہارا دیا اور ساحلِ مراد تک پہنچانے میں اپنی تمام اہم مصروفیات ومشاغل پر ترجیح دی۔

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر محمد عیسیٰ عابد کی اس فی سبیل اللہ سعی وجہد کو شرفِ قبول بخشے، اور ان کو دنیا وآخرت کی برکات سے بہرہ مند فرمائے ان کے ذوقِ قرآن اور علم وعمل کو اپنی تائید غیبی سے نوازے۔ مرزا محمد حسین مالک کتب خانہ شرف الرشید شاہ کوٹ (ضلع شیخوپورہ) نے بھی اپنی ڈھلی ہوئی پیری کے باوجود اس کے لیے جو دوڑ دھوپ کی وہ بھی قابلِ ستائش ہے۔ اللہ کریم انہیں اس کا اجرِ جزیل عطا فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

محمد اقبال سلمان مدیر روزنامہ کوئٹہ

۲۶ نومبر ۷۵ء

فہرست

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
تعارف	۴	مولانا احمد بابا مخدومی	
وہ کون تھا ؟	۱۷	علامہ اقبال سے تاریخی ملاقات	۳۲
مُفسرِ عظیم		آخری بات	۳۳
عام اندازِ تفسیر	۱۹	دنیائے تفسیر	″
متجدّدین	۲۰	اختلاف	۳۴
خصوصیت خواجہ	″	عالی ظرفی	۳۵
علامہ جیراجپوری	″	دلیل کی عظمت	
پروفیسر شبیر احمد	″	خاتمہ	۳۷
علامہ سید سلیمان ندوی	۲۱	سرآغاز	۳۸
علامہ اقبال	۲۲	خواجہ احمد الدین (نظم)	۳۹
مسلکِ اقبال	۲۴	تعارف	۴۰
تعزیت	۲۵	رحمٰن۔ رحیم یوم الدین	۴۴
علامہ اقبال	۲۶	فاتحہ میں جمع کے صیغے	۴۵
ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ	″	صراط مستقیم	″
محمد عباس صفوی۔ ڈاکٹر طالب علی، حکیم محمد حسین سید مقبول	″	غیر مبدل عالمگیر صراط	۴۶
احمد، حفیظ ہوشیارپوری۔	۲۷	"اَنعَمتَ" میں نکتہ	۴۷
خواجہ عباد اللہ اختر	″	عالمین	۴۸
تلمیذ الرحمن	۲۸	دعا پر اعتراض اور جواب	″
معجزانہ قرآن فہمی	۲۹	وجہ تسمیہ "البقرہ"	۵۴
انفرادیت	۳۰	ربط فاتحہ و بقرہ۔	″

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
اسرار مقطعات	۵۵	ابلیس و شیطان میں فرق	۸۶
شرح "غیب"	۵۷	آدم کی جنت اور خلافت	۸۷
ایمان و کسبِ خیر	۵۸	آدم میں تمام بنی آدم شامل ہیں	۸۸
شاہ عبدالعزیز دہلوی	〃	مکالمہ حالی ہے قالی نہیں	۸۹
کفار کے دلوں پر مُہر	۶۱	رویائے یوسف کی تعبیر	۹۱
منافق	۶۵	تقریر رازی	۹۱
اِذَا قِیْلَ لَهُمْ	〃	منّ و سلویٰ و بارہ چشمے	۹۳
شرح استہزاء اور مکر اللہ	۶۷	شرح فَوْقَكُمُ الطُّوْر	۹۵
لغت کی شہادت	〃	گاؤ پرستی	۹۶
سمع و ابصار میں جمع و واحد لانے کی حکمت	۶۸	شرح قِرَدَةً خَاسِئِیْن	〃
خاتم الکتب	۶۹	بقرہ کی لغوی تحقیق	۹۸
مُطاع حقیقی	〃	اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا کی تفسیر	۹۹
حقیقت سماوات	۷۰	اصلاح نصاب زکوٰۃ	۱۰۱
بے مثل کتاب	۷۵	اسلام کی ابدیت و جامعیت	۱۰۲
شرح اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ	۷۶	فرقہ بندی	〃
جزاء و عمل کا قدرتی تعلق	〃	ہاروت ماروت	۱۰۳
با تاخیر جزاء و سزا	۷۸	شفاعت کی حقیقت	۱۰۵
موت کے بعد	۷۹	مومنوں کا شفاعت سے کوئی واسطہ نہیں	۱۰۶
نکتہ	۸۰	کفار شفاعت کے امیدوار	۱۰۶
جن "الناس" میں داخل ہیں	۸۳	تین قسم کے لوگ	۱۰۷
ریب کی حقیقت	۸۴	مقام محمود	۱۰۸
ترجیح انسان بر ملائک	۸۵	ابتلائے ابراہیم	۱۰۹
شیطان	۸۶	آیات مخصوصہ شفاعت	〃
انسان	〃	قدامت مکہ اور تعمیر کعبہ	۱۱۱

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
ابراہیمی قبلہ	۱۱۲	طیور ابراہیم	۱۴۰
قرآنی دلائل	//	تفسیر رازی	//
مصلحت	۱۱۴	تفسیر ابومسلم اصفہانی	۱۴۲
عقلی دلائل	۱۱۶	مادرِ مریم	۱۴۴
شطر کی اہمیت	۱۱۷	محکم و متشابہ	۱۴۵
قبلہ قومی شعار	۱۱۸	ولادت مسیح	۱۴۶
تعامل	//	کذالک	۱۴۹
قرآن کی اہمیت	۱۱۹	مہد مسیح	۱۵۱
صفا و مروہ	۱۲۱	وفات و حیات مسیح	۱۵۳
حج و عمرہ کی معنویت	۱۲۲	جہنم۔ ہسپتال	۱۵۵
عرفات	۱۲۲	کوئی رسول موت سے مستثنیٰ نہیں	۱۵۶
المشعر الحرام	//	حلِ آیت بل رَفَعَہُ اللہ	
رؤیائے خلیل	۱۲۳	"انّہٗ لعلم للسّاعۃ" کا مطلب	۱۶۰
ابراہیمی حج	//	"خلد لبشر" کا مطلب	۱۶۱
نساؤکم حرثٌ لکم	۱۲۴	ابوالکلام اور مسیح کی آمد ثانی	۱۶۲
عورتوں پر مردوں کا درجہ	۱۲۵	قرآن اور مرزائیت	//
خلع و طلاق	۱۲۶	مجدد کی کوئی ضرورت نہیں	//
صلوٰۃ وسطیٰ	۱۲۸	اسلام پہ بہتان	۱۶۳
بزدلی موت ہے	۱۳۰	سرسیدؒ اور مسیح	۱۶۴
تابوت سکینہ	۱۳۲	ولادت مسیح	//
ایمان۔ جبری یا اختیاری	۱۳۳	رُوحٌ مِنہ	۱۶۷
مکالمہ ابراہیم و بادشاہ	۱۳۴	حمل مریم	//
اَوْ کَالَّذِی مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ	//	مریم مسیح کو لے کر قوم کے پاس آتی ہیں۔	۱۶۸
طلب معجزہ	۱۳۵	وَالَّتِی اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا	۱۶۹

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
خلقِ عیسیٰ کمثل آدم	۱۶۹	ولادتِ مسیح "مریم" میں	۱۸۲
ابن مریم	۱۷۰	وجہ تسمیہ ابنِ مریم	۱۸۴
وفات مسیح	"	"کلمہ" کے معنی	۱۸۵
محمد علی اور مسیح	۱۷۲	مثلِ آدم سے مفہوم	"
کفالت مریم	"	جدید نبوت	۱۸۶
ولادت مسیح	"	کنواری سے پیدائش کا عقیدہ کفر ہے۔	۱۸۷
مسِّ بشر	"	فرشتے کی آواز	"
شہادتِ حدیث	"	رفع مسیح	"
مسیح صرف بنی اسرائیل کے لیے	۱۷۳	وفات مسیح	۱۸۸
سورۂ مریم میں ولادت مسیح	"	معجزات مسیح بہ نظر خواجہ احمدالدین	۱۹۰
مسیح آیۃ للناس	"	آسمانی مائدہ	"
مسیح کی سواری	۱۷۴	خلق طیر وغیرہ کی حقیقت	۱۹۲
کلمۃ اللہ سے مراد	"	لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا	۱۹۳
دوسری توجیہ	"	رزق مریم	۱۹۴
جھولے میں باتیں کرنا	"	حضور کا مطلب	"
وفات مسیح	۱۷۵	سرسید اور رزق مریم	۱۹۵
حدیث میں وفات مسیح	"	محمد علی اور تذکرہ مریم	"
رفع مسیح	"	محمد علی اور رزق مریم	"
حدیث رفع	۱۷۶	پرویز اور تذکرہ مریم	۱۹۵
سورۂ نساء میں ذکر مسیح	۱۷۷	پرویز اور رزق مریم	۱۹۶
سورۂ زخرف میں ذکر مسیح	۱۸۰	خواجہ اور اصطفائے مریم	"
پرویز اور مسیح	۱۸۱	دوبارہ کفالتِ مریم	"
ولادتِ مسیح آل عمران میں	"	خلق طیر وغیرہ محمد علی کی نظر میں	۱۹۷
معجزات مسیح کی توجیہ	"	اکمہ اندھا وغیرہ	۱۹۸

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
اَبْرَص	۱۹۸	صحابہ اور غلامی	۲۱۶
اُحْیِ الموتیٰ	۱۹۹	غلاموں کا نکاح	//
بِمَا تَاکُلُوْن	۲۰۰	غلام کی قیادت	۲۱۷
آسمانی دسترخوان	//	غلاموں کی سردایاں	//
دعائے مائدہ	//	مغربی علماء اور اسلام میں غلامی	[illegible]
معجزاتِ مسیح اور سرسید	۲۰۱	سید امیر علی	
خلق طیر	//	علامہ رشید رضا	
آیت ربانی	//	غلامی جرنل یورپی فاضل کی نظر میں	
اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا	//	غلامی اور ابوالکلام	۲۱۸
مردوں کو زندہ کرنا	۲۰۲	غلامی مولوی محمد علی کی نظر میں	۲۲۰
غیبی خبریں	//	غلامی پرویز کی نظر میں	
نزولِ مائدہ	//	تعدد ازدواج اور خواجہ احمدالدین	۲۲۲
معجزاتِ مسیح اور پرویز	۲۰۳	سرسید اور غلامی	۲۲۴
مائدہ کے معنی	۲۰۴	غلامی اور ڈاکٹر عبدالحکیم خاں	//
مزید تحقیق احمدالدین	۲۰۵	غلامی سید قطب شہید کی نظر میں	۲۲۵
وحی و مشورہ	۲۰۶	احترام آدمی	//
کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَال	۲۱۰	طریقہ میراث پر تنقید	۲۲۸
ایک آیت میں تمام حروف تہجی	۲۱۱	عورتوں کی اصلاح و حفاظت	۲۲۹
غلامی بند	۲۱۲	عورتوں کو وعظ و سنا	//
الرق فی الاسلام	۲۱۴	حرمتِ رضاعت	۲۳۲
حضرت عمرؓ کا عمل	//	صلوٰۃ بمعنی محل صلوٰۃ	۲۳۳
جاہلیت کے غلام	//	وضو و تیمم	۲۳۴
ذمی اور غلامی	//	تشریح جنب	۲۳۶
مکاتبت	۲۱۵	عابری سبیل و علی سفر میں فرق	//

عنوان	صفحہ
طمس وجوہ کی تشریح	۲۳۷
جبت و طاغوت	۲۳۸
اَطِیعُوا اللہَ وَاَطِیعُوا الرَّسُول	۲۳۹
دو اطیعُوا	۲۴۰
منافقین اور فصلِ خصومات	״
صلوٰۃ	۲۴۲
مروّجہ نماز	۲۴۴
مختلف نمازیں	۲۴۵
مصرفِ مساجد	״
صلوٰۃِ وُسطیٰ	״
اعتکاف	۲۴۶
دُعا	״
اوقاتِ صلوٰۃ	۲۴۸
جمعہ	۲۴۹
اذان	״
طہارت	״
ہیئتِ صلوٰۃ	۲۵۰
اَذکارِ صلوٰۃ	۲۵۱
دعا کا طریقہ	۲۵۲
نماز میں آواز	۲۵۲
کئی گروہ	״
کامل نماز	״
خطرے میں بھی نماز	۲۵۳
ایک اور نکتہ	״
قصر من الصلوٰۃ	۲۵۳
مُعلّقہ	۲۵۴
فرشتے، کتابیں اور رسول	״
بے نام مذمّت	۲۵۵
ابولہب	״
وحی کے تین طریقے	۲۵۷
قبل بعثت کے مومن	۲۵۹
مسیح کی ماں کی طرف نسبت	۲۶۰
تمت منزلِ اوّل	
سُورۃُ المائدہ	۲۶۱
اہل کتاب سے مناکحت	۲۶۲
آدم کے دو بیٹوں کی خبر	۲۶۳
قتل ہابیل	۲۶۴
نعشِ ہابیل	״
وسیلہ	۲۶۶
تورات میں حکم اللہ	۲۶۸
شرعۃ و منہاج	۲۷۰
منع کثرتِ سوال	۲۷۱
سورۃُ الانعام	۲۷۲
نور و ظلمت کے دو خالق نہیں	״
غیر نافع خوارق	۲۷۵
خوارق اور دجل	۲۷۷
نفخِ صور	۲۷۸
حقیقتِ جن	۲۸۰

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
کیا فرشتے انسان بن سکتے ہیں ؟	۲۸۳	اَلَسْتُ وبلیٰ	۳۲۷
ضعیف ابراہیم	″	مسیح اور اَلَسْتُ	۳۲۸
جہاد اور حق	۲۸۷	غزوات میں فرشتوں کی مدد	۳۲۹
علم غیب	۲۸۸	تمہید	″
الربا	۲۹۲	فرشتوں کی طرف وحی	۳۳۱
روپیہ اور محنت	۲۹۳	دیار میت	۳۳۳
بنک	۲۹۵	قدرتی ماہ وسال	۳۳۵
رہن	″	دائمی عذاب	۳۳۷
جنت وجہنم	۲۹۷	اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ	۳۳۹
اعراف	″	کِدْنَا لِیُوْسُفَ	۳۴۱
ناقۃُ اللہ	۲۹۹	معراج	۳۴۲
لُوط علیہ السلام	۳۰۱	موطا مالک	۳۴۳
فوجی آدمی	۳۰۲	اصحاب کہف	۳۵۴
ملک صدق	″	ایک مشکل کا حل	۳۵۶
خلاصہ	″	حضرت موسیٰ کا سفر مدین	۳۵۸
معجزات موسیٰ علیہ السلام	۳۰۴	ذوالقرنین ویاجوج وماجوج	۳۶۲
استعارے کی زبان	۳۰۹	ابراہیم اور آگ	۳۶۷
موسیٰ علیہ السلام وعبور بحر	۳۱۳	حضرت ابراہیم پر اتہام	۳۶۹
تکملہ	۳۱۴	عجیب واقعہ	۳۷۱
ربّ اَرِنی	۳۱۶	داؤد وسلیمان علیہم السلام	۳۷۴
الواحِ موسیٰ علیہ السلام	۳۱۸	ایک مقدمے کا فیصلہ	″
بچھڑا اور سامری	۳۱۹	صنعت داؤد	″
زیارت کی ماہیت	۳۲۰	ہوا اور سلیمان	۳۷۷
سُنیت	۳۲۴	مزید تحقیق، تجارتی ہوائیں ۔	۳۷۸

عنوان	صفحہ
جن مزدور و کاریگر	۳۷۹
رحلت سلیمان	۳۸۰
جن	〃
کرسیٔ سلیمان پر جسد	〃
ملک سلیمان	۳۸۱
رحلت سلیمان	〃
ایروپلین	〃
شیاطین مطیع سلیمان	〃
ایک مقدمہ داؤد کی محراب میں	۳۸۲
غلطی داؤد	〃
سلیمان کے گھوڑے	۳۸۳
بلقیس و سلیمان	۳۸۴
عرش بلقیس	〃
ذکر ایوب علیہ السلام	۳۸۷
ذکرِ یونس علیہ السلام	۳۸۹
ظلمات	۳۹۰
طَیِّ السَّمآءِ	۳۹۲
سبع طرائق	۳۹۳
حج و قربانی وغیرہ	۳۹۴
واقعہ افک	۳۹۶
آیہ نور	۳۹۷
مَدَّ الظل	۳۹۹
جمع و واحد کی حکمت	〃
دآبّۃ الارض	۴۰۱
عمر نوح علیہ السلام	۴۰۲
طوفانِ نوح	۴۰۳
اسوۂ حسنہ	۴۰۵
ازواج النبیؐ	۴۰۸
حقیقت درود	۴۱۳
زیدؓ و زینبؓ	۴۱۶
نکتہ	۴۱۷
خاتم النبیین م	۴۱۸
معنی رسول	〃
ارسال عام	〃
وسعت معنی رسول	〃
ہر بستی میں رسول	۴۱۹
ہر امت میں رسول	〃
غیر نبی اور تلاوت	〃
بظاہر عام رسول	〃
اطاعتِ دو قسم	۴۲۰
نتیجہ، خاص رسول، بہاءاللہ	〃
شرح این نکتہ	۴۲۱
ظہار، نا جائز قسمیں	〃
زیدؓ و زینبؓ	۴۲۲
خطائے زید	〃
باریک حکمتیں	〃
خاتم صرف ایک	۴۲۳
فترت	۴۲۴

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
یوسف خاتم نہیں	۴۲۴	قدرتی الہام	۴۳۵
دعا	〃	عدم الہام کی دلیل	〃
جواب	〃	قدرتی الہام	〃
رحمت خاص	〃	عدم الہام کی دلیل	〃
خاص لوگ، خاص نبی	〃	بے شمار شواہد	〃
خاص نبی کے خاص کام	۴۲۵	خواب	〃
کامیاب لوگ	〃	عدم قابلیت	〃
خطاب عام	〃	وید کے مصنف	〃
دعا، جواب	〃	بے ضرورت اور قبل از وقت	〃
نگاہ بازگشت	〃	وید اور تبت	۴۳۶
قرآن و رسول کی خصوصیت	۴۲۶	وید کی زبان	〃
شان قرآن	〃	وید منتروں کے سُر	〃
صحیفہ فطرت	۴۲۹	قدامتِ وید	〃
کلامِ الٰہی	〃	وید کی اشاعت	۴۳۷
عقلی دین	۴۳۰	باب و بہا	〃
کامل دینی کورس	۴۳۱	بائبل	〃
وید مقدس	〃	وید کا لغت	〃
وید اور قرآن میں فرق	〃	قرآن حکیم	۴۳۸
آغاز انسانیت	۴۳۲	الہام دو قسم	〃
تغیرات کے بعد	۴۳۳	قادیانی	〃
آخری کورس کا موزوں وقت	〃	قرآن کامل لیکن بے کار	۴۳۹
چار وید	۴۳۴	مرزا کے بغیر سب کچھ بے کار	〃
یکساں استعداد	〃	رسولوں پر بالتبع ایمان	〃
الہام نتیجہ عمل ہے؟	〃	اختلافات سے دلیل	۴۴۰

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
ساری دنیا کے لیے ایک نبی	۴۴۱	مرزا صاحب اپنی نبوت میں متذبذب	۴۵۷
فقط اسلام ہی دین ہے	〃		
وحی و صحیفہ فطرت	۴۴۲	آخری بات	〃
صحیفہ فطرت کی بے مثلیت	۴۴۳	عرضِ امانت	۴۵۹
وحی کی بے مثلیت	〃	ذکر داؤد علیہ السلام	۴۶۰
بقائے انفع	۴۴۴	ملائکہ اُولی اَجنِحَۃ	۴۶۱
قرآن میں اغلاط	〃	بعث بعد الموت	۴۶۲
وحی کی تین اقسام (حاشیہ)	〃	برزخ	۴۶۲
دعاوی قرآن	۴۴۶	نفخ صور و برزخ	۴۶۳
پیروی کی دو قسمیں	۴۴۷	کہانت اور شیطانی وحی	۴۶۴
حفاظت قرآن	〃	ذبح عظیم	۴۶۷
دو قسم مدعی الہام	۴۴۸	اللہ کے حضور جھگڑنا	۴۶۹
اللہ کی ذمہ داری	〃	انبیاء پر سلام مگر....	۴۷۰
محمد صحف اولیٰ میں	۴۴۹	یوم، عرش، کرسی	۴۷۱
بہائیت پر تبصرہ	〃	کرسی	۴۷۴
قادیانی نبوت	۴۵۲	خلاصہ	〃
آیت مُنعَمْ عَلَیہِم	〃	آسمانی مخلوق	۴۷۵
آیہ خَاتَمُ النَّبِیّٖن	۴۵۳	شقّ القمر	۴۷۶
آیہ بعث فِی الاُمّیین	۴۵۴	والعادیات	۴۷۸
آیہ لَمَّا یَلحَقُوا بِہِم	〃	القارعۃ	۴۷۹
ظِلّ و بُروز	۴۵۵	الفیل	۴۸۰
آیہ قطع وتین	〃	الکوثر	۴۸۱
ہر مفتری مقتول نہیں	〃	اللھب	۴۸۲
نئی رسالت کی دو وجوہ	۴۵۷	الفلق	۴۸۳

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
سورہ مجادلہ	۴۸۵	قرآن نیوٹن سے پہلے	۵۰۲
رسول کریم سے مجادلہ	〃	نبا عظیم	〃
اسوہ حسنہ	۴۸۶	قیامت مرتے ہی	۵۰۵
مسیح کی آمد ثانی	〃	راجفۃ	۵۰۸
یوم الجمعہ	۴۸۸	الطامۃ الکبریٰ	〃
ازواج النبیؐ اور طلاق	۴۸۹	الساعۃ	〃
خدا، مادہ اور روح	۴۹۳	تکویر شمس اور زلزلہ	۵۰۹
ذوالمعارج	۴۹۵	سورۂ انفطار و تناسخ	۵۱۰
(پچاس ہزار سال کا ایک دن)	〃	شرح صدر نہ کہ شق صدر	۵۱۴
سورۂ جن	۴۹۷	زلزال	۵۱۵
جہنم کے انیس فرشتے	۵۰۰	الناس۔	۵۱۶
دس مرتبہ "ویل"	۵۰۱		

وُہ کون تھا؟

آپ جاننا چاہیں گے کہ اس کتاب میں جس شخص کے انکار سے آپ کا سابقہ پڑنے والا ہے۔
وہ کون تھا؟

وہ ایک گمنام شخص تھا۔ جس نے اپنے لیے خود ہی گمنامی کو پسند کر لیا تھا۔
اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ دنیا میں نام و نمود کی قسم کی کوئی چیز ہے اور وہ قابلِ توجہ ہے۔
لیکن وہ ایک سدا بہار۔ خزاں ناآشنا پھول تھا جو اپنی دلآویز و مشام نواز خوشبو کو اپنے اندر بند نہ رکھ سکتا تھا۔ وہ خوشبو اس کی خواہش و ارادہ کے بغیر خود بخود اس کے اندر سے صادر ہوتی اور ارد گرد کی فضا میں پھیلتی رہتی تھی۔
وہ لوگ جو صحیح دماغ رکھتے تھے، جن کی قوتِ شامہ مفلوج و معطل نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی طلب و تمنا کے بغیر خود بخود اس کی طرف کھچے چلے آتے تھے، وہ اس سے راحت و تازگی اور طمانیت حاصل کرتے تھے لیکن وہ ان کے شکریے کے الفاظ سے بے نیاز تھا۔ کیونکہ وہ اس خوشبو کو اپنی چیز نہیں سمجھتا تھا۔ یہ تو باغباں کا فیض تھا۔ اگر کوئی شکریہ کرنا چاہے تو باغباں شکریے کا مستحق ہوتا ہے، نہ کہ پھول۔
یہ کتاب فکرِ سلیم کی ندرت کا ایک شاہکار ہے۔ اگر آپ فکرِ سلیم کی دولت سے محروم ہیں تو اس کو ہاتھ نہ لگایئے۔ اس سے آپ کو تکلیف پہنچنے کا احتمال ہے۔

طعمہ ہر مرغکے انجیر نیست — بر سماع راست ہر تن چیز نیست

لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ۔ کلام مطہر سے وہی لوگ لگاؤ رکھتے ہیں، جن کا باطن مطہر ہو۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روید در شورہ بوم خس

مفسرِ عظیم:۔ نام: خواجہ احمد الدینؒ۔ ولادت: ۱۸۶۱ء۔ وفات: ۱۹۳۶ء
مولد و مدفن: امرتسر (بھارت)۔ مکتبی تعلیم: انٹرنس۔ دینی استاذ: مولانا غلام العلی قصوریؒ ذریعہ معاش: تدریس حساب، ریاضی، فارسی، اردو، عروض وغیرہ۔ زبان دانی: اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں فاضلانہ مہارت۔ پنجابی (مادری زبان) بھاشا آریہ لٹریچر سمجھنے کے لیے، اپشنو گورمکھی، (سکھ دھرم کی زبان)۔ علوم: اقتصادیات (سود، ٹیکس، زکوٰۃ، صدقہ قرض وغیرہ مباحث پر عبور) علم بیان و معانی و بدائع وغیرہ تاریخ اسلام و تاریخ عالم کا وسیع مطالعہ، جغرافیہ۔ دنیا بھر کے جغرافی معلومات کا استحضار، حدیث، صحاح ستہ و دیگر کتب حدیث، علم حیوانات کا مفصل مطالعہ۔ دینیات کے لئے تو عمر ہی وقف کر رکھی تھی۔ قرآن مجید کے علاوہ بائبل

پر مکمل عبور دید، گرنتھ، منوسمرتی، ستیارتھ پرکاش اپنشد، فقہ و تفسیر کی مستند کتب، جدید مذاہب بہائی، قادیانی وغیرہ پر بھی گہری نظر تھی۔

ریاضی میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ اس کی تمام شاخوں، الجبرا، ٹرگنومیٹری، حساب، جومیٹری، کیلکولس میں مرتبہ استادی پر فائز تھے۔ صرف و نحو۔ ادیرجن زبانوں کا ذکر ہوا۔ ان کی صرف و نحو سے بھی بخوبی واقف تھے۔ طبقات الارض کا مطالعہ بھی خوب کیا تھا عروض پر ناقدانہ بصیرت رکھتے تھے۔ فلکیات کے عملی مشاہدات وحسابات سے پوری طرح واقف تھے۔ منطق و فلسفہ سے اتنا انہماک تھا کہ شہر بھر میں اس تفوق میں معروف تھے۔ فقہ سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ خصوصاً علم میراث میں تو تجدید و اجتہاد کے درجے تک پہنچے ہوئے تھے۔ علم نباتات کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے اور بیان فرماتے تھے، موسیقی کے رمز آشنا تھے۔ منطق۔ اس میں کافی مہارت تھی لیکن مغالطہ سے نفرت رکھتے اور اسے اصول تحقیق کے خلاف سمجھتے تھے۔ موسیقی۔ غالباً کتب موسیقی کا مطالعہ آپ نے نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے ماہروں سے ملاقات ہوتی تو ان کے رموز و نکات دریافت کرتے رہتے تھے۔ خواجہ دل محمد ایم اے اور دین محمد قوال سے اس پر بات چیت ہوئی تھی۔

مذکورہ بالا علوم کے وقائق موقع بموقع آپ کی تفسیر قرآن میں نظر آتے ہیں، اس کے علاوہ بھرپور معلومات اور عمیق و دقیق نکتے آپ کی گفتگو، خطاب جمعہ اور درس قرآن کے دوران خاص طور پر تفصیل سے بیان ہوتے تھے۔ آپ کی مجالس میں حاضرین کو سوال کی کھلی اجازت ہوتی تھی۔ سوال کے بعد آپ کی زبان سے معلومات کا چشمہ رواں ہوجاتا تھا۔ قرآن مجید کے کسی بھی اہم و دقیق بیان پر فی البدیہہ ایسی تقریر فرماتے تھے کہ گویا اسی مبحث پر ابھی لغت اور کتب متعلقہ کا مطالعہ کرکے آرہے ہیں۔ قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ کی ایسی محققانہ اور مفصل تشریح کرتے تھے کہ مفردات راغب وغیرہ کتب، لغت کے حافظ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

ایسے غیر معمولی تبحر کے باوجود اپنے آپ کو ہمیشہ طالب علم ہی سمجھتے اور رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي اور رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا کی دعائیں کرتے رہتے تھے۔ آپ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ مستقبل کا مفسر قرآن حکیم کے اور زیادہ علوم و عجائبات کا ماہر ہوگا۔ قیامت تک اس کتاب مجید سے نئے نئے معارف حاصل ہوتے رہیں گے جن مسائل کے فہم میں آپ مطمئن ہوچکے تھے۔ ان میں بھی مزید معلومات کے متمنی رہتے تھے۔ وہ اس کے قائل نہیں تھے کہ

سلف لکھ گئے، جو قیاس اور گمان سے
صحیفے ہیں اُترے ہوئے آسماں سے

اپنے فہم و فکر کو غلطی سے پاک نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کی تفسیر جو سات منزلوں پر مشتمل ہے۔ ان میں بعض کے اختتام پر اس قسم کے منکسرانہ الفاظ ملتے ہیں۔

"قرآن پاک سے جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے۔ اُسے لوگوں کے آگے پیش کر دیا ہے۔ اگر کوئی صاحب الفاظ قرآن سے اس

کا زیادہ اچھا بیان پیش کر دے تو میں دل سے اس کا شکریہ بجا لاؤں گا۔ (خاتمہ منزل اوّل ص۶۶)

محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تیسری منزل بھی ختم ہوئی یہ مجھ نادان اور ہیچ مدان پر اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے۔ لقمان جیسے لوگ نادانوں کے بیانوں سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ص۲۸۲

چوتھی منزل کے اخیر میں لکھتے ہیں۔

یہ منزل بھی ٹوٹی پھوٹی عبارت میں لکھی گئی ہے۔ کم ترین اس سے بھی قابل نہ تھا۔ ھذا من فضل ربی۔ خدا تعالےٰ اسے اپنے فضل ہی سے مفید بنائے ص۲؟

آخری، ساتویں منزل کا خاتمہ دیکھئے :۔

سپاس بے قیاس رب الناس، ملک الناس، الٰہ الناس کے لیے سزاوار ہے جس نے میری کمزوری اور بے شعوری کے باوجود ساتویں منزل کی تفسیر ٹوٹی پھوٹی عبارت میں تکمیل کو پہنچا دی۔

فللہ الحمد۔

سبحان ربك رب العزة عما يصفون وسلام على المرسلين والحمد لله رب العالمين ص۲۸۲

یہ تو ہوئے خاتمے۔ اب آغاز بھی ملاحظہ فرمائیے گا۔ حضرت خواجہؒ کے زمانے میں کتابوں کو نذر ـــ انتساب اور معنون وغیرہ کرنے کا رواج چل نکلا تھا۔ چنانچہ امرتسر کے ایک مشہور مفسر نے اپنی تفسیر کا آغاز اس شعر سے کیا تھا۔

در روز محشر ہر کسے، در دست گیرد نامۂ
من نیز حاضر می شوم، تفسیر قرآن در بغل

خواجہؒ کی ہر منزل کا آغاز اس طرح ہوتا تھا۔

نذر

اِنَّ صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین[۱] ۔ نیاز آگین احمدالدین

عام اندازِ تفسیر

ہماری بیشتر تفاسیر کسی خاص فرقے کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مفسر قرآن میں داخل ہونے سے پہلے اپنے فرقے کی عینک آنکھ پر رکھ لیتا ہے اور اپنی پوری تفسیر میں وہی کچھ لکھتا چلا جاتا ہے جو اس کے فرقے کے سابقین لکھتے چلے آئے ہیں۔ الّا یہ کہ اس کا انداز تحریر اپنا ہو اور کہیں کہیں کوئی بات کی باریکی لیے ہوئے ہو۔ لیکن وہ صدیوں پیشتر کی قائم شدہ حدود سے باہر نہیں جا سکتا۔ اگر کہیں اس کا قدم آگے بڑھا تو مختلف قسم کے فتاویٰ کے ہدف بننے کا

---

[۱] میری نماز دیگر عبادات، زندگی اور موت (سب کچھ) اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے (الانعام - ۱۶۲)

اندیشہ اس کو فوراً سمٹنے اور سنبھل جانے پر مجبور کر دیتا ہے ـــــ یہ تو ہے ہمارے راسخ العقیدہ بزرگوں کی روش۔

متجددین

دوسری طرف ہمیں بعض ایسے مفسر نظر آتے ہیں جو قدیم ذخائر سے استفادہ کرنے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اور جدید مغربی علوم کی عینک سے قرآن کو دیکھتے ہیں۔ جس طرح سابق الذکر قرآن کو اپنے فرقے کے پیچھے لگاتے ہیں۔ یہ لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر اللہ کی کتاب کو اپنے جدید معلومات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

خصوصیت خواجہ

خواجہؒ یک طرفہ عالم نہیں تھے۔ انہیں مغرب و مشرق اور جدید و قدیم پر یکساں عبور حاصل تھا۔ لیکن ان کے سوچنے کا طریق بالکل جداگانہ تھا وہ پہلے قرآن کو دیکھتے تھے۔ اس کی عطا کردہ عینک چشم بصیرت پر لگاتے اور اس کی آیات کو حل کرنے کے لیے متعلقہ علوم کی طرف آتے۔

فلکیات سے متعلق آیات، نباتات سے متعلقہ آیات۔ طبقات الارض سے متعلقہ آیات وغیرہ ذالک یعنی قرآن آگے ہوتا اور یہ تمام علوم جو ان کے زمانے تک مدون ہو چکے تھے اور جن تک ان کی رسائی تھی، ان کو قرآن کے پیچھے چلانے کی کوشش کرتے۔ اس میں ان کو اکثر کامیابی ہوتی تھی اور کہیں کہیں مشکل بھی پیش آتی تھی۔ ایسے مقامات پر ہم ان سے اختلاف کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ خود بھی کسی شخص کو اپنا مقلد بنانا پسند نہیں کرتے تھے اور اپنے فہم کو حتمی اور قطعی منوانے کا خبط نہیں رکھتے تھے۔

ان کی اسی معتدل روش کا نتیجہ ہے کہ ان کے حلقۂ مستفیدین میں ہم کو جہاں بعض ماہرین علوم جدیدہ نظر آتے ہیں۔ وہاں کئی ایک قدیم مکاتب فکر کے نمائندے بھی ان کی فکر کو استحسان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ بعض اصحاب کے اعترافات سطور ذیل میں دیئے جاتے ہیں۔

علامہ جیراجپوری

علامہ حافظ، مفتی محمد اسلمؒ جیراج پوری جو تفسیر حدیث فقہ اور ادب کے جیّد عالم تھے۔ قدیم تفاسیر پہ پر لکھنے کے بعد کہ "ان کا بڑا حصہ بے کار ہے" فرماتے ہیں "مولانا احمد الدین صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے قرآن فہمی میں اپنی پوری زندگی صرف کی اور قرآن کو قرآن ہی سے سمجھتے رہے .... وہ قرآن کے ایک ایک لفظ۔ ایک ایک آیت اور ایک ایک مسئلہ کی تشریح شواہد فطریہ اور دلائل عقلیہ کی روشنی میں صرف قرآن ہی سے کرتے ہیں .... یہ بہت ممکن ہے کہ ہم ان کی بعض تشریحوں سے متفق نہ ہوں۔ لیکن ان کے مسلک سے اختلاف کرنا ممکن نہیں ہے ...... مولانا موصوف اپنی مسئولیت اور ذمہ داری کا احساس رکھتے ہیں۔ اس لیے جو مطلب سمجھتے ہیں، اس کو بلا خوف لومۃ لائم صاف صاف لکھ دیتے ہیں۔ مفہوم کے ہر پہلو پر ان کی نظر رہتی ہے اور سب کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے بیان میں طوالت ضرور آجاتی ہے۔ مگر کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہنے پاتا ..... وراثت کے مسائل کو انہوں نے خصوصیت کے ساتھ سمجھا ہے ..... ان کی یہ تفسیر مجتہدانہ شان رکھتی ہے۔ اور قرآنی تعلیمات کو قرآن ہی سے حل کرنے اور سمجھنے والوں کے لیے ایک نادر ذخیرہ ہے۔" (سیرت احمد الدین۔ حصہ دوم۔ ص۱۰)

پروفیسر شبیر احمد

پروفیسر شبیر احمد۔ ایم۔ اے امرتسری جو حیاتیات کے استاد اور اس فن سے متعلق بہت سی انگلش

کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے خواجہؒ کی ابتدائی تصنیف "خیر کثیر در اثبات وجود ربِ قدیر" پر ایک مفصل تبصرہ لکھا تھا۔ جو سات صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی چند سطور بھی دیکھ لیجئے۔

(اس کتاب میں خواجہ صاحب نے) "نہایت خوبی اور ژرف نگاہی کے ساتھ دہریت کے پیچیدہ سے پیچیدہ دلائل کا جواب دیا ہے۔ اور فاطرِ کائنات کی ہستی کو ایسے عالمانہ و محققانہ انداز میں ثابت کیا ہے، جس سے ان کے ذہن و فکر کی دقت و جودت کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ اس رسالے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم تمام علوم متداولہ میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ کہیں علم الحیات سے استدلال کیا گیا ہے۔ کہیں ہندسہ و ہیئت کی مدد سے دہریت کی گمراہیوں اور ضلالت انگیزیوں کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے، کہیں طبعیات و کیمیا کی روشنی میں مطالب الٰہیہ پر بحث و تمحیص کی گئی ہے۔ غرض کہ ان تمام علوم عقلیہ کو معرض بحث میں لے آتے ہیں۔ جو دہریوں کے دلائل و براہین کا محور رہے ہیں۔ اور ان سوالات کا اطمینان بخش حل پیش کر دیا ہے۔ جن میں سرگرداں ہو کر ایک تعلیم یافتہ انسان فلسفہ کی پناہ ڈھونڈنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

مولانا مرحوم نے موضوع کے ہر پہلو پر مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ بحث کی ہے اور اس کی تفریعات و جزئیات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں انہوں نے انکار و الحاد کی جگہ اذعان و یقین کی روح نہ پیدا کر دی ہو"

وجود باری پر مولانا خواجہؒ کے ایک دعویٰ اور اس کی دلیل کا ذکر کرتے ہوئے فاضل تبصرہ نگار لکھتے ہیں۔

"اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں مولانا صاحب ایک ایسی دلیل پیش کرتے ہیں، جس کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ مولانا صاحب کی جودتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ میں نے آج تک اسے کسی فلسفہ و سائنس کی کتاب میں مرقوم نہیں پایا"

(سیرت احمد الدین صفحہ ۱۰۸ و ۱۱۱)

ان اقتباسات میں صرف ایک مقام پہ دونوں تبصرہ نگار حضرات میں توارد ہوا۔ اس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

قدیم مکتب فکر کے فاضل نمائندہ مولانا حافظ اسلم جیراج پوری نے اپنے تبصرہ تفسیر "بیان للناس" کے آخر میں لکھا ہے۔

"ان کی یہ تفسیر مجتہدانہ شان رکھتی ہے"۔ (صفحہ ۱۰۰)

اور جدید علوم کے نمائندہ پروفیسر بشیر احمد مرحوم ایم اے اپنے تبصرہ "خیر کثیر" تصنیف خواجہؒ میں رقم طراز ہیں۔

"مولانا مرحوم نے موضوع کے ہر پہلو پہ مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ بحث کی ہے" (صفحہ ۱۱۰)

یعنی قدیم و جدید دونوں حلقوں کے بالغ نظر نمائندے حضرت خواجہؒ کی مجتہدانہ شان اور مجتہدانہ بصیرت کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہمارے مفسرین میں اس دوگونہ فضیلت سے متصف بہت تلاش کرنے سے بھی شاید ہی کوئی مل سکے۔

علامہ سید سلیمان ندوی

معروف ترین فاضل علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے حضرت خواجہؒ کے رسالہ "معجزۂ قرآن" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

معجزۂ[1] قرآنی : در بیان میراث مسلمانان ۔ مولوی احمد الدین[2] مدرس مدرسۃ المسلمین امرتسر نے مسائل میراث اسلامی پر ایک ناقدانہ رسالہ لکھا ہے ۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ علماء میں اب ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو مسائل فقہیہ میں بلا خوف لومۃ لائم فقہائے متقدین شکر اللہ مساعیہم کے اجتہادات پر قلم اٹھاتے ہیں ۔ ہمارے برادران اہل حدیث سے توقعات تو بہت تھیں ۔ لیکن ان کی پچھلی تاریخ سے واضح ہوتا ہے ۔ کہ نماز روزہ سے آگے ان کے زور بیان کے دیکھنے کا موقع نہ ملے گا ۔ ان مسائل میں جن کا ماحصل صرف افضلیت اور ترجیح پر ختم ہو جاتا ہے ۔ زور استدلال اور قوت بیان سے آگے بڑھ کر مجادلہ ۔ مقاتلہ ۔ اور مقادمہ (یا باہم مقدمہ بازی) تک نوبت پہنچ جاتی ہے ۔ لیکن معاملات جن پر مسلمانوں کے اجتماعی اور مالی حالات کا مدار ہے ۔ ان (اہلحدیث) میں کسی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوتی ۔ اسی بنا پر ہم نے مولوی صاحب کے رسالہ میراث کو پوری قدر اور غور کے ساتھ پڑھا اور پھر اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ اس میں بہت سی باتیں لائق توجہ ہیں اور درحقیقت ان مسائل میں ہمارے فقہاء کتاب و سنت سے کسی قدر دور[3] جا پڑے ہیں ..... الخ (سیرت احمد الدین ص ۱۴۵ بحوالہ ماہنامہ "معارف" ، صفر ۱۳۳۶ھ دسمبر ۱۹۱۷ء ص ۵۶) ۔

علامہ اقبال

ترجمان حقیقت ، حکیم الامت علامہ اقبال[رح] علوم جدیدہ کے تو بحر ذخار تھے ہی ۔ اسلامیات کے قدیم ذخائر پر بھی وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے ——— جس زمانے میں آپ خطبات مدراس کی تصنیف و تشکیل میں مصروف تھے ۔ آپ کو قرآن حکیم کے بعض خاص و اہم مسائل میں مشورہ و استفادہ کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ ملک کے مشاہیر علماء کے اسمائے گرامی کی فہرست آپ کے سامنے تھی ۔ لیکن اس ہجوم میں آپ کی نظر ایک گم نام ، گوشہ نشین پر پڑی ۔ جو کسی دارالعلوم کا سند یافتہ نہیں تھا ۔ اور نہ کسی درس گاہ اسلامی کی مسند درس پر مشرف ——— ایک معمولی سکول ماسٹر جس کو اسلام قرآن اور مختلف علوم سے فطری لگاؤ تھا ۔ جس کا استاد غیر معمولی ذہانت و دوراکی اور حد سے بڑھا ہوا شغف مطالعہ تھا ۔

حضرت علامہ[رح] ——— خواجہ[رح] کے مضامین متعلقہ قرآن کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے جو ہر ماہ ——— ماہ نامہ "بلاغ" امرتسر کے ذریعے ان تک پہنچ جاتے تھے ۔ جیسا کہ ان کے بعض مکاتیب سے ظاہر ہوتا ہے ۔ جو انہوں نے پروفیسر صوفی تبسم[4] ایم اے کے نام لکھے ——— ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

---

[1] ۔ اصل نام "معجزہ قرآن" ہے ی کا اضافہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتا ہے ۔

[2] واضح رہے کہ حضرت مرحوم کو تینوں القاب سے ملقب کیا جاتا تھا ۔ مولوی ۔ مولانا ۔ خواجہ ۔ آخری لقب آپ کی نوبت سے متعلق ہے اور اول الذکر دو لقب علمیت کے بخشیدہ ہیں ۔

[3] ہمارے مفسر بھی عموماً کتاب و سنت سے دور جا پڑے ہیں اس کے ثبوت میں ۔ " التفسیر والمفسرون " ، مؤلفہ محمد حسین ذہبی ۔ مطبوعہ قاہرہ (مصر) کا مطالعہ کرنا چاہیئے ۔ اس کے علاوہ محدثین و صوفیہ کا بڑا حصہ بھی کتاب و سنت سے دور جا رہا ہے جیسا کہ ان علوم کے بعض مصنفین نے بیان کیا ہے

[4] صوفی تبسم صاحب نے برسوں حضرت خواجہ کے فیضان صحبت سے استفادہ کیا اور ان کی تفسیر "بیان للناس" منزل اول کا دیباچہ بھی لکھا ہے ۔

"میں کل شام مولوی صاحب کا منتظر رہا..... ان کی یہ عنایت کم نہیں کہ وہ محض میرے فائدہ کے لیے لاہور تشریف لانے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں..... موضوع گفتگو کے متعلق اگر "مشروعیت جہاد" نہیں تو اور بہت سے امور ہیں جن کے متعلق میں ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ آپ مہربانی کر کے میری تحریر سے یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ مجھے ان سے فائدہ اٹھانے میں تامل ہے آپ کو گذشتہ خط لکھنے کے بعد میں نے چند باتیں نوٹ بھی کر رکھی تھیں، جن پر مولوی صاحب کے خیالات سے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا آرزو مند ہوں۔ (مخلص محمد اقبال۔ لاہور ۶ ستمبر ۲۵ء)

خط کو ختم کرنے کے بعد آخر میں یہ سطر الگ لکھی ہے۔

"مولوی صاحب کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کر دیجیے گا"

راقم الحروف جناب معز الدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی کراچی کا ممنون ہے کہ انہوں نے نیشنل لائبریری کراچی سے یہ خط تلاش کرا کے استفادے کا موقع دیا۔

اب ایک مطبوعہ مکتوب کے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ لیکن اس سے پہلے صوفی صاحب کی ایک تمہید کی بعض سطور دیکھ لیجیے۔ ذیل کا خط علامہ مرحوم نے ۱۹۲۵ء میں میرے نام لکھا تھا..... اسی زمانے میں امرتسر سے رسالہ "بلاغ" شائع ہوا تھا۔ اس رسالے میں خواجہ احمد الدین مرحوم کے مضامین اور قرآن حکیم کی تفسیر انہی کے قلم سے شائع ہوتی تھی۔ یہ رسالہ ڈاکٹر (اقبال) صاحب کی خدمت میں باقاعدہ[2] پہنچتا تھا اور وہ بالاستیعاب اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اس خط میں جن مولانا کا ذکر ہے، وہ یہی خواجہ احمد الدین مرحوم ہیں تبسم۔ (بلاغ، امرتسر ۱۹۳۸ء ماہ اگست منقول از "راوی"[3] لاہور)

علامہ لکھتے ہیں:

"میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود[4] ہے۔ البتہ فرصت کے اوقات میں میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات

---

[1] یہ خط اور زیر نقل خط دونوں کی فوٹو کاپی صوفی صاحب کے پاس موجود ہے اور اصل خطوط نیشنل لائبریری کراچی میں موجود ہیں۔

[2] حکیم شہاب الدین مرحوم مالک و مدیر اول بلاغ کی زبان سے راقم الحروف نے سنا ہے کہ علامہ باقاعدہ رسالے کا سالانہ چندہ ادا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک ملاقات میں انہوں نے حکیم صاحب موصوف سے کہا میرے پاس تمام جرائد معاوضہ وقیمت کے بغیر پہنچ جاتے ہیں۔ صرف آپ ہی ہیں جو مجھ سے بلاغ کی قیمت وصول کر لیتے ہیں۔

[3] گورنمنٹ کالج لاہور کا آرگن۔

[4] اس خط کی اشاعت پر علامہ کے معتمد خاص میاں محمد حسین مرحوم نے کہا کہ یہ جعلی ہے۔ صوفی صاحب نے خط کا فوٹو چھپوا دیا اور بعد میں جب ان سے ملے تو کہا۔ میاں صاحب! تحقیق کیے بغیر کوئی بات منہ سے نکالنا اچھا نہیں۔ ایسا ہی ڈاکٹر شاہ علی نے کراچی ریڈیو پر ۲۰ رات ساڑھے ۶ بجے کی "بزم طلبہ" کی نشریات میں کہا کہ علامہ کے خطوط بنام علامہ سید سلیمان ندوی کی اشاعت رکوانے کی بہت کوشش کی گئی۔ ایسے لوگ علامہ کے ذوق علم اور جذبہ استفادہ کو ان کی عظمت کے منافی اور کسر شان سمجھتے ہیں۔ حقیقت کو چھپانا، نہ ممدوح کی خدمت ہے اور نہ علم تاریخ سے انصاف۔

میں اضافہ ہو..... اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعہ میں گزری ہے، اور یہ نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطۂ نگاہ سے حقائق اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں[1].....

مذکورہ بالا حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ مولوی صاحب موصوف (یعنی خواجہ احمد الدین) کو میرے ساتھ تبادلہ خیالات کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہاں مجھ کو ان سے فائدہ پہنچنا یقینی ہے۔ اس واسطے وہ اگر مجھ کو مستفیض کرنے کے ارادے سے امرتسر سے لاہور آنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ تو ان کی بہت مہربانی ہے جس کے لیے میں ان کا نہایت شکر گزار ہوں۔

مجھ کو ان کے خیالات سے پہلے بھی کس حد تک آگاہی ہے.....

(محمد اقبال۔ لاہور۔ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء)

اس خط کی چند سطریں اور پیش کرنے کو جی چاہتا ہے، جن میں علامہ چاہتے ہیں کہ

"کیا اچھا ہو کہ وہ (خواجہ صاحب) شریعت محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب مرتب فرمائیں، جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو "معاملات" کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔" (ایضاً)

مسلکِ اقبال

"صرف قرآن" سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خارج از قرآن اسلامی لٹریچر کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے جتنی ہمارے مختلف مکاتب فکر کے علماء دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بعض سوانح نگار اسی نتیجے پر پہنچے کہ۔

"وہ (علامہ) اس اسلام کے داعی تھے جس کی دعوت خود قرآن مجید نے دی تھی۔ یعنی وہ اہل قرآن تھے۔ لیکن اپنے آپ کو اہل قرآن کہنا بھی ایک قسم کی فرقہ پسندی تھی۔ اس لیے انہوں نے کبھی اپنے آپ کو اہل قرآن کی طرف منسوب نہیں کیا تاہم ان کے اشارات بلکہ تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کے متعلق ان کا عروۃ الوثقیٰ صرف قرآن تھا۔ مثنوی رموز بے خودی میں فرماتے ہیں۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن | نیست ممکن جز بقرآں زیستن
صوفیِ پشمینہ پوش حال مست | از شراب نغمہِ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش | در نمی سازد بقرآں محفلش
واعظ دستاں زن افسانہ بند | معنی او پست و حرف او بلند
از خطیب و دیلمی گفتار او | با ضعیف و شاذ و مرسل کار او

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب
تو ازو چیزے کہ می خواہی بیاب[2]

---

[1] خواجہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے مغربی فلسفہ اور دیگر علوم کا مطالعہ کرتے تھے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔

[2] صوفی شعر و شاعری اور قوالی کی محفلوں میں مست ہے اور قرآن اُسے موافق نہیں آتا۔ اسی طرح واعظ مکر و فریب، قصہ کہانی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک بار علامہ سے سوال کیا گیا کہ "اسلام بتمامہ قرآن میں محصور ہے یا نہیں؛ انہوں نے سائل سے کہا "مفصل کہو" سائل نے کہا ——— خارج از قرآن ذخیرہ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس بات میں کفایت کرتا ہے" ——— انہوں نے فرمایا۔

"یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتا چلتا ہے کہ کن ضروریات کے تحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفس اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آ چکا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لیے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں" علامہ کے ایک خطبے کے یہ الفاظ بھی مزید تائید کرتے ——— " وہ حضرت عمرؓ امت کے اوّلین دل و دماغ ہیں۔ جو ہر معاملے میں آزادیٔ رائے اور تنقید سے کام لیتے ہیں۔ اور جن کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم تھا کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت نزع میں یہاں تک کہہ دیا کہ ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے"۔ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" ص ۲۵۱ ترجمہ سید نذیر نیازی)

ایک اور صحبت میں ایک غالی اہل حدیث کے ساتھ گفتگو کے دوران میں فرمایا۔

"میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو معلوم ہے کہ کن ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہے"۔

لیکن بایں ہمہ وہ حدیثوں کے سرے سے منکر نہ تھے بلکہ بہت سی حدیثوں پر شدت سے اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کو جو کچھ شک و شبہ تھا احادیث کی شرعیت (حجیت) کے متعلق تھا چنانچہ ایک خط میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔

شرعیت احادیث کے متعلق جو کھٹک میرے دل میں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ احادیث سرے سے بیکار ہیں ...... الخ (تلخیص از "اقبال کامل" مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی ص۵۵ و ۵۶)

یہی مسلک خواجہ احمدالدین" کا تھا۔ جیسا کہ ان کی بعض تصانیف "برہان القرآن" وغیرہ سے واضح ہوتا ہے۔ لوگوں نے ان کو "اہل قرآن" کہا، لیکن وہ کسی بھی فرقے سے اپنے آپ کو منسوب کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف "مسلم" تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے احباب نے ان کی تحقیق قرآنی کی اشاعت کے لیے ایک مجلس کی بنیاد رکھی تو اس کا نام وہی رکھا گیا جو حضرت ابراہیم نے تجویز کیا اور اللہ تعالیٰ نے پسند کیا تھا یعنی "امت مسلمہ"

تعزیت خواجہ صاحب کی وفات پر احباب کی طرف سے بہت سے خطوط آئے جن میں سے صرف چند ان کے سیرت نگار

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور محدثین و احادیث کے سقم و صحت میں الجھا ہوا ہے۔ اصل چیز تو قرآن ہے اے مسلمان تجھ پر فرض ہے کہ قرآن میں غور کرے تیری ہر مراد قرآن ہی سے پوری ہو گی۔ اشارہ ہے اس مضمون کی آیات کی طرف۔ تفصیل کل شئ وھدی ورحمۃ لقوم یومنون (رعد ۱۱۱) جئناھم بکتاب فصلناہ علی علم (اعراف ۵۲) کتاب احکمت آیاتہ ثم فصلت من لدن حکیم خبیر (ہود۔ ۲) یعنی قرآن میں ہر بات کی تفصیل ہے۔

نے درج کئے ہیں۔ یہاں ان کی صرف ایک ایک، دو دو سطریں پیش کی جارہی ہیں۔

علامہ اقبالؒ

" خواجہ مرحوم کے انتقال کی خبر سے بہت رنج ہوا۔ خدا تعالیٰ مغفرت کرے۔ اس زمانے میں ان کا دم غنیمت تھا۔ عالم باعمل روز روز پیدا نہیں ہوتے" (سیرت ص۸۵)

یہ سطور جس مکتوب سے لی گئی ہیں وہ اپنی مکمل صورت میں "اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال" کے صفحہ ۳۰۰ و ۳۰۱ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس پر ۱۴ ر جون ۱۹۳۶ء کی تاریخ درج ہے۔

اس وقت یہ مجموعہ پیش نظر ہے۔ اس میں ایک اور مکتوب تقاضا کر رہا ہے کہ اس کی چند سطور بھی یہاں نقل کر دی جائیں۔

مکتوب الیہ (ہرشی) کو مخاطب کر کے علامہؒ لکھتے ہیں مولوی (خواجہ احمد الدین) صاحب قبلہ کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کر کے بہت بہت شکریہ ادا کیجئے۔ میں گذشتہ ۱۰ ماہ سے ہائی کورٹ کا کام نہیں کرتا۔ اس واسطے مولوی صاحب سے گفتگو کرنے کے لیے مجھے کچھ پہلے کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوگا ۔۔۔ امید کہ مولوی صاحب کا مزاج بخیر ہوگا۔ (مخلص محمد اقبال، ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

اس خط سے۔ تعزیت نامے سے اور اوپر لکھے گئے بیانات سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت علامہ کی نظر میں حضرت خواجہ کی کتنی عزت و عظمت تھی۔

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب

ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ماہر ہفت زبان[1]

میں خواجہ صاحب کو اس وقت سے جانتا ہوں۔ جب کہ وہ ایم۔ اے۔ او ہائی سکول امرتسر میں مدرس تھے ۔۔۔۔ جب میرا دائرہ معلومات وسیع ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے عالم دین اور مفسر قرآن ہیں ۔۔۔۔ انہوں نے قرآن کے مفہوم کو مشتبہ روایات کی مدد سے سمجھنے کی بجائے خود قرآن کی اپنی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی اور عجائب پرستی اور توہمات سے آزاد ہو کر قرآن کو عقلی اور فطری انداز میں سمجھا اور دوسروں کو سمجھایا ۔۔۔ (سیرت ص۶۹)

محمد عباس صفوی شمس آباد۔ یو۔ پی

مصنف تنقید الاحادیث

... مفسر جلیل حضرت خواجہ احمد الدین علیہ الرحمۃ کی "خبر ارتحال سن کر صدمہ عظیم ہوا" (یہ صاحب ایک روشن خیال، معتدل مزاج

---

[1] آپ متعدد اردو و انگریزی مقالات و کتب کے مصنف و مترجم ہیں اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگاروں میں شامل ہیں۔

شیعہ فاضل تھے)

ڈاکٹر طالب علی صاحب

"خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر سے غیر معمولی صدمہ ہوا۔ ایسی مقدس ہستیاں صدیوں بعد پیدا ہوا کرتی ہیں"۔۔۔۔ صک۸۲

حکیم محمد حسین صاحب مرہم عیسیٰ

۔۔۔۔ ایک نہایت ہی غم سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ ہاتھوں میں لغزش ہے۔ آہ! ہمارا پیارا دوست اس عالم میں موجود نہیں ہے ۔۔۔۔ صک۸۲

(یہ بزرگ لاہوری احمدی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور خواجہ صاحب سے قرآن فہمی میں استفادہ کیا کرتے تھے)

سید مقبول احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر اعظم گڑھ

"حضرت خواجہ صاحب کے انتقال کی خبر سن کر بے حد صدمہ ہوا۔۔۔۔ اگر قرآن کو بھی تفسیر و روایت کے ذریعے سے سمجھا ہے تو خواجہ صاحب کی تفسیروں سے مرجح ہے ۔۔۔۔" صک۸۲و۸۳

جناب حفیظ ہوشیارپوری۔ ایم اے

قطعہ تاریخ وفات خواجہ احمد الدین صاحب مفسر قرآن

خواجۂ ما چو رفت از دنیا — گفتم ایں شعر پاک اندر سال

احمد الدین مفسرِ قرآن — صاحب امجد، انیس بزم وصال

۱۳۵۵ — صک۲۸

خواجہ عباد اللہ اختر بی۔ اے

یہ (وفات) شخصی نہیں بلکہ قومی نقصان ہے ۔۔۔۔ ان کے قلب سلیم پر جو آسمان سے نازل ہوتا تھا، وہ کس کو نصیب ہے۔ وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ میں نے تاریخ وفات لکھی ہے۔

آں خدا دوست خواجہ احمد دین — آں دلیل بہشت دنیا را

رفت و برکندہ شد بنائے تمیز — مہر عقبیٰ بہشت دنیا را

۱۳۵۵ھ — صک۸۶

اس کے بعد خواجہ اختر صاحب نے ایک اور طویل خط لکھا۔ اس کی بھی چند سطور دیکھئے۔

دور ہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود   بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

انکسار (خواجہ کی) طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اخلاق حسنہ کا مجسمہ تھے، وہ اپنے عقائد محکم و تحدی سے منوانا نہیں چاہتے تھے۔۔۔۔ انہیں مل کر صدر اسلام کے بزرگان ملت کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ان کی وفات حسرت آیات پر اور کیا کہا جائے کہ۔

غریباں را دل از بہر تو خون است

دل خویشاں نمی دانم کہ چون است

آپ نے ماسوی اللہ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اور دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کے لطف سے بہرہ اندوز نہ تھے۔ تقویٰ آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ہر وقت قال اللہ زبان پر تھا اور توحید میں یہ انہماک کہ انہیں اسی میں کچھ لطف زندگی تھا۔۔۔۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما   صفحہ ۸۹، ۹۰

حکیم ڈاکٹر طالب علی ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔۔۔۔ خواجہ صاحب کو قرآن حکیم کے لفظ لفظ اور آیت آیت پر جو عبور تھا اس کی نظیر دیکھنے میں نہ آئی، سب سے اعلیٰ وصف جو حضرت مرحوم میں دیکھا گیا وہ یہ تھا کہ جس مسئلہ کو خود جس طرح صحیح یقین کرتے تھے۔ وہ بغیر کسی خوف و خطرہ اور بغیر پروائے لومۃ لائم ٹھیک ٹھیک اسی طرح بیان یا تحریر کر دیتے تھے جس طرح کہ وہ خود سمجھے ہوئے تھے۔ اور یہ وہ وصف ہے جس سے زمانہ حال کے بڑے بڑے علامہ بھی محروم ہیں۔۔۔۔ صفحہ ۹۱

یہ عام عادت تھی کہ کسی کے ہاں کھانا نہیں کھاتے تھے اور اپنے ہاں سے جبر اً، منت سے، عاجزی سے غرض جس طرح بھی ہو سکے، ضرور کھلایا کرتے تھے۔ کھانے کا وقت نہ ہوتا تو فرماتے۔ لسی پیو، دودھ پیو، کوئی پھل ہی کھاؤ۔۔ کوئی خواجہ صاحب کے اوصاف کہاں تک گنائے۔ اس کے لیے ضخیم جلدیں درکار ہیں۔ ان کے علمی نکات کی تفصیل اس چھوٹی سی تحریر میں کہاں سما سکتی ہے۔۔۔۔ ایسی ہستیاں کہیں صدیوں بعد ہی پیدا ہوا کرتی ہیں۔ صفحہ ۹۲

قرن ہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود

بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

تلمیذ الرحمٰن

اب ہم اس بات پر غور کریں گے کہ خواجہ صاحب ایک غریب، کثیر العیال اور کسب معاش میں مصروف رہنے والے آدمی تھے۔ انہوں نے کسی کالج یا دینی دار العلوم کا دروازہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود علامہ اقبال ایسی بے مثل شخصیت، علامہ اسلم جیراجپوری، شمس العلماء مولانا محب الحق عظیم آبادی اور سید سلیمان ندوی ایسے فاضل اجل (وغیرہم) ان کے فضل و کمال کے معترف اور ان کی شخصیت سے

غیر معمولی طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں خواجہ عباد اللہ، اختر کے ان الفاظ پہ غور کرنا ہوگا۔

"ان کے قلب سلیم پر جو آسمان سے نازل ہوتا تھا۔ وہ کس کو نصیب ہے۔ وہ اپنی نظیر آپ تھے۔"

یعنی وہ تلمیذ الرحمٰن تھے۔ ان کا علم وہبی تھا۔ ان کی فکر و فراست کو تائیدِ الٰہی حاصل تھی۔ آپ اس کتاب میں جا بجا اس بات کے شواہد ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہاں دو ایک مثالیں نمونتہً پیش خدمت ہیں۔

آپ کا سیرت نگار رقم طراز ہے اور راقم خود بھی اس کا شاہد ہے کہ

معجزانہ قرآن فہمی

آپ خاصے سائنسدان اور اسٹرانمی (علم ہیئت) کے ماہر بھی تھے۔ قرآن اور سائنس وغیرہ علم معقول کو تطبیق دینے میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ ۱۹۰۴ء میں آپ نے سنا کہ سورج میں ایک بہت بڑا سیاہ داغ پڑ گیا ہے[1] تو آپ (خواجہ) نے اپنے اکثر احباب اور رشتہ داروں سے ذکر کیا کہ ایک خوف ناک زلزلہ کا خطرہ ہے۔ چنانچہ ۴ اپریل ۱۹۰۵ء کو ایک ہیبت ناک زلزلہ آیا جس کی یاد آج تک دلوں سے محو نہ ہو سکی[2] ـــــ زلزلہ آنے کے بعد خواجہ غلام علی (خواجہ صاحب کے ایک رشتہ دار) صاحب سلمہ، اور بعض دوسرے احباب نے خواجہ صاحب سے دریافت کیا کہ آخر آپ کو اتنا عرصہ پیشتر اس قیامت خیز زلزلے کا علم کیسے ہوا؟

اس کے جواب میں فرمایا کہ!

"مجھے وحی یا الہام سے اس کا علم نہیں ہوا تھا اور نہ اس پیش گوئی میں میری کوئی خصوصیت ہے۔ بلکہ یہ قرآن مجید کی خوبی ہے کہ اس میں بے شمار علمی حقائق بھرے پڑے ہیں ـــ چنانچہ پیش گوئی کی حمایت میں آپ نے یہ آیات تلاوت کیں۔

"اذا الشمس کورت۔ واذا النجوم انکدرت" یعنی جب سورج لپیٹا جاتا ہے (اس کی روشنی میں داغ پیدا ہو جانے کی وجہ سے کمی واقع ہو جاتی ہے) اور جب ستارے میلے ہو جاتے ہیں (سورج کی روشنی میں کمی کے سبب ستارے بھی گدلے ہو جاتے ہیں) تو اس کے نتیجے کے طور پر "واذا الجبال سیرت" اور جب پہاڑ اڑائے جاتے ہیں (یعنی زلزلے آتے ہیں) چوں کہ آفتاب میں داغ پڑنے کی اطلاع موصول ہوئی تھی۔ اس لیے قرآن مجید کے اس ارشاد کے پیش نظر مجھے خیال ہوا کہ خوف ناک زلزلہ آئے گا۔ قرآن مجید میں ایسے کروڑں علم بھرے پڑے ہیں۔ (رب زدنی علماً ص ۴۷-۴۸)

محترم ناظرین! آج تک اس نقطہ نگاہ سے قرآن مجید کو کس نے دیکھا ہے؟

---

[1] غالباً امریکہ کے کسی اخبار میں چھپا تھا۔ وہاں کے کسی ماہر فلکیات نے اس داغ کی پیمائش بھی لکھی تھی جو کئی ہزار میل تھی۔ خواجہ صاحب کی زبان سے راقم نے یہ بات سنی تھی۔

[2] پنجاب میں "وڈا بھونچال" زلزلہ عظیم کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سے کانگڑہ بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ اور بھی کئی شہروں کو سخت نقصان پہنچا تھا۔

قرآن اپنی یہ خصوصیت دنیا سے منوا کر رہے گا کہ وہ ماضی، حال اور استقبال کے تینوں زمانوں پر حاوی ہے۔ اس کے خلاف ہمارے اکثر بزرگ بضد ہیں کہ اُسے صدیوں پیچھے موڑ کر وہیں جما دیا جائے۔ خواجہ رہ ان محققین میں ایک ممتاز مقام پر فائز ہیں۔ جو قرآن کی ہمہ گیری کو علم و عمل کی وساطت سے ثابت کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ خود علامہ اقبال قرآن کی محض ماضویت پر مطمئن نہیں تھے۔ جیسا کہ وہ اپنی چشم بصیرت سے قرآن کے اندر جھانکنے کے بعد فرماتے ہیں۔

صد جہاں باقیست در قرآں ہنوز
اندر آیاتش یکے خود را بسوز

انفرادیت

یہ مقام "در آیاتش بسوز" کے بغیر حاصل نہیں ہوتا آئیے خواجہ رہ کی انفرادیت کا ایک اور منظر سامنے لائیں۔ اسلامیات میں علم فرائض بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ علماء میں بھی بہت تھوڑے ہیں جو اس میں مہارت رکھتے ہوں۔ وہ ان حدود سے باہر نکلنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ جو آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے محمد بن عبدالرشید سجاوندی حنفی، سراج الدین لقب، ابو طاہر کنیت (متوفی ۶۰۰ھ) نے اپنی مشہور و مقبول کتاب "سراجی" میں مقرر کر دی ہیں۔ آج تک اس کو صحیفہ آسمانی کی طرح ناقابلِ تنقید سمجھا جاتا رہا ہے۔ خواجہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اس پر قلم اٹھایا اور اس کی غلطیوں کو پوری جرأت سے عالم آشکار کیا۔ جیسا کہ آپ سطور بالا میں علامہ سید سلیمان ندوی کے تبصرے میں دیکھ چکے ہیں اس فن میں ایک سخت مشکل مسئلہ "عول" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی مشکل کو علامہ اقبال بھی سختی سے محسوس کرتے تھے۔ جیسا کہ ان کے بعض خطوط سے ظاہر ہے۔

"۔۔۔۔ فی الحال میرے (اقبال کے) خیال میں چاہیئے کہ ایسی مثالیں لی جائیں۔ جن میں فقہا کے نزدیک "عول" کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور تقسیم سے ثابت کیا جائے کہ "عول" کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔ میں خود بھی "عول"[2] کی تردید سے دلچسپی رکھتا ہوں۔۔۔۔ اگر مسئلہ عول پر ایک علیحدہ رسالہ لکھا جائے تو نہایت مناسب ہوگا۔ جو کچھ مولوی (احمد الدین) صاحب نے تفسیر میں لکھا ہے۔ اس کی مزید تشریح و توضیح کے ساتھ علیحدہ چھاپ دیا جائے تاکہ مسئلہ کی طرف علماء کی خاص توجہ ہو جائے اور وکیل و بیرسٹر صاحبان بھی اس میں خاص دلچسپی لے سکیں۔ (خط بنام عرشی۔ اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۹، ۲۰)۔

---

[1] پنجاب میں "وڈا بھونچال" (زلزلہ عظیم) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سے کانگڑہ بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ اور بھی کئی شہروں کو سخت نقصان پہنچا تھا۔

[2] عول۔ (یا تخفیف حصص) بعض دفعہ ذوی الفروض (قسم اول و دوم) کے وارثوں کو ان کے مقررہ حصے دینے پر جمع کریں تو مجموعہ اکائی سے بڑھ جاتا ہے۔ اس صورت میں تمام ذوی الفروض (قسم اول و دوم دونوں) افراد کے حصوں کو ان کے پہلے حاصل کردہ حصوں کی نسبت سے اسی قدر کم دیا جاتا ہے تاکہ مجموعہ اکائی (یا فرض کردہ رقم) کے برابر بن جائے۔ اس کے عمل کو عول کہتے ہیں (تقسیم وراثت مفصل، ص ۱۰، مرتبہ ملک بشیر احمد بگوی)

خواجہ رحؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ثابت کر دیا کہ "عول" کی کوئی ضرورت نہیں اور ان کے استنباط کی پوری عمارت آیات توریث پر قائم ہوتی ہے۔ انہوں نے "سراجی" کی تنقید میں جو کچھ لکھ دیا۔ اس پر قدامت پسند فقہا نے کفر کے فتوے تو لگائے لیکن جواب کوئی نہ دے سکا۔ بلکہ اس کے برعکس بعض اونچے درجے کے علماء نے اس کو لبیک ہی جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا۔ "سیرت احمد الدین" میں بعض اور نام بھی ملتے ہیں مثلاً۔

خواجہ صاحب نے رسالہ معجزہ قرآن میں یتیم پوتے کے حصے کے متعلق دلائل قرآنیہ سے مفصل بحث کی تھی۔ اس پر علامہ عبداللہ العمادی نے زمیندار میں (ان دنوں آپ روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر تھے) شاندار ریویو کیا تھا..... اس ریویو کے مطالعے سے شیخ محمد صادق بیرسٹر۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو بیرسٹر وغیرہ ارکان انجمن اسلامیہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ قرآن پاک میں یتیم پوتے کے حصے کی پوری حمایت کی گئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے "معجزہ قرآن" منگوا کر اس کا مطالعہ کیا۔ اور جب انجمن میں خواجہ صاحب کا معاملہ پیش ہوا تو ارکان انجمن کی ایک خاصی جماعت کسی ترغیب کے بغیر خواجہ صاحب کی حامی بن گئی..... "معجزہ قرآن" نے ہندوستان میں خاصی شہرت حاصل کی۔ مولانا محمد علی امام جماعت احمدیہ لاہور۔ مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار منشی محمد دین صاحب فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین۔ مولوی محمد انشاء اللہ ایڈیٹر وطن۔ مولوی ثناء اللہ صاحب ایڈیٹر اہلحدیث وغیرہ ملک کے کئی بزرگوں نے اس پر ریویو لکھے۔ سید سلیمان صاحب ندوی نے "معارف" میں معجزہ قرآن" کا ذکر کرتے ہوئے شکایتاً لکھا کہ انہیں جماعت اہلحدیث سے توقع تھی کہ وہ میراث کے معاملے میں اصلاح کی کوشش کرے گی لیکن ان سے مجادلہ، مقاتلہ بلکہ مقادمہ (مقدمہ بازی) سے زیادہ کچھ بن نہ آیا۔۔۔ انہوں نے خواجہ صاحب کی جرأت کی تعریف کی اور تسلیم کر لیا کہ مروجہ قانون میراث بالضرور قابل اصلاح ہے ص ۱۶۵ء ۔

علامہ مفتی اسلم صاحب جیراجپوری نے جو علماء احناف[1] میں خاص شہرت رکھتے ہیں "معجزہ قرآن" کا مطالعہ فرمایا اور میراث کے معاملے میں خواجہ صاحب کے ہم نوا بن گئے۔ بلکہ آہستہ آہستہ حدیث کے متعلق بھی مسلک اعتدال کے سالک بن گئے ص ۱۶

مولانا احمد بابا مخدومی (حاشیہ نگار تفسیر سرسید)

غالباً آپ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ مفکر و محقق ہونے کے ساتھ قوت عمل بھی رکھتے تھے جب "معجزہ قرآن" شائع ہوا اور اخبار "زمیندار" نے اس پر شاندار ریویو لکھا تو ممدوح نے "معجزہ قرآن" منگوا کر اس کا مطالعہ فرمایا اور خواجہ صاحب کو ان کی جرأت پر ہدیہ تبریک پیش کیا۔ اس کے بعد کئی مرتبہ امرتسر آئے اور خواجہ صاحب[2] سے ملتے رہے ص ۶۷

---

[1] سیرت نگار مرحوم سے سہو ہوا ہے۔ حضرت اسلم خاندانی اہلحدیث تھے۔

[2] راقم نے کئی مرتبہ خواجہ صاحب اور دوسرے بزرگوں اور دوستوں کے ہمراہ حضرت احمد بابا مخدومی کی اقتدا میں نماز عشاء ادا کی ہے آواز میں نہایت سوز و گداز ہوتا تھا۔

خواجہ صاحب کی تنقید سراجی کے ساٹھ سال بعد ان کی تائید میں ایک اور آواز اٹھی جو غالباً انہی سے متاثر ہو کر نمودار ہوئی۔ مولانا ابوالجلال ندوی جو اس وقت[1] قمری حساب سے عمر کی ۸۲ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں۔ "شیخ محمد عرب کا احسان مجھ پر ہے۔ وہ ادب کے استاد تھے۔ لیکن مجھے فقہی مسائل کی طرف متوجہ کیا کرتے تھے میں فقہ میں (ندوۃ العلماء کے تمام طلبہ سے کم زور تھا۔ اس کمزوری کو وہ دور کرتے تھے۔ ان کی زبانی تعلیم کی بدولت مسائل میراث مجھے ازبر تھے۔ حالانکہ موجودہ میراث کو جو سراجی میں ہے۔ میں قرآن مجید کے خلاف تصور کرتا ہوں۔" (منقول از ماہ نامہ "مہر نیم روز" کراچی بابت جولائی۔ اگست ۲، ۱۹ء صفحہ ۱۸)

علامہ اقبال سے تاریخی ملاقات

اوپر خواجہ و علامہ کی جس تاریخی ملاقات کا اشارۃً ذکر کیا گیا ہے۔ اس کو قدرے تفصیل سے آپ کے سیرت نگار خواجہ ضیاء اللہ مرحوم نے لکھا ہے۔

ایک صاحب[2] نے جو اس وقت ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی میں موجود تھے۔ مذکورہ بالا ملاقات کے متعلق اپنے تاثرات کا یوں اظہار فرمایا ہے۔

"چند سال کا عرصہ ہوا، خواجہ مرحوم کی ملاقات قبلہ ڈاکٹر سر اقبال مدظلہ سے ہوئی۔ اس ملاقات کا مقصد محض تبادلہ خیالات تھا۔ اس کا تصفیہ صوفی تبسم اور قبلہ ڈاکٹر صاحب کے مابین بذریعہ خط و کتابت ہوا۔ جو بعض اعتبار سے نہایت دل چسپ ہے۔

خواجہ مرحوم فرماتے ہیں کہ

"میں اس ملاقات کو اپنے لیے بڑی سعادت سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے وسیع معلومات علمی سے استفادہ کروں۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ (اپنے خطوط میں) لکھتے ہیں مولانا سے ملنا اپنے لیے باعث شرف خیال کرتا ہوں۔ اس ملاقات سے میری غرض ان کے عمیق قرآنی مطالعہ سے استفادہ کرنا ہے اور بس،

غرض اس تواضع و انکسار نے بہت طول کھینچا ..... بالآخر صوفی صاحب خواجہ مرحوم کی معیت میں قبلہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رات کے ۹ بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

گفتگو کی ابتدا بھی باہمی اظہار انکسار سے ہوئی۔ جس سے سراسر خلوص ٹپکتا تھا۔ صوفی صاحب کا بیان ہے کہ

"میں نے جب ان بزرگوں کے مخلصانہ انداز گفتگو کو دیکھا تو مجھ پر ایک رقت سی طاری ہو گئی۔ اور میری آنکھوں میں محبت و عقیدت کے آنسو بھر آئے اور میرا سر عجز سے خود بخود جھک گیا۔

گفتگو دقیق فلسفیانہ مسائل پر تھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک مسئلہ بیان فرماتے اور خواجہ مرحوم اس مسئلے کی تائید میں آیات قرآنی پڑھتے۔ ڈاکٹر صاحب بعض آیات کو نوٹ کر لیتے۔ ساڑھے تین گھنٹے کے عرصے میں اثبات وجود باری تعالیٰ ــــ جبر و قدر ــــ

---

[1] سنہ ۱۹۷۲ء میں

[2] افسوس ہے کہ سیرت نگار نے ان کا نام نہیں لکھا تاہم یہی باتیں راقم نے خود صوفی تبسم صاحب کی زبان سے متعدد مرتبہ سنی ہیں۔

خیر و شر ـــــ غرض ہر عمیق مسئلہ پر بڑی دقت طرازیوں سے روشنی ڈالی گئی ـــــ گفتگو کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

آخری بات

"مولانا آپ نے قرآن کا مطالعہ اتنی دقتِ نظر سے کیا ہے اور اس پر اپنی زندگی کا کثیر حصّہ صرف کیا ہے مسلمانوں کی موجودہ مذہبی ضروریات کا بھی آپ کو پورا احساس ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ اس مطالعہ سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی فقہ تیار کریں"

خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اظہار عجز کرتے ہوئے کہا کہ ـــــ "ڈاکٹر صاحب! آپ کو ماشاء اللہ قرآن اور فلسفہ جدید دونوں پر عبور حاصل ہے۔ یہ کام آپ ہی کے شایان شان ہے"

غرض یہ بات بھی طے نہ ہو سکی اور معاملہ پھر انکسار کی انتہائی کوششوں میں آکر الجھ گیا"

جن لوگوں کو قبلہ سر اقبال سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ آپ اپنی علمی گفتگو میں اکثر انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں، جس کی وجہ اردو میں صحیح اصطلاحات علمیہ کا فقدان بھی ہے۔ اس قرآنی مذاکرہ میں ڈاکٹر صاحب کو خواجہ مرحوم سے گفتگو کرتے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔ اس لیے کہ خواجہ صاحب ہر انگریزی اصطلاح سے بخوبی واقف تھے۔

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی جو اس دوران میں حاضر ہو گئے تھے۔ ان کا اور صوفی صاحب کا بیان ہے کہ "ہم پر اس گفتگو کا بے حد اثر ہوا مسلسل دو دن تک ہمیں یہ محسوس ہوا کہ ہم زمین پر نہیں بلکہ عالم بالا کی سیر کر رہے ہیں۔ اور آج بھی جب اس ملاقات کا خیال آتا ہے۔ تو ہمارے دل و دماغ پر وہی روحانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے"

(سیرت احمدالدین ص ۵۶، ۵۷)

خواجہ صاحب کے دوستانہ تعلقات ہر فرقہ و مذہب کے لوگوں سے استوار تھے۔ تنگ خیال مولویوں اور مولوی زدہ لوگوں کے سوا سب لوگ (جن میں ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ وغیرہ شامل ہیں) آپ کا نہایت احترام کرتے اور پاک باز بزرگ سمجھتے تھے۔

دنیائے تفسیر

تفسیر قرآن کی دنیا جو گذشتہ چودہ صدیوں میں تخلیق ہوئی۔ اس کی سیر کے لیے عمر نوح بھی ناکافی ہے۔ شاید عمر خضر کچھ کفایت کر سکے۔ پھر اس میں اقسام و انواع تفسیر پر نظر کی جائے تو افادیت کم سے کم اور تضیع وقت بلکہ

"شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا"

تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ قرآن پس پردہ چلا جاتا ہے۔ مفسرین کی دور از کار باتیں ذہن و دماغ پر چھا جاتی ہیں پڑھنے والے[1] "فی کل وادٍ یھیمون" بن کر رہ جاتے ہیں ـــــ بلاشبہ ان ذخائر میں ایسی چیزیں بھی ضرور موجود ہیں۔ جو قرآن فہمی میں قابل قدر مدد دیتی ہیں لیکن "زیادہ تر مجموعے ایسے ہیں جو اپنے کسی خاص نصب العین کے تحت کتاب الٰہی کے مقصود کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اور

---

[1] ہر وادی میں سرمارتے پھرتے ہیں (شعراء ۲۲۵)

اور وہ مقصود ہے قرآن کو دین کے طور پر سمجھنا۔ اہل عالم کے لیے اللہ کی طرف سے ہدایت سمجھنا جو دنیا و آخرت دونوں کی اصلاح و سعادت پر مشتمل ہو۔[1]

۱۔ بعض لوگوں نے الفاظ، معانی، بلاغت اور اسلوب بیان کو مطمح نظر بنایا ہے۔ جیسے کہ زمخشری اور اس جیسے دوسرے مفسر۔

۲۔ بعض نے قصہ، کہانی، تاریخ و اسرائیلیات اور جو کچھ ادھر ادھر سے سنا تفسیر قرآن میں بھر دیا۔ اس سے بے پرواہ ہو کر کہ شرع و عقل سے بھی اس کی مطابقت ہے یا نہیں۔

۳۔ بعض پر فقہ کا غلبہ تھا۔ وہ احکام الشرعیہ۔ عبادات و معاملات کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے۔ جیسے کہ ابوبکر ابن العربی۔

۴۔ بعض نے اصول عقائد میں متکلمانہ روش اختیار کی اور بحث و مناظرہ کے انبار لگا دیئے جیسے کہ امام رازی۔

۵۔ بعض واعظانہ افسانہ گوئی اور صوفیانہ حکایات کے گرویدہ ہوئے اور قرآن کے مقررہ فضائل و آداب کے حدود سے نکل گئے۔

۶۔ بعض نے قرآن کو کتاب "اشارات" بنا دیا۔ اور صوفیت کے لباس میں باطنیت کی تبلیغ کی۔ جیسے کہ قاشانی باطنی کی تفسیر جو شیخ اکبر کی طرف منسوب ہے۔ اس میں وہ کچھ بھرا ہوا ہے جس سے اللہ کا دین بالکل بری ہے۔[2] بقول شاعر

ابن عربی سرخوش خم خانۂ تاویل — تفسیر چناں کرد کہ قرآن نو سے ساخت
مسلم برہِ کعبہ رواں بود، رہش زد — تا جانب بیت الصنم راہ دگرے ساخت

یہ انواع تفسیر کے متعلق محض اجمالی اشارات ہیں۔ تفصیل دیکھنی ہو تو محمد حسین ذہبی کی "التفسیر والمفسرون" مطبوعہ قاہرہ جو تین مجلدات پر مشتمل ہے دیکھنی چاہیئے۔ یا کم سے کم "اتقان فی علوم القرآن" سیوطی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔
غرائب تفسیر کے ضمن میں ایسی باتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ جن کو دیکھ کر شرم تو ایک طرف رہی بے شرمی کی آنکھیں بھی جھک جاتی ہیں۔[3] یہ سب کچھ ہمارے علماء نے نہایت فراخ دلی اور عالی ظرفی سے اپنی تصانیف میں محفوظ کر لیا ہے۔ تاکہ آئندہ نسلوں کو معلوم ہوتا رہے کہ مسلمان کہلانے والوں نے قرآن کو اللہ کی کتاب ماننے یا کہتے ہوئے اس کے ساتھ کیا کیا تلعب کیا ہے؟

اختلاف

فہم قرآن میں اختلاف قرن اول ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ "التفسیر والمفسرون" کی پہلی جلد میں ہمیں یہ عنوان نظر آتا ہے۔ "تفاوت الصحابہ فی فہم القرآن" اس کے نیچے مولف نے لکھا ہے کہ صحابہ کرام فہم قرآن میں ایک

---

[1] تفسیر القرآن علامہ مفتی عبدہٗ مصری ص ۱۷، ۱۸ مطبوعہ مصر ایڈیشن چہارم
[2] ایضاً
[3] جس کا جی چاہے "اتقان" حصہ دوم بزبان اردو (ناشر نور محمد۔ اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی) صفحہ ۵۹۲، ۵۹۴ پر اس کا نمونہ دیکھ لے۔

مرتبے پر فائز نہیں تھے۔ بعض کے لیے ایک مقام کو سمجھنا مشکل تھا۔ اور دوسرے کے لیے آسان۔ یہ ان کی قوت عقلیہ اور معرفت میں فرق کی وجہ سے تھا۔۔۔۔۔ اور اس قسم کے اختلاف میں کوئی مضائقہ نہیں ص ۲

اس کے بعد کئی مثالیں دی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں صحابہ کے اختلاف فہم پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مخلصانہ اور تعمیری اختلاف سے علم میں اضافہ اور قوت فکریہ میں ارتقاء حاصل ہوتا ہے ؎

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن

اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

عالی ظرفی زیر نظر کتاب میں آپ کو کئی جگہ قدما سے اختلاف نظر آئے گا۔ اگر اختلاف نہ ہوتا تو نئی سے نئی تفسیروں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس کے لیے آپ کو عالی ظرفی سے کام لینا ہوگا۔ اس مقام پر آپ کی توجہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف منعطف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولٰئک الذین ھداھم اللہ واولٰئک ھم اولوا الالباب (زمر-۱۸)

پس خوش خبری سنا دو میرے ان بندوں کو جو سنتے ہیں بات پھر پیروی کرتے ہیں اچھی بات کی۔ انہیں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور وہی عقل مند ہیں۔

"یعنی سب طرح کی باتیں سنتے ہیں، پھر ان میں جو بات اچھی ہو اس پر چلتے ہیں۔ کامیابی کا راستہ ان ہی کو ملا ہے۔ کیونکہ انہوں نے عقل سے کام لے کر توحید خالص اور انابت الی اللہ کا راستہ اختیار کر لیا" (شیخ الاسلام عثمانیؒ)

اس ایک آیت نے کتنی باتیں سکھا دیں ـــــ جو لوگ بات کو سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان کے لیے

۱۔ اللہ کی طرف سے خوش خبری ہے۔

۲۔ وہ اچھی بات کو انتخاب کر کے اس پر عمل کرتے ہیں۔

۳۔ ان کو اللہ تعالیٰ ہدایت سے مستفید فرماتا ہے۔

۴۔ وہ صحیح معنی میں دانش مند ہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوا کہ جو لوگ بات کو سننے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

۱۔ وہ ربانی خوشخبری سے محروم رہتے ہیں۔

۲۔ حُسنِ انتخاب اور عمل صالح کی توفیق نہیں پاتے۔

۳۔ اللہ کی ہدایت کا دروازہ ان پر بند ہو جاتا ہے۔

۴۔ وہ عقل سے کورے یعنی احمق ہیں۔

دلیل کی عظمت قرآن خدائے سبوح وقدوس، حکیم وعلیم کی کتاب ہے پھر بھی وہ کوئی بات جبر واکراہ سے ٹھونستا نہیں

چاہتا۔ وہ برہان وبصیرت پیش کرتا ہے۔ اور دوسرے فریق سے بھی برہان و دلیل مانگتا ہے۔

۱۔ اَدعوا الی اللہ علی بصیرۃ (یوسف ۱۰۸) میں بلاتا ہوں اللہ کی طرف دلیل و برہان کی روشنی میں اور میرے ساتھی بھی۔

۲۔ ھذا بصائر من ربکم (اعراف ۲۰۳) یہ تمہارے رب کی طرف سے دلیل وبصیرت کی باتیں ہیں۔

۳۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین (بقرہ ۱۱۱) اگر تم سچے ہو تو اپنی سچائی کی دلیل پیش کرو۔

مسیحیت کہتی ہے کہ "اقانیم ثلاثہ"[1] سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس پر ایمان لاؤ۔ ایسے ہی کئی مذاہب اسرار رموز کی دکان لگائے بیٹھے ہیں۔ ہمارے اندر بھی جمود و تقلید نے ایسے لوگ پیدا کر دیئے۔ جو

"بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید" (حافظ)

کو بطور حجت پیش کر کے اپنی ہر بات منوانا چاہتے ہیں۔ تمام مذاہب عالم پر اسلام کو یہ فضیلت و فوقیت حاصل ہے۔ کہ ایک عام عورت بھی سلطان عرب خاتم النبیین ارواح و اجسام کے حاکم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف کا حق رکھتی ہے۔ اور پھر ایسا امکان بھی ملتا ہے کہ وحی الٰہی پیغمبر خاتمؐ کی رائے کے برعکس عورت کی تائید کر دے۔

قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا وتشتکی الی اللہ ...... (مجادلہ ۱) اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو اپنے شوہر کے متعلق تجھ سے جھگڑتی تھی اور اللہ کے حضور اپنی شکایت پیش کر رہی تھی۔ یہ واقعہ اوس بن الصامتؓ اور اس کی بیوی خولہ بن ثعلبہ سے متعلق ہے۔ کہ وہ اپنی بیوی کو ماں کہہ بیٹھا۔ رسم عرب کے مطابق وہ اس کے لیے حرام ہو گئی۔ حضورؐ نے اسی رسم کی تائید کر دی۔ عورت نے اللہ کے حضور شکوہ و زاری کی تو یہ رسم ہمیشہ کے لیے منسوخ ہو گئی۔ البتہ ایسا کہنے والوں کے لیے سزا مقرر کر دی۔

جب صاحب وحی و حکومت پیغمبر سے اختلاف صالح کا جواز ملتا ہے۔ صحابہ کرامؓ میں اختلاف فہم موجود ہے۔ تو کسی امام مصنف یا مفسر کو کیا حق ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو ہر شخص سے ماننے کی توقع رکھے ـــــ اسلام اس رہبان و احبار پرستی کی شدت سے منع کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ دلوں کے تالے کھول کر غور کرو۔ آنکھیں بند کر کے ایمان نہ لاؤ۔ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا (محمد ۲۴) کیا قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے لگے ہوئے ہیں! ـــــ

اذا ذکروا بآیات ربھم لم یخروا	رحمٰن کے بندوں کو جب اُن کے رب کی باتیں سمجھائی جائیں،
علیھا صما وعمیانا (فرقان ۷۳)	تو اُن پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔

خواجہ احمد الدینؒ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ان کی کوئی بات بغیر سوچے سمجھے محض مقلدانہ مان لی جائے۔ ان کی مجالس میں ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے۔ کہ ان کے احباب و رفقاء ڈٹ کر ان سے اختلاف کرتے تھے۔ وہ نہایت حلم سے ہر اعتراض کو سنتے اور تفصیل سے

---

[1] تین خدا۔

جواب دینے کی کوشش کرتے عموماً ان کی بات تسلی بخش ہوتی تھی (لیکن کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا تھا۔ البتہ ہٹ دھرمی کے مقابلے میں کبھی کبھی تیز بھی ہو جاتے تھے)

بالکل اسی طرح اس کتاب کے قاری کو حق ہے کہ جو بات قرآن حکیم اور عقل سلیم کے مطابق پائے اُسے قبول کرے۔ جہاں دیکھے کہ صاحب تفسیر کی تحقیق تسلی بخش نہیں ہے۔ اس سے آگے بڑھ جائے۔ اور بزرگوں کے اس قول پر عمل کرے۔ خذ ما صفا ودع ما کدر[1] اگر کوئی عزیز کسی خاص فرقے سے وابستہ ہے۔ اور اپنے سوا تمام فرقوں کو کافر یا کم از کم گمراہ سمجھتا ہے تو یہ کتاب اس کے لیے نہیں ہے۔

یہ طالبان تحقیق کے لیے ایک گراں بہا تحفہ ہے جن کے فکر و فہم کی لوح صاف و پاک ہے۔ اور ہر نقش حق کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ بقول اقبال ؎

"سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک"

ہماری اکثر تفسیریں وہی کچھ کہتی ہیں۔ جو کم و بیش اکثر تفسیروں میں لکھا چلا آرہا ہے لیکن اس میں بہت سی ایسی باتیں ملیں گی۔ جن سے ذخائر تفاسیر یکسر خالی ہیں۔ لیکن ان میں آیات قرآنی سے مطابقت کی کوشش کی گئی ہے جو عموماً کامیاب ہے اور کہیں ناکام بھی۔

خاتمہ میرا خیال ہے کہ زیب عنوان سوال کہ "وہ کون تھا"؟ کا کسی قدر جواب اس تحریر میں آگیا ہے۔
افوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد ۔

۱۴ر ستمبر ۳، ۱۹۷ء محمد حسین عرشی امرت سری
خالد اسحاق دار الکتب کراچی

---

[1] صاف کو لے لو اور ناصاف کو چھوڑ دو۔

سرآغاز

(طبع اوّل)

اے نام تو زینتِ سرآغاز   آغاز تو بر تراز ہر آغاز

قرآن شریف کی بے شمار تفاسیر کے ہوتے ہوئے بظاہر کسی نئی تفسیر کی ضرورت نہ تھی، لیکن ذرا تامل کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عموماً ہر تفسیر، تفسیر قرآن ہونے کی بجائے کسی خاص فرقہ کے خیالات اور معتقدات کی تفسیر ہے۔ ہر مصنف نے آیات قرآنیہ کو اپنے ہی مذہب کے ائمہ واجلہ کی نظر سے دیکھنے کی سعی کی ہے (الا ماشاء اللہ) قرآن کو (کہ قولِ الٰہی ہے) آیات قرآنی اور صحیفۂ فطرت (کہ فعلِ الٰہی ہے) کی مدد سے سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی تصنیف کو اس کے مصنف کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنا۔ یہی ضرورت تھی جو محرک ہوئی، تفسیر پیش نظر کے وجود میں آنے کی۔ قدما میں بھی خال خال کے ایسے لوگ نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے ماحول کے لحاظ سے نہایت قابل قدر تفسیریں لکھیں۔ لیکن چونکہ قرآن ایک مخصوص ماحول کا پابند نہیں کسی خاص فرقہ کے خیالات کا آئینہ دار نہیں، کسی متعین زمانہ اور محدود ملک کی ضرورتوں کا متکفل نہیں۔ اس لیے ضرورت تھی کہ عصر حاضر تک کی ترقی علوم و تجارت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ایک عمیق مطالعہ تمام کائنات انسانی کے سامنے پیش کیا جائے۔ پس اس تفسیر میں یہ پانچ خصوصیتیں ہیں۔ جو اس کو عام تفاسیر سے ممتاز کرتی ہیں۔

۱۔ اس کے مخاطب بلا لحاظ فرقہ و مذہب تمام انسان ہیں جیسا کہ قرآن کا اپنا شیوہ ہے۔

۲۔ اس میں حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بات عقل سلیم کے خلاف نہ ہو۔

۳۔ ترجمہ میں سب سے پہلے اصول عربیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۴۔ اس کے بعد عام منشائے قرآن کا تتبع ہے۔ جو محکمات سے واضح ہو۔

۵۔ اس کے ساتھ ہی سنت اللہ یعنی نیچر کے قوانین کا احترام کیا گیا ہے۔

اس کا فیصلہ بالغ نظر ناظرین کی رائے پر ہے کہ مصنف علامہ حضرت خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری کو ان مقاصد میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ ہمارے دل حضرت حکیم شہاب الدینؒ میاں مولا بخش صاحب سوداگر صابون، ڈاکٹر طالب علی صاحب، خواجہ غلام محمد محقق وغیرہم بزرگوں کے شکریہ واحسان سے معمور ہیں، جن کی تحریک و تشویق نے خواجہ محترم کو اس اہم امر کے لئے آمادہ کیا اور آج ہمارے ہاتھ میں یہ متبرک صحیفہ موجود ہے۔ جزاہم اللہ جمیعاً۔

محمد حسین عرشی امرتسری

خواجہ احمد الدینؒ

نظم ذیل ۱۹۱۸ء میں حضرت خواجہ (روحہ اللہؒ) کے ایک خطبہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی جب کہ ماہ نامہ "بلاغ" اور "تفسیر بیان للناس" کا وجود جامۂ ظہور سے عاری تھا۔ حضرت مرحوم کی غیر معمولی خوئے انکسار کے مجروح ہو جانے کے خوف سے اس کی اشاعت کی جرأت نہ ہو سکی۔ وہ اپنی ستائش میں ایک کلمہ سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کی رحلت کے بعد ۱۹۳۶ء ماہ ستمبر کے "بلاغ" میں جو آپ کے سوانح پر مشتمل ہے، اس کو شامل کرنا مناسب سمجھا گیا۔

"نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمین"

اے کہ تو ہے قابلِ تفہیمِ اسرارِ کلام!
اے کہ تو ہے ضامنِ تبیانِ اخبارِ کلام!

تیرا ہر حرف اہلِ بینش کا سوادِ دیدہ ہے
تیرے پہلو میں دلِ روح الامیں پوشیدہ ہے۔

تو شبستانِ حقیقت کا چراغِ نور ہے
ذرہ ذرہ تیرے صحرا کا حریفِ طور ہے

جلوۂ معنی کو تو نے آشکارا کر دیا!
شعلۂ افسردن آمادہ کو تارا کر دیا

اے تُرا سرمایہ اندوزِ فقاہت کردہ اند
در دلت اسرارِ حکمت را ودیعت کردہ اند

تیری آواز آج گو اک نغمۂ خوابیدہ ہے
گو تیرا حُسنِ بیاں اک جلوۂ پوشیدہ ہے

مصدرِ تفسیر مانیں گے تجھے سب ایک دن
تیرا علم بنے گا نیرِ کوکب ایک دن

تیری ہر ہر بات گل بانگِ دُہل ہو جائے گی
باغِ عالم میں حریفِ بوئے گل ہو جائے گی

تجھ کو مانا جائے گا وارفتۂ سلمائے حق
عالمِ علم و ہنر میں باعثِ اعلائے حق

پھیل جائیں گے تیرے نغمے فضائے دہر میں
اور پہنچ جائیں گے گوشِ اصفیائے دہر میں

گو ہر یک دانۂ تدقیق مانیں گے تجھے
اور غواصِ یمِ تحقیق مانیں گے تجھے

ایں جہاں میت پرست افتادہ و تو زندۂ
در شبِ تاریک صحرا گوہرِ تابندۂ

مرحبا! مشاطۂ گیسوئے الہام آمدی
کوکب افروز جبینِ شاہدِ شام آمدی

تعارف

(طبع ثانی)

عوام کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ کالانعام بل ھم اضل ہی رہیں یا بجبر و اکراہ رکھے جائیں، جابر حکومتوں نے ہمیشہ اپنی رعایا کو اپنی صحیح و غیر صحیح و غیر صحیح مرضیات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا، حکام نے اپنی جوع الارضی، عیش کوشی، انتقام کشی و دشمن کشی کی خواہشات کی تکمیل کے لیے بدبخت عوام پر علماؤ مشائخ اور اُمراء و عمائد کو مسلط کیا، زنداں کی چار دیواری، سپاہ کے درخشاں اسلحہ، پولیس کی سخت گرفت، مولوی کا دلنشین وعظ، پنڈت کی لوتر کتھا، صوفی کی تلقین مراقبہ، لیڈر کا ہیجان انگیز لیکچر اور مصنف کی دلکش عبارت، ایک ہی منزل کی راہیں ہیں اور ایک ہی مقصد کے حاصل کرنے کے ذرائع یعنی عوام بیدار نہ ہونے پائیں۔ انہیں اپنے انسان ہونے کا احساس نہ ہونے پائے اور وہ اپنے قوائے فکر و عمل کو آزادی و اختیار سے استعمال کرنے کے قابل نہ ہو سکیں۔ اس ظلمت آباد میں اگر کبھی کوئی نورانی پیکر نمودار ہوا اگر کوئی صدائے حق بلند ہوئی تو تمام مذکورۃ الصدر قوتوں نے اس کو مٹانے کی کوشش کی، مذہبی مقدسوں نے اس کو مذہب سے خارج کردیا، عوام نے اس پر فتوی رد و لعن صادر کئے، حکام نے اس کو قید و بند اور قتل و صلیب سے سرفراز فرمایا۔ کائنات انسانی کے جرائم کی فہرست میں "اعلان حق" سے بڑا جرم آج تک تصور نہیں کیا گیا، ہر بڑے سے بڑے مجرم کی حمایت میں اسکے احباب و اعزہ اور اولاد و والدین پیش پیش نظر آتے۔ اس کو غیر مجرم ثابت کرنے کے لیے زر و مال اور صدق و ایمان کو ہاتھ سے کھو دیتے ہیں، لیکن کلمۃ الحق کے مرتکب کو باپ گھر سے نکال دیتا ہے، بیٹا بائیکاٹ کا اعلان کردیتا ہے، قوم آمادہ رجم ہو جاتی ہے، بیوی رفاقت چھوڑ دیتی ہے، سُولی کے اوپر اس کا مقام ہے اور زہر کا پیالہ اس کی خوراک۔

ایسی حالت میں کون ہے جو ان قطعی اور یقینی نتائج کو دیکھتا ہوا میدان میں نکلے اور آگ میں کُود پڑے۔ بس یہ موانع ہیں۔ جنہوں نے عموماً حق شناسوں کو حق گوئی سے باز رکھا، انہیں بجائے مقتدار بننے کے عوام کا مقتدی ہونا پڑا، عوام کی زبان و اصطلاح میں باتیں کرنی پڑیں، امام غزالیؒ نے اسی کتابیں علوم دین پر تحریر کیں لیکن حقیقت کا اظہار کسی میں بھی نہ کرسکے چنانچہ مولانا شبلی الکلام میں فرماتے ہیں۔

"یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے ائمہ فن کے اصلی خیالات یا سرے سے ہی ظاہر نہ ہو سکے، یا ہوئے تو اس طرح کہ کسی نے سمجھا اور کسی نے نہ سمجھا"

پھر فرماتے ہیں۔

"امام غزالیؒ وغیرہ کی تصنیفات پڑھو تو صاف نظر آتا ہے کہ سینکڑوں خیالات دل میں بھرے ہیں۔ لیکن زبان تک نہیں لا سکتے۔ جواہر القرآن میں لکھتے ہیں کہ بعض کتابوں میں میں نے کچھ اصل خیالات بیان کئے ہیں۔ لیکن قسم دلائی ہے کہ بجز خاص اہل لوگوں کے یہ کتابیں اور کسی کے ہاتھ میں نہ جانے پائیں۔"

الکلام ص ۵۰ پر ارشاد ہوتا ہے:۔

جن تصنیفات میں امام صاحب نے اسلام کے اصلی عقائد اور ان کے حقائق بیان کئے ہیں، ان کو نہایت اہتمام سے مخفی رکھنا چاہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ باوجود مختصر اور سہل ہونے کے وہ رواج پذیر ہیں۔ خدا کی ذات صفات افعال اور قیامت کے متعلق عقائد کو انہوں نے احیاء العلوم وغیرہ میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے لیکن جواہر القرآن میں لکھتے ہیں کہ

یہ چاروں علوم یعنی علم ذات صفات، وافعال و معاد۔ ان کے ابتدائی اور جامع اصول جہاں تک مجھ کو معلوم ہو سکے میں نے بعض تصنیفات میں درج کئے۔ باوجود اس کے کہ فرصت کم اور آفتیں بہت تھیں اور دوست و مددگار کم یاب تھے۔ لیکن ان تصنیفات کو میں نے ظاہر نہیں کیا ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ ان کو سمجھ نہ سکتے اور ان کو ان سے نقصان پہنچتا اور مدعیان علم اکثر اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان تصنیفات کو ان لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا چاہیئے۔ جن کو علم ظاہر میں کمال حاصل ہو چکا ہو اور صفات مذمومہ کے دور کرنے میں اس قدر کوشش کر چکے ہوں کہ ان کا نفس رام ہو چکا ہو اور دنیا کی خواہش بالکل باقی نہ رہی ہو اور طلب حق کے سوا ان کی کچھ غرض نہ ہو ان سب باتوں کے ساتھ ذکی الطبع خوش فہم جدید الذہن سلیم الطبع ہوں۔ جس کے ہاتھ یہ تصنیف پڑ جائے اس پر حرام ہے کہ کسی شخص کے سامنے اس کو ظاہر کرے، بجز ایسے شخص کے جس میں یہ تمام صفات جمع ہوں۔"

یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ مفسرین نے تفسیر کر کے قرآن حکیم کے فطری حقائق و سادہ تعلیمات کو اپنی طبیعت کے تصنع تمدن کی گوناگوں رنگ آمیزیوں اور فلسفیانہ مباحث کی دقت طرازیوں سے کس قدر پیچیدہ بنا دیا ہے اور اس طرح یہ سادہ حقیقت انسانی نظروں سے اور بھی مستور ہو گئی، اس پر ستم یہ ہوا کہ اس علمی سعی و اجتہاد کے عہد کی مساعی آئندہ نسلوں کی کورانہ تقلید کا موجب ہو گئیں۔ اور اس طرح اس ذہنی تنزل و انحطاط کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ ان الجھنوں نے تقلید کے پرستار عوام کی طبعی اور فطری استعداد سلب کر لی اور رفتہ رفتہ قرآن کے صحیح مسلک سے بہت دور جا پڑے۔

عوام قرآن پاک کے سادہ طریق استدلال اور فطری اسلوب بیان سے اس قدر نا آشنا ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی آواز بلند کی جائے کہ یہ تعلیمات ایزدی، وضعی علوم کی تمام پیچیدگیوں سے منزہ اور خارجی موثرات سے بے نیاز ہو کر بھی اپنے اندر ایک حسن ایک عظمت رکھتی ہیں۔ تو وقت پسند طبائع اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکیں گی۔ قرآن پاک کو سمجھنے اور اس کی حقیقی تعلیم سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے لازمی ہے کہ ہم ان تمام پردوں کو یکسر دور کر دیں جو ہمارے اسلاف کی کم نگاہیوں کے باعث اس پر پڑ چکے ہیں لیکن اس حقیقت کا اعلان بہت بڑی جرأت ہے۔

ہمارے زمانے میں سب سے پہلے یہ جرأت مولوی چراغ علی، سرسید، مولانا غلام غلام علی رحمہم اللہ اور ان کے بعض تلامیذ کی طرف

سے ظاہر ہوئی۔ ان بزرگوں نے کوشش کی کہ اپنے عام اجتہادات کے لیے کتب سلف سے استشہاد کریں اور لغت، تصوف تفسیر حدیث وغیرہ سے مستفید ہوں تاکہ اسی ذریعہ سے بارگاہِ عوام میں رسائی حاصل ہو، لیکن غیر ملکی اور غیر مذہبی حکومت کے تسلط اور گرفت کے باوجود علماء و عوام نے جو کچھ ان سے بن پڑا، کیا ان میں سے بعض مخلصین اسلام نے جدید فلسفہ اور سائنس کے نظریات و مسلّمات کا اعتدال سے زیادہ احترام کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفسیر آیات میں اکثر مقامات پہ روح قرآنی سے دور ہو گئے، چنانچہ تاویل معجزات اور اجابت دعا وغیرہ سے متعلق سیدؒ نے جو کچھ سمجھا ہے عموماً الفاظِ قرآنی اس کے متحمل نہیں (تفصیل کے لئے دیکھو حیاتِ جاوید، حالی)

عصرِ حاضر میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر سورۃ فاتحہ میں بہت صاف گوئی سے کام لیا ہے، کاش وہ تمام ترجمہ و تحشیہ میں یہی التزام قائم رکھتے۔

پیشِ نظر تفسیر کو مذکورۃ الصدر مساعی کا نقشِ ثانی سمجھنا چاہیئے۔ اس میں آپ کو بہت سے ایسے نکات نظر آئیں گے جو نقشِ اوّل میں قطعاً نہیں اور اگر ہیں تو اس وضاحت سے نہیں۔

(۱) مولانا خواجہ احمدالدین قرآن کو صرف قرآن سے سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس کی بہت کم پروا کرتے ہیں کہ "زید علیہ السلام نے کیا سمجھا اور بکر رضی اللہ عنہ نے کیا فرمایا؟

۲۔ وہ لغاتِ عرب اور کارگاہِ فطرت کے سوا کسی اسناد و استشہاد کے نیازمند نہیں معلوم ہوتے۔

۳۔ وہ اللہ تعالیٰ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ کو متصرف فی الکائنات سمجھتے ہوئے قبولیت دعا پر بہت مضبوط ایمان رکھتے ہیں۔

۴۔ وہ اس بات کی پرواہ بہت کم کرتے ہیں کہ عوام یا علماء ان کی تحریر کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مضامین کی اشاعت کے دوران میں ان پر اور ان کے رفقاء پر طرح طرح کی سختیاں کی گئیں۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسی طرح صاف گوئی اور حق کوشی میں مصروف ہیں۔

۵۔ انہوں نے تقسیم میراث کے مسئلہ پر صدیوں سے جو حجاب پڑ چکے تھے، ان کو کافی غور و تعمّق کے بعد دور کر دیا۔

۶۔ انہوں نے عبادت الٰہی کو رسم و تقلید کی پستیوں سے نکال کر، حقیقت و معرفت کے بلند مینارہ پہ رونمائے عالم کر دیا۔

۷۔ انہوں نے رسالت و الوہیت کے حدود و امتیازات سب سے پہلے اور سب سے زیادہ کھلے طور پر بیان فرمائے۔

۸۔ انہوں نے عقیدہ توحید باری کو اسرار و رموز اور تصوف و طریقت کی پیچیدگیوں سے نکال کر قابلِ فہم حد تک ظاہر فرمایا۔

۹۔ انہوں نے قرآن مجید کی آیات، رکوعات اور سُوَر کے باہمی ربط کو نہایت خوش اسلوبی سے واضح کیا۔

۱۰۔ ان کی مساعی جمیلہ کا سر رشتہ ان عالی ظرف متقدمین سے جا ملتا ہے، جنہوں نے مذہبی فرقہ بندیوں سے بلند ہو کر قرآن مجید کا مخاطب تمام نوعِ انسانی کو قرار دیا۔

ان اجمالی اشارات کے علاوہ محقق ناظرین اس تفسیر میں بہت کچھ سامان بصیرت پائیں گے جو آئندہ نسلوں کی قرآن فہمی کے لیے ازبس ضروری ہے۔

یہ وہ ابتدا ہے جو یقیناً ان سعید روحوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ جو قانونِ خداوندی کو حقیقی رنگ میں جلوہ گر دیکھنے کی تمنا رکھتی ہیں۔ مصنف علام ہر اس کوشش کے لیے چشم براہ ہیں جو اس معاملہ میں بروئے کار لائی جائے اور ان کے دل کی گہرائیوں سے ایسے مجاہدین کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم۔ ایم اے
۷ر اکتوبر ۱۹۳۵ء پروفیسر گورنمنٹ کالج۔ لاہور

رحمٰن، رحیم، یوم الدین

رحمٰن وہ ہے جو اپنی مخلوق کے لیے سامان رحمت پیدا کرتا ہے اور ہر مخلوق کو اس کی ضرورت کے مطابق فطری ہدایت بخشتا ہے اسی وجہ سے اسم رحمٰن کا اطلاق خدا کے سوا کسی دوسری ہستی پر نہیں ہو سکتا۔ اللہ بھی ایسا ہی خاص نام ہے۔
رحیم وہ ہے جو فطری ہدایت و اسباب کے مطابق کوشش کرنے والوں کو کامیابی سے ہم کنار کرتا ہے اور تنبیہی تکلیف دے کر عاصیوں اور تساہل پسندوں کو راہ راست کی طرف لاتا ہے۔

یوم الدین کا مطلب عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ فنائے کائنات کے بعد تمام زمانوں کے انسانوں کی جزا و سزا ایک ہی وقت میں واقع ہوگی۔ خواجہ صاحب اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ
انسان جب سے پیدا ہوئے ہیں، موت ان کے ساتھ لگی رہی ہے اور وہ اپنے اپنے وقت میں "یوم الدین" میں پہنچتے رہے ہیں۔ لہٰذا "یوم الدین" ہمیشہ سے موجود چلا آرہا ہے اور اللہ تعالیٰ آج بھی "مالک یوم الدین" ہے۔ موت کے بعد ملنے والی زندگی اس وقت بھی مرنے والوں کو مل رہی ہے اور جزا و سزا کا قانون اپنا عمل کر رہا ہے ـــ خواجہ صاحب نے اس پر جو قرآنی دلائل فراہم کئے ہیں۔ وہ آئندہ صفحات میں ملیں گے۔ مفردات راغب میں اس کی تائید میں اشارے ملتے ہیں۔

القیامۃ ثلاثۃ:

(۱) الساعۃ الکبریٰ وھی بعث الناس للمحاسبۃ الخ

(۲) والساعۃ الوسطیٰ وھی موت اھل القرن الواحد الخ

(۳) والساعۃ الصغریٰ وھی موت الانسان فساعۃ کل انسان موتہ۔ (زیر لفظ "ساعۃ")

یعنی قیامتیں تین ہیں ایک بڑی قیامت جس میں لوگ حساب کے لیے زندہ کیے جائیں گے۔

دوسری درمیانی قیامت یعنی ایک صدی کے لوگوں کی موت۔

تیسری چھوٹی قیامت۔ یعنی ہر انسان کی موت اس کی قیامت ہے۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ ان مرنے والوں کی قیامت دوبارہ نہیں۔

———— ○ ————

فاتحہ میں جمع کے صیغے

خواجہ صاحب اللہ تعالیٰ کی صفت رب العالمین اور اسلام کے عالمگیر دین ہونے کی وجہ سے سورہ فاتحہ میں جمع کے صیغوں کی یہ حکمت و جامعیت بتاتے ہیں کہ

تمام دنیا کے موحدین و عابدین کو جو کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، اس دعا میں شامل کیا گیا ہے کہ ہم سب کو سیدھی راہ دکھا جو انعام یافتہ لوگوں کی راہ ہے، جو غضب اور گمراہی سے بچے رہے۔ اس پر وہ آیات ذیل سے استدلال کرتے ہیں۔

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ۔ (آل عمران ۱۱۴)

اہل کتاب میں کچھ لوگ ہیں جو رات کو جاگ کر آیات پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا۔

اس میں مسلمانوں کو اور اہل کتاب کو یکساں موحدانہ عبادت کا حکم دیا ہے۔

(آل عمران ۶۱)

لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط (الحج ۴۱)

اس آیہ میں اسلامی مساجد کے ساتھ مختلف مذاہب کے معابد رجن میں اللہ کا ذکر کثیر خود قرآن نے تسلیم کیا ہے) کا یکساں احترام چاہا گیا ہے۔

اس لحاظ سے اِيَّاكَ نَعْبُدُ...... الخ کا مطلب یہ ہوا کہ

اے خدا ہم مومنین قرآن اور ہمارے بھائی اہل تورات و اہل انجیل اور دوسری کتابوں کے ماننے والے اور تمام حق پرست تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ تو ہم سب کو صراط مستقیم دکھا کر متحد بنا دے۔ یہی صراط تمام منعم علیہم کی مشترکہ راہ ہے جو مغضوب و ضال نہیں ہیں کم از کم ہم سب غضب و ضلالت سے بچ کر منعم علیہم کے ادنیٰ درجے ہی میں شامل ہو جائیں۔

صراط مستقیم

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۔

عام طور پر ان آیات میں تین مختلف جماعتیں اور اُن کے راستے مراد لیے گئے ہیں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

۱۔ منعم علیہم اور ان کی راہ

۲۔ مغضوب علیہم اور ان کی راہ

۳۔ ضالین اور ان کی راہ

ابن کثیر کا خلاصہ یہ ہے کہ "منعم علیہم" سے مراد انبیاء، صدیق، شہیداور صالح لوگ ہیں۔ مغضوب علیہم سے مراد یہودی اور ضالین نصاریٰ ہیں۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ یہاں ایک ہی جماعت کی تین صفات (ایک ایجابی اور دو سلبی) بیان فرمائی ہیں، یعنی، ہم کو ان لوگوں کا راستہ دکھا۔

۱۔ جن پر تو نے انعام کیا (ایجابی)

۲۔ وہ ایسے نہیں ہیں جن پر غضب کیا گیا (سلبی)

۳۔ اور وہ گم راہ بھی نہیں (سلبی)

ان کی تحقیق یہ ہے کہ مروجہ عام تراجم کی رو سے "غیر" کو "صراط" کی طرح منصوب ہونا چاہیئے لیکن مشہور و متواتر قرأت "غیر" مجرور ہے، جو کسی پہلے مجرور کی صفت ہو سکتا ہے۔ اور وہ ہے "اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ"، جو صراط کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ منعم علیہم وہ ہیں جو "مغضوب علیہم" اور "ضالین" نہیں۔

تفسیر مظہری میں اسی مفہوم کو ترجیح دی گئی ہے۔ صاحب تفسیر قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ لکھتے ہیں۔

"غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ یہ الذین انعمت علیہم سے بدل ہے یعنی، جن پر خدا نے اپنا فضل کیا۔ ان سے وہ لوگ مراد ہیں، جو غضب خداوندی اور گم راہی سے سالم و محفوظ ہیں۔"

شاہ عبدالقادر دہلویؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:۔

"راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا، جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گم راہ ہوئے۔"

ان بزرگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے محققین اس نقطۂ نظر کے مؤید ہیں۔

غیر مبدّل، عالم گیر صراط

مذاہب و ادیان کی دنیا میں صراط مستقیم کے تصورات بے شمار ہیں اور سب کے سب عموماً آپس میں مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ کوئی ایسا قابل عمل تصور جو پوری انسانیت کے لیے ہر مکان و زمان میں تجربتہً تسلیم کیا جا سکے، کسی کے پاس نہیں ہے۔ محققین عالم جب بھی اس کی تلاش میں نکلیں گے، قرآن حکیم ان کا استقبال کرے گا اور انہیں کہے گا، "تعالوا" میری طرف آؤ "اتل" میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہارے رب نے تم پر کیا کچھ حرام کیا ہے؟ سب سے پہلے شرک پھر والدین سے نامناسب سلوک وغیرہ اندازہ

بیان دیکھئے :-

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۖ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(انعام - ۱۵۲ - ۱۵۴)

جو کچھ تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے۔ (۱) اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ (۲) ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک ملحوظ رکھو (۳) اولاد کو تنگ دستی کے خیال سے قتل نہ کرو ہم تم کو اور ان کو بھی روزی دیتے ہیں۔ (۴) کھلی اور چھپی بے حیائیوں سے دور رہو (۵) کسی شخص کو ناحق قتل نہ کرو (۶) کسی احسن طریقے کے سوا یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائے۔ (۷) تول، ماپ کو انصاف سے پورا کرو۔ ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے (۸) جب بولو تو عدل کو ملحوظ رکھو۔ اگرچہ کوئی قریبی عزیز ہی ہو (۹) اللہ تعالیٰ کے وعدے کو پورا کرو۔ یعنی اللہ پر ایمان لاکر اس کو حاضر ناظر جان کر جس سے بھی تم وعدہ کرو اس کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں وصیت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ یہ میری صراط مستقیم ہے (ان احکام کی خلاف ورزی حرام ہے) لہٰذا اس (صراط یا ارشاد) کی پیروی کرو اور خود ساختہ مختلف راستوں کی پیروی نہ کرو، وہ تم کو خدا کے راستے سے الگ لے جائیں گے اللہ تعالیٰ تمہیں وصیت کرتا ہے (اس میں سراسر تمہارا ہی فائدہ ہے) کہ تم غلط روی اور اس کے تکلیف دہ نتائج سے بچ جاؤ۔

ان ۹ احکام میں کوئی حکم ایسا نہیں جو مختص الزمان والمکان ہو۔ ان کی ابدیت مسلّم ہے۔

"انعمت" میں نکتہ

سورۂ فاتحہ میں دعا کے بہت سے آداب سکھائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک ادب یہ ہے کہ "انعمت علیہم" میں یہ تعلیم دی ہے کہ انعام دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن "مغضوب علیہم" اور "ضالین" کی نسبت اس کی طرف نہیں کی گئی۔

اس سے یہ اعتراف کرانا مقصود ہے کہ غضب اور ضلالت انسان کے اپنے ناشائستہ اعمال کا نتیجہ ہے۔

"ضالّ" وہ ہے جو خود گمراہ ہو رہا ہے اور اپنے نقص کو محسوس نہیں کرتا۔ یعنی اپنی گمراہی کو ہدایت سمجھ کر پسند کر رہا ہے۔ لیکن غضب کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کے باوجود ایسے کام کرنے سے نہیں ہچکچاتا جن کا نتیجہ غضب کی صورت میں برآمد ہو ـــ اس لیے مغضوب علیہم سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ انہوں نے غضب کو پسند کیا ہے، بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اعمالِ بد کی وجہ سے وہ غضب کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

عالمین

مجموعی حیثیت سے زمین ایک "عالم" ہے۔ عالمین (بصیغہ جمع) سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں بہت سی آباد دنیائیں ہیں ان میں دوابّ (چلنے پھرنے والے جان دار) پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ۔ (الشوریٰ ۲۹)	زمین اور آسمانوں کی پیدائش اور ان دونوں میں جان داروں کی موجودگی میں اللہ کی نشانیاں ہیں اور وہ جب چاہے۔ ان (مختلف دنیاؤں کے جان داروں) کو آپس میں ملانے پر قادر ہے۔

یعنی زمین کے علاوہ آسمانوں میں بھی جاندار پائے جاتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف دنیاؤں میں بسنے والے جو وفات پا جاتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں جب چاہتا ہے آپس میں ملا دیتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ زمین اور مریخ وغیرہ میں پیغام رسانی کا سلسلہ قائم کر کے انہیں آپس میں ملا دے۔

خواجہ صاحب کی وفات (۱۹۳۶ء) کے بعد اب جب کہ بیسویں صدی کا نصف آخر تقریباً وسط میں پہنچ چکا ہے۔ کلام پاک کی یہ آیت اور زیادہ کھلتی جا رہی ہے اور مختلف دنیاؤں کے باشندوں کا آپس میں ملنا اور ایک دنیا سے دوسری دنیا میں آنا جانا غیر ممکن نہیں رہا۔

"دعا" پر اعتراض اور جواب

اعتراض سورۂ فاتحہ سورۂ دعا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ہماری کوئی ضرورت پوشیدہ نہیں۔

جامِ جہاں نماست ضمیرِ منیرِ دوست
اظہارِ احتیاج خود آں جا چہ حاجت است (حافظ)

دعا کے ذریعے اس کو اپنی ضروریات سے مطلع کرنا کس طرح مناسب ہو سکتا ہے؟

جواب ایک طبیب کا بیٹا اپنے بھائی کو سخت گالیاں دے رہا تھا۔ طبیب ہمسائے کے مکان میں مریض کو دیکھنے کے لیے

آیا ہوا تھا۔ اس نے بیٹے کی گالیاں اپنے کانوں سے سنیں۔ شام کو جب اس کے پاس شکایت پہنچی، تو دشنام دہندہ نے صاف انکار کر دیا۔ باپ نے ڈانٹ کر کہا ـــــ "جھوٹ کیوں بولتا ہے! میں نے تیری بے ہودگی خود سنی ہے۔ اگر تو اعتراف کر کے بھائی سے معافی مانگے گا، تو تجھے چھوڑ دوں گا، ورنہ سزا دوں گا۔"

لڑکا نادم ہوا اور اعتراف قصور کے بعد بھائی سے معافی مانگی۔

باپ نے بیٹے سے اعتراف قصور کرایا۔ حال آں کہ وہ اس کی شرارت سے باخبر تھا۔ اور اسے معاف کرنا بھی چاہتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لڑکا اعتراف خطا سے اپنی اخلاقی کوتاہی کو محسوس کرے اور آئندہ احتیاط و اصلاح کی راہ پر چلے۔

بھائی سے معافی مانگنے کا مطلب بھی اس کو اپنی غلطی سے مطلع کرنا نہیں تھا، وہاں بھی آئندہ محتاط رہنے کے عزم کا اظہار تھا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ بندوں کے محتاج و عاجز ہونے کے اعتراف اور اپنے قادر مختار ہونے کے یقین دلانے کے بعد دامن سوال پھیلانے کا حکم دیتا ہے۔

پیاس کے بغیر پانی اور طلب کے بغیر حصول میں کوئی لذت اور قدر نہیں ہوتی۔ دعا سے طلب میں قوت پیدا ہوتی ہے اور مطلوب کی قدر کی جاتی ہے۔ بندہ شکرگزاری کی تعلیم پاتا ہے، جو خود ایک نعمت ہے۔ اس طرح شئے مطلوب کا ٹھیک استعمال کرتا ہے۔ اور اس میں افزائش پاتا ہے۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (سورۃ ابراہیم)

دعا کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہمارے بتانے سے اللہ تعالیٰ کو ہماری حالت کا علم ہوتا ہے:

آں کس کہ تو حال خود بدو می گوئی ۔۔۔ آگاہ نہ کہ اُو بتو بنمودہ ترا! (سحابی نجفی)

ترجمہ: کہ اپنا حال سنا رہا ہے۔ یہ حال سنانے کی توفیق اسی نے بخشی ہے اور تو جو اپنے آپ کو جانتا ہے، تو یہ بھی اُدھر ہی کا فیضان ہے۔

دعا سے مقصود ہمارے اخلاق و اعمال کی اصلاح و ترقی ہے۔ دعا ہی کی بدولت اللہ تعالیٰ کے قرب و معیت کا یقین پختہ سے پختہ تر ہوتا جاتا ہے، جو تمام سچے مذاہب کا حقیقی مقصود ہے:

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را (اقبالؒ)

سارے جہاں کا مدعا اس ایک بات میں ادا ہو سکتا ہے!

"سب کا بھلا۔ سب کی خیر"

لیکن حضوری اور تخاطب کی لذت کو برقرار رکھنے کے لئے..

ؔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چناں کہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ط زمین اور آسمانوں میں جو کوئی ہے، سب اسی داتا کے دربار کے منگتے ہیں۔
(الرحمٰن - ۲۹)

مُردہ زمین بارش کی بھیک مانگ رہی ہے۔ درخت خشک شاخوں کو اٹھائے ہوئے دست بدعا ہیں۔ دُکھی انسان صحت کا طالب ہے۔ ہر مصیبت زدہ مصیبت سے رہائی چاہتا ہے۔ فقیر کی صورت ہی سوال ہے۔ ساری کائنات کے سراپا سوال و دعا ہونے پر کسی کو اعتراض پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن دل یا زبان سے انسان کے اظہار سوال پر اعتراض کیا جاتا ہے۔

"بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست"

سخت درد و کرب کے وقت بے اختیارانہ چیخ نکل جاتی ہے۔ پھر زبان سوال کو اختیاری جنبش دینے پر اعتراض، کہاں کی معقولیت ہے! جو شخص دلی رغبت سے اپنے فقر و احتیاج کے اعتراف و اظہار کو خلاف شان سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ اُسے بے اختیار کر کے دکھا دیتا ہے کہ وہ طبعاً سائل و محتاج ہے۔ دعا کا حکم اسی طبعی تقاضے کی مطابقت سے ہے۔ ورنہ وہاں تو سب کچھ معلوم ہی ہے۔ وھو بکل شیءٍ علیم۔

حال دلم را بہ دانی از من ناگفتہ دانا! نوشتہ خوانا! (شعری کشمیری)

بعض لوگ کہتے ہیں۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن!
کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند (حافظ)

انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ دعا کا معاملہ مزدوری سے بالکل الگ ہے۔ مزدوری مزدور کا حق ہے، جو اُسے ضرور ملنا چاہیئے۔ نہ دینے والا ظالم سمجھا جائے گا، لیکن دعا کرنے والا فقیر ہے داتا چاہے تو سائل کو سوال کے مطابق یا اس سے کم دے، یا دوسرے وقت پر چھوڑ دے یا کوئی اور اشارہ کر دے جس کی تعمیل سے اس کی کچھ مطلب برآری ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فقیروں کو ضرور دیتا ہے، طلب سے زیادہ بھی دیتا ہے۔ مناسب حالات میں بے طلب بھی مرحمت فرماتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے مزدوروں کی طرح ان کا کوئی حق قائم نہیں ہو جاتا۔ وہ کسی مرتبے پر بھی پہنچ جائیں بہر حال فقیر ہی رہتے ہیں۔ اسی میں ان کی سعادت مندی ہے۔ ایک در کی فقیری جو ہزار در سے بے نیاز کر دے کوئی معمولی نعمت اور تھوڑی دولت ہے؟

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ ۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور (اے لوگو!) تم سب کے سب محتاج اور منگتے ہو۔
(محمد - ۳۸)

کہنے والے نے خوب کہا ہے:-

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

کوئی فقیر کسی دوسرے فقیر کو داتا سے دلوانے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ دعا میں ایک طرف "امید" کی نسیم خوشگوار چل رہی ہے تو دوسری جانب "خوف" کا لرزہ بھی ساتھ ہی لگا ہوا ہے۔

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔ (اعراف ۵۶) اللہ تعالیٰ کو پکارو خوف کرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے۔

دوسرا اعتراض اگر اللہ تعالیٰ ہماری کسی ضرورت کو پورا کرنے کا ارادہ کرے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اور اگر ارادہ نہ ہو تو ہماری دعا اس میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔

جواب دعا کے دو رخ ہیں۔ اِدھر سے طلب۔ اُدھر سے عطا۔ (پہلا رخ) نیکی کا کوئی خارجی فائدہ ہو یا نہ ہو۔ وہ خود اپنا اجر ہے۔ زید سب کی خیر چاہتا ہے۔ اس کا نتیجہ کس کے حق میں خیر ہو یا نہ ہو۔ زید کی نیت خود اس کے حق میں ایک اطمینان بخش نیکی ہے۔

دو قومیں آپس میں جنگ برپا رکھتی ہیں۔ زید ان میں صلح وامن چاہتا ہے اگر وہ اور زیادہ جنگ جو یا فسادی بن جائیں تو کیا زید کو اپنا مصلحانہ خیال ترک کر دینا چاہیئے؟ ہرگز نہیں۔

زید چاہتا ہے سب موحد اور نیکوکار بن جائیں۔ اس کے برعکس ساری دنیا توحید و نیکی کو بے فائدہ کہنے لگے تو زید کے عقیدہ و نیت کی صحت میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟[1]

جو چیز اپنی ذات میں اچھی ہے اس سے کوئی ظاہری فائدہ ملے یا نہ ملے اس کو "لاحاصل" نہیں کہا جا سکتا ــــ اسی طرح دعا سے بظاہر مقصد پورا ہو وہ "لاحاصل" نہیں ہے جب کہ وہ اپنی ذات میں عین عبادت ہے ــــ دعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط و تخاطب کا شرف حاصل کرنا اپنی ذات میں اعلیٰ درجے کی نیکی ہے ــــ یہ قلبی لگاؤ و توجہ اپنے باطن کی اصلاح اور عبادت لاحاصل نہیں ہو سکتی۔ (دوسرا رخ) ایک شخص کا بیٹا بیمار ہے۔ کیا معترض کہہ سکتا ہے کہ "اللہ کو شفا منظور ہے تو ہو کر رہے گی، موت منظور ہے تو آ کر رہے گی۔ لہٰذا دوا و علاج لاحاصل ہے؟"

کیا کسی کسان کو یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ غلہ پیدا کرنا چاہے گا تو وہ ضرور پیدا ہو گا۔ نہ چاہے گا تو ہرگز پیدا نہیں ہو گا۔ لہٰذا تخم ریزی، آب پاشی اور حفاظت و محنت وغیرہ "لاحاصل" ہے؟

اس اعتراض اور اس کے پیدا کردہ امکانات کے باوجود علاج کرنا اور بیج بونا ضروری ہے۔ تو دعا کو کیوں "لاحاصل" کہا

---

[1] لوط علیہ السلام کی کوشش کا قوم کے ایک فرد پر بھی اثر نہ ہوا۔ پھر کیا ان کو اپنا عقیدہ بدل لینا مناسب تھا؟ ان کے نیک خیال اور کوشش کا کم از کم یہ نتیجہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب سے بچا لیا اور آخرت کا دائمی اجر بھی اس (بظاہر بے اثر) خیال و کوشش ہی کا نتیجہ ہو گا۔

جا سکتا ہے؛ اگر اس اعتراض کو صحیح مان لیا جائے تو انسانی دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اعتراض میں اللہ تعالیٰ کے ارادے کی دو قسمیں ظاہر کی گئی ہیں۔

اول: کوئی کام کرنے کا ارادہ ـــــ وہ پورا ہو کر رہے گا۔

دوم: نہ کرنے کا ارادہ ـــــ وہ ہرگز نہیں ہو سکے گا۔

اہم نکتہ ایک تیسری قسم بھی ہے، جو معترض کی نگاہ سے اوجھل رہ گئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کام کا کرنا یا نہ کرنا متعین ہی نہ کرے، بلکہ اُسے اپنی حکیمانہ مرضی سے کھلا رہنے دے اور ذی اختیار مخلوق کے اختیاری اعمال و خواہشات کے مطابق اس کی کسی ایک جہت کو ترجیح دے۔ دعا اسی کھلے ارادے سے فائدہ اٹھانے کے لیے التجا کرنے کا نام ہے (اس نکتے کی تفصیلات آئندہ اوراق میں ملیں گی)

تیسرا اعتراض علاج علت ہے شفا کی، اور تخم ریزی علت ہے اناج پیدا ہونے کی۔ ان دونوں مثالوں میں علت و معلول کا رشتہ صاف نظر آرہا ہے۔ لیکن دعا مطلوب کے لیے علت نہیں۔ لہٰذا مجیب کا استدلال صحیح نہیں۔

جواب دوا سے حصول شفا یقینی نہیں۔ اسی طرح دعا سے حصول مدعا یقینی نہیں۔ کسان کی ساری احتیاط و محنت کے باوجود اناج کا اس کے گھر تک پہنچ جانا بھی یقینی نہیں۔ بونے سے توالرن کر حلق تک پہنچنے میں بے شمار ارضی و سماوی، معلوم و غیر معلوم آفتیں اور رکاوٹیں ہیں۔ جن پر قابو پانا غریب کسان تو کیا کسی بڑے سے بڑے سلطان یا سائنس دان کے بس میں بھی نہیں ـــ یہ ہے آپ کے علت و معلول کا حال! تاہم بات کو نمٹانے کے لیے ہم معترض کے قول کو دلیل مان لیتے ہیں۔ مزدور کی محنت بلاشبہ روپیہ پیسہ حاصل کرنے کی علت ہے۔ اور فقیر کا سوال کرنا یقیناً اس قسم کی علت نہیں۔ لیکن فقیر کو بھی روپیہ پیسا مل ہی جاتا ہے۔ فقیر کا سوال اور دعا کرنے والے کی دعا یکساں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فوق الفطرت تصرف سے جس کے لیے چاہتا ہے۔ اسباب مہیا فرما دیتا ہے۔ کائنات کی ہر شے اُس کے منشاء کے مطابق سرگرم کار ہو جاتی ہے۔

چوتھا اعتراض دو بادشاہ میدان جنگ میں آمادۂ پیکار ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنی فتح اور دوسرے کی شکست کے لیے سچے دل سے دعا مانگ رہا ہے۔

عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ فریقین اپنی اپنی کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا رہے ہیں۔

زمیندار بارش کے لیے آسمان کی طرف نظریں اٹھائے، ہاتھ پھیلائے آہیں بھر رہا ہے۔ کمزور جھونپڑوں اور ٹپکنے والے کچے مکانوں کے غریب مکین بارش کے نام سے لرزتے ہیں۔ اس قسم کے تمام متضاد امور میں اللہ تعالیٰ کس کی دعا قبول فرمائے گا اور کس کو رد کرے گا؟

جواب مدعی اور مدعا علیہ کی درخواستوں میں تو تضاد ہو سکتا ہے، لیکن جج کے حکم میں تضاد نہیں ہو سکتا ـــ بادشاہوں کی خواہشیں ایک دوسرے کے خلاف ہو سکتی ہیں؛ لیکن احکم الحاکمین کے فیصلے میں اختلاف ناممکن ہے،

بارش کی طلب میں بھی لوگوں کا خیال الگ الگ ہو سکتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم یقیناً غلطی سے پاک ہوگا۔

اگر کوئی شخص ظلم کر کے کامیاب ہونا چاہتا ہے یا کسی فاسقانہ مقصد کے لیے دعا کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کو اپنے چاؤ کے پیچھے چلانا چاہتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ سے کوئی خفیہ سے خفیہ تدبیر بلکہ ارادہ و خیال تک پوشیدہ نہیں، وہ تو کسی کے داؤ میں آنے والا نہیں ـــــ لیکن اگر دونوں فریق مجبور ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کو مختلف صورتوں میں فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

دعا کا مقصود اصلی خیر اور حقیقی فائدہ ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ مقصود سائل کی چاہی ہوئی خاص صورت ہی میں پورا ہو۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی سے ایک فائدہ روک لیتا ہے۔ تو اس سے بڑھ کر دوسرا فائدہ دے سکتا ہے[1]

اللہ تعالیٰ دونوں مخالف بادشاہوں، یا فریقین مقدمہ کے درمیان باعزت صلح بھی کرا سکتا ہے انہیں ایک دوسرے کے خیرخواہ اور معاون بھی بنا سکتا ہے۔ کل کے دشمن آج اتحادی اور آج کے اتحادی کل کو دشمن ـــــ بار بار دیکھنے میں آتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ایک قطعہ زمین میں بارش کر کے دوسرے قطع کو اس سے الگ رکھ سکتا ہے۔ یا بارش کر کے بھی پرانے مکانوں کو محفوظ رکھ سکتا ہے اس کے علاوہ دعا کے خاص فوائد جو دوسرے عالم میں حاصل ہوں گے، حقیقی اعلیٰ اور ابقیٰ فوائد وہی ہیں۔

الحمد للہ رب العالمین۔

---

[1] یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے ظلم سے، غلامی کی طویل مدت سے۔ اور قید خانے سے بچنے کا فائدہ نہیں دیا۔ یہ تینوں سانحے ان کو برداشت کرنے ہی پڑے۔ لیکن ان محرومیوں کے عوض کتنا عظیم فائدہ دیا! اور وہ عظیم فائدہ ان مصائب میں سے گزر کر ہی حاصل ہوا۔ سبحان ربی العظیم۔

بس دعا ہا کان زبان است و ہلاک　　از کرم می نشنود یزدان پاک　　(رومیؒ)

وجہ تسمیہ "البقرہ"

یہود جو انبیاءؑ کی اولاد ہونے پر فخر کرتے تھے، عملاً و اعتقاداً دین ابراہیمؑ سے منحرف ہو کر شرک و بدعات اور فسق و طغیان میں مبتلا ہو چکے تھے۔ بیک وقت دو عظیم پیغمبروں (موسیٰؑ و ہارونؑ) کے صحابہ ہوتے ہوئے اور پے در پے معجزات کی آغوش میں پلتے ہوئے بقرہ پرستی اور باہمی خون ریزی جیسے جرائم کے ارتکاب سے باز نہیں آتے تھے، ان کی ایسی حرکات کا ذکر اس سورہ میں عمود کے طور پہ لا کر اصلی ابراہیمی دین کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کا نام "بقرہ" نہایت مناسب ہے۔

ربط فاتحہ و بقرہ

۱۔ سورہ فاتحہ متن قرآن ہے۔ باقی تمام قرآن اس کی شرح ہے، جس کا آغاز بقرہ سے ہوتا ہے۔

۲۔ فاتحہ میں صحیح الفطرت انسانوں (متقین) کی ہدایت کا بیان ہے۔

۳۔ فاتحہ میں تین قسم کے انسانوں کا ذکر ہے۔ منعم علیہم، مغضوب علیہم، ضالین۔ بقرہ کا آغاز بھی بالفاظ دیگر انہی تین قسموں سے ہوتا ہے: متقین، کفار، منافقین۔

۴۔ فاتحہ میں عبادت کا ذکر ہے۔ (ایاک نعبد) بقرہ کا پہلا خطبہ بھی عبادت سے شروع ہوتا ہے۔ (یاایھا الناس اعبدوا ربکم)

۵۔ فاتحہ میں صراط مستقیم کی طلب سکھائی گئی ہے۔ بقرہ میں اس کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

ہر سورۃ کا پہلا لفظ

اسرار مقطعات

ہر سورۃ کے پہلے لفظ کا تعلق سورۃ کے تمام مضمون (یا مضامین) سے ایسا ہوتا ہے، جیسا بیج کا درخت سے۔ مثلاً جن سورتوں کا آغاز الٓمٓ سے ہوا ہے، ان میں اسلام پر مختلف انداز سے بحث کی گئی ہے۔

جن سورتوں کے پہلے حمد کا لفظ آیا ہے، ان میں اللہ تعالیٰ کے محامد و کمالات کو طرح طرح سے بیان فرمایا ہے۔ جن کی ابتداء تسبیح (سَبَّحَ یُسَبِّحُ، سَبِّحِ، سبحان) سے ہوئی ہے، ان میں تنزیہہ کی تفصیلات ہیں۔ جن کو تبارک سے شروع کیا ہے، ان میں خیر کثیر اور برکات کا ذکر ہے۔

حروف مقطعات، حروف ہجا تو ہیں لیکن ان کی ترکیب سے کوئی لفظ نہیں بنتا۔ اور یہ اعراب سے بھی خالی ہیں۔ عربی زبان میں مستعمل حروف مفردہ (استفہامیہ، جارہ، قسمیہ، عاطفہ وغیرہ) سے بھی نہیں۔ بعض الفاظ یا جملوں کے اختصاری اشارات (مثلاً رضؓ، صلعم، ؑ الخ) بھی نہیں ــــ ان حروف کا لغت، وضع اور صرف و نحو سے کوئی تعلق نہیں۔ جو لوگ ان کو مختلف معانی کا لباس پہناتے ہیں، خواہ مخواہ تکلف کرتے ہیں، جس کی کوئی سند نہیں۔ عربوں کی بول چال میں بامعنی الفاظ کی طرح ان کا کبھی استعمال نہیں ہوا۔

ہم مادہ، روح، بجلی، کشش وغیرہ کی ماہیت کو نہیں جانتے۔ لیکن ہمارے عدم علم سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان چیزوں کی کوئی ماہیت ہی نہیں ــــ اسی طرح مجرد حروف (جن سے بامعنی الفاظ بنتے ہیں) کی حقیقت ہم نہیں سمجھ سکتے لیکن اللہ تعالیٰ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ اسی طرح اسرار حروف بھی پوشیدہ نہیں۔ جس طرح بیج میں درخت موجود ہوتا ہے، لیکن نہ ہم اسے دیکھ سکتے ہیں۔ نہ خارج میں نکال سکتے ہیں۔ اس کا ظہور اور نشوونما اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُونَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (الواقعہ ۶۳-۶۴)

اسی طرح حروف میں جو علوم پنہاں ہیں، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی تشریح و تبیین سے ہم کو معلوم ہو سکتے ہیں۔ عربی زبان کی ساخت عجیب و غریب ضابطوں کی پابند اور سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے اوزان کی تبدیلی سے الفاظ کے معانی بدل جاتے ہیں۔ حروف کی زیادت سے معنی میں زور و زیادت پیدا ہو جاتی ہے۔ ملتے جلتے حروف والے الفاظ میں معنوی قرب و اشتراک پیدا ہو جاتی ہے مثلاً جن لفظوں ن ج اور ف جمع ہوں ان میں کسی نہ کسی جہت سے خروج، جہاں ف اور ل اکٹھے ہوں پھاڑنا اور ح، ن والے لفظوں میں پوشیدگی

ؓ یعنی رضی اللہ عنہ ــــ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ علیہ السلام

ؔ بظاہر زمین میں بیج تم ڈالتے ہو لیکن زمین کے اندر اس کی پرورش کرنا پھر اس کو لہلہاتی کھیتی بنا دینا تمہارا کام ہے یا ہمارا؟

کا مفہوم پایا جاتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف میں باریک اور نازک معانی ضرور موجود ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے بتانے سے ہم کو معلوم ہو سکتے ہیں۔

جن سورتوں کے آغاز میں یہ حروف ہیں، وہ سورتیں ہی ان کی تشریح ہیں بیج سے درخت کو پیدا کرنے والے خدا نے حروف کو سورتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ متجانس حروف مقطعات والی سورتوں کے مضامین میں بھی مماثلت و مشابہت پائی جاتی ہے اور ان سورتوں میں ان حروف کا استعمال بھی دوسری سورتوں کی بہ نسبت زیادہ ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ ق میں جتنے قاف آئے ہیں کسی دوسری سورت کی اتنی سطروں میں اتنے قاف نہیں آئے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

خواجہ صاحب نے اور بھی بہت سے اسرار مقطعات بیان کئے ہیں جو بڑی تقطیع کے نو صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں ان کی نقل کی گنجائش نہیں۔

شرح "غیب"

متقی دو قسم | خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ متقی دو قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ الذین یؤمنون بالغیب میں پہلی قسم کے متقی بتائے گئے ہیں، جو اپنی فطرت اور ضمیر کی اندرونی ہدایت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور خدا کی دی ہوئی چیزوں سے خرچ کرتے ہیں۔ وہ چوں کہ حق کے طالب اور محب ہوتے ہیں۔ اس لیے ہدایت میں ترقی حاصل کرنے کے لیے خود ہی قرآن مجید کی پناہ میں آجائیں گے۔

۲۔ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ الخ۔ دوسری قسم متقیوں کی وہ ہے، جو الہامی کتابوں کو مانتے ہیں۔ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ دو مرتبہ "وَالذین" لانے کا مقصد یہی ہے کہ یہ دو قسمیں الگ الگ ہیں۔

انسان فطری طور پر فجور و تقویٰ کو جانتا اور ان میں تمیز کر سکتا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (الشمس - ۸) اسی فطری صلاحیت کا ذکر اس آیت میں ہے (هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ) اس مفہوم کی اور بھی آیات ہیں۔ مثلاً۔

۱۔ تو اس شخص کو ڈراتا ہے، جو نصیحت کی پیروی کرے اور رحمٰن سے غائبانہ ڈرتا رہے (یٰس - ۱۱)

۲۔ تو اس کو ڈرانے والا ہے، جو آخرت کا خوف رکھتا ہے (نازعات - ۴۶)

۳۔ تو ان لوگوں کو سناتا ہے، جو ہماری آیات کو مانتے ہیں اور وہ مسلم ہیں (نمل - ۸۱)

۴۔ تو ان لوگوں کو ڈراتا ہے، جو اپنے پروردگار سے غائبانہ ڈرتے ہیں۔ اور نماز قائم کرتے ہیں۔ (فاطر ۱۸)

حاصل یہ کہ قرآن حکیم سے استفادہ کرنے کے لیے طبعاً کچھ نہ کچھ اتقا کی ضرورت ہے۔ پھر قرآن کی رہنمائی میں تقویٰ کے اعلیٰ مدارج پر رسائی حاصل ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ ارتقائی سفر کوئی حد و نہایت نہیں رکھتا۔

اے برادر بے نہایت در گہے ست
ہر چہ بروے می رسی آں جا مایست! (رومی)

ایمان وکسبِ خیر

وقتِ آخر جب انسان کو دوسرے عالم کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں، پہلے سے غائبانہ ایمان نہ ہو، تو اس وقت ایمان لانے سے کوئی نفع نہیں ہوتا۔

اگر پہلے سے ایمان تو ہے، لیکن عملاً خیر وسعادت کا کوئی کام نہیں کیا، تو ایسا بے مغز ایمان بھی کچھ فائدہ نہیں دیتا۔۔۔ قرآن حکیم بے ثمر ایمان کی دعوت نہیں دیتا۔ وہ فرماتا ہے اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (انعام - ۱۵۸)

حقیقی مومن کے لیے محض "آمنّا" کہہ دینا کافی نہیں۔ مومن کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اس کو مصائب میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

ایسے حالات میں اگر وہ ایمان کے مقتضیات پر ثابت قدم رہا، تو مومن ہے ورنہ نہیں۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (العنکبوت - ۲)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ زبان سے کہہ دیا "ہم ایمان لے آئے"، بس اتنا کہنے سے چھوٹ جائیں گے؟ ایسا نہیں ہوگا۔ ان کو جانچا جائے گا۔ ان کا امتحان لیا جائے گا۔

* *

زیرِ غور آیت میں الٰہی کتابوں پر ایمان لانے کا مقصود یہ ہے کہ ان کے مطابق "کسبِ خیر" کیا جائے، کیوں کہ سب کتابوں کا بنیادی اصول ایک ہی ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

شاہ صاحب بھی یہاں دو ہی قسم کے متقی تسلیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے:

متقیاں دو قسم اند۔ قسمِ اوّل کسانے کہ ایمان بغیب می آرند و بمقتضائے ایمان، اعمال واخلاق خود را درست می کنند۔

متقیوں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور اس ایمان کے مطابق اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کرتے ہیں۔

دوم کسانیکہ از سابق ایں امورِ غیبیہ را معلوم دارند برائے تاکید وتقویتِ آں معلوماتِ خود التجا باین کتاب می آرند۔

دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں، جو پہلے ہی غیبی امور کو جانتے ہیں اور اپنے سابقہ معلومات کی تائید کے لیے اس کتاب (قرآن حکیم) کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ان دو قسموں کی تعیین میں خواجہ صاحب اور شاہ صاحب کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش ہے

نہ ضرورت۔

خواجہ صاحب اپنا استدلال آیات ذیل سے مستحکم کرتے ہیں۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّنَ (البقرہ ۲۱۳) — سب لوگ ایک ہی جماعت تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نبی مبعوث فرمائے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (یونس ۱۹) — سب لوگ ایک ہی جماعت تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہوگئے۔

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (البقرہ ۲ - ۲۱۳) — (بعثت انبیاء کا مقصود یہ تھا کہ) لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ ہو جائے۔

بعثت انبیاء اور ظہور اختلافات سے پہلے جس دین پر لوگ امت واحدہ کی طرح متفق اور عامل تھے وہ فطری دین ہی ہو سکتا ہے۔ جب فطرت شبہات اور بری عادات کے نیچے دب جاتی ہے؛ تو مرد وعورت دونوں جنسوں کی چھپی برائیاں (سَوْاٰتُهُمَا) کھل جاتی ہیں۔ اس وقت سوئی ہوئی فطرت ہی کو بیدار کرنے کے لیے تعلیمی وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔

فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (البقرہ ۳۷) — پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ باتیں سیکھ لیں۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ ۳۸) — پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو میری ہدایت پر چلا، ایسے ہی لوگ خوف و غم سے بچ جائیں گے۔

رسولوں کو "مذکر" اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ بھولی ہوئی بات کو پھر سے یاد دلاتے ہیں:۔

اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ۔ غاشیہ ۲۱ — اے پیغمبر تو صرف یاد دلانے والا ہے۔

سعادت مند لوگ رسول کی بات کو اپنی ضمیر کی آواز سے مطابق پاکر پہچان لیتے ہیں:۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا۔ (بقرہ ۲ - ۸۹) — پھر جب ان کے پاس وہ ہدایت نامہ آپہنچا جس کو انہوں نے پہچان لیا۔

یہ دونوں قسم کے متقی ہدایت کی راہ پر ہیں۔ یہ ہدایت فطری ہو یا بذریعہ وحی دونوں کا منبع اللہ تعالےٰ کی ذات بابرکات ہی ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ۔ — یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔

ان کے لیے مزید ترقیات کے دروازے کھلے ہیں۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ — اور یہی لوگ کام یاب ہونے والے ہیں۔

مشہور رباعی گو سحابی نجفی کے سامنے معلوم نہیں یہ آیت تھی یا نہیں، لیکن اس کے قلم سے یہی حقیقت ٹپک پڑی ہے۔

آنم کہ ندارم بدو عالم کامے　　　نایافتہ جز پیک وجود آرامے
گر خلق جہاں جملہ چو من بودندے　　　لازم نشدے رسولے و پیغامے

(یعنی، اگر سب لوگ میری طرح اپنے اندرونی قاصد کے پیغام کو مکتفی سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہو جاتے تو کسی پیغمبر اور سماوی کتاب کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

کافروں کے دلوں پر مُہر

اہلِ ایمان و تقویٰ کے بعد کافروں کا ذکر آتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَ اَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ۔

جو لوگ کافر ہوئے۔ ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے یکساں ہے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

اس آیت کے سمجھنے میں عموماً تسامح ہوا ہے کہ یہاں خاص قسم کے کافر مراد ہیں جو حتماً ایمان نہیں لا سکتے۔ ان کے لیے تبلیغ و رسالت بے کار ہے۔

وسبق فی علم اللہ انہ یموت علیٰ کفرہٖ
(تفسیر قرطبی جز اوّل ص۱۹۰)

اللہ کے علم میں پہلے سے طے شدہ ہے کہ وہ (کافر) اپنے کفر پر قائم رہتے ہوئے مرجائے گا۔

فان الختم ھو الطبع فمن این لھم الایمان ولو جھدوا۔ (ایضاً ص۱۹۲)

ختم اور طبع کا ایک ہی مطلب ہے (یعنی مُہر) جب مہر لگ گئی تو وہ کوشش بھی کریں تو ایمان سے محروم ہی رہیں گے۔

تفسیر مظہری میں ہے :-

خدا تعالیٰ کو کفار کے دلوں کا پاک کرنا منظور نہ تھا اس لیے ان کو آیات میں فکر کرنے اور قدرت کی نشانیوں میں غور کرنے سے روک دیا۔ ۔ ۔ ان کے دلوں میں ایمان و یقین کے اثر قبول کرنے کا ملکہ پیدا نہیں کیا ۔ ۔ ۔ مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اس (خدا) نے دلوں میں یہ صلاحیت و قابلیت ہی پیدا نہیں کی کہ وہ ایمان و یقین کے اثر کو قبول کر لیں۔

ترجمہ اُردو مظہری جلد اول ص۲۶، ۲۷

خواجہ صاحب اس تفسیر کو صحیح نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں عام قرآنی اسلوب کے مطابق یہ کافروں کی کوئی خاص قسم نہیں ہے ـــــ اللہ تعالیٰ نے یہاں صاحب اختیار انسانوں کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ مومن ـــــ کافر ـــــ منافق۔ ان میں سے کوئی بھی، ایمان، کفر یا نفاق پر مجبور نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کے ساتھ ہی ان تینوں کو "الناس" کہہ کر خطاب فرمایا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ

اے سب لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان کو جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ اعبادت کی غرض

تَتَّقُوْنَ (البقرہ-۲۱) یہ ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

اگر "کافر" کا کفر لاعلاج اور مجبوری ہے تو اس کو عبادت کا حکم دینا اور اس سے متقی بن جانے کی توقع رکھنا، بے معنی ہو جائے گا۔

عبادت وسنت الٰہیہ یہ ہے کہ جب کفر لاعلاج ہو جاتا ہے، تو کافروں کو دنیا سے اٹھا لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ عاد، ثمود، قوم لوط، قوم نوح، قوم فرعون وغیرہ کے حالات سے ظاہر ہے۔ جو لوگ اس حد تک پہنچ جائیں ان سے یہ نہیں کہا جاتا کہ "عبادت کرو تاکہ تم بچ جاؤ یا متقی بن جاؤ"

نتیجہ یہ ہے کہ تینوں قسم کے لوگ عبادت وتقویٰ کے ذریعے اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں اور متقی بن سکتے ہیں۔

بعض مفسروں کو "سواءٌ علیہم" اور "لا یؤمنون" کا مطلب سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ یہاں اس کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔

قرآن پاک کا انداز بیان دیکھیے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرہ-۱۲۰) تجھ سے یہود ونصاریٰ ہر گز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ تو ان کے دین کا پیرو نہ ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ آنحضرت نہ یہودی بنے نہ عیسائی ہوئے، پھر بھی ہزاروں یہود ونصاریٰ آپ کی حیات مبارکہ میں آپ کے پیرو بنے اور لاکھوں کروڑوں آپ کے بعد حلقہ بگوش اسلام ہو کر آپ سے راضی ہوئے۔

لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی یہودی و نصرانی باوصف یہودیت ونصرانیت آپ سے راضی نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ ضد وتعصب کے مرض سے صحت یاب ہو کر اور اخلاص سے تحقیق وتسلیم کی راہ پر لگ گیا تو یہودی ونصرانی نہ رہا۔ اب وہ آپ سے راضی ہوتا ہے تو یہودی ونصرانی نہ رہا۔ اب وہ آپ سے راضی ہوتا ہے۔ تو یہودی ونصرانی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ محقق ومسلم کی حیثیت سے راضی ہو رہا ہے۔ ایسی ہی یہ آیت ہے۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (کافرون ۵) اور تم اس کو نہیں پوجو گے۔ جس کو میں پوجتا ہوں۔

یعنی تم کفر پر قائم رہتے ہوئے خدائے واحد کے مخلص پجاری (عابد) نہیں بن سکتے۔ ایسی ہی ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (بقرہ ۲۵۹) اللہ تعالیٰ ظالموں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

بلاشبہ ظالم، ظلم پر قائم رہتے ہوئے ہدایت سے محروم رہتا ہے، بلکہ ظلم وضلالت میں بڑھتا جاتا ہے لیکن جب وہ ظلم سے نادم، تائب اور بیزار ہو کر عدل کی راہ اختیار کرتا ہے، تو عدل میں ترقی حاصل کرتا ہے ــــ اس قسم کے تمام احکام مخصوص حالات سے متعلق ہیں اور حالات کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔

کفار سے متعلق زیر غور آیات (ختم اللہ علی قلوبہم۔ سواءٌ علیہم ــــ لا یؤمنون) کا انداز بیان بھی یہی ہے جب کوئی شخص کفر سے رغبت اور ایمان سے نفرت کرتا ہے تو اس کی یہ رغبت ونفرت مشق ومزاولت سے بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ کفر کو ترک کر دے

تو کفر کی سختی، ایمان کی نرمی میں بدلتی جائے گی اور اللہ کے ذکر سے اس کو اطمینان حاصل ہونے لگے گا اور پاکیزہ صفات حاصل ہوتی جائیں گی۔

اللّٰهُ يُزَكِّي مَنْ يَّشَآءُ۔ (نساء-۵۰)

اللہ تعالیٰ اپنی (مشیت وحکمت کے مطابق) جسے چاہتا ہے، پاکیزہ صفات سے متصف کر دیتا ہے۔

جس طرح کافر کے اختیار کردہ کفر کی وجہ سے مُہر لگ جاتی ہے، اسی طرح ترکِ کفر سے ایمان کی بدولت مُہر کو دور بھی کر دیا جاتا ہے۔

اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ط (انعام ۴۶)

اگر اللہ تعالیٰ تمہیں سننے اور دیکھنے سے محروم کر دے اور دلوں پر مُہر لگا دے (فکر وفہم غیر متوازن ہو جائیں) تو اللہ تعالیٰ کے سوا کون سا معبود ہے جو تم کو پھر سے یہ نعمتیں عطا فرمائے، (یعنی سماعت، بصارت بخش دے اور مُہر کو دور کر دے۔

اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ لگی ہوئی مہریں دور بھی ہو جاسکتی ہیں اور ان کا دور کرنا بھی اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔

اگر ہماری بے اعتدالی کے سبب اللہ تعالیٰ اپنے قانون کے مطابق ہمیں مبتلائے امراض کرتا ہے (یا ہم خود مبتلائے امراض ہوتے ہیں) تو ہمارے رجوع، علاج اور پرہیز سے شفا بھی عنایت فرماتا ہے۔

ہم اچھا بیج بوتے ہیں، تو وہ تعمیر اپنے فیضانِ پرورش سے اس کو اچھا درخت بنا دیتا ہے اور ہمیں اس سے لذیذ ومفید پھل کھلاتا ہے اور اگر ہم خبیث شجر لگاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے بھی پروان چڑھا دیتا ہے اور اس کے زہریلے نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہی حال ایمان وکفر اور اچھے بُرے عقائد واعمال کا ہے۔

امام ابن تیمیہ سے بھی اس تفسیر کی تائید ملتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

فالمراد ان الكافر ما دام كافرا لا يقبل الحق سواء انذر ام لم ينذر، ولا يؤمن ما دام كذالك لان على قلبه وسمعه وبصره موانع تصد عن الفهم والقبول۔ فهكذا حال من غلبت عليه هواه۔

آیت ختم اللہ علی قلوبہم سے مراد یہ ہے کہ کافر جب تک کافر بنا رہے گا، حق قبول نہیں کرے گا اس کو ڈرانا یا نہ ڈرانا یکساں ہے۔ جب تک کفر کی حالت پر قائم رہے گا، ایمان نہیں لائے گا۔ (لا یؤمنون) اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دل، کان اور آنکھ پر ایسی رکاوٹیں ہیں، جو سوچنے سمجھنے اور قبول کرنے میں روک بن رہی ہیں یہی حال ہر ایسے شخص کا ہے، جس پر ہوائے نفس غالب ہو۔

اس حالت میں پہنچ جانے کے بعد بھی ان کے ایمان لے آنے کا امکان ہے۔ اس کے متعلق امام موصوف وہی بات لکھتے ہیں جو خواجہ صاحب نے بیان کی ہے۔

وذالك لا يمنع ان يكونوا قد يسمعون
(اذازال الغطا الذی علیٰ قلوبهم و
سمعهم وابصارهم فانّهم لا يسمعون)
لذالك المعنى مشتق منه وهو الكفر فما
داموا هذه حالهم فهم كذالك ولكن
تغير الحال ممكن - كما قال اِلّا ان يشاء
الله كما هو الواقع -

(انعام ۱۱۱)

(مجموعہ تفسیر ابن تیمیہ مطبوعہ بمبئی ، الہند)

مہر لگ جانے کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ قلب وسمع وبصر پر سے کفر کا اثر دور ہو جانے کے بعد بھی وہ مہر لگی ہی رہے گی اور وہ حق کے سننے اور ماننے سے ہمیشہ محروم ہی رہیں گے حقیقت یہ ہے کہ جب تک کفر پر اصرار موجود ہے، مہر لگی رہے گی لیکن اس حالت کا بدل جانا بھی ممکن ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

"مگر جو چاہے اللہ" اس کا ثبوت واقعات سے ملتا ہے کہ جو لوگ پہلے کافر تھے۔ بعد میں ان کو اسلام کی سعادت نصیب ہوئی۔

منافق

انسانوں کی اکثریت ایسی ہے جن کا خدا کو ماننا نہ ماننے کے برابر ہے۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (یوسف - ۱۰۶) — بہت سے لوگ اللہ پر ایمان لانے کے بعد بھی مشرک ہی رہتے ہیں۔

منافق اللہ اور آخرت پر رسمی ایمان رکھتے تھے، وہ اپنے زعم میں اللہ کو دھوکا دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں وہ نعوذ کسی کے ظاہری نماز روزے کے فریب میں نہیں آسکتا۔ دہری یا منافق خدا کے منکر ہو سکتے ہیں۔ لیکن قوانین فطرت کا انکار نہیں کر سکتے۔ ان قوانین کو دھوکا دینا غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔

مایخدعون الا انفسھم ومایشعرون (بقرہ ۹) دل کا سخت ہو جانا تزکیہ نفس اور اصلاح ذات سے بے بہرہ رہنا اپنے آپ کو دھوکا دینے اور خائب و خاسر رہنے کے مترادف ہے۔ ہر بُری عادت مشق سے مزید ترقی کرتی ہے فَزَادَهُمُ اللهُ مَرَضًا، سے یہی مراد ہے ـــــ اگر روحانی و اخلاقی امراض لاعلاج حد تک نہ پہنچ جائیں، تو مستقل مقابلہ و معالجہ سے ان کو محاسن میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (ھود - ۱۱۴) کا یہی مطلب ہے۔

اذا قیل لھم

إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ - (بقرہ - ۱۱) — جب منافقوں کو فساد سے منع کیا جاتا تو وہ اپنے آپ کو اصلاح پسند کہتے۔

اس آیت سے عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ فساد سے روکنے والے مسلمان تھے۔ چنانچہ مظہری میں ہے "جب مسلمان ان سے کہتے تھے کہ ملک میں فساد نہ ڈالو تو وہ اپنے آپ کو "مصلحون" کہہ کر اس کی تردید کرتے تھے (ص۲۲) ـــــ اسی طرح اگلی آیت وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ کو بھی مسلمانوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

خواجہ صاحب کے نزدیک یہ تفسیر صحیح نہیں، بوجوہ ذیل :-

۱۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ، جب ان منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح (یک سو ہو کر) ایمان لے آؤ" ـــــ مسلمان اپنے آپ کو" دوسرے لوگ" نہیں کہہ سکتے۔

۲۔ منافق جواب میں کہتے ہیں۔ أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں؟ ـــــ منافق

مسلمانوں کے مُنہ پر ان کو "احمق" نہیں کہہ سکتے۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ منافق لوگ مسلمانوں اور کھلے کافروں کے لیے یکساں خطرہ اور ناقابل اعتماد تھے۔ مسلمان یا کافر کوئی بھی ان کے متعلق فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ دل سے کس طرف ہیں! اسی وجہ سے کفار اُن سے کہتے تھے کہ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ۔ مفسدانہ حرکتیں نہ کرو۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بظاہر مسلمان بن کر مسلمانوں کے حالات معلوم کر کے داخلی طور پر ان کی تبلیغ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ اس سے ہماری غرض "اصلاح" ہے (نحن مصلحون) حالاں کہ وہ بے شعور یقیناً خود ہی مفسد تھے اور پھر کافر انہیں کہتے کہ تم مومن ہو کر ایک طرف ہو جاؤ کہ تمہارے متعلق ہمارا دغدغہ ختم ہو" وہ کہتے کہ ایک طرف مومن تو احمق ہیں۔ جنہوں نے اپنے مال و جان کو خطرے میں ڈال رکھا ہے کیا ہم ان احمقوں کی طرح ہو جائیں؟" اس کے برعکس جب مومنوں سے ملتے تو ایمان کا اقرار کر لیتے (وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا)۔

خواجہ صاحب کی یہ توجیہ و تشریح قابل غور ہے۔

استہزاء اور مکر اللہ کی شرح

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ . . . . الخ (البقرہ ۱۴ - ۱۵)

منافق جب اپنے شیطانوں کے پاس تنہائی میں ہوتے تو کہتے ہم (دل سے) تمہارے ساتھ ہیں۔ (بظاہر جو مسلمانوں میں شامل ہیں تو ان سے ہنسی کرتے ہیں۔ (دراصل) اللہ ان سے ہنسی کرتا ہے۔

حق سے روگردانی اور باطل سے رغبت۔ دراصل انہی سے ہنسی ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہنسی کی سزا اس رنگ میں مل رہی ہے، آیت کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوتا ہے۔ وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں سرکشی میں ایسی مہلت مل رہی ہے کہ وہ اندھے ہو رہے ہیں۔

لغت کی شہادت

ہر زبان میں ایسے مقابلے کے الفاظ ہوتے ہیں۔ اس طرز کلام کو صنعت مقابلہ کہا جاتا ہے "مصباح المنیر" میں لکھا ہے۔

مکراللہ والمکر، جازای علی المکر و سمی الجزاء مکراکما سمی جزاء السیئۃ بسیئۃ مجازا علی مقابلۃ اللفظ باللفظ۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے مکاروں کو ان کے مکر کی سزا دی اور مکر کی سزا کو مکر اسی طرح کہتے ہیں، جس طرح بدی کی سزا کو لفظی مقابلے کے طور پر بدی کہتے ہیں۔

سعدیؒ نے بوستان میں لکھا ہے،

بدی را بدی سہل باشد جزا — اگر مردی احسن الیٰ من اسا

قرآن مجید میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں مثلاً

جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ - ۴۰)

بدی کا بدلہ اس کی مثل بدی ہے (یعنی سزا) جو تم پر زیادتی

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ (بقرہ - ۱۹۴)

کرے، تم اس پر زیادتی کرو بالکل اتنی ہی زیادتی، جتنی اس نے تم پر کی۔

یہاں بدی کے بدلے میں جو بدی ہوگی، وہ حقیقتاً بدی نہیں، بلکہ بدی کی سزا ہے جو صرف شکلاً بدی ہے ــــ اسی طرح زیادتی کے بدلے میں جو زیادتی کی جائے گی، وہ عین زیادتی نہیں بلکہ زیادتی کی سزا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کو سبوح و قدوس وسلام کہا گیا ہے اس کی ذات پاک میں کوئی بات ایسی نہیں ہوسکتی، جو اس کی شایانِ قدوسیت اور تعلیم قرآن کے خلاف ہو۔

سمع وابصار میں جمع وواحد لانے کی حکمت

قرآن مجید میں عموماً سمع بصیغہ واحد اور اس کے ساتھ ابصار بصیغہ جمع لایا گیا ہے، جیسا کہ سورہ بقرہ کے ابتدائی دو رکوع میں آیا ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ انسان کو کسی کی آواز سننے کے لیے صاحب آواز کی طرف مڑنے کی عموماً ضرورت نہیں ہوتی - ایک ہی رخ بیٹھے ہوئے دائیں بائیں، آگے، پیچھے اور نیچے، اوپر کی آواز سنی جا سکتی ہے ــــ لیکن آنکھیں مختلف سمتوں کی چیزوں کو نہیں دیکھ سکتیں - جب تک ان کا رخ چیز مقصود کی طرف نہ پھیرا جائے - اگر کسی جگہ سَو آدمی ہوں، تو ایک آدمی کا سننا یا سَو آدمی کا سننا ایک ہی حقیقت رکھتا ہے، لیکن دیکھنے کے لیے مختلف اشخاص کے نظری خطوط کا مختلف ہونا لازم ہے، اس کے بغیر دیکھنا ناممکن ہے -

خاتم الکتب

تمام ربانی مذاہب کے بنیادی اصول یکساں ہیں۔حق غیر متبدل ہے۔یہی محکم اور ام الکتاب ہے۔یہی اصل دین اور صراط مستقیم ہے۔اسی پر عمل کر کے آغاز عالم سے لوگ منعم علیہم بنتے آرہے ہیں۔قرآن مجید اہل کتاب اور تمام دنیا کو اسی پہ جمع کرنا اور تفرقے مٹانا چاہتا ہے۔اسی وجہ سے وہ خاتم الکتب ہے۔وہ اپنا کوئی الگ فرقہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا۔وہ ہزار کو ایک بنانے والا ہے۔ایک ہزار ایک کر دینے والا نہیں۔

مطاعِ حقیقی

اہل مذاہب نے عموماً اپنے بزرگوں کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ برابر کا مطاع قرار دے لیا ہے۔اس طرح ہر مذہب والے ایک سے زیادہ اصل مطاع مان رہے ہیں۔اور اس پہ دلیل یہ دیتے ہیں۔کہ خود خدا ہی نے ہم کو حکم دیا ہے کہ میرے فلاں رسول و نبی کو میری ہی طرح اصل مطاع مانو۔اس لیے یہ شرک نہیں ہے۔قرآن مجید اہل کتاب کی ایسی بے چون وچرا بشری اطاعت کو "اربابًا من دون اللہ" کہتا ہے۔یعنی یہ تو بندوں کو رب بنانا ہوا۔خواجہ صاحب ایک مثال دے کر اس عقیدے کی تردید کرتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں۔

ایسی ناپاک دلیل سے تمام شرک صحیح سمجھے جا سکتے ہیں۔کیا خاوند کے حکم سے کسی غیر شخص کو خاوند کے حقوق میں شریک کرنا جائز ہے ! خدائے تعالیٰ جو بڑا غیور خاوند خداوند ہے ایسی بے حیائی کا حکم دے سکتا ہے ! ان الحکم الا للہ (یوسف ۴) خدا کے سوا کوئی نہیں جس کا حکم بے چون وچرا تسلیم کیا جائے۔

حقیقت سماوات

سماوات کے متعلق پرانا بطلیموسی نظام فرسودہ ہو چکا ہے۔ جدید تحقیق ابھی کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچی ہے نئے مفسروں نے سات آسمانوں کے متعلق مختلف نظریئے پیش کئے ہیں جن کو ظن و تخمین ہی کا مرتبہ دیا جا سکتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس پر غور کیا تو وہ حسب ذیل نتیجے پر پہنچے۔

بقرہ کی آیت (۲۹) میں تسویۂ سماء (سات آسمانوں کے مرتب کرنے) کا بیان ہے۔ اس کے متعلق چند اشارے پیش کئے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فضائے غیر متناہی کو بنا کر اس میں بے شمار نظام ہائے شمسی پیدا کر دیئے۔ اس طرح یہ کائنات لاتعداد سورجوں، چاندوں، ستاروں اور سیاروں پر مشتمل ہے، جو سب کے سب ایک نظام اعلیٰ میں اس طرح پرو دیئے ہوئے ہیں۔ جیسے تسبیح کے دانے۔ ہر ذرہ کائنات کی دوسرے تمام ذرات سے ہم آہنگی اس بات پر گواہ ہے کہ یہ سارا کارخانہ عظیم ایک ہی مدبر حکیم کے ماتحت چل رہا ہے۔ ہر ستارے اور سیارے سے دوسرے تک نور، حرارت، حرکت، جذب وغیرہ تاثیرات پہنچانے کے لیے مدبر حکیم تم نے اپنی حکمت کاملہ سے ایک عجیب ذریعہ (موصل) پیدا کیا ہے، جو ساری فضائے لامتناہی میں پھیلا ہوا ہے، جس کا عربی نام "اثیر" ہے۔ اسی کو بر تبدیل لہجہ "ایتھر" (ETHER) کہتے ہیں۔ یہ ایتھر عام مادے سے مختلف ہے۔ مادے میں اس کے سبب جذب و مدافعت پیدا ہوتی ہے۔ مرکب مادہ (پتھر، لوہا، سونا، ہیرا وغیرہ) خواہ کتنا ہی پیوستہ و چسپیدہ ہو، پھر بھی اس کے ذرات میں غیر مرئی فاصلے ضرور ہوتے ہیں لیکن ایتھر اس قدر متصل اور پیوستہ چلا جا رہا ہے کہ اس میں قطعاً کہیں فصل و شگاف نہیں۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ (ق-۶)	کیا وہ اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھتے، ہم نے اسے کس طرح بنایا اور سجایا اور اس میں کوئی شگاف نہیں۔

سورج اور زمین دونوں اپنے مشترکہ مرکز ثقل پر جو مرکز زمین سے بہت دور اور مرکز آفتاب سے بہت قریب واقع ہے، گردش کرتے ہیں۔ اتنے عظیم فاصلے کے باوجود یہ دونوں ایک نظام گردش میں اسی "ایتھر" کے ذریعے منسلک ہیں۔ اگر ایتھر کی بجائے لوہے کی موٹی سے موٹی اور مضبوط سلاخ ہوتی تو وہ ایک ہی جھکولے میں، ایک ہی سیکنڈ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی۔ لیکن ایتھر اپنی مرتب صورت میں ہو یا غیر مرتب[1]، بے حد قوی موثر ہونے کے لحاظ سے بہت ہی مضبوط اور شدید ہے۔

---

[1] ہلاکت انگیز اثرات (طوفان و زلازل وغیرہ) پہنچانے کے وقت ایتھر کی قیامی و تعمیری ترتیب میں فرق آجاتا ہے۔

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا۔ (نبا-۱۲)
اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔

ایتھر کی قوت ایصال ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، اس میں ہر قسم کی تحریکات کے بے شمار تموّج پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان ہر جہتی لہروں کو بُنے ہوئے جال سے تشبیہہ دے سکتے ہیں جو نہایت مناسبت رکھتی ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (ذاریات-۷)
قسم ہے آسمان جال دار کی (ترجمہ شیخ الہند)

اس کے سبب سے ہر تاثیر و تاثر بلکہ آواز و خیال کے اثرات بھی خواہ کوئی رنگ اختیار کرلیں ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔ کبھی معدوم نہیں ہو سکتے۔ یہ ہر ستارے اور سیارے کے گرد ایک محفوظ چھت کی طرح محیط ہے۔

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (انبیاء ۳۲)
اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا۔

اوپر اور نیچے نسبتی لفظ ہیں۔ اگر ہر ستارے اور سیارے کے مرکز کو اس کا تحت سمجھیں تو اس کی ہر طرف جو کچھ بھی موجود ہے، وہ اس کے مرکز کی نسبت سے اس کا "اوپر" ہے۔ یہی بات ہماری زمین پر صادق آتی ہے، جو اس فضا کا ایک چھوٹا سا سیارہ ہے۔ زمین کے اندر ناقابلِ تصور حد تک تیز حرارت پائی جاتی ہے۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ (الرحمٰن-۳۵)
تم (جن و انس) پر اوپر سے اور زمین کے اندر سے آگ کے شعلے اور دھواں بھیجا جائے تو تم اپنے آپ کو بچا نہ سکو۔

اس بے اندازہ[1] حرارت کے اثر سے تمام دھاتیں گھلی ہوئی حالت میں ہیں، اور بہت سی چیزیں نحاس (دھوئیں) کی صورت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سطح ارض اس آگ کے لیے بمنزلہ تنور ہے۔ چنانچہ عرب سطح ارض کو تنور ہی کہتے ہیں[2]۔ سطح کی جانب سے حرارت کم ہو جانے سے پوست زمین بنا ہے۔ آتش خیز پہاڑ اب بھی زمین کی اندرونی حرارت کا پتا دے رہے ہیں۔ طور بھی ایک آتشیں پہاڑ تھا جو کسی چیز کے حائل ہونے کے سبب بجھ کر سرد ہو چکا ہے۔

زمین کے بیرونی پوست یعنی تورہ زمین میں آہستہ آہستہ طویل زمانوں میں بہت سے طبقات پیدا ہوئے، جن میں زمین کی تاریخ قدیم اس طرح موجود ملتی ہے۔ گویا وہ لکھی ہوئی ہے۔

وَالطُّوْرِ ۙ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِىْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ (طور-۱، ۲، ۳)
قسم ہے طور کی اور لکھی ہو کتاب کی جو ازمین کے) پھیلے ہوئے باریک پردوں میں ہے۔

---

[1] "بے اندازہ" کا لفظ انسانی فکر و فہم کی نارسائی کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کے پیش نظر تمام کائنات بحر و بر اور موجودات سماء و فضا کے ذرات تک بھی "بے اندازہ" نہیں ہیں وہاں تو ہر جزو و کل کیلئے پیمانے مقرر ہیں۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

[2] قال علی کرم اللہ وجہہ ہو وجہ الارض وشئہ وردعن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ وقال قتادہ اعلیٰ الارض واشرفہا (تاج العروس) حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ "تنور" کے معنی سطح زمین" ہیں قتادہ نے کہا ہے کہ "تنور" بلند زمین کو کہتے ہیں۔

اس پوستِ زمین کے اوپر بے شمار نبات، حیوان، اور انسان کے باعث ایک گھاگھمی ہے، جس سے یہ دنیا آباد گھر کی صورت میں دکھائی دے رہی ہے:

وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ (طور - ۴)

اور قسم ہے اس آباد گھر (رُبعِ مسکون) کی

اس کے اوپر ہر طرف ایتھر ایک بلند چھت کی طرح چھایا ہوا ہے۔

وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ (طور ۔ ۵)

اور قسم ہے اس بلند (محیط) چھت کی

پھر اس وسیع بلندی میں نیبولا[1] کے آتشیں سمندر ٹھاٹھیں مار رہے ہیں۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (طور - ۶)

اور قسم ہے بھڑکائے گئے سمندر کی

سورہ طور کے آغاز میں یہ قسمیں یا عظیم الشان شہادتیں اس بات کے لیے بطور دلیل پیش کی گئی ہیں کہ

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝ (طور ۔ ۷، ۸)

(یہ مناظر و وقائع و حوادث کہہ رہے ہیں کہ) تیرے رب کا عذاب ضرور وقوع پذیر ہو کر رہنا ہے کوئی قوت اس میں روک نہیں بن سکتی۔

یہ "بحرِ مسجور" یعنی نیبولے ہمیشہ فضائے سماوی میں رواں، دواں رہتے ہیں۔ ان کی مثال بالکل کاغذوں کے مُٹھے کی سی ہوتی ہے۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ (انبیاء ۱۰۵)

جس دن ہم آسمان کو تحریرات کے مُٹھے کی طرح لپیٹتے ہیں، جیسے ہم نے پہلی پیدائش کو شروع کیا۔ اسی طرح اس کو دہراتے رہتے ہیں۔

نیبولے اس طرح چکر کھاتے ہیں۔ جس طرح تحریروں کے مُٹھے کو لپیٹا جاتا ہے۔ اس مُٹھے کا مرکز نکلس NUCLEUS کہلاتا ہے جو انقباض کی وجہ سے مجتمع ہوتا ہے اور کاغذوں کے سرے کھلے اور ڈھیلے ہوتے ہیں۔ درمیانی مجتمع حصہ سورج بنتا ہے اور باقی حصے قوتِ مدافعت سے مناسب فاصلوں پر پھینکے جاتے ہیں، جو سیارے اور چاند بن جاتے ہیں۔ اس طرح ایک نظامِ شمسی تیار ہو جاتا ہے۔ پھر سیاروں کے پوست سرد ہونے پہ ان میں جماد، نبات اور حیوان کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی طرح نیبولے کے نئے نئے سمندروں سے نئی دنیائیں بنتی رہتی ہیں۔ ہماری زمین پر بھی یہ چار دور گزر چکے ہیں۔

۱۔ پہلے وہ عظیم نیبولے کا ایک جزوِ صغیر تھی۔

۲۔ پھر پگھلے ہوئے مادے کی صورت میں آگئی۔

۳۔ اس کے بعد منجمد ہو کر آتشیں کرہ بنی۔

---

[1] نیبولا: NEBULA) اہلِ علم کی تا حال رسائی کے مطابق) کراتِ سماوی کی ابتدائی تخلیقی حالت کا نام ہے۔

۴۔ آخر میں اس کرۂ آتشیں کا پوست سرد ہوا اور آبادی کے قابل بنا۔

فِي اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔ (حم۔ ۱۰)
یہ سب کچھ چار ادوار (زمانوں) میں درست ہوا، ضرورتمندوں کے لیے۔

جب زمین سورج سے جدا ہوئی تو اس کا سماوی اور ارضی مادہ دونوں ملے جلے ہوئے، لیکن منتشر حالت میں تھے۔

کَانَتَا رَتْقًا (انبیاء۔ ۳۰)
(زمین و آسمان) دونوں باہم ملے جلے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین کے کثیف مادے کو الگ کر کے وسط کی طرف سکیڑنا شروع کیا اور اس طرح اُسے آبادی کے لائق بنایا۔

فَفَتَقْنٰهُمَا: (ایضاً)
پھر ہم نے ان دونوں (زمین و آسمان) کو الگ کر دیا۔

اس وقت زمین کا متعلقہ اثیر (ایتھر) اس کے اطراف میں "دخان" کی صورت میں تھا۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ۔ (حم۔ ۱۱)
پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان (زمین سے متعلقہ ایتھر) کی طرف توجہ فرمائی اور وہ دُخانی حالت میں تھا۔

پھر اُس دُخان کو جس میں سات قسم کے ایتھر غیر مرتب حالت میں تھے، زمین کی ضرورت کے مطابق ترتیب دے کر سبع سماوات بنا دیا اور ہر سماء میں اس کے مناسب حال وحی فرمائی۔ یہ ترتیب اور "وحی امر" دو زمانوں میں انجام پائی۔

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (حم۔ ۱۲)
پھر انہیں سات آسمان بنا دیا۔ دو دنوں (یا زمانوں) میں اور ہر آسمان میں اس کا "امر" وحی کیا۔

دوسری جگہ اس کی تفسیر و غایت بتائی۔

يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (الطلاق۔ ۱۲)
امرِ الٰہی نازل ہوتا ہے، زمین اور سات آسمانوں میں تاکہ تم جانو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔

خواجہ صاحب نے ان تمام آیات کے ضمن میں جو سماء یا سماوات کی مختلف حالتوں کو واضح کرتی ہیں۔ ایسے ہی علمی انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض قارئین کو آیات کی یہ تفسیر و تعبیر انوکھی معلوم ہو کیوں کہ قدیم تفسیریں ایک ہی بنائی راہ پر چل رہی ہیں، جو پہلے سے مسلّم سمجھی جا چکی تھی اور ظاہر ہے کہ وہ راہ اُس زمانے کے غیر قرآنی معلومات کی بنا پر تسلیم کی گئی تھی اور قرآن کسی ایک خاص زمانے کی کتاب نہیں ہے۔ ہر دور کا مفسر اپنے دور سے آگے نہیں جا سکتا، لیکن قرآن حکیم کو لا انتہا بلندیوں پر پہنچنے اور پہنچانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ خواجہ صاحب آج (۱۹۶۸ء) سے تقریباً ۸۰ برس پہلے جن نتائج پر اپنی فکرِ رسا اور وسعتِ مطالعہ کی بنا پر پہنچے تھے۔ جدید زمین ماہرین علوم اور محققین قرآن بھی قریب قریب وہی باتیں کہہ رہے ہیں۔

چنانچہ "التفسیر العلمی للآیات الکونیۃ فی القرآن" کے نام سے مبسوط کتاب مولفہ حنفی احمد، دار المعارف مصر سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی ہے

جس میں فلکیات قدیمہ و جدیدہ کی روشنی میں ان مباحث پر سیر حاصل تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ مؤلف کی گہری نظر قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ علم ہیئت کی جدید تحقیقات پر بھی ہے۔ اس اہم موضوع پر انہوں نے قریب قریب وہی کچھ لکھا ہے، جو خواجہ صاحب بہت پہلے لکھ چکے ہیں۔ آیہ "دخان" ـــــ "رتق و فتق" ـــــ "ستۃ ایام" وغیرہ مباحث میں دونوں بزرگ ہم نوا ہیں۔ البتہ "سبع سماوات" کی توجیہ میں خواجہ صاحب منفرد ہیں۔ لیکن وہ جو کچھ کہتے ہیں، اس پر یقین کی حد تک مطمئن ہیں۔ احمد حنفی صاحب اس ضمن میں کسی بھی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے ـــــ "نشوء السماوات" کے ذیلی عنوان سے وہ لکھتے ہیں۔

عن المادۃ الکونیہ الاولی ـــــ کانت السماء قبل خلقھا مثل الدخان والتخصیص فی التشبیہ بالدخان لیشیر اشارۃ قویۃ دقیقۃ الی ان مادۃ السماء الاولی کانت تشبہ الدخان العادی فی اھم صفاتہ فکانت مفککۃ الاجزاء مظلمۃ، وخفیفۃ منتشرۃ فی الفضاء کالغاز او السحاب المنتشر، وساخنۃ الی حد ما وتحوی دقائق انواع المادۃ الثلاث۔ ص ۳۲۳

کائنات کا ابتدائی مادہ ـــــ آسمان اپنی تخلیق سے قبل دھوئیں کی مانند تھا۔ دھوئیں سے جو خاص طور پر تشبیہ دی گئی ہے اس میں اس بات کی طرف نہایت اہم اور دقیق اشارہ ہے کہ آسمان کی ابتدائی حالت اپنی مخصوص صفات میں دھوئیں سے مشابہ تھی۔ یعنی اس کے اجزا بکھرے ہوئے (غیر منجمد) سیاہ و تاریک، نہایت سبک، فضا میں گیس کی طرح یا بکھرے ہوئے بادل کی طرح پھیل رہے تھے۔ اور اس میں انتہائی حرارت تھی۔ اور اس میں مادے کی تینوں قسمیں (یعنی ھباء، بخار اور ہوا) شامل تھیں۔

مصنف نے ان تینوں اقسام مادہ کی شرح میں لکھا ہے، الھباء دقائق صلبۃ۔ والبخار دقائق سائلۃ والھواء دقائق غازیۃ۔ یعنی ارضی قسم کے ذرے مثل غبار۔ سیال ذرے جیسے بھاپ۔ گیس کی قسم کے ذرے جیسے دھواں ـــــ اس فن سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ قرآن کے لیے یہ کتاب علم افزا ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب "توفیق الرحمٰن للتوفیق بین ما قال علماء الھیئۃ وبین ما جاء فی الاحادیث الصحیحۃ وآیات القرآن" مصنفہ مفتی مصر شیخ محمد نجیت زیادہ مفصل اور قابل مطالعہ ہے۔

بے مثل کتاب

کفار کا دعویٰ تھا کہ اگر ہم چاہیں تو ایسی کتاب بنا سکتے ہیں۔ لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (انفال ۳۱) تاریخ شاہد ہے کہ وہ اپنی قابلِ فخر فصاحت و بلاغت کے باوجود ایسا نہ کر سکے۔ انہوں نے اسلام کے مقابلے میں کیا نہیں کیا؟

۱۔ اعتراضات کے طوفان اٹھائے۔

۲۔ سخت مخالفانہ پروپیگنڈا کیا۔

۳۔ مسلمانوں کو فرداً فرداً ناقابلِ برداشت اذیتیں پہنچائیں۔ تاریخ میں جن کی مثال نہیں ملتی۔

۴۔ سخت لڑائیاں لڑیں ــــ الغرض اس ربانی تحریک کو ختم کرنے کے لیے سب کچھ کیا۔ لیکن وہ کام نہ کیا جو ان کے لیے بالکل آسان تھا، یعنی، قرآن کے مقابلے میں ایک صفحہ بھی اپنی یادگار کے طور پر بنا کر دنیا میں نہ چھوڑ گئے۔ بلکہ اس کے برعکس جنگوں اور مقابلوں کے بعد بچ رہنے والے سب کے سب قرآن کے حضور سربسجود ہو گئے، جو نسلاً بعد نسلٍ آج تک اس کی بے مثلیت کا اعتراف کرتے چلے آرہے ہیں۔ فصاحت، بلاغت اور لغت کے امام اور مصنف مسلم ہوں یا غیر مسلم اپنے فن کے متعلق کسی اختلافی مسئلے میں متفقہ طور پر قرآن ہی کی سند پیش کرتے ہیں قرآن کو حکم مانتے ہیں۔ یہ مرتبہ قرآن حکیم کے سوا کسی مدعی وحی کتاب کو آج تک حاصل نہیں ہو سکا۔ ماضی قریب میں جن لوگوں نے وحی کے دعوے کئے ہیں۔ ان کی وحی کو آج تک کسی نحوی، لغوی یا ماہر لسانیات نے پوچھا بھی ہے؟ بلکہ ایسی جرأت ان کے مرید بھی نہیں کر سکے۔

"من مثلہ" کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔

مِنْ مِّثْلِهٖ

۱۔ اس بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے کسی اور بندے سے ایک ہی سورت بنوا لاؤ۔

۲۔ اس قرآن کی کوئی مثل نہیں، بلکہ بعض مثل (مِن "تبعیضی ہے) یا اس کی تمام مثلوں میں سے جو تصور میں آسکتی ہیں۔ کسی مثل سے ایک سورۃ لے آؤ اس کی طرح انقلاب انگیز اور جامعہ بشریہ کو ہیمانہ پستی سے ملکوتی بلندیوں پر پہنچا دینے والی ہو۔

"اُعِدَّت للکافرین" کی شرح

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ ۔ (البقرہ ۲۴)

اس آگ سے ڈرو، جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں ۔ وہ کافروں کے لیے تیار کی جا چکی ہے ۔

جزا و عمل کا قدرتی تعلق

انسان جس طرح جسمانی قویٰ و اعضا کے عمل سے کام لے کر اپنی ضروریات کا انتظام کرتا ہے ۔ اسی طرح باطنی قویٰ کی حرکت و عمل کی مدد سے باطنی اشیاء (علوم، عقائد، اخلاق وغیرہ) تیار ہوتی ہیں ۔ لہٰذا کفر سے جہنم اور ایمان و تقویٰ سے جنت کی تیاری عین مطابق فطرت ہے ۔ ہر انسان کے فعل کے دو اثر ہوتے ہیں ۔

۱۔ داخلی، جس سے اس کا باطن متاثر ہوتا ہے ۔

۲۔ خارجی، جس سے اس کا ماحول اثر پذیر ہوتا ہے ۔

داخلی اثر سے اندر ہی اندر ایک مرتب کتاب سی تیار ہوتی رہتی ہے ۔ اس کا ظہور عالم جزا میں ہوتا ہے اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے ۔

کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ (المجادلہ ۲۲)

اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ۔

وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا (بنی اسرائیل ۱۳، ۱۴)

ہم انسان کے لیے اس کی جزا کے دن ایک کتاب نکالتے ہیں جسے وہ کھلا ہوا پاتا ہے (حکم ہوتا ہے) اپنی کتاب پڑھ ۔ آج تو خود ہی اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہے ۔

خارجی عالم میں بھی انسانی فعل، نیت، عقیدہ اور خیال کا اثر قائم رہتا ہے ۔ اس سے علیین اور سجین کے دفتر تیار ہوتے ہیں ۔

اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ ۝ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّیْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ (تطفیف ۷، ۸، ۹)

بدکاروں کی کتاب (اعمال) سجین (زندان) میں ہے، تجھ کو معلوم ہے کہ سجین کیا ہے! وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے ۔

اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ ۝ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّیُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ (تطفیف ۱۸، ۱۹، ۲۰)

نیکوں کی کتاب (اعمال) علیین (بلند مقامات) میں ہے ۔ تجھے کیا معلوم ۔ علیون کی حقیقت کیا ہے! وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے ۔

ان دونوں داخلی اور خارجی اثرات کے ملنے سے جہنم اور جنت کا ظہور ہوتا ہے ۔ زیر عنوان آیت " اعدت للکافرین " کا یہی مطلب ہے ۔ مزید تائید کے لیے آیات ذیل دیکھیے ۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا

جو شخص کافر ہوا، وہ اپنے کفر کی سزا پائے گا ۔ اور نیکوکار

فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ (روم - ۴۴) — لوگ اپنی ہی آسائش کی تیاری کر رہے ہیں۔

وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (کہف ۴۹) — انہوں نے جو عمل کیے۔ انہیں اپنے سامنے موجود پایا

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ (آل عمران ۳۰) — جس دن ہر شخص اپنے اچھے اور برے اعمال کو اپنے سامنے حاضر پاتا ہے۔

ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ (الذاریات - ۱۴) — اپنے فتنہ (وشرارت) کے مزے کو چکھو۔

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (مریم ۵۹) — قریب ہی وہ اپنی گمراہی کو پالیتے ہیں۔

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا (الدہر ۶) — چشمہ جس سے اللہ کے نیک بندے پیتے ہیں۔ وہ خود ہی اسے چیر کر بہا نکالتے ہیں۔

قَوَارِيْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا (الدہر-۱۶) — شیشے کی طرح شفاف چاندی کے برتنوں کو انہوں نے خود ہی اندازے سے بنایا ہے:

ایسی ہی بہت سی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی اعمال کے معانی آخرت میں متشکل و مجسم ہو کر[1] نعمتیں یا عقوبتیں بن جاتے ہیں۔ دوزخیوں کے لیے لوہے کے گرز دنیوی لوہار نہیں بناتے۔ اہل جنت کے بلند تخت، درخشاں کٹورے، صف بستہ تکیے اور بچھے ہوئے غالیچے بنانے کے لیے کسی بڑھئی، کمہار، درزی اور قالین باف کی حاجت نہیں۔ نظام قدرت خود ہی تمام اشیا کو بندوں کے اعمال کی مطابقت سے تیار کر دیتا ہے۔ اہل جنت اپنے اعمال کے پھل کو پہچان کر کہتے ہیں۔

هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (البقرہ ۲۵) — یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے دیا گیا تھا۔ دراصل وہ پھل انہیں (ان کے عمل سے) ملتا جلتا ہی دیا جاتا ہے۔

---

[1] علامہ اقبال کی تحقیق بھی یہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

آں جہانے کہ درو کاشتہ را می دروند — نور و نارش ہمہ از سبحہ و زنارِ من است

"جاوید نامہ" میں مزید وضاحت کرتے ہیں۔

گفت رومی اے گرفتارِ قیاس — درگزر از اعتبارات حواس

ایں کہ بینی قصر ہائے رنگ رنگ — اصلش از اعمال و نے از خشت و سنگ

آں چہ خوانی کوثر و غلمان و حور — جلوۂ ایں عالم جذب و سرور

افلاک کی سیر میں پیر رومؒ علامہ کی رہنمائی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ یہ جو تم بہشت میں عالی شان قصر و ایوان دیکھ رہے ہو یہ اینٹ پتھر سے نہیں بنے۔ یہ انسانوں کے دنیوی اعمال ہی ہیں جو یہاں جنت کی نعمتیں بن گئے ہیں۔ علامہ کا ایک شعر اور ملاحظہ فرمائیے۔

عاشق آنست کہ تعمیر کند عالم خویش — درنسازد بجہانے کہ کرانے دارد

بلا تاخیر جزا و سزا

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔

(البقرہ - ۲۸)

تم اللہ تعالیٰ کا انکار کس طرح کرتے ہو؟ حالاں کہ تم بے جان تھے۔ پھر تمہیں زندہ کیا۔ پھر تم کو اللہ تعالیٰ ماردیتا ہے۔ پھر تمہیں (دوبارہ) زندہ کرتا ہے۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہو۔

ظاہر ہے کہ تمام آدمی بیک وقت پیدا نہیں ہوجاتے اور نہ بیک وقت مر ہی جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری بھی ولادت و وفات کی طرح الگ الگ اپنے وقت پر ہوتی ہے۔ طوفانوں، وباؤں، زلزلوں اور بڑی بڑی جنگوں میں ہلاک ہونے والے اپنی اپنی موت کے ساتھ ہی عالم جزا میں پہنچ جاتے ہیں۔ قیامت کبریٰ یعنی نوع انسان کے خاتمے پر زمین و آسمان کے موجودہ نظام کے بدلنے، پہاڑوں کے اڑنے اور دوسرے بڑے بڑے حوادث و صدمات کے باعث لوگ بیک وقت ہلاک ہوجائیں گے اور موت کے بعد ایک ایک ہوکر جائیں گے۔ ایسا نہیں ہوگا کہ پہلے کے تمام مرے ہوؤں کو پھر سے زندہ کرکے دوبارہ ہلاکت کے گھاٹ اتارا جائے۔ یہ جو فرمایا ہے کہ

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا۔

(حج - ۲)

اس دن تم دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی بدحواس ہو کر اپنے شیرخوار بچے کو چھوڑ دے گی اور ہر حاملہ اپنا حمل ڈال دے گی۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ پہلے انسان سے لے کر قیامت کے دن تک جتنی حاملہ اور مرضعہ ہوں گی، ان سب کو زندہ کر کے اس بدحواسی اور ہول ناکی کی حالت میں لاکر ہلاک کیا جائے گا بلکہ ہر مرنے والے کی قیامت اس کی موت سے شروع ہوجاتی ہے۔ اسے بڑی قیامت کے انتظار میں طویل ترین برزخ یا قبر میں زندہ نہیں رکھا جاتا۔

شہید اور ان سے بلند مرتبہ لوگ (صدیق و نبی) موت کے بالکل متصل ہی دوسری پاکیزہ زندگی سے ہمکنار ہوجاتے ہیں، لیکن گنہگار جن کی توجہ مادیات میں غرق ہوتی ہے، دنیا سے منقطع ہونے سے دکھ پاتے ہیں۔ بے ہوش مریض کی طرح کراہتے ہیں، جیسے ڈوبنے والا بچ جانے کے خیال سے جھاگ[۱] پر ہاتھ مارتا ہے۔ اس طرح وہ جسم و جسمانیات کی طرف جھکتے ہیں، لیکن اس سے کچھ

---

۱ سبحان اللہ کیسی حقیقت افروز تشبیہ ہے۔ اس وقت آخرت کے مقابلے میں دنیا کے تمام ساز و سامان، سہارے اور آسرے عظمتیں اور وجاہتیں جھاگ کی طرح بے حقیقت ہوجائیں گی یہی ان کی اصلیت ہے۔

حاصل نہیں ہوتا۔ اس نیچے دروں نیمے بروں حالت کا نام برزخ ہے۔ پھر مناسب وقت پر انہیں برزخی حالت سے نکال کر پوری طرح سپرد آخرت کر دیا جاتا ہے[1]

مکڑی، پتنگا اور ریشم کا کیڑا مختلف مراحل سے گزرتے ہیں۔ پہلے کیڑا انڈے میں تکمیل پاتا ہے۔ پھر اس سے باہر نکل آتا ہے۔ بعد میں اس کو انڈے (قشر) کی ضرورت نہیں رہتی۔ پھر وہ اپنے جسم سے کئی پوست اتارتا ہے۔ آخر میں اس کے گرد ایک غلاف سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اب وہ بے حس و حرکت ہو کر اسی محفوظ مقام میں پڑا رہتا ہے۔ آخر میں اس غلاف سے پردار ہو کر نکلتا ہے۔ حالات کی تبدیلی سے اس کی شخصیت نہیں بدلتی —— اسی پر اُخروی منزل کا قیاس کر لیجئے۔ مرنے کے بعد انسان ظاہری کثیف جسم کو بالکل چھوڑ دیتا ہے، لیکن اس کی شخصیت غیر مرئی حالت میں ضرور موجود رہتی ہے۔

انسان نطفہ اور علقہ سے شروع ہو کر، موت تک کئی تبدیلیوں سے گزرتا ہے اور موت کے وقت اپنے ساتھ ایک لطیف غیر مرئی جسم لے کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ کفار کا یہ غیر مرئی جسم برزخی حالت میں خستہ و شکستہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی پور پور درست کر کے انہیں پورے عذاب میں داخل کر دیتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۔ (القیامۃ ۴) ہاں، ہم اس کی پور پور درست کرنے پر قادر ہیں۔

موت کے بعد

موت کے ساتھ ہی ہر شخص کی الگ الگ دربارِ جزا میں حاضری اور جسم لطیف کے ساتھ دوزخ بہشت میں داخلہ آیات ذیل سے صراحتہً ثابت ہوتا ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْ

اور اگر تو دیکھتا! جب ظالم موت کی بے ہوشیوں میں ہوتے ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلا کر کہتے ہیں کہ اپنی جانوں کو نکالو۔[2] آج تمہیں اللہ تعالیٰ کے متعلق ناحق گوئی اور آیات الٰہی سے تکبر کے سبب عذاب ذلت کی سزا دی جاتی ہے (تو تو سخت ہولناک منظر دیکھتا) اور اللہ تعالیٰ اس وقت فرماتا ہے) تم ہمارے پاس (مرنے کے ساتھ ہی) تنہا تنہا آ گئے ہو۔ ٹھیک اسی طرح، جیسے ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ تنہا تنہا ہی پیدا

---

[1] برزخ کی مدت ہر شخص کی دنیوی رغبت و عشق کے مطابق کم بیش ہوتی ہے۔ چونکہ شہید و صدیق و نبی کو ادھر قطعاً رغبت نہیں رہتی، پورا عشق اُدھر ہی کا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے لیے برزخ کا ایک لمحہ بھی نہیں ہوتا۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم　　　چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست (اقبال)

[2] ہمارے ہاتھوں سے نکالو یا اپنے جسموں سے نکالو اپنی جانوں کو جنہیں تم طرح طرح کے حیلوں سے بچاتے پھرتے تھے۔

كُمْ ۚ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ ۚ لَقَد تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ۔

(انعام ۹۴، ۹۵)

کیا تھا۔ اور جو نعمتیں ہم نے تمہیں دی تھیں، تم انہیں اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے سفارشی بھی نہیں دیکھتے۔ جن کے متعلق تمہارا گمان تھا کہ وہ تمہیں بچانے میں ہمارے شریک کار ہیں۔ یقیناً تمہارے باہمی تعلقات کٹ گئے اور تمہارے خیالی دعوے سب کے سب باطل ثابت ہوئے۔

إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ ۝ وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ ۝ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَٰكِن لَّا تُبْصِرُونَ ۝ فَلَوْلَا إِن كُنتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ۝ تَرْجِعُونَهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَأَمَّا إِن كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ ۝ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ ۝ وَأَمَّا إِن كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۝ فَسَلَامٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۝ وَأَمَّا إِن كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ ۝ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ ۝ وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ ۝ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۔

(الواقعہ ۸۳ تا ۹۶)

جب (مرنے والے کا نسمہ) گلے میں پہنچتا ہے اور تم لوگ (تیماردار) اس وقت (پاس بیٹھے) دیکھ رہے ہوتے ہو۔ ہم تمہاری نسبت اس سے قریب تر ہوتے ہیں، لیکن تم (ہمیں) نہیں دیکھتے۔ اگر تم سچے ہو کہ تم کسی کے ماتحت نہیں، تو اس (نسمہ کو) واپس کیوں نہیں کر لیتے؟ پھر اگر وہ (مرنے والا) مقربوں سے ہوتا ہے تو آسائش، خوشبو، اور نعمت کا باغ پاتا ہے۔ اور اگر وہ برکت والوں سے ہے تو اسے کہا جاتا ہے، تیرے لیے برکت والوں کی طرف سے سلام (و مسرت) اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہوں سے ہوتا ہے۔ تو اس کے لیے کھولتے پانی کی مہمانی اور جہنم میں جلنا ہوتا ہے یہ بات حق الیقین تک پہنچی ہوئی صداقت ہے سو تو اپنے عظمت والے رب کی پاکیزگی بیان کر (سبحان ربی العظیم)

نکتہ ان آیات میں نسمے کے لیے مونث اور اصل انسان کے لیے مذکر ضمیریں لائی گئی ہیں۔ جس سے نسمے کی صراحت و وضاحت معلوم ہو رہی ہے۔

كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝ وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۝ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ۔

(القیامۃ ۲۶ تا ۳۰)

جب (نسمہ یا جان) گلے تک پہنچ جاتی ہے اور کہا جاتا ہے۔ کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا (معارج)؟۔ اور وہ (مرنے والا) گمان کرتا ہے کہ اب جدائی ہے، اور پنڈلی کے ساتھ پنڈلی لپٹتی ہے، تیرے رب تعالیٰ کی طرف اس دن روانگی ہے۔

وَقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝

(التحریم - ۱۰)

(نوحؑ و لوطؑ کی خائنہ بیویوں کو) کہا گیا کہ تم دونوں آگ میں داخل ہو جاؤ داخل ہونے والوں کے ساتھ۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۔

(نوح - ۲۵)

(منکرین نوحؑ) اپنی بعض خطاکاریوں کے بدلے غرق کئے گئے۔ پھر آگ میں داخل کر دیئے گئے سو انہوں نے اللہ کے سوا کوئی مددگار نہ پائے۔

دیکھئے ان آیات میں ماضی کے صیغے لائے گئے ہیں۔ مترجمین و مفسرین یہاں ماضویت کا انکار نہیں کر سکے۔ ان کو برزخ کا سہارا لینا پڑا ہے۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْۗءَ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْۗءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۔

(النحل ۲۸ تا ۲۹)

(دنیوی عذاب و ہلاکت کے بعد) پھر قیامت کے دن اللہ انہیں رسوا کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ "میرے وہ شریک کہاں ہیں، جن کے سبب تم آپس میں لڑا کرتے تھے؟ اہل علم نے کہا۔ "آج کی رسوائی اور خرابی کافروں پر ہے جنہیں فرشتے ایسی حالت میں فوت کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہوتے ہیں۔ پھر وہ انکار یہ کہتے ہوئے صلح چاہتے ہیں۔ کہ ہم کوئی بدی نہیں کرتے تھے" ـــــ کیوں نہیں اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں۔ جو تم کرتے تھے سو تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ (تم یہیں رہوگے۔ متکبروں کا ٹھکانا بہت بُرا ہے۔

كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

(النحل - ۳۱، ۳۲)

اسی طرح اللہ تعالیٰ متقیوں کو جزا دیتا ہے، جنہیں فرشتے اس حال میں فوت کرتے ہیں کہ وہ نیک ہوتے ہیں کہتے ہیں، تم پر سلامتی ہو، جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس کے عوض میں جو تم (نیک کام کرتے تھے)

سورہ یٰسین میں ایک شہید توحید کا ذکر آتا ہے۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۙ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۝ اِنْ كَانَتْ اِلَّا

اسے کہا گیا "جنت میں داخل ہو جا" اس نے کہا "اے کاش! میری قوم جانتی، میرے رب نے مجھ پر جو بخشش فرمائی اور مجھے عزت والوں سے بنایا" پھر ہم نے اس کے بعد آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری اور نہ ہم کبھی اتارتے ہیں۔ صرف

صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ - (یٰسٓ ۔ ۲۶ تا ۲۹) اک دھماکا ہوا، سو وہ ناگہاں بجھ کر رہ گئے۔

یعنی وہ جنت میں اسی وقت پہنچ گیا اور عزت پا گیا۔ قیامت کبریٰ کا منتظر نہ رہا۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ۝ ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ ۝

(انعام ۶۱، ۶۲)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم پہ پہرے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے اس کو فوت کرتے ہیں اور وہ اس میں کوئی کمی نہیں کرتے پھر وہ اپنے سچے مولا، اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، سن رکھو! حکم اسی کا ہے اور وہ جلد حساب لینے والا ہے۔

ایسی ہی اور بہت سی آیات ہیں، جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ موت کے بعد جزا و سزا میں تاخیر نہیں ہوتی اور قیامت کبریٰ کا طویل ترین انتظار نہیں کیا جاتا۔ ہر شخص جلدی ہی اپنے اعمال کے نتائج سے جا ملتا ہے۔

جنّ "الناس" میں داخل ہیں

اہل لغت کے نزدیک "ناس" میں جن وانس دونوں داخل ہیں، عرب کہتے ہیں، رأیت ناساً من الجن " یعنی میں نے جنوں میں سے ناس (لوگ) دیکھے۔ پس جس وجود پر "رأیت" (میں نے دیکھا) بولا جاسکتا ہے اس کو غیر مرئی مخلوق کیسے کہا جاسکتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے "رجال من الجن" (جن سے مرد) جس کے معنی "جنّ مرد" ہیں۔ "رجل" یا مرد غیر مرئی مخلوق کو نہیں کہتے۔۔۔۔ کفار رسول کے ساتھ فرشتے کے نزول کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کے جواب میں فرمایا۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (الانعام - ۹)

اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے کسی فرشتے کو تو اسے بھی مرد ہی بناتے اور یوں ان لوگوں کو اسی اشتباہ میں ڈال دیتے، جس میں اب مبتلا ہیں۔

قرآن فرماتا ہے کہ "ناس" مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ۔ (حج ۰۰)

اے لوگو! اگر تمہیں (دوبارہ) جی اٹھنے میں شک ہے تو (سوچو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے۔

اس بنا پر اگر جن[1] رجال اور ناس میں داخل ہیں تو وہ بھی مٹی کی پیدائش ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان صرف مٹی سے نہیں بنا۔

خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا (الفرقان ۵۴)

بشر کو پانی سے پیدا کیا۔

پھر اس میں ناریت یا شعلہ مزاجی بھی شامل ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ۔ (انبیا ۳۷)

انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے۔

"جنن" کے معنی ہیں چھپانا، اندھیرا، مٹی میں ملانا۔ "جانّ" کے معنی ہوئے اندھیرا کرنے والا، مٹی میں ملانے والا، متکبر لوگ جو امن سے نہیں رہ سکتے، دوسروں پر دباؤ ڈال کر انہیں زیر کرنا اور غلام بنانا چاہتے ہیں، جن ہیں۔ جن کا لفظ وصفی معنی میں بھی آتا ہے۔

---

[1] الرجل: من یمشی علی رجلیہ، الرجلۃ، مونث الرجل۔ کالمرء والمرأۃ (المنجد) رجل یعنی مرد جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور رجلہ مونث ہے رجل کی جیسے مرء (مرد) مذکر ہے اور مرأۃ مونث ہے۔ قرآن میں رجل یا رجال نساء کے مقابل آیا ہے الرجال قوامون علی النساء (مرد عورتوں پر محافظ و نگران ہیں (نساء ۳۴)

[2] جراح، معظم اللغات، متن اللغۃ وغیرہ کتب میں جن کے مشہور معانی کے ساتھ ساتھ ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جن الرجل جنونا، دیوانہ شد جنان الناس، جماعۃ مردم، جنّ الناس وجنا نہم معظمہم، جنّ الناس لوگوں میں بڑا آدمی، لوگوں کا گروہ۔

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ ۗ (الکہف ۵۱) — وہ جنوں (کافروں، سرکشوں، متکبروں) میں سے تھا۔ اس لیے اپنے رب کے حکم سے نکل گیا۔

اس معنی کی تائید آیۂ ذیل سے ہوتی ہے :

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۔ (البقرہ ۳۵) — ابلیس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں سے تھا۔

ہر رسول کے زمانے میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ متکبر اور کم زور

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا (الاعراف ۷۵) — حضرت صالح کی قوم کے متکبروں نے کمزوروں سے کہا ......

مطلب یہ ہے کہ استبداد پسند، جاہ طلب لیڈر، اور نذریں وصول کرنے والے پیر، گرو اور کاہن؛ انسانی جن ہیں ان میں سے بہت سے غیب دانی اور کرامات کے دعوے کرتے ہیں، یہ لوگ نہیں چاہتے کہ لوگ ان کی غلامی سے نجات پائیں۔ ان میں ناریت اور تعلی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

یہ قطعی ہے کہ کوئی رسول غیر جنس (بلکہ غیر بولی بولنے والی قوم) کی طرف رسول بن کر نہیں آسکتا۔ اگر زمین میں عافیت کی طرف سے بے خوف اور مطمئن ہو کر فرشتے بس رہے ہوتے تو ان کی طرف فرشتہ ہی رسول آتا۔

لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا ۔ (بنی اسرائیل ۹۵) — اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے تو ضرور ہم آسمان سے فرشتہ رسول بنا کر بھیجتے۔

لیکن اب، جب کہ انسان کو زمین کی خلافت سونپی گئی ہے تو انسانوں (الناس) کے لیے رسول بھی انسانوں (الناس) ہی سے ہونا چاہیئے۔

لہٰذا وہ جن جو قرآن مجید کو سن کر ایمان لائے اور وہ جن جو حضرت سلیمان کے وقت معماری اور غواصی کی خدمت انجام دیتے تھے اور زنجیروں میں جکڑ کر رکھے جاتے تھے؛ سب کے سب "الناس"، یعنی انسانوں میں داخل تھے۔ کسی غیر مرئی ہوائی یا ناری مخلوق کو لوہے کی مادی و مرئی زنجیروں میں نہیں جکڑا جا سکتا[1]

"ریب" کی حقیقت

ریب بے چینی پیدا کرنے والی بات کو کہتے ہیں۔ تفسیر مدارک میں "ریب" کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

---

[1] مزید تشریح "حقیقت جن" کے عنوان کے تحت دیکھیئے۔

"ریب کے معنی قلقِ نفس اور انتفائے طمانینہ (بے چینی) ہیں "قرآن پاک قلبِ سلیم کے لیے بالکل "لاریب فیہ" ہے۔ خالی الذہن[1] اور صحیح الفطرت انسان اس میں کہیں ریب نہیں پاتا۔ قلبِ مریض اور عادات و جذبات سے متاثر فطرت کو اس میں ریب دکھائی دینا ممکن ہے ایسی حالت کا علاج بھی قرآن میں موجود ہے، جس سے آخر کار قرآن مجید کا "لاریب فیہ" ہونا ضرور ہی ثابت ہو جاتا ہے۔

مر کر جی اٹھنے کے متعلق بھی "لاریب فیہ" کہا گیا ہے۔

يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ (الجاثیہ - ۲۶) — (اللہ تعالیٰ) تمہیں روز قیامت کی طرف جمع کرتا ہے۔

إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا (الجاثیہ - ۳۲) — اللہ تعالیٰ کا وعدہ برحق ہے قیامت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

انسان کی ترجیح ملائکہ پر

مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے اور ان کی شفاعت پر نازاں تھے۔ مجوس اہرمن (ابلیس) کو دکھ اور بدی کا دیوتا قرار دیتے اور اس کی پوجا کرتے تھے۔ اہل کتاب بزرگ انسانوں کو نجات دہندہ اور شفیع مانتے تھے اور ان کو مخلوقات سے ارفع، خدا کے فرزند یا الوہیت میں داخل سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بقرہ کے چوتھے رکوع میں آدم، ملائکہ اور ابلیس کے بیان میں ایسے باطل خیالات کی تصحیح فرمائی ہے اور انسان کی لغزش کے بعد اس کی اصلاح و نجات کو اپنی ہی ہدایت پر منحصر فرمایا ہے۔

فرشتوں کے متعلق ارشاد ہے۔

۱۔ فرشتے خلافت ارضی کی اہلیت نہیں رکھتے۔ یہ شرف صرف انسان کو بخشا ہے۔ (انی جاعل فی الارض خلیفہ)

۲۔ فرشتوں کا علم محدود و متعین ہے۔ اس میں ترقی کی گنجائش نہیں (لا علم لنا الا ما علمتنا) انسان میں لامحدود استعداد رکھ دی گئی ہے (علم آدم الاسماء کلھا)

۳۔ فرشتے انسان کے خادم و ساجد بنائے گئے ہیں۔

---

[1] بقول اقبال؎   سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک،

کچھ شیطان کے متعلق

شیطان | شیطان کے بجاری آگاہ ہو جائیں کہ

۱۔ شیطان تمہارا دشمن ہے۔ کبر و کفر کا دیوتا ہے۔ منشاء ربانی یہ ہے کہ تم اسے اپنا مطیع و ساجد بناؤ۔ اس کے سامنے جھکنے سے انکار کردو۔

۲۔ اس نے تمہیں اطمینان کی جنت سے نکلوایا اور تمہارے جذبات و سوآت (پوشیدہ برائیوں) کو اُبھارا۔

کچھ انسان کے متعلق

انسان کے پجاری غور فرمائیں کہ :۔

انسان کتنا ضعیف ہے۔

۱۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلافت و شرافت سے نوازا اور جنتی حالت میں رکھا، لیکن وہ حقِ نعمت ادا کرنے کی بجائے اس اعلیٰ حالت سے گر گیا۔

۲ انسان میں عداوت کا مرض پیدا ہوا (بعضکم لبعض عدو)

لہٰذا فرشتہ، شیطان اور انسان تینوں ہی معبود نہیں ہو سکتے۔

ابلیس و شیطان میں فرق

ابلیس و شیطان ایک ہی ذات کے دو مختلف پہلو ہیں :۔

۱۔ اس کے گمراہ کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ قزاقوں کی طرح اپنے شکار کو مرعوب کرتا ہے یہ ہے ابلیسیت۔

۲۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ خوشنما رنگ میں سبز باغ دکھلاتا اور عجیب و غریب امیدیں دلاتا ہے یہ ہے شیطنت۔

چشم بصیرت کھلی ہو، تو اپنے نفس میں اور دوسرے لوگوں میں بھی شیطانی حرکات اور ابلیسی حیلے دکھائی دینے لگتے ہیں۔

اس کے مقابلے کے لیے اللہ کی پناہ میں آجانا چاہیئے۔

رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۙ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝

(المؤمنون ۹۸،۹۷)

اے میرے رب! میں شیطانوں کے وسوسوں سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اور آپ کی پناہ میں رہوں تو وہ میرے قریب نہ آنے پائیں۔

آدم کی جنّت اور خلافت

حضرت آدمؑ زمین ہی میں خلیفہ بنائے گئے، قلبی اطمینان اور فطری ہدایت کی جنت میں رکھے گئے۔ اس جنت میں کبھی روزی تنگ نہیں ہوتی۔ ھبوطِ آدم سے مراد اعلیٰ حالت سے گر کر ادنیٰ حالت میں آجانا ہے۔ کشاف میں ہے "زل عن مرتبتہ .... من النعیم والکرامۃ نعمت، بزرگی اور مرتبے سے گزر جانا صـ۲۱۱ مطبوعہ مصر ۱۹۴۸ء۔

شجرۂ ممنوعہ سے مراد باہمی دشمنی کا بیج ہے (بعضکم لبعضٍ عدو) اس بیج کا نشوونما "لباسِ تقویٰ" سے محروم کر دیتا ہے۔ سوات (یعنی کمزوریاں) اور عیب کھل جاتے ہیں، اختلافات اور فرقہ بندی کے درخت کی خاردار ٹہنیاں پھیلنے لگتی ہیں۔ غافل انسان شیطانی اغوا سے اپنی فرقہ پرستی کو شجرۂ الخلد سمجھنے لگتا ہے۔

آدم میں تمام بنی آدم شامل ہیں

۱۔ قصہ آدم میں واحد، تثنیہ اور جمع تینوں قسم کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اولین ماں اور باپ میں ان کی ساری نسل شامل ہے۔ قرطبی میں ہے۔ قال مجاہد والحسن ایضاً بنو آدم و بنو ابلیس " صـ۲۷۲ ابو مسلم اصفہانی بھی اسی کے موید ہیں۔ صـ۱۵۱ تفاسیر ابو مسلم اصفہانی ترجمہ اردو۔ اس کی تصدیق کے لیے آیہ ذیل دیکھئے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ۔ (الاعراف ۱۱)

ہم نے تم (انسانوں) کو پیدا کیا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں (یہ کر چکنے کے بعد) پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدم کی تخلیق اور صورت گری میں سب آدمیوں کی تخلیق اور صورت گری داخل ہے۔ اسی طرح سجدہ آدم میں تمام بنی آدم کے سجدہ سمجھنا چاہیئے۔

۲۔ خلیفہ صرف آدم نہیں۔ بلکہ آدم کے تمام فرزند خلیفے ہیں۔

جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ ط (فاطر۔ ۳۹)

جس طرح آدم کو زمین میں خلیفہ بنایا، اسی طرح اللہ نے، تم سے (انسانوں) کو زمین میں خلیفے بنایا۔

۴۔ آدم اوّل نے زمین میں کبھی خونریزی نہیں کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اعتراض (یسفك الدما) کی تردید نہیں کی، بلکہ مسلّم رکھ کر جواب دیا ہے کہ (انی اعلم مالا تعلمون) لہٰذا اس میں تمام بنی آدم کو شامل کرنا پڑے گا، جواب تک فرشتوں کے اعتراض کی تصدیق کر رہے ہیں۔

۵۔ یٰبَنِىْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا۔ (الاعراف ۲)

اے اولاد آدم! تم کو شیطان بہکانے نہ پائے۔ جیسے کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا۔ ان کا لباس اتروا دیا تاکہ ان کی سوآت ان کو نظر آنے لگیں۔

اس آیت سے مفہوم ہوتا ہے کہ آدم و اولاد آدم یکساں شیطان کے زیر اثر ہیں۔ اخراج جنت، انتزاع لباس اور افشاء عیوب (سوآت) میں آدم کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔

۶۔ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۔ (البقرہ۔ ۳۶)

اور تم سب کے لیے زمین میں ٹھکانا اور فائدہ ہے۔ کچھ مدت کے لیے۔

اس سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ آدم میں تمام بنی آدم شامل ہیں۔

مکالمہ حالی ہے قالی نہیں

اللہ تعالیٰ، آدم اور ملائکہ کے مکالمے کو عام انسانی بزم آرائی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بزبان حال مکالمہ ہے، جو ہر فریق کے اظہار حال کے لیے بیان کیا گیا ہے بوجوہ ذیل:۔

۱۔ اس مکالمے میں تین فریق شامل ہیں، جو ہر لحاظ سے باہم مختلف ہیں، خدا تعالیٰ، فرشتے اور انسان۔ ان کا مکالمہ ایسا نہیں جو ایک نوع کے چند افراد کا آپس میں ہو سکتا ہے۔

۲۔ فرشتوں کو حکم تھا کہ جب آدم جسم و روح سے تکمیل پا کر ایک زندہ ہستی بن جائے، تو اس کے سامنے سربسجود ہو جانا، لیکن یہ مکالمہ سجدے سے پہلے کا ہے کیوں کہ سجدے کے بعد ملائکہ کے اعتراض کا کوئی موقع نہیں نکل سکتا جب کہ آدم (جو ایک فریق مکالمہ ہے) ابھی تیار ہی نہیں ہوا تھا تو بولنے کیسے لگ گیا؟ اس دلیل سے بھی اس مکالمے کا حالی ہونا قطعی طور پر ثابت ہے۔

مکالمے کا مقصود یہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار ہیں، تسبیح و تقدیس الٰہی کو ثابت و ظاہر کرنے والے ہیں، نظام عالم کو چلا رہے ہیں۔ بظاہر ان کے ہوتے ہوئے اس مخلوق کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے جس میں فساد و تخریب کے قوی امکانات پائے جائیں۔ یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی لازمی طور پر اعلیٰ ارتقا کے امکانات بھی لگے ہوئے ہیں۔ جن سے فرشتے خالی ہیں۔ فطرت آدم کے دو پہلو ہیں۔ اسے دونوں طرف جھکنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہی اس کا شرف ہے، جو فرشتوں کو حاصل نہیں۔ فرشتے زبان حال سے کہہ رہے ہیں۔ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔ آپ نے ہمیں جو کچھ سکھا دیا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے —— آدم (بنی آدم) صفات ملائکہ کے علاوہ مزید استعدادیں بھی رکھتا ہے اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فرشتوں کے خواص ایک ایک کر کے بیان کر دیتا ہے۔ وہ علم مجموعہ کائنات ہے۔ استخراج نتائج کا ماہر ہے۔ صاحب اختیار ہے۔ نیکی بدی میں امتیاز کر سکتا ہے اگر اس میں سفاکی و فساد کی قوت نہ ہوتی تو وہ مجبور محض ہوتا۔ اس کی کوئی نیکی، حقیقی یا اختیاری نیکی نہ ہوتی یہی ہے اس کا علم و کمال اور فضیلت آدمی کے ہنگاموں کے مقابلے میں بے چارہ فرشتہ۔ ع

وہ نقطہ اللہ ھُو اللہ ھُو

اگر انسان اپنے اختیار کا صحیح استعمال نہ کرے، تو اسفل السافلین کی حالت میں گر جائے گا۔ اس کو خلیفہ اسی غرض سے بنایا ہے کہ وہ اپنے بنانے والے کا جمال و جلال ظاہر کرے اور اس کے حضور جواب دہی کو فراموش نہ کرے یہی وصف اس کے لیے غیر محدود ارتقا کا ذریعہ ہے۔

اگر صاحب اختیار اور خلافت مآب انسان پیدا نہ کیا جاتا تو فرشتے اس زمین کو کس طرح آباد کرتے؟ اونٹ، گھوڑے، ہاتھیوں اور مویشیوں سے کیا کام لیتے؟ دریاؤں اور سمندروں میں سٹیمر کون چلاتا؟ حکومت و عدالت کے محکمے کون قائم کرتا؟ بے شمار علوم و فنون کی اشاعت و تدوین کون کرتا؟ تجارت و حکمت کو کون فروغ دیتا؟ ہوائی جہاز، ریل، لاسلکی اور ٹیلیفون کون ایجاد کرتا؟

اندھوں اور گونگوں بہروں تک کی تعلیم و تدریس کہاں سے آتی؟ کیا ایسے سب کام فرشتے انجام دے سکتے تھے؟ انسان کے بغیر یہ دنیا کیا ہوتی؟ شاعر کا خانہ ویراں سے

"اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اگر تمام انسان رہبانیت کے مشورے کو قبول کریں، تعاون و تعامل سے دست کش ہو جائیں، میل جول اور حقوق طلبی کو موجب فساد کہہ کر کنارہ کشی اختیار کر لیں۔ منتظموں اور حاکموں کو بے ضرورت بلکہ مضر کہنے لگ جائیں، تو کیا یہ معترضانہ روش درست سمجھی جائے گی؟ اسی قسم کا اعتراض فرشتوں کی طرف سے ظاہر کیا گیا ہے۔

جو لوگ خود کچھ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، کرنے والوں پر نکتہ چینی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ حکام، سلاطین اور موجدین و محققین کو کوستے ہیں۔ ایسے لوگ مقصدِ خلافت سے بے خبر ہیں۔

زاہد نداشت تابِ جمالِ پری رخاں
کنجے گرفت و یادِ خدا را بہانہ ساخت

—— ۵ ——

رؤیائے یوسفؑ کی تعبیر

سورج کے گرد زمین کے علاوہ جو گیارہ ستارے گردش کرتے ہیں۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں عطارد، زہرہ، مریخ سیارات صغار میں سے چار بڑے ستارے مشتری۔ زحل، یورنیس اور پنچوں یوسف زمین میں رہتے تھے۔ انہوں نے زمین ہی میں خواب دیکھا۔ خواب میں زمین کی جگہ اس کا چاند دکھایا گیا ہے۔ ان فلکی موثرات وانوار کے سجدے کی تعبیر یعقوب علیہ السلام نے یہ کی کہ اللہ تعالیٰ یوسفؑ کو ظاہری عروج واقبال اور علمی وروحانی نور وہدایت عطا فرمائے گا جس سے دیگر اولاد یعقوبؑ کو بھی حصہ ملے گا۔

كَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِن قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ ..... الخ

رؤیائے یوسف کی پیغمبرانہ تعبیر یہ ہے کہ تجھ (یوسف) کو تیرا رب برگزیدہ کرے گا اور باتوں کی حقیقت سکھائے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور اولاد یعقوب پر پوری کرے گا۔ جیسے کہ اس سے پہلے تیرے اجداد ابراہیم واسحاق پر پوری کی۔

اس پیغمبری تعبیر میں سجدے کا کہیں ذکر نہیں اور اس نعمت یوسفی کی تشبیہہ جو نعمت ابراہیمی واسحاقی سے دی گئی ہے، اس کی مماثلت بھی روحانی ومادی عروج ہی ہو سکتی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ابراہیمؑ واسحاقؑ کو ان کے بھائیوں اور والدین نے کبھی سجدہ نہیں کیا ــــ اصلیت یہ ہے کہ جب خاندان یعقوب اللہ کی عنایت سے مصر میں داخل ہوا تو یوسف نے اپنے والدین کو عزت وتکریم سے تخت پر بٹھایا۔ اس وقت وہ سب یوسف سمیت جامع المتفرقین اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہو گئے۔ ماں باپ کا یوسف کو سجدہ کرنا، اور وہ بھی تخت پر چڑھ کر، بالکل بے معنی بات ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ ربّ عرش عظیم کو ہر حال میں اور ہر مقام پہ سجدہ ہو سکتا ہے۔ اس وقت یوسفؑ نے اپنے بزرگ باپ کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ اقبال وعروج میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو آپ نے کی تھی۔ اللہ نے اسے سچا کر دیا۔ فالحمد للہ

تقریر رازیؒ

اس مبحث میں امام رازی نے حسب عادت بہت طوالت سے کام لیا ہے۔ اس میں سطور ذیل بھی ملتی ہیں۔ "یعقوبؑ، یوسفؑ کے باپ تھے، اور باپ ہونے کا حق بہت بڑا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو اس آیت میں اللہ پاک نے والدین کے حق کو اپنے حق سے بالکل متصل رکھا ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ جوان یوسفؑ پہ بوڑھے یعقوب علیہ السلام کی تعظیم واجب ہے۔

عبادات اور طاعات کے لحاظ سے بھی پیغمبر باپ کا مرتبہ بیٹے سے بڑھا ہوا ہے۔ ان اسباب ووجوہ کی بنا پہ واجب ہے کہ

یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں دست بستہ اور کمر بستہ حاضر ہوں۔ پس یوسف علیہ السلام نے کس طرح گوارا کر لیا کہ یعقوبؑ اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں؟

اس سوال کے جواب میں امام صاحب نے سات وجوہ بیان کی ہیں۔ جس میں سب سے پہلی وجہ حسب ذیل ہے۔

وهو قول ابن عباس فی روایة عطاء ان المراد بهذه الآیة انهم خروا له ای لاجل وجدانه سجداً لله تعالی وحاصل الکلام ان ذالك السجود للشکر فالمسجود له هو الله ..... الخ

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اس ملاپ پر سب نے مل کر اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا۔ یہ سجدہ مسجود حقیقی کے شکریئے کے لیے تھا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہو سکتا ہے؟

صفحہ ۲۱۲ ۔ جزء ۱۸ مطبوعہ مصر ۱۹۳۸ء.

من وسلویٰ اور بارہ چشمے

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۔

(البقرہ - ٥٧)

(بیابان سینا کی جلتی ریگ سے محفوظ رکھنے کے لیے) تم پر بادلوں کا سایہ کیا اور (تمہارے کھانے کے لیے مناسب درختوں پر موسم کی مناسبت سے ترنجبین اور سلویٰ (تیتر اور بٹیر کی قسم کے خاص موسم پر آنے والے پرندے لا) اتارے۔

بیابان میں ایک موقع پر پانی کو ترسنا پڑا۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بذریعہ الہام ایسے پہاڑی مقامات بتا دیئے، جہاں سے پانی قریب تر تھا۔ موسیٰؑ کا چرواہا کا سا عصا جس پر لوہا لگا ہوتا ہے، اس کی معمولی کھدائی سے وہ پانی جو نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا، نکل پڑا۔ اگر آپ الٰہی اشارے سے ضرب عصا نہ لگاتے اور پانی قدرتی طور پر اپنا راستہ بناتا یا ایک ہی چشمہ نکلتا، جو اتنے قبائل کے لیے ناکافی ہونے کی وجہ سے باہمی جنگ و فساد کا موجب بنتا، یا پانی اوپر کو راہ بنانے کی بجائے پتھر کے نیچے ہی نیچے کسی دور مقام پر جا نکلتا، تو ایسی صورتوں میں بنی اسرائیل کے لیے ہلاکت کے سوا کیا چارہ کار تھا۔ وحی الٰہی کے متصرفانہ دخل نے قدرتی فوائد کو قریب تر کر دیا۔ پانی نکلنے سے پہلے بارہ قبیلوں کے لیے بارہ گھاٹ مقرر کر دیئے گئے۔ جو کافی فاصلوں پر وسیع رقبے کو گھیرے ہوئے تھے۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ بارہ چشمے ایک پتھر سے پھوٹ پڑے تھے۔ جس کو بنی اسرائیل ساتھ ساتھ اٹھائے پھرتے تھے۔

چشموں کے نکلنے کا قدرتی طریقہ یہ ہے کہ پہلے بہت تھوڑا تھوڑا پانی نکلنا شروع ہوتا ہے۔ پھر اگر پانی اونچا ہے اور اس کا ذخیرہ بہت زیادہ ہے تو وہ اپنے زور سے اپنی راہ فراخ کر لیتا ہے۔ اور کافی مقدار میں بڑے جوش و خروش سے نکلنے لگتا ہے بقول سعدیؒ

سرچشمہ شاید گرفتن بمیل　　ولیکن چو پُر شد نہ بندد بہ پیل

بالکل اسی قدرتی طریقے سے یہ بارہ چشمے بھی نکلے تھے۔ پہلے پانی کا انبجاس (کم کم نکلنا) شروع ہوا۔

فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (الاعراف - ١٦٠)　　اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے

پھر انفجار (ایک دم جوش) ہوا:

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا۔ (البقرہ - ٦٠)　　پھر اس سے بارہ چشمے (زور سے) جاری ہو گئے۔

قرآن پاک نے ایک ہی موقع کے لیے دو جگہوں میں دو مختلف لفظ استعمال فرمائے ہیں۔ خواجہ صاحب کی نظر اس دقیق حکمت کی طرف گئی۔ اور انہوں نے مذکورہ بالا فرق نکالا امام راغب اس کی تائید کرتے ہیں۔

الانبجاس اکثر ما یقال من شیء ضیق والانفجار یستعمل فیه وفیما یخرج من شیء واسع ولذالک قال عزوجل فانبجست ..... الخ وفی موضع آخر فانفجرت ..... الخ	انبجاس ـ تنگ سوراخ سے پانی کا نکلنا ـ انفجار ـــ اس معنی میں بھی مستعمل ہے اور اس کے علاوہ کشادہ جگہ سے پانی نکلنے کو بھی کہتے ہیں جیسا کہ آیات فانبجست اور فانفجرت سے ظاہر ہوتا ہے۔

مادہ فجر کے تحت لکھتے ہیں الفجر، شق الشیٔ شقا واسعاً۔ کسی شے میں بہت وسیع شگاف پیدا ہو جانا پتھروں سے چشموں، دریاؤں اور نہروں کا جاری ہونا بالکل قدرتی امر ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔

وَاِنَّ مِنَ الۡحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنۡهُ الۡاَنۡهٰرُ (البقرہ ـ ۷۴)	پتھروں میں بعض جگہ نہریں (یا دریا) بہ نکلتے ہیں۔ اور بعض مقامات پر پھٹ جانے سے پانی نکل آتا ہے۔

یعنی عصا کی ضرب کے بغیر بھی بعض حجری مقامات سے دریا جاری ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی اطلاع والہام سے لوہے والے عصا کی ضربوں سے کام لیا جائے، تو اس کے مفید ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ آخر لوگ کدال وغیرہ آلات سے زمین کے نیچے سے پانی نکالتے ہی ہیں بے شمار کنوئیں جو دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح بنے ہیں۔ کبھی کوئی پتھر یا مٹی خود پانی نہیں بن جاتے۔ یا معدوم کو موجود نہیں کر لیتے۔ جہاں پہلے سے پانی موجود ہوتا ہے، وہیں سے نکلتا ہے یا نکالا جاتا ہے۔

سخت مصیبت اور تمام ظاہری سہاروں کے ٹوٹ جانے کے وقت اس قسم کے الہام اور غیر متوقع فتوحات کا تعلق صرف انبیاءؑ ہی سے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے مضطر بندوں کی آڑے وقت میں مدد کرتا رہتا ہے۔

الا لا یجزن اخوالبلیۃ   فللرحمٰن الطاف خفیۃ۔

مصیبت زدہ لوگوں کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ خدائے رحمٰن کی خفیہ مہربانیاں بگڑے کاموں کو سنوار دیتی ہیں۔

کسی کو خواب میں گھر کے اندر گڑے ہوئے دفینے کی اطلاع مل جاتی ہے۔ کسی کو کسی اور ذریعے سے کوئی فائدہ پہنچ جاتا ہے اور مشکل حل ہو جاتی ہے۔ کارساز حقیقی کی کارسازی ہمیشہ جاری رہتی ہے[1]۔

---

[1] ۔ خواجہ صاحبؒ کے خلف اکبر مرحوم نے سنایا کہ ان کی اہلیہ محترمہ بیمار تھیں اور کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک رات خواب میں انہوں نے ایک درویش کو دیکھا۔ اور اس کے پوچھنے پر اپنی تکلیف بیان کی اس نے دو تین مفرد دواؤں کے نام بتلائے اور طریقہ استعمال بتایا۔ انہوں نے صبح اٹھ کر دوائیں منگوائیں اور چند روز میں صحت یاب ہو گئیں ایسی ہی اور بھی کئی شہادتیں مل سکتی ہیں (منہ)

فوقکم الطور کی شرح

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ -

(البقرہ - ۶۳)

جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا اور طور کو زلزلوں کے ساتھ تمہارے سروں پہ جھکایا، (بلکہ جڑوں سے ہلا کر اور زمین سے اُبھار کر) تم پہ اونچا کر دیا۔ (اس خوف ناک وقت میں کہا کہ) جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں اسے مضبوط تھامے رہو اور اس میں جو تعلیم ہے، اُس کو یاد رکھو تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

کوہ طور ایک آتش خیز پہاڑ تھا اب وہ مدت سے بجھ چکا ہے۔) اُس زمانے میں وقتاً فوقتاً اپنے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔ بنی اسرائیل دامانِ کوہ میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ پہاڑ ان کے سروں پہ بلند تھا۔ اس میں اس وقت زلزلے آ رہے تھے۔ جن کی وجہ سے جھک کر ان کے سروں پہ آجاتا تھا۔ گویا وہ متحرک سائبان تھا۔ جس کے گر پڑنے کا خدشہ لاحق تھا (کَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ - الاعراف ۱۷۱)

سخت زلزلے کے وقت بعض اوقات پہاڑ اپنی بنیادوں سے ہل کر زمین کے اوپر اُبھر آتا ہے اور اپنی عام حالت کی نسبت زیادہ بلند ہو جاتا ہے۔ زلزلے کے ہچکولوں سے پتھر اُڑ کر سروں کے اوپر سے گذر جاتے ہیں۔ ایسے خوفناک وقت کا "عہد" دل میں گھر کر جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے جلال و جبروت اور گرفت و ہیبت کا نقشہ مدت تک ذہن پر مسلط رہ سکتا ہے۔ لیکن سنگِ دل اسرائیلیوں نے ایسے سنگین (بلکہ آتشیں) عہد کو بھی جلد ہی پس پشت ڈال دیا۔

گاؤ پرستی

"سبت" جو خود بنی اسرائیل نے اپنے ذمے لے رکھا تھا، اس کو بھی نباہ نہ سکے۔ اس کے علاوہ مشرکانہ رسموں کے دل دادہ رہتے تھے۔ خدا کے فضل سے سمندر پار ہوئے، تو ایک بُت پرست قوم کو دیکھ کر موسیٰؑ سے ایسے ہی محسوس و مشہود معبود کا مطالبہ کرنے لگے ۔ موسیٰؑ پہاڑ پہ گئے تو ان کے پیچھے اپنے زیورات سے بچھڑا بنا کر اس کی پوجا کرنے لگے۔ فرعون کی غلامی میں انہوں نے ایسی بلائیاں اپنالی تھیں جب بچھڑا ان کے پاس نہ رہا اور طبیعت پھر گاؤ پرستی کی طرف مائل ہوئی، تو موسیٰ سے چھپا کر ایک زندہ سانڈھ کو بطور معبود آزاد کر دیا۔ بچھڑا تو گائے کے بچے کا ڈھانچہ تھا۔ اور یہ نوجوان سانڈھ تھا۔ اُس کو جلا کر اڑا دیا گیا تھا۔ اور اس کو ذبح کرا دیا گیا۔ وہ کُھلم کُھلا پکڑا گیا۔ اس کو چھپانے کی بہت سی کوششیں کی گئیں۔

بنی اسرائیل کے مشرکانہ عقائد و اعمال کی فہرست بتانے کا مقصد ان کے اسلاف کی عیب چینی نہیں، بلکہ یہ درس عبرت پیش نظر ہے کہ اگر کسی قوم میں سچی دین داری اور تعلق باللہ کی حقیقی روح پیدا نہیں ہوئی، تو بہت سے نبی، بہت سے صحیفے، بہت سے فرضی یا اصلی معجزات اُسے کچھ کام نہیں دے سکتے۔

قردۃ خاسئین کی شرح

كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (البقرہ-۶۵) — (سبت میں زیادتی کرنے والوں کو ہم نے کہا) ہو جاؤ بندر ذلیل۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں۔ کہ یہ اس قسم کی بات ہے، جیسے ایک استاد اپنے حد درجہ کند ذہن اور کام چور شاگرد کی تعلیم سے ناکامی کے بعد کہے۔ "جا گدھا بن"۔ یہ ایک قسم کی پھٹکار ہے۔ وہ اپنی تائید میں متعدد آیات پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

فَنَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحٰبَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا (النساء-۴۷) — ہم ان (شرارت پسند اہل کتاب) کو اسی طرح پھٹکار دیں۔ جیسے ہم نے سبت والوں کو پھٹکارا تھا۔ اور خدا کا کام (یونہی) ہوتا رہا ہے۔

* *

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پھٹکار شرارتوں کے نتیجے میں قدرتاً ہوا ہی کرتی ہے۔ اب بھی اپنے موقع پر ہو سکتی ہے۔ یہ ایک دائمی قانون ہے۔

چنانچہ یہ زیر غور آیت (بقرہ ۶۵) کے بالکل متصل (بقرہ ۶۶) میں اس حقیقت کو کھول دیا گیا ہے۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكٰلًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا — پھر ہم نے اس واقعہ (قردۃ خاسئین) کو موجودہ و آئندہ انسانوں

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ کے لیے عبرت اور متقیوں کے لیے نصیحت بنا دیا۔

ظاہر ہے کہ دوسروں کے لیے عبرت و نصیحت وہی واقعہ ہو سکتا ہے جو دوسروں پر بھی وارد ہو سکے لیکن جس کا وقوع ایک ہی مرتبہ کسی ایک گوشہ آبادی میں ہوا۔ وہ عام عبرت و نصیحت کیسے ہو سکتا ہے؟

خواجہ صاحب سورۂ مائدہ کی آیت ذیل کو بھی اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ۔ (۵-۶)

کہہ دیجیے کہ میں تم کو (وہ لوگ) بتلاؤں جو اللہ کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے اس سے بدتر ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے رحمت سے دور کر دیا۔ اور ان پر غضب کیا اور ان میں سے بندر اور سور بنا دیئے۔ انہوں نے سرکشوں کی پوجا کی (ظالم بادشاہوں کی غلامی پر رضامند رہے) یہ لوگ درجے میں بدتر اور سیدھی راہ سے گمراہ تر ہیں۔

٭ ٭ ٭

یعنی ظالم و جابر حکام کی غلامی پر قانع ہو جانا انسان کو ملعون و مغضوب بنا کر انسانیت کے درجے سے گرا کر بندر و سور بنا دیتا ہے۔ بقول پیر رومؒ۔

از دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

بقرہ کی لغوی تحقیق

"بقرہ" کی ۃ، تائے وحدت ہے، نہ کہ تائے تانیث۔ بقرہ کا نر اور مادہ گاؤ دونوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ بقرہ کی ۃ کو گرانے سے بقر اسم جنس بن جاتا ہے۔ جو لفظاً مذکر ہے اور بقرہ لفظاً مونث ہے لیکن معناً یہ دونوں لفظ نر اور مادہ ہر دو کے لیے مستعمل ہیں۔

بنی اسرائیل نے جس بقرہ کو بطور معبود آزاد چھوڑ رکھا تھا، وہ سانڈھ تھا (جیسا کہ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہل نہیں چلاتا تھا۔ کھیت کو پانی نہیں دیتا تھا۔ اس پر بوجھ نہیں لادا جاتا تھا۔ خوبصورت، گہرے زرد رنگ والا ہے داغ اور نوعمر تھا۔ نیز ہر طرح بے عیب اور سڈول تھا۔ اس کا کوئی سینگ ٹوٹا ہوا نہیں تھا۔ نہ اس کے جسم پر زخم کا کوئی نشان ہی تھا۔ بالکل صحیح سالم اور تن درست تھا۔

اذ قتلتم نفساً کی تفسیر

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔

(البقرہ ۲- ۷۲، ۷۳)

(اے بنی اسرائیل! مشرکانہ سانڈھ کو چھپانے کے علاوہ) جب تم نے ایک (محترم) شخص کو قتل کر دیا، پھر اس الزام کو ایک دوسرے کے سر تھوپا اور جو کچھ تم چھپا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ اسے ظاہر کرنے والا تھا پھر ہم نے (مضروب کو وقتی طور پر ہوش میں لانے کیلئے) فرمایا کہ اس کے ایک حصے (دھڑ) کو دوسرے حصے (دست و پا) سے ضرب پہنچاؤ، اس تجویز سے وہ چند لمحوں کیلئے ہوش میں آ گیا اور تمام واقعہ کہہ سنایا اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ تم عقل سے کام لو۔

یہ ترجمہ مع توضیحی عبارات خواجہ صاحب کی تحریر ہے۔ اب سنئے ان کی تفسیر کاوش ان آیات کے متعلق، جب بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے پنہاں سانڈھ کی پرستش شروع کی اور موسیٰؑ نے معلوم ہو جانے پر اسے بحکم الٰہی ذبح کرا دیا، تو وہ سمجھے کہ ہارونؑ نے موسیٰؑ کو اس کی اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ سو وہ ان سے پہلے ہی ناخوش تھے۔ اب ذبح گاؤ کے وقت اور بھی غضب ناک ہو گئے۔ بچھڑے کو جلانے کے موقع پر حضرت ہارونؑ کا اپنا یہ قول اس بات کا موید ہے۔ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ - (اعراف ۱۵۰) قریب تھا کہ یہ (بچھڑے کے پجاری) مجھے قتل کر دیں۔ سو تو (اے موسیٰؑ) ان دشمنوں کو مجھ پر نہ ہنسا۔

اب انہوں نے موقع پا کر انہیں زد و کوب کیا، یا کسی اور ذریعے سے قتل کر دیا۔ قبل اس کے کہ جسم و روح میں مفارقت ہو، موسیٰؑ کو معلوم ہو گیا۔ انہوں نے تفتیش کی تو قاتلوں نے باہمی سازش سے الٹا موسیٰؑ پر الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے بڑے بھائی کا سر اور داڑھی پکڑ کر ان کی بے عزتی کی تھی اور قیادت میں ان کی شرکت کو ناپسند کرنے لگے تھے "نفساً" کی تنکیر و تعظیم کے لیے ہے، "قتلتم" ماضی ہے یعنی مقتول جاں بر نہیں ہو سکا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ پھر چلتا پھرتا زندہ بن گیا تھا، انہیں سوچنا چاہیئے کہ اپنے عظیم معجزانہ نتیجے کے متعلق صرف یہ کہنا سخت ناکافی ہے کہ

وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۔ جس بات کو تم چھپا رہے تھے، اللہ تعالیٰ اسے ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

مدعا صرف یہ تھا کہ واضح طور پر قاتلوں کا سراغ لگ جائے۔ اگر گائے کا ٹکڑا مقتول کے جسم سے چھونے سے وہ زندہ ہو سکتا، تو ان کے ہاتھ سے ذبح کرانے کی مجبوری تھی؟ یہ کام تو موسیٰؑ خود بھی کر سکتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ رکوع گزشتہ رکوع سے بالکل الگ ایک واقعہ بیان کرتا ہے۔ ان دو رکوعوں کے واقعات کو خلط ملط کرنا درست نہیں۔ "نفساً" کے بعد تین ضمیریں ہیں۔ دو مونث ایک مذکر تینوں کا مرجع "نفس" ہے۔ اختلاف ضمائر مختلف لحاظ سے ہے۔ علماء کے نزدیک مسلّم ہے کہ قرآن مجید میں ایک چیز کے لیے مختلف لحاظ سے مختلف ضمیریں آئی ہیں (مثال کے لیے دیکھیے سورۃ والشمس آیت ۱۱ تا ۱۵) یہاں دو مونث ضمیریں نفس کی طرف راجع ہیں۔ نفس عربی میں مونث ہے اور ضمیر مذکر نفس کے بڑے بعض یا حصے (دھڑ) کی طرف پھرتی ہے۔ اور "بعض" مذکر ہے اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوا۔

فاضربوہ ببعضھا اس نفس (شخص) کے جسم کے بڑے حصے کو اس کا چھوٹا (بعض) حصہ مارو۔ جسم کا بڑا حصہ (بعض) سر اور دھڑ کا مرکب ہوتا ہے اور چھوٹا حصہ ہاتھ پاؤں جو بطور شاخ (اطراف) کے ہوتے ہیں۔ یعنی ہاتھ پاؤں کو موڑ کر (بڑے حصے) پشت و سینہ پر مارو۔ وقتی طور پر سانس کو جاری کرنے کا یہ عام طبی معمول ہے۔ بے ہوش آدمی کو کسی بلند جگہ پر لٹا دیا جاتا ہے۔ چار آدمی اس کے چاروں اطراف (ہاتھ پاؤں) کو پکڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص اس کا ایک ہاتھ اس کے سینے پر لگا کر اٹھا لیتا ہے۔ پھر دوسرے ہاتھ والا بھی یہی عمل کرتا ہے۔ پاؤں والے بھی اس کی ایڑیوں کو باری باری اس کے چوتڑوں پر مارتے ہیں۔ اس تدبیر سے کبھی کبھی تنفس جاری ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ تجویز اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے، اس لیے اس کا نتیجہ خیز ہونا ضروری تھا۔ اس طرح جب وہ شخص ہوش میں آیا تو اس نے اپنے قاتلوں کا پورا پتا بتا دیا، جس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہ رہی اور وعدہ الٰہی پورا ہو گیا۔ واللہ مخرج ما کنتم تکتمون اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کرنے والے ہیں جو تم چھپانے ہو۔

"قتلتم" (تم نے اسے قتل کیا) اس کے حق میں پورا ہوا۔

جب ہم شام کو سو کر صبح جاگتے ہیں تو کہتے ہیں۔

الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا۔ تمام خوبیوں کا مالک اللہ ہے، جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی بخشی۔

وہ نفس مقتول ایسی حالت میں تھا کہ سب سمجھ چکے تھے۔ اب اس کے قاتل کا سراغ نہیں مل سکتا۔ جس خدا نے اس کو وقتی طور پر ہوش میں لا کر اس کی زبان سے راز کھلوا دیا کیا عقلی طور پر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ مردہ کو زندہ کر دینا بھی اس کی قدرت کا ادنیٰ کرشمہ ہے؟ اسی عقلی نتیجے کی طرف متوجہ کرنے کے لیے آیت کے آخر میں یہ ٹکڑا رکھ دیا "لعلکم تعقلون" تاکہ تم عقل سے کام لو۔ خیالی اور روایتی معجزوں کی بارگاہ میں بے چاری عقل کی رسائی کہاں؟ عقل کو روشن کرنے کے لیے معقول اور معمول کے مطابق قدرتی نشان ہی ہونے چاہئیں، جن کی طرف قرآن حکیم بار بار توجہ دلاتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے قاتلوں کو سزا دی، امن قائم ہو گیا۔ لیکن بنی اسرائیل کے دل پھر اسی قساوت میں مبتلا ہو گئے۔ نبیوں اور رسولوں کو قتل کرتے، توریت کو سمجھ بوجھ کر، اس میں تحریف کرتے۔ نئے نئے مسئلے ایجاد کرتے کتاب اللہ کو اپنی خواہشوں کے پیچھے چلاتے۔

(من بعد ما عقلوہ)

نصابِ زکوٰۃ قابلِ اصلاح ہے

سونے کا نصاب ساڑھے سات تولے اور چاندی کا باون½ تولے بتایا جاتا ہے اسی طرح بھیڑ بکری اور اونٹوں کا نصاب بھی قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ تقرر و تعین قطعاً ناقابلِ عمل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں ان چیزوں کی قیمتوں میں تساوی و توازن قائم ہو، لیکن ہمیشہ ایسا رہنا ناممکن ہے۔ اس پیمانے سے نصاب کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ کیا آج ½۷ تولے سونے کی وہی قیمت ہے جو ۵۲ تولے چاندی کی ہے۔؟ اس طرح ایک شخص تبدیلِ جنس کر کے زکوٰۃ سے بچنے کا حیلہ نکال سکتا ہے۔

خرچ کے متعلق ہر شخص کے حالات اور استطاعت ملحوظ رہنی چاہیئے۔

عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ۔ ج (البقرہ - ۲۳۶) صاحب توفیق اپنے اندازے کے مطابق اور تنگ دست اپنی قدر کے موافق۔

موتی، جواہرات، گھوڑے اور گدھے سب مال میں داخل ہیں۔ ان کو زکوٰۃ سے خارج کر دینا یقیناً غلط ہے۔

پھلوں اور کھیتی باڑی کا حق ان کی کٹائی کے دن وصول ہو جانا چاہیئے۔ (باغ، کھجور، کھیتی، زیتون انار وغیرہ) اس کے پھل سے کھاؤ، جب وہ پھل لائے اور اس کے کاٹنے کے دن اس کا حق دو۔ (انعام - ۱۴۲)

سالانہ زکوٰۃ غلط

تنخواہ دار آدمی سے تنخواہ کے وقت وصول کیا جائے۔ جب کسی اصلاح کا موقع ہو، اسی وقت چندہ اکٹھا کرنا لازم ہے۔ اس کے لیے خواہ مخواہ سال بھر کا انتظار کرنا بے معنی رسم ہے۔

غیر معقول مصارف

جن ممالک کے لوگ معقول طور پر خرچ کرتے ہیں، انہیں دوسروں پر غلبہ و تسلط حاصل ہوتا ہے اور جو لوگ رسم و تقلید کے طور پر خرچ کرتے ہیں وہ ہمیشہ مغلوب و ذلیل رہتے ہیں۔ آخر اس دنیا سے مٹ جاتے ہیں۔

موجودہ مسلمانوں کے خرچ کسی دوسری قوم سے غالباً کم نہیں ہوں گے۔ لیکن وہ عموماً عقل و دین کے خلاف ہونے کی وجہ سے قوم میں کوئی بہتری کی روح نہیں پھونکتے۔ بلکہ ذلت و نکبت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر ہمارے انفرادی اور قومی اخراجات میں سے نصف یا ربع ہی معقول طور پر خرچ کئے جائیں تو ہمارا ہر آئندہ سال، گزشتہ سال کے مقابلے میں بہتر کا پیغام لے کر آئے۔ لیکن یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے علماء و قائدین کی آنکھیں کھل جائیں اور ان کے اندر "مقدس رسوں" کا جوا اتار پھینکنے کی جرأت پیدا ہو جائے۔

اسلام کی ابدیت وجامعیت

نجات کے لیے ہمیشہ سے ایک ہی صراط مستقیم چلا آرہا ہے۔ آغاز عالم سے منعم علیہم انعام پانے والے لوگوں نے اسی پر چل کر نجات پائی ہے بے شمار ادیان و مذاہب میں صرف ایک اسلام ہی فطری اور عالم گیر حقیقت ہے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران ۸۶) اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہتا ہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

فرقہ بندی یہ جو لوگوں نے بابیت، بہائیت، احمدیت، اہل حدیث، وغیرہ مختلف انسانوں اور انسانی تصنیفوں سے منسوب الگ الگ دین بنالیے ہیں، بلا شک وشبہ یہ لوگ دنیا کو متحد کرنے والے اسلام سے دور لے جانے والے اور جنگ و تفرقہ کی آگ کو ہوا دینے والے ہیں۔

قرآن حکیم نے تمام انبیاء کا مسلک ایک ہی بتایا ہے اور وہ اسلام ہے۔ اسلام ہی کا مقابلہ کرتے ہوئے قومیں ہمیشہ تباہی کا شکار ہوتی رہی ہیں۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل ۸۲) حق کے ظہور سے باطل کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور باطل کی تقدیر یہی ہے کہ مٹتا رہے۔

ہاروت ماروت

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ
سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ
كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ٭ وَمَآ اُنْزِلَ
عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ
وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا
نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا
مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَ
مَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ
اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا
يَنْفَعُھُمْ ۭ

(البقرہ ۱۰۲)

(یہود کے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو پس پشت پھینکا) اور اس چیز کی پیروی کی جسے شیاطین سلیمان کے عہد حکومت سے منسوب کر کے پڑھتے پڑھاتے تھے، حالانکہ سلیمان نے کفر نہیں کیا، لیکن شیطان (جادوگر) کفر کرتے تھے (جو) لوگوں کو جادو سکھلاتے تھے۔ اور وہ (جادو) بابل میں دو (فرضی) فرشتوں پر نازل نہیں کیا گیا تھا۔ اور وہ دونوں کسی کو نہیں سکھاتے تھے جب تک کہہ نہیں لیتے تھے کہ "ہم (مجسم) فتنہ (ابتلائے مصیبت) ہیں سو تو کافر نہ بن"۔۔۔ سو یہ لوگ ان دونوں (کی طرف) سے ایسی چیز سیکھتے ہیں جس کے ذریعے سے میاں بیوی میں تفرقہ ڈال دیں۔ اس سے اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ایسی چیز سیکھتے ہیں جو خود ان کے لیے مضر تو ہے، نفع بخش نہیں ہے۔

سماوی نور (کتاب اللہ) کو چھوڑ کر ایسی کافرانہ چیزوں کے پیرو ہو گئے، جن کو اپنے نبیوں کی طرف منسوب کر کے انہیں بھی کافر ٹھہرالیا (معاذ اللہ) یعنی شیطنت پیشہ جادوگروں کے پیچھے ہو لیے اور اس ذلیل پیشے کو مقدس بنانے کے لیے حضرت سلیمان کے عہد حکومت کی طرف منسوب کر دیا۔ مسلمانوں کے "سحر سلیمانی" اور "نقش سلیمانی" بھی اُسی کی یادگاریں ہیں۔

اس قسم کی روایتیں افتراکیں کہ حضرت سلیمانؑ کی سلطنت کا دار و مدار جنتر، منتر اور جادو کی انگشتری کے نقش و نگار پر تھا۔۔۔۔۔
یہ خیال قطعاً کافرانہ ہے۔ سلیمانؑ پیغمبر کو کفر سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہی شیطان یعنی جادوگر کافر تھے، جو پیغمبر پر ایسے افترا کرتے اور لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ یہ روایت بھی یہودی سے ماخوذ ہے کہ "بابل میں ان کے دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر جادو کا علم اللہ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ دراصل وہ جادوگر ہی تھے جن کو سحر پرستوں نے فرشتے قرار دے لیا (یا مشہور کر دیا) واقعہ یہ ہے کہ وہ یہ کہے بغیر کسی کو یہ فن نہیں سکھلاتے تھے کہ "دیکھو ہمارا وجود تو ایک فتنہ ہے، پھر تم لوگ کفر میں کیوں مبتلا ہوتے ہو؟" یعنی جادوگری کے پیشے کی برائی اتنی معروف تھی کہ اس کے معلم بھی اسے خدا پرستی کے خلاف سمجھتے تھے[1] ٹھیک اسی طرح جیسے عام بدمعاش قمار

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بازوغیرہ اپنے شغل کی برائیاں تسلیم کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا کوئی عزیز، فرزند وغیرہ ان کا سا نکل آئے۔ اس کے باوجود خود باز نہیں آتے۔

اس پر بھی لوگ ان سے ایسے فتنہ انگیز عمل سیکھتے جن کے ذریعے میاں بیوی میں جدائی ڈالنا چاہتے۔

آباد گھروں کو اجاڑ دیں۔

آیت ۱۰۲ میں "الملکین" طنزاً کہا گیا ہے۔ الف لام عوض مضاف الیہ ہے۔ یعنی مَلَکَیْهِمْ (ان کے دو فرشتے) اس کی مثالیں قرآن میں موجود ہیں یہود نے کہا "انا قتلنا المسیح ابن مریم رسول اللہ" حالانکہ وہ مسیح کو "رسول اللہ" مانتے ہی نہیں۔ محض طنزاً ایسا کہہ دیا۔ قریش نے کہا۔ یا ایہا الذی نُزّل علیہ الذکر انک لمجنون۔ اے وہ شخص جس پر ذکر (قرآن) نازل ہوا ہے تُو پاگل ہے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کو پاگل کہنے والے آپؐ پر نزول قرآن کا اعتراف نہیں کر رہے ہیں، بلکہ طنزاً کہہ رہے ہیں۔

جنتر، منتر، ٹونا، رمل، جفر اور دیگر توہمات اور فریبوں سے باز رہنا اور حقیقی علم حاصل کرنا نہایت اہم ہے۔ "نقش سلیمانی" جیسی کتابیں شیاطین کے کارنامے ہیں۔ ان سے احتراز لازم ہے۔

لہ آج بھی ہمارے ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو دو قسم کے علموں کے قائل ہیں۔ ایک کالا علم دوسرا نوری علم کالے علم کو شیطانی علم بھی کہتے ہیں اور اس کے ماہر "عامل" کہلاتے ہیں، جو سادہ لوح لوگوں کو طرح طرح سے فریب دے کر، امید دلا کر لوٹتے ہیں۔ مرتب

شفاعت کی حقیقت

وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ۔ (البقرہ - ۱۲۳)

اس دن سے ڈرو، جب کوئی نفس کسی نفس کو کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔ نہ اس سے فدیہ قبول کیا جاتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی شفاعت نفع دے سکتی ہے اور نہ ان کی مدد کی جاتی ہے۔

خواجہ صاحب اس اہم بحث کے متعلق اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں:۔

انسان کو خلافت کا شرف عطا ہوا، تو یہ کسی کی سفارش سے نہیں ملا اور نہ سفارشوں کے سہارے خلافت قائم رہ سکتی ہے۔ آیات سابقہ میں فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل نے خدا پرستی اور نیک عملی کی طرف پیٹھ کرلی اور اپنے انبیاء کی سفارشوں اور کفاروں کے بھروسے پہ مطمئن ہوگئے۔ اس پر فرمایا۔

"میں نے تمہیں نعمتوں سے سرفراز کیا۔ تمہیں دوسری قوموں پر فضیلت دی۔ اس میں تمہارے زندہ انبیاء کی سفارش اور کفارے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اور اب کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تم ان کی سفارشوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہو۔ یاد رکھو، نجات حاصل کرنے کے تمام ذریعے، جو تم نے گھڑ لیے ہیں تمہارے کام نہیں آئیں گے۔ علیم الکل اور حاکم عادل کے دربار میں سفارش کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ عدالت کے روز کوئی دوسرا مالک و مختار نہیں ہوسکتا۔

یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (الانفطار - ۱۹)

اس دن کوئی شخص، کسی شخص کے لیے کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ (سارے کا سارا) معاملہ اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

اس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ ہر اعلیٰ و ادنیٰ، آدم سے لے کر آخری انسان تک ۔۔۔ کسی کو کچھ اختیار نہیں۔ یعقوبؑ فرزندوں سے کہتے ہیں: (مصر میں) ایک دروازے سے داخل نہ ہونا اور جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا، تاکہ وہ لوگ تمہاری جماعت دیکھ کر شک میں نہ پڑ جائیں اور تمہارے معاملے میں کھوج نہ لگانے لگیں) وما اغنی عنکم من اللّٰہ شیئًا - اور میں اللہ کے ہاں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا ...... الخ رجب رسول اس دنیا میں خدا کے ہاں سفارش نہیں کرسکتے اور اس کے فیصلے کو ٹال نہیں سکتے اور اسی پر توکل کرتے ہیں تو کیا جزا کے دن جہاں خدا کے سوا کسی کا اختیار نہیں سفارش کرسکتے ہیں (سورہ یوسف، ۲ منزل سوم ص۱۲۳) اُس دن کوئی نفس بشر ایسا نہیں، جس کو اپنی نہ پڑی ہو پھر سفارش کا کس کو ہوش ہوگا؟

یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۔

اس دن ہر شخص اپنے ہی (چھٹکارے کے) لیے جھگڑتا (اور نفسی نفسی پکارتا) ہوا آتا ہے، اور ہر شخص کو (بلا سفارش) اس کے عمل کا پورا

(النحل - ۱۱۱) بدلہ دیا جاتا ہے ـــــ اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔

خواجہ صاحب اپنے عقیدے کے مطابق حال کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔

کیا ایسے دن کسی غیر خدا کی سفارش تصور میں بھی آسکتی ہے ؛ جس کے متعلق ارشاد ہے :۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا۔ اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کچھ بھی کام نہیں آتا۔

عمر بھر کفر و شرک و عصیان میں مبتلا رہ کر شفاعت کی امید رکھنا ایک ایسا خواب ہے، جس کی تعبیر کبھی نہیں نکلے گی، وہاں تو مومنوں کو بھی اپنے ایمان و عمل اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے سوا کوئی چیز کام نہیں دے گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ (البقرہ - ۲۵۴)

اے اہل ایمان ! اُس دن کے آنے سے پہلے ہمارے دیئے ہوئے سے خرچ کرلو، جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوتی ہے اور نہ کوئی دوستی و سفارش (کام دے سکتی ہے) اور کافر جو ایسے خیالوں میں مست ہیں اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔

مومنوں کا شفاعت سے کوئی واسطہ نہیں

قرآن عظیم کو اول سے آخر تک دیکھ جائیے۔ مومنوں کو مخاطب کر کے کسی شفیع الذنبین انسان کی شفاعت کی امید نہیں دلائی گئی۔ اور یہ بھی کہیں نہیں فرمایا کہ مومن دوسرے عالم میں کسی وقت بھی سفارش کرنے والوں کی تلاش میں نکلیں گے ـــــ البتہ بدعمل کفار شفاعت کے بھروسے پر جو چاہتے ہیں، کر گزرتے ہیں۔

کفار شفاعت کے امیدوار

يَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ ۚ (یونس - ۱۸) کہتے ہیں ـــــ " اللہ کے حضور یہ ہمارے سفارشی ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے !

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۚ (الزمر - ۴۳) کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا سفارشی بنا رکھے ہیں ؟

آخرت اور اللہ کے منکر پیشی کے دن کہہ رہے ہیں۔

فَهَل لَّنَا مِن شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا (الاعراف ۵۳) سو اب کوئی ہمارے سفارشی ہیں ! تو وہ ہماری سفارش کریں۔

ان آنے والوں نے بتا دیا کہ سفارشوں کے متلاشی اور امیدوار مومن نہیں صرف کفار ہیں۔ انہی لوگوں کے جواب میں فرمایا :

" کیا یہ تمہارے شفیع میرے اذن و رضا کے بغیر سفارش کر سکیں گے ، اگر میں نے انہیں اذن دیا ، ان سے وعدہ کیا۔ اور ان کی سفارش کو پسند کیا تو یقیناً سفارش ہو سکے گی ، اور میں کسی معذور پر رحمت کرنا چاہوں تو کیا اس میں مجھے کسی شفیع کا انتظار حائل ہو سکتا ہے ؟ (اس مفہوم کی آیات متعدد جگہ قرآن میں ملتی ہیں اور خواجہ صاحب نے اپنے انداز میں ان کی تفسیر کی ہے)

قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے اہل جنت کا ذکر فرمایا گیا ہے ، لیکن اول سے آخر تک ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جس میں کسی

ایک بہشتی کے بذریعہ شفاعت داخلِ بہشت نہ ہونے کا بیان ہو، بلکہ داخلے کا ذریعہ عمل بتایا گیا ہے۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ اُورِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الزخرف ۷۲) — یہ وہی بہشت ہے جس کے تم وارث ہوئے اپنے اعمال کے بدلے میں۔

اس سے چند آیات آگے بڑھیں تو یہ آیت آتی ہے۔ جس میں شفاعت پرستوں اور شفیعوں کا بیان ہے۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (الزخرف ۸۶) — یہ لوگ خدا کے سوا جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کچھ اختیار نہیں رکھتے۔ مگر وہی (خدا) جس نے (قرآن میں) سچی گواہی دے دی ہے اور یہ (کفار اسے) سمجھتے ہیں۔

خدا کی گواہی دیکھئے آیات ذیل ہیں:

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ (الانعام ۔ ۱۹) — کہہ دیجئے سب سے بڑا گواہ کون ہے؟ کہہ دیجئے "اللہ" گواہ ہے میرے اور تمہارے درمیان اللہ نے گواہی دی کہ

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (آل عمران ۱۸) — اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (وغیرہ ذالک من الآیات)

شفاعت کے متعلق خصوصاً اللہ کی گواہی سنیئے:

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا (زمر ۔ ۴۴) — کہہ دیجئے! سفارش ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

یہاں "جمیعًا" کا لفظ پوری طرح احاطہ کر رہا ہے کہ شفاعت کی کوئی قسم[1] اور کوئی جزو ایسا نہیں جو کسی غیر اللہ کے اختیار میں ہو۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کا عدل ظالموں سے انتقام لے گا تو دوسری طرف اُسی کی رحمت معذوروں کی سفارش ہوگی۔

نفس شیطان زد کریما راہِ من
رحمت باشد شفاعت خواہِ من

جن کا اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے، ان کے لئے اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کافی شفیع ہے اور جن کا نبیوں، ولیوں پر بھروسہ ہے، وہ سوچ لیں:

فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (الانعام ۸۲) — دونوں گروہوں میں سے کون امن کا زیادہ حق دار ہے۔ (الانعام ۸۲)

تین قسم کے لوگ | پیشی کے دن لوگ تین قسموں میں منقسم ہوتے ہیں۔ اصحاب النار، اصحاب الجنۃ اور اصحاب الاعراف۔

---

[1] شارحین حدیث نے حضورؐ کے لیے دس قسم کی شفاعتیں ثابت کی ہیں۔ فتح الباری میں ملاحظہ فرمایئے۔ منہ

موخر الذکر نہ ناری ہیں، اور نہ ناجی، لیکن ناری و ناجی دونوں کو ان کے خاص نشانوں سے پہچانتے ہیں۔ یہ لوگ دین حق کی تلاش کرتے ہوئے راہی آخرت ہوئے۔ وہ دونوں مقدم الذکر گروہوں کی حالت دیکھ کر اصحاب الاعراف کہتے ہیں:

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۔ (الاعراف۔ ۴۷) اے ہمارے رب! ہم کو ظالم قوم کے ساتھ نہ کیجیے۔

اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول فرماتا ہے اور اپنی رحمت سے ان کو نوازتے ہوئے فرماتا ہے:

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (الاعراف۔ ۴۹) (تم بھی) جنت میں داخل ہو جاؤ بے خوف اور بے غم ہو کر۔

یہ نتیجہ ہے ان کی سچی معذوری اور اعتماد علی اللہ کا۔ اگر انہوں نے کسی انسان کی شفاعت پر بھروسا کیا ہوتا، تو ان کے لیے جنت کا دروازہ ہرگز نہ کھل سکتا۔

مقام محمود شفاعت کے ثبوت کے لیے آیہ ذیل پیش کی جاتی ہے۔

عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ (بنی اسرائیل۔ ۷۹) قریب ہے کہ تیرا رب تجھے تعریف کے مقام پر کھڑا کر دے۔

کہا جاتا ہے کہ "مقام محمود سے مراد مقام شفاعت عظمیٰ ہے یحمدہ اہل الجمع کلھم (بخاری) یعنی سب لوگ جو اس موقع پر جمع ہوں گے آپ کی حمد کریں گے..... اور بعض احادیث میں مقام محمود سے مراد شفاعت لی گئی ہے۔

اگر پہلے سے ہی ایسا عقیدہ ذہن میں نہ جمالیا ہو اور صرف آیت کے سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو ساری دنیا میں ایک شخص ایسا نہیں ملے گا۔ جو روایتی تفسیر سے ہم آہنگ ہو۔

اوپر کے رکوع میں مکی زندگی کے مصائب کا ذکر ہے جب کہ دشمن گالیاں دیتے، معاندانہ پروپیگنڈا کرتے، قتل، قید یا جلاوطن کر دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپؐ کو تلاوت فجر اور صلوٰۃ لیل کے بعد پیش خبری پر مشتمل بشارت اور تسلی دیتا ہے۔ کہ آج آپ کو زیادہ سے زیادہ برا کہا جا رہا ہے۔ وہ وقت دور نہیں، جب آپ کی خوبیاں بیان کی جائیں گی۔ چنانچہ سارا عرب آخرکار آپ کے دین کا پیرو ہو کر آپ کے زیر حکومت آ گیا۔ سب نے تسلیم کیا کہ آپؐ نے ملک کو ادبار و جہالت کی پستیوں سے اٹھا کر دین و دنیا کی بلندیوں پر پہنچایا۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی   اک آواز میں سوتی بستی جگا دی (حالی)

آپؐ کی رحلت کے بعد سے آج تک مسلموں کے علاوہ غیر مسلم، منصف مزاج، اہل علم نے آپؐ کی مسلمہ خوبیوں کا اتنا اعتراف کیا کہ اس سب کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ آج دنیا کا کوئی متمدن گوشہ ایسا نہیں جہاں آپؐ کا ذکر مبارک نہ پہنچ چکا ہو۔ اور کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا۔ جب کہ کسی نہ کسی جہت سے تمام براعظموں کے مراکز اور دیگر مقامات میں آپ کی حمد نہ کی جاتی ہو ـــ یہ ہے نقد و حاضر مقام محمود نہ کہ وہ جس کا ذکر صرف بعض کتابوں میں ملتا ہے کہ دنیا کے خاتمے پر قیامت کے موقع پر حاصل ہوگا۔

اگلی آیت میں ہجرت اور غلبۂ اسلام کی پیش خبری ملتی ہے:

قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ ..... الخ (بنی اسرائیل ۸۰)

یعنی اے رب جہاں مجھے پہنچانا ہے (مدینے میں) اگر وہ خوبی اور خوش اسلوبی سے پہنچا۔

مطلب یہ ہوا کہ آیہ "مقام محمود" کے ایک طرف مکے کی ایذائیں اور دوسری جانب مدینے کی فتح مندیاں ہیں۔ درمیان میں شفاعت کا کون سا موقع نکل آیا؟ ایسی تفسیر بالآیات سے بے پروائی کا نتیجہ ہے۔

بنی اسرائیل کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ جن اماموں اور رسولوں کو تم اپنا شفیع سمجھ رہے ہو۔ وہ خود بھی صبر و ابتلا کے مقامات سے گزر کر ہی ترقی حاصل کر سکتے تھے وہ کسی کی شفاعت کا خیال تک نہیں کرتے تھے۔ قال تعالیٰ:۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ۔ (السجدہ - ۲۴)

(بنی اسرائیل میں) ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔ جب کہ وہ صبر و استقلال میں پورے اترے اور ہماری آیات پر (کامل) یقین رکھتے تھے۔

ابتلائے ابراہیمؑ

حضرت ابراہیمؑ کو بھی ابتلا سے گزر کر ہی امامت ملی۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ (البقرہ - ۱۲۴)

جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو وہ آزمائش میں پورے اترے۔

قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (")

فرمایا میں تجھے لوگوں کا امام بناؤں گا۔

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ (")

عرض کیا، اور میری اولاد میں سے بھی (امام بنائے جائیں گے؟)

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ (")

فرمایا، میرا یہ عہد (امامت) ظالموں کے لیے نہیں ہے — مطلب یہ ہوا کہ اتنے عظیم نبی اللہ کے دوست اور جد الانبیاء کی دعا ہو یا سفارش — نہ باپ کو جہنم سے بچا سکتی ہے اور نہ ظالم اولاد کو ان کے فضائل کا وارث بنا سکتی ہے۔ اسی طرح ان کی اولاد کو بھی امتحان ہی میں کامیاب ہو کر سرفرازی مل سکتی ہے۔

آیات مخصوصہ شفاعت

بعض خاص آیات جن سے شفاعت کی گنجائش نکالی گئی ہے، خواجہ صاحب انہی کے الفاظ سے شفاعت کی نفی ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً:

وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (الانبیاء ۲۸)

اور وہ شفاعت نہیں کرتے مگر جس کے لیے (خدا خود ہی) راضی ہو (اور ظاہر ہے کہ خدا کی رضا کے بعد کسی کی شفاعت کی ضرورت ہی نہیں ہو سکتی۔ وہ کس طرح شفیع بن سکتے ہیں، جب کہ وہ اپنے معاملے میں بھی ڈر رہے ہیں) اور وہ اس کے خوف سے لرزتے ہیں (منزل چہارم ص۲۲۵)

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ (یونس - ۳)

کوئی شفیع نہیں بن سکتا مگر اس کے اذن کے بعد (یعنی اذن پہلے

ہونا چاہیئے۔ جب اذن ہو گیا تو شفیع کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اللہ کسی کے بخشنے کا ارادہ کرے تو کسی کو اس بخشش میں اپنے ساتھ ملانے کی ضرورت نہیں) (منزل سوم صفحہ ۲)

۲۔ یَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (طٰہٰ۔ ۱۰۹)

اس دن شفاعت کوئی نفع نہیں دیتی۔ ہاں جس کو خدا نے اذن دے دیا ہو اور اس کے لیے (کسی دوسرے کو) کہنا اور اس دوسرے کو اپنے ساتھ شامل کرنا) پسند کیا ہو (کفار شفاعتوں کو مانتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کیا تمہارے شرکا میرے اذن کے بغیر شفاعت کر سکتے ہیں؟ خدا جس کا فیصلہ ناطق ہے۔ اگر اس نے کسی کو ایسا اذن دیا ہے تو اسے پیش کرو۔ پس تمہارے قول کے مطابق تمہاری سفارش ہو نہیں سکتی۔ اور مومنوں کو صرف اللہ کی رحمت پر بھروسہ ہے۔ وہ کسی شفاعت کے قائل نہیں۔ کیا خدا خود ہی ان کے لیے کافی نہیں؟ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ ؕ (زمر۔ ۳۶) خدا کے فیصلے کے بعد کسی اور کے دخل کی گنجائش ہی نہیں رہ سکتی۔ شفاعت کے ماننے والے مشرکوں سے کہا ہے کہ اذن کے بغیر شفاعت نہیں ہوگی اور مشرکوں کی شفاعت از روئے قرآن ناممکن ہے۔

اگر اس قسم کی آیات سے امکان شفاعت نکالا جائے تو سب سے پہلے مشرکوں کے لیے ہونا چاہیئے۔ جو اس کے قائل ہیں اور مومن جو شفاعت کے قائل ہی نہیں۔ اور انہیں معلوم ہے لَا شَفَاعَةٌ (بقرہ۔ ۹۷) اور لَا شَفِيعٌ (انعام۔ ۵۲) اور انہی کے لیے ہے یہ ارشاد کہ

لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ؕ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (الزمر۔ ۵۳)

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ اللہ سب گناہوں کو بخش دے گا وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

مومنوں کو کبھی نہیں کہا گیا کہ تمہارے لیے شفاعت کا اذن دینے کی ضرورت ہے (منزل چہارم تفسیر ص ۲۰۳، ۲۰۴)

قدامت مکّہ اور تعمیر کعبہ

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ
وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ
اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا
وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔

(البقرہ - ۱۲۷ تا ۱۲۹)

جب ابراہیم اور اسماعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو کہہ رہے تھے) اے ہمارے رب! (اس عاجزانہ خدمت کو) ہم سے قبول فرما تو سننے، جاننے والا ہے۔

اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار (مسلم) بنا! اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو مسلم (فرماں بردار) بنا اور ہمیں اصلاح کے طریقے (مناسک) سکھا۔ ہم پر نگاہ کرم رکھ۔ بے شک تو رحمت سے توجہ فرمانے والا ہے۔ اور ان میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرما۔ جو ان کو تیری آیات سنائے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے بلاشبہ تو غالب اور حکیم ہے۔

ان آیات سے خواجہ صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

ابراہیم اپنے جوان فرزند اسماعیلؑ کو مکے لے گئے تھے۔ مکہ پہلے سے آباد شہر تھا۔ باپ بیٹے نے مل کر مسجد کعبہ کو اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا اور اپنی اولاد کو اس مسجد کے حوالے میں بسایا تھا۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ایک بیوی کے کہنے سے دوسری بیوی اور اس کے شیر خوار بچے کو جنگل میں چھوڑ گئے اور یوں ان بے گناہوں کو جلا وطنی کی سزا دی۔ یہ بات ابراہیم ایسے (اواہ حلیم) دردمند، بردبار بزرگ کی شان کے خلاف ہے۔

ابراہیمی قبلہ

سمت قبلہ کے متعلق خواجہ صاحب کی تحقیق بالکل انوکھی معلوم ہوگی۔ انہوں نے اس نازک مبحث پر بڑی محنت سے سیر حاصل بحث کی ہے اور اپنی طرف سے اس کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی ہے اور سابق و لاحق آیات کو اپنی تائید و استدلال کے طور پر پیش کیا ہے۔ اُن کے استدلال کے ضعف و قوت کو جانچنا بالغ نظر اہل علم کا کام ہے۔

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ط قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ..... (البقرہ ۱۴۲)	بے وقوف لوگ ضرور کہہ اٹھیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے سابق قبلے سے کس چیز نے پھیر دیا؟ کہہ دیجئے کہ پورب اور پچھم اللہ ہی کے ہیں.....

خواجہ صاحب کا کہنا ہے۔

قرآنی دلائل

بقرہ کے رکوع ۱۴ میں قبلوں کی اصلاح کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ کسی ملک یا قوم کا مخصوص قبلہ ایک عالمگیر اور ابدی دین کا جزو لاینفک نہیں ہو سکتا۔ خدائے واسع و علیم کی عبادت صرف کسی ایک جہت کی طرف رُخ کرنے سے مقبول اور دوسری جہتوں کی طرف ہو تو مردود ٹھہرے ـــ اس میں کیا خوبی ہے؟ جب کہ خود اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق تمام جہات اللہ ہی کی ہیں۔ پھر ان میں سے کسی ایک کو ترجیح کیسے ہو سکتی ہے!

قرآن پاک مساجد سے متعلق بحث کرتے ہوئے اس پر روشنی ڈالتا ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ق فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ۔ ۱۱۵)	مشرق ہو یا مغرب، سب جہتیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ لہٰذا تم جس طرف بھی رُخ کرو گے، اُدھر ہی اللہ تعالیٰ کو متوجہ پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً فراخی والا، علم والا ہے[۱]

جس کتاب میں یہ نص صریح موجود ہو۔ اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ایک مخصوص جہت سے ہٹا کر دوسری مخصوص جہت کا پابند بنا رہی ہے، ایسا ہی ہے، جیسے "فرمن المطر و وقع تحت المیزاب" بارش سے بچ کر پرنالے کے نیچے آ کھڑے ہونا۔

ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا کوئی قبلہ نہ تھا، وہ مسجد کعبہ کے اندر نماز پڑھا کرتے تھے۔ ان کو حکم تھا کہ کعبے کو ہر قسم کے نمازیوں کے لیے

---

[۱] فتوحات مکیہ باب ۶۹ میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی لکھتے ہیں، مجھ سے پہلے اگر اجماع نہ ہو چکا ہوتا تو میں یہ نہ کہتا کہ نماز کی صحت کے لیے کعبے کی طرف رُخ کرنا شرط ہے اس لئے کہ آیت سابق الذکر محکم اور غیر منسوخ ہے لیکن اجماع اسی دوسری آیت پر منعقد ہے۔

اندر سے صاف رکھیں۔ ہم کو بھی حکم ملا کہ مقام ابراہیم کو مصلّٰی (نماز کی جگہ) بناؤ۔ صاحب مکان کا مقام مکان کے اندر ہوتا ہے نہ کہ باہر اصل مقام یا مسجد کو تالا لگا رکھنا اور بلا ضرورت اس کے ارد گرد کو معبد بنانا، تعمیر مسجد کے مقصد کو فوت کرنا نہیں تو کیا ہے؟ ہاں اندر کی معموری کے بعد ضرورتاً باہر کا حصہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ کعبہ کے اندر نماز کی کوئی مخصوص جہت جیسے ابراہیمی عہد میں نہیں تھی، آج بھی نہیں ہے ع

"اندرون کعبہ رسم قبلہ نیست"، (رومیؒ)

قرآن پاک میں ابراہیمی قبلے کی اطلاع آیہ ذیل دے رہی ہے:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ — میں یک سو ہو کر اپنی توجہ اس ذات کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں اہل شرک میں سے نہیں ہوں۔ (الانعام - ۸۰)

کعبے کے اندر نماز کا بے قبلہ ہونا آج بھی ہمیں حقیقی سب جہت یا ہر جہتی قبلے کی حقانیت کی طرف دعوت دے رہا ہے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود\
قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں (غالب)

اگر ابراہیمؑ کا کوئی خاص قبلہ ہوتا تو حجاز و عرب کے لوگ اس سے بے خبر نہ ہوتے۔ حضورؐ چودہ پندرہ برس تک قبلہ یہود کی طرف نمازیں نہ پڑھتے۔ یہودیوں کا قبلہ مسلمانوں کا قبلہ اول مشہور نہ ہو سکتا۔ حضورؐ نے بیت المقدس کو حضرت داؤدؑ کا قبلہ سمجھ کر اختیار کئے رکھا، لیکن آپؐ کو اس میں کوئی خصوصیت اور حکمت نظر نہ آئی۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی نبی کو ابراہیمی قبلے سے روگردانی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ ضرور تھا کہ سب نبی حج کعبہ کے لیے آتے اور اپنی تعلیم پھیلاتے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کہتے ہیں حضورؐ سے پہلے "خلیلؑ و اسماعیلؑ کے بعد کوئی نبی نہیں آیا، قریش کا امّی رہنا، بے علم اور بے نبی ہونا خود عرب میں مشہور تھا۔

حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد (بحکم قرآن) دین اسلام کے پابند تھے، لیکن کعبے کو بحیثیت قبلہ وہ بھی نہیں جانتے تھے۔ عالمگیر اسلام مصنوعی نشانوں، لباسوں اور رنگوں کا حامی نہیں،

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔ — حقیقی رنگ اللہ کا رنگ ہے اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہو سکتا ہے؟ (البقرہ - ۱۳۸)

اگر انبیاء رسم و رواج کے مطابق یا کسی آزمائشی حکم کے تحت، مناسب وقت کے لیے کوئی کام کریں تو وہ کام دائمی اصول نہیں بن سکتا۔ اسی لیے فرمایا،

وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (البقرہ - ۱۴۱) — جو کچھ وہ کرتے تھے، اس کے متعلق تم سے سوال نہیں ہو گا۔

آزمائشی اور وقتی حکم کی مثال دیکھئے۔ طالوت اپنے لشکروں سے کہہ رہے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ (البقرہ ۲۴۹)

اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر کے ذریعے آزمانے والا ہے۔ سو جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا، وہ مجھ سے نہیں ہے اور جو اس سے نہ چکھے وہ مجھ سے ہے، الا یہ کہ کوئی ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔

یہاں اللہ تعالیٰ فوجوں کے امتحان صبر کے لیے ایک حکم دیتا ہے، لیکن یہ حکم دائمی اصول نہیں —— اسی سورۃ میں آگے چل کر پوری وضاحت سے قبلوں کی حقیقت کا انکشاف فرماتا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (البقرہ ۱۷۷)

مشرق و مغرب کے قبلوں[1] کی طرف تمہارا منہ کرنا کوئی نیکی نہیں ... (البقرہ ۱۷۷)

اس سے زیادہ صریح و مبین انداز بیان کہاں سے آئے گا؟

مصلحت ہر اجتماع میں جگہ اور وقت کی مناسبت سے سٹیج ایک طرف نصب کیا جاتا ہے اور تمام حاضرین کا رخ اسی طرف ہوتا ہے۔ اسی طرح کعبے کے اندر وعظ و نماز کے لیے امام اور مقتدیوں کی صواب دید کے مطابق ایک جہت مقرر ہونی چاہیئے۔ مومنوں کے تمام کام جن کی صراحت وحی میں نہیں، باہمی مشورے سے انجام پانے چاہئیں أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (شوریٰ ۳۸)

ممکن ہے کہ ہماری موجودہ جہت صلوٰۃ و مساجد یک جہتی اور انتظام کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے مقرر فرمائی ہو۔ اس کو جاری رکھنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے۔ لیکن اس کو داخل اسلام، جزو نماز اور اصل دین سمجھنا قرآن کریم کے بین الاقوامی مقاصد کے منافی ہے۔ خدائے واسع علیم جہت، مکان اور زمان سے یقیناً منزہ ہے، مخصوص قبلوں کا وحی سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس کا تعلق صرف حسب حال شوریٰ سے ہے[2]۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ

آپ جس قبلے پر تھے۔ ہم نے اسے آزمائشی طور پر مقرر کیا تھا کہ اس زمانے کے رسول کی کون پیروی کرتا ہے اور کون

---

[1] خواجہ صاحب نے "قِبَل" کو قبلہ کی جمع سمجھا ہے غالباً وہ اس میں منفرد ہیں۔

[2] مولانا ابوالکلام حاشیہ آیۃ "ولکل وجھۃ ھو مولیھا" میں لکھتے ہیں۔

تقرر قبلہ کا معاملہ کوئی ایسی بات نہیں جو دین کے اصول و مہمات میں سے ہو، اور اسے حق و باطل کا معیار سمجھ لیا جائے ... عبادت جس طرف بھی منہ کر کے کی جائے، خدا کی عبادت ہے، وہ تو کسی ایک جہت میں محدود نہیں۔ اصل چیز جو سمجھنے اور کرنے کی ہے؛ وہ "خیرات" ہے، یعنی، نیک عمل۔

عَلٰی عَقِبَیۡہِ ط (البقرہ - ۱۴۳) الٹے پاؤں پھر جاتا ہے؟

خواجہ صاحب کہتے ہیں۔ کہ جب بھی بیت المقدس کو بطور قبلہ مقرر کیا گیا تھا، اُس سے مقصود اُس وقت کے رسول کے پیچھے جھوٹے پیروؤں کو متمیز کرنا تھا۔ یہ کوئی اصولی چیز نہ اس وقت تھی نہ بعد میں ہو سکی بعض چند روزہ آزمائش تھی۔ سچے پیروؤں کے سوا دوسرے لوگوں کو اس زمانے میں یہ تعیین گراں گزری تھی۔ اور مسلمانوں نے بطور جواز اس کی طرف رخ کر لیا تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، اس سے ان کے ایمان کے ضیاع کا کوئی اندیشہ نہیں۔ جیسا کہ خود فرمایا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيۡعَ اِيۡمَانَكُمۡ (البقرہ ۱۴۳) اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں

قَدۡ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِى السَّمَآءِ۔ (البقرہ ۱۴۴) ہم آسمان میں تیرے منہ کا بار بار اٹھنا دیکھ رہے ہیں۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں۔ کہ رسول کریم کو اہل کتاب کی اس تخصیص جہت میں کوئی حکمت نظر نہیں آتی تھی۔ آپ فضائے آسمانی میں ہر طرف دیکھتے۔ کسی جہت کو ترجیح معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ہر طرف جلوۂ ربانی یکساں ضیا افگن نظر آتا فاینما تولوا فثم وجہ اللہ کون سی جا ہے، جہاں وہ قبلۂ اہل نظر موجود نہیں۔

اے کہ در ہیچ جا نداری جا در عجب ماندہ ام کہ ہر جائی!

اے آں کہ ز معرفت بفرقت تاج است با تست ہے کہ عالمش محتاج است

بکشائے نظر کہ ہر نظر دیدار یست بردار قدم کہ ہر قدم معراج است (سحابی نجفی)

آپ کے اس ذوق تحقیق (تقلب وجہ) پر ارشاد ہوا کہ ہمیں تیرا مافی الضمیر معلوم ہے۔ اب تیرے لیے تیرا پسندیدہ قبلہ ہوگا۔ پس تو مسجد حرام کی ہر جہتی کو اپنا امام بنا لے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاف کیوں نہ کہہ دیا کہ "تمہارے لیے سب جہتیں یکساں ہیں۔ جدھر چاہو نماز ادا کر لو"۔ اس سوال کا جواب خود قرآن نے پہلے دے رکھا ہے۔

وَلِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ فَاَيۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ (البقرہ - ۱۱۵) مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں۔ جدھر تم رخ کرو، ادھر ہی اللہ تعالیٰ کو متوجہ پاؤ گے۔

لیکن اس مقام پر ایک دلیل بھی دے دی گئی ہے کہ مسجد حرام تمہارے سامنے موجود ہے۔ یہ تمہارے مسلم بزرگ ابراہیم علیہ السلام کا نشان ہے۔ اس کی جہت صلوٰۃ بیت المقدس وغیرہ تمام قبلوں سے قدیم تر اور مستند ہے۔ اب تم دیکھو اس کا شطر یعنی رخ کدھر ہے! ظاہر ہے کہ چاروں طرف ہے اور اس کی حقانیت سے اہل کتاب بھی انکار نہیں کر سکتے۔ پس ابراہیمی قبلہ چاروں طرف ہوا۔

انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا۔ میں یک سو ہو کر زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی طرف رخ کرتا ہوں۔

اور بعد کے بنے ہوئے قبلے نہ دائمی ہیں، نہ اصولی۔ ان میں ھدی للعالمین (بین الاقوامی) ہونے کی صلاحیت نہیں۔ کعبہ ہی وہ ہے

هدی للعالمین ہے۔ کہ اس میں نسل و وطن کی تخصیص نہیں۔
تعیین قبلہ کے متعلق اہل کتاب کے مختلف گروہوں میں اختلاف چلا آرہا تھا۔

وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ۔ (البقرہ - ۱۴۵) — ان میں سے بعض، بعض کے قبلے کو تعلیم نہیں کرتے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ (ایضاً) — اگر تم ان کی خواہشات پر چلے بعد اس کے کہ تمہارے پاس علم آپہنچا۔ تو یہ تمہاری بے انصافی ہوگی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قبلے کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ علمی۔ جس کی بنیاد علم پر ہو۔ کوئی صاحب علم اس کا انکار نہ کر سکے۔
۲۔ اہوائی۔ یعنی رسمی، تقلیدی جس کا علم سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

ابراہیمؑ کا ہر جہتی قبلہ علمی ہے۔ خدا کے واسع علم کی عالمگیر عظمت و وسعت کے لائق ہے۔ اس کے سوا تمام قومی اور ملکی قبلے خاص قوموں کی اپنی اپنی اہوار (خواہشات) کے مظہر ہیں۔

اہل کتاب ابراہیمؑ کی عظمت کا اظہار نہیں کر سکتے اور نہ ابراہیمؑ ہی کو اپنے مختلف قبلوں کا پابند ثابت کر سکتے ہیں۔ لہذا وہ اپنے علیم باپ ابراہیمؑ کے ہر جہتی قبلے کا انکار نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ اسے ایسا ہی جانتے پہچانتے تھے۔ جیسے کوئی شخص اپنی اولاد کو جانے پہچانے۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ (البقرہ ۱۴۶) — جن کو ہم نے کتاب دی ہے۔ وہ اس کو اسی طرح پہچانتے ہیں۔ جس طرح اپنے بیٹوں کو،

ان میں سے جو لوگ ہٹ پر قائم ہیں، اصلیت سے بے خبر وہ بھی نہیں، لیکن وہ دانستہ حق کو چھپا رہے ہیں۔

وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔ (البقرہ - ۱۴۶) — ان میں سے کچھ لوگ حق کو دانستہ چھپاتے ہیں۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ عملی نیکیوں میں سبقت کریں اور فروعی مباحث میں نہ الجھیں۔ اخلاص عمل ضائع نہیں جائے گا۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا۔ (البقرہ - ۱۴۸) — مختلف لوگوں کے مختلف قبلے ہیں جدھر وہ رُخ کرتے ہیں۔ تم نیکیوں میں سبقت کرو۔ جہاں کہیں تم ہوگے وہ تم سب کو جمع کرے گا۔

عقلی دلائل

خواجہ صاحب منصوص و منقول دلائل کے علاوہ عقلی و تجربی براہین بھی پیش کرتے ہیں۔
عملی لحاظ سے مخصوص قبلوں کی رعایت ہو ہی نہیں سکتی، جب تم وطن سے دور کسی مقام کی طرف نکلو گے تو ذرا سے زاویے کے فرق سے قبلے تک پہنچتے پہنچتے میلوں کا فرق پڑ جائے گا۔ مسجد حرام کی چہار جہتی، ہمہ گیری ہر جگہ سے یکساں تعلق رکھتی ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ — (سیر و سفر کی غرض سے) تو جس طرف کو نکلے مسجد الحرام کی جہت

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَإِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۔ (البقرہ-۱۴۹)

صلوٰۃ کی طرف اپنا منہ پھیر۔ تیرے رب کی طرف سے یہی اصل حق ہے۔ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

وہاں تو اعمال جانچے جاتے ہیں جہتوں کی پرستش نہیں۔

خاص کعبے کے نقطے کی طرف صحیح طور پر رخ کرنا سفر اور حضر میں ممکن نہیں۔ زمین کے کُروی ہونے کی وجہ سے مندرجہ ذیل صورتوں میں جہت کعبہ کا تقرر محال ہے۔

۱۔ اگر کعبہ اور قطبین سے گزرتا ہوا ایک بڑا دائرہ زمین کے گرد کھینچا جائے، تو وہ خانہ کعبہ کا دائرہ نصف النہار ہوگا۔ جو کُرۂ زمین کے دوسری طرف ایلاسکا، ورسبحر الکاہل کے کئی جزائر سے ہوتا ہوا انٹارکٹکا سے گزرے گا۔ اس خط نصف النہار پہ جو لوگ مقیم ہوں گے، کعبہ ان سے دونوں طرف شرقی وغربی طول بلد میں ایک سو اسّی درجے کے یکساں فاصلے پہ ہوگا۔ وہاں کے باشندے یا جہازرانی کرنے والے کس طرف منہ کرکے نماز پڑھیں؟ کیا دونوں طرف؟ کیوں کہ ان کے دونوں طرف کعبہ یکساں فاصلے پہ ہوگا۔

۲۔ جو قطعہ زمین کُرۂ ارض کے دوسری جانب کعبے کے عین مقابل ہوگا، کعبہ اس سے ہر طرف یکساں فاصلے پر ہوگا۔ بحرالکاہل میں اس نقطے کے قریب کئی جزائر دکھائی دیتے ہیں۔ نیز نئے جزائر بھی سمندر کی تہ سے اُبھرنے اور آباد ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں عام طور پر جہازرانی بھی ہوتی ہے، وہاں کے لوگ جدھر بھی رخ کریں گے۔ وہ کعبے ہی کی طرف ہوگا۔

۳۔ اگر کوئی شخص ایران، یا بلوچستان، ہندوستان یا سیام میں کعبے کی طرف منہ کرکے نماز ادا کرے، تو کیا فاصلوں کی کمی بیشی اس کی نماز کو کم وبیش بنا دے گی؟ سو، دو سو یا بارہ ہزار میل کے فاصلے سے کعبے کی طرف منہ کرنا یکساں ہے۔ اگر فاصلوں کی کمی بیشی کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کُروی زمین پر ہر جگہ آگے پیچھے منہ کرنے سے کعبے ہی کی طرف رہے گا۔ اگرچہ ایک طرف فاصلہ زیادہ ہوگا۔ دوسری طرف کم۔

۴۔ اگر کوئی شخص اپنے پہلو پر (عَلٰى جُنُوْبِهِمْ[1]) لیٹ جائے تو ہر جگہ اور ہر طرف کعبہ اس کے سامنے ہی رہے گا۔

شطر | عام مترجمین قرآن نے لفظ "شطر" کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ترجمے میں اس کے معنی ہی نہیں کئے۔

"وَلِّ" کا مصدر "تولیہ" ہے۔ اس کا معنی ہے "پھیرنا" اس کے دو مفعول آتے ہیں، ایک وہ جس کو پھیرا جائے۔ یعنی منہ دوسرا وہ جس کی طرف پھیرا جائے۔ یعنی قبلہ دونوں مفعول بنفسہٖ ہوتے ہیں، صلے کے طور پہ کسی حرف کے محتاج نہیں۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے:۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً (البقرہ-۱۴۴) ہم تجھے پھیر دیں گے اس قبلے کی طرف دیکھئے یہاں "اِلٰی" کے بغیر ہی "طرف" کا مفہوم فعل "وَلِّ" سے نکل رہا ہے اب اس میں "شطر" کا اضافہ کریں تو معنی میں بھی اضافہ ہوگا۔ مثلاً

---

[1] اشارہ ہے اس آیت کی طرف وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهٖٓ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَآئِمًا... (یونس-۱۲)
جب انسان کو دکھ پہنچتا ہے تو وہ ہم کو لیٹے، بیٹھے اور کھڑے (ہر حالت میں) پکارتا ہے۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔ تو اپنے منہ کو مسجد حرام کے شطر (جہت) کی طرف پھیر ــــ ان آیات میں "وجہتہ" اور "قبلۃ" کے معنی جہت صلوٰۃ، وجہ صلوٰۃ اور قبلہ صلوٰۃ ہی کے ہیں۔ چوں کہ مسجد حرام میں ہر طرف نماز پڑھی جاتی ہے، اس لیے مسجد حرام کی جہت صلوٰۃ ہر طرف ہے۔ یہ مسجد "ھدی للعالمین" اور ہر جائی قبلے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

قبلہ قومی شعار یا انتظام قرآن مجید کے نزدیک اصل قبلہ خدا ہے، جو ہر جائی ہے، ہر جائی قبلہ تمام مصنوعی قبلوں کی خصوصیت کو ختم کر دیتا ہے۔ اس عقیدے کے تحت نماز ہر طرف منہ کر کے ادا ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر انتظام کی خاطر، یا قومی شعار کو ملحوظ رکھتے ہوئے مخصوص قبلہ کی طرف نماز ادا کی جائے اور اس کی خصوصیت کو اصول کا درجہ نہ دیا جائے۔ اور تمام خارجیوں کی نماز کو نماز ہی سمجھا جائے اور ان کے ساتھ شامل ہو کر نماز ادا کی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

خواجہ صاحب اعتراف کرتے ہیں کہ

ہم بلا تکلف کعبے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اپنی جماعتوں میں خواہ مخواہ اختلاف پیدا کرنا حد درجہ معیوب سمجھتے ہیں۔ نماز سے ہمارا اصل مقصود خدا ہوتا ہے۔ ہم جدھر بھی رخ کریں اُسی کی طرف مخاطب ہوتے ہیں۔ ہم کسی قبلہ کو اصل نیکی نہیں سمجھتے۔

تعامل اکثر لوگ تعامل پر بہت زور دیتے ہیں اور اس کو وحی کے برابر بنا دیتے ہیں۔

دنیا میں انبیا و رسل کے وقت سے کئی تواتر و تعامل ایسے چلے آتے ہیں۔ جن کی عملی اصلاح وہ اپنے وقت میں نہ کر پائے۔

۱۔ مثال کے طور پر کعبے کی موجودہ تعمیر ابراہیمی تعمیر سے مختلف ہے اور اس تبدیلی کی ذمہ داری قریش پر عائد ہوتی ہے۔ ابتداءً کعبے کے ایک سے زیادہ دروازے تھے، قریش نے ایک ہی دروازہ مشرق کی طرف بنا دیا۔ برادران اہل حدیث تسلیم کرتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے فرمایا۔ "اے عائشہ! اگر تیری قوم نئی نئی کفر سے نہ نکلی ہوتی تو میں کعبے کو ابراہیمی طرز پر بنا دیتا اور اس میں آنے جانے کے لیے دو دروازے رکھتا" حضورؐ نے علم کے باوجود اس اصلاح کو عملی جامہ پہنانا مناسب نہ سمجھا۔ بعد میں عبداللہ بن زبیرؓ نے یہ جرأت کر کے ابراہیمی طرز تعمیر کو اپنایا۔ لیکن قدامت پسندوں نے اُسے قبول نہ کیا اور دوبارہ وہی غیر ابراہیمی تعمیر قائم کر لی۔

۲۔ تمام دنیا میں ہفتے کے سات دن تواتر و تعامل کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ اس میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ لیکن اس تعامل کی تہ میں کوئی حقیقت پنہاں نہیں۔ یہ صرف اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے نظام شمسی میں صرف سات سیارے ہیں اور چاند، سورج ان میں شامل ہیں۔

۳۔ یہود میں "سبت" کی عزت و حرمت تعامل کی حد سے بھی زیادہ کی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو پہاڑ پر جو دس حکم ملے تھے، ان میں ایک خاص "سبت" کے متعلق تھا۔ قرآن میں بھی اس کی تصدیق موجود ہے (قلنا لھم لا تعدوا فی السبت) اس کے باوجود خود قرآن ہی کے ارشاد کے مطابق یہ محض ایک سزائی حکم تھا، جس میں کوئی خیر و خوبی نہ تھی۔

۴۔ نصاریٰ میں "عشائے ربانی" کا تعامل چلا آ رہا ہے۔ انجیل میں اس کے متعلق مسیحؑ کا حکم موجود ہے، جس کو کفارے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ کفارہ خود ہی باطل ہے۔ لہٰذا تعامل کے زور سے کوئی باطل، حق نہیں بن سکتا۔

۵- ہمارے کعبے میں ایک سنگ سیاہ کو چومنے کا تعامل چلا آرہا ہے۔ لیکن قرآن مجید فرماتا ہے۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ (الحج ۳۰)

ان پتھروں کی پلیدگی سے بچو (جن کی پوجا کی جاتی ہے) اور جھوٹی بات (اور روایت) سے بچو۔ (ترجمہ خواجہ صاحب)

اس آیت میں حجر اسود کے تقدس کو مٹایا گیا ہے اور اسے ان محرمات میں داخل کیا گیا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔ لوگ اس کے متعلق جھوٹی روایتیں بیان کرتے ہیں، ان سے بھی بچنے کی تاکید کی ہے۔ کوئی کہتا ہے، اسے آدم علیہ السلام بہشت سے لائے تھے۔ پہلے اس کا رنگ نورانی تھا۔ ہمارے گناہوں کے سبب سیاہ ہو گیا۔ وغیرہ وغیرہ (منقول از بیان للناس۔ تفسیر سورۂ حج)

خواجہ صاحب لکھتے ہیں۔

قرآن کی اہمیت

ہمارے پاس سب سے بڑھ کر تعامل و تواتر قرآن مجید ہے۔ جو کبھی روایت اور راویوں کی شہادت در شہادت کا محتاج نہیں ہوا اس کے حافظ ہر وقت ہر جگہ ملتے ہیں۔ اس کی کتابت ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے۔ اس کی حفاظت کے وعدۂ ربانی میں بھی کسی تلاوت کرنے والے نے شک نہیں کیا۔ عہد صحابہؓ کا لکھا ہوا قرآن آج بھی موجود ہے۔ اس کے من جانب اللہ ہونے کے دلائل اس کے اندر موجود ہیں۔ یہ رسول کریم کے عہد کی یقینی تاریخ ہے۔ (جس کا مصنف خود اللہ تعالیٰ ہے)۔ لہٰذا عہد رسولؐ کی جو خبر قرآن کے اندر موجود ہوگی اس کے خلاف کوئی تعامل کچھ وزن نہیں رکھتا۔۔۔۔۔ غرض یہ کہ وہ تواتر جو وحی کے خلاف ہو ناقابل اعتبار ہے۔

قرآن ہر ملک و قوم اور ہر ماحول کی ضروریات کے مطابق ہے۔ اس کا تعلق کسی خاص زمانہ یا خاص ماحول یا خاص فہم یا خاص تعامل کے ساتھ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ قرآن ہر وقت ایسا ثابت ہونا چاہیئے کہ گویا آج کی ضرورتوں کے مطابق آج ہی نازل ہوا ہے۔ یہ ہر وقت تازہ اور نیا ہے اور کبھی پرانا نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابراہیمؑ کا کوئی مخصوص مکانی قبلہ نہیں تھا۔ ملت ابراہیم (جس کی پیروی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے) سیدھا سادھا موحدانہ طریقہ تھا۔ جب (آخری نبوت میں) نوع انسان کے اتحاد کے لیے ملت ابراہیمی پیش کی گئی تو مخصوص قبلوں کی خصوصیت کو ختم کرنا ضروری سمجھا گیا۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ إِبْرَاهِيْمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ (البقرہ ۱۳۰)

اور ابراہیم کی ملت سے منہ موڑنے والا سوائے احمق کے اور کون ہو سکتا ہے؟

ابراہیم نے اپنے بیٹوں اور یعقوب نے اپنی اولاد کو وقت رحلت اسلام ہی کی وصیت کی تھی۔ وہ یہودیت و نصرانیت ایسی فرقہ پرستیوں سے بیزار تھے۔ اور ان کے مخصوص قبلوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے۔

اللہ نے فرمایا ہے کہ مشرق اور مغرب کے قبلے کوئی نیکی نہیں ہیں (لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ) نیکی (نماز وغیرہ عبادات و اعمال ہیں۔

بعض علماء[1] بھی محسوس کرتے ہیں کہ عین کعبہ کی طرف منہ کرنا عام حالات میں تکلیف مالا یطاق ہے۔ اسی وجہ سے خدائے تعالیٰ نے مسجد حرام کی طرف منہ کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ مسجد حرام کے شطر کی طرف منہ کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ لیکن اس کے نزدیک شطر سے مراد وہ جہت ہے۔ جس میں خانہ کعبہ نمازی کی نسبت سے واقع ہے۔ نقشۂ ذیل سے کعبے کی اس جہت (شطر) کے معلوم ہو سکتے ہیں۔

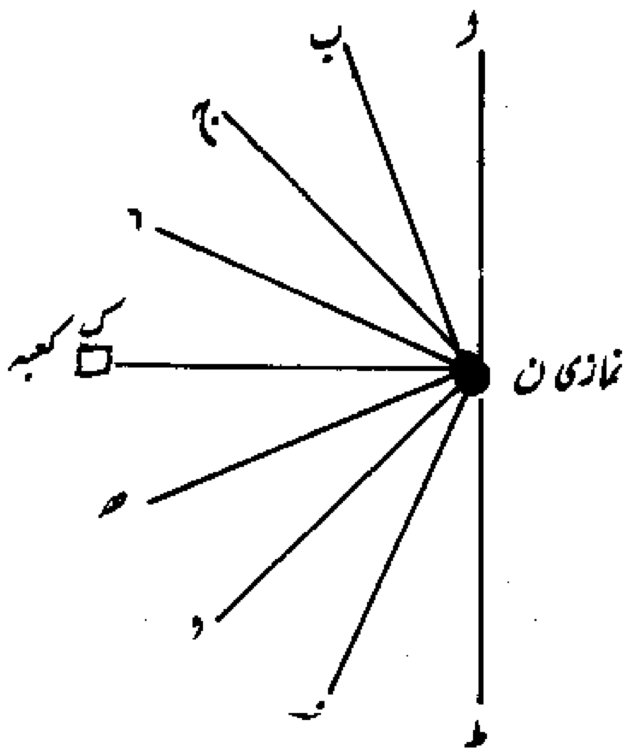

اس نقشے میں کعبے اور نمازی کے درمیان ک، ن ایک خط مستقیم کھینچا گیا ہے۔ یہ خط دوسرے خط مستقیم ا، ط پر عمود ہے۔ نمازی اس کے نقطہ ن پر کھڑا ہے۔ باقی خطوط نمازی سے کعبے کی جہت میں کھینچے گئے ہیں۔

جہت کے اس مفہوم کے پیش نظر اگر نمازی کعبے کی بجائے ب، ج، د، ھ، و اور ز کے نقاط کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے تو جائز ہے۔ کیوں کہ یہ تمام نقاط اس جہت میں واقع ہیں، جس میں خانہ کعبہ نمازی کے لحاظ سے واقع ہے۔

اس بیان سے ہر جائی قبلے کے نیم یعنی تقریباً نصف کا ثبوت تو مل جاتا ہے۔ لیکن اگر زمین کے گول ہونے کے سبب نمازی دوسری جانب کو بھی کعبے ہی کی جہت سمجھ لے اور اس طرف بھی کعبے کی جہت کا یہی حساب لگائے تو اس ہر جائی قبلے کا پورا ثبوت مل جائے گا۔

یہ علماء جہت کعبہ سے وہ جہت مراد لیتے ہیں۔ جس میں کعبہ واقع ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ دوسرے پارے کی ابتدائی آیات میں جہاں جہاں قبلہ، وجہہ اور شطر کا ذکر آیا ہے وہاں مطلق جہت نہیں، بلکہ جہت صلوٰۃ مراد ہے۔

---

[1] اشارہ ہے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف۔ آیۂ زیر نظر کی تفسیر دیکھئے تفسیر "فتح العزیز" میں۔ مرتب۔

صفا و مروہ

حقیقتِ قبلہ کے انکشاف کے بعد صفا و مروہ کا فیصلہ بھی فرما دیا۔ یہ دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں، جو مسجد کعبہ سے باہر اس کے بیرونی احاطے میں موجود ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق اُس کی خالقیت اور صنعت گری کا ایک نشان ہے ویسے ہی یہ بھی شعائر اللہ میں داخل ہیں۔

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ تو روئے نیست

در طلبت تواں گرفت، بادیہ را بہ رہبری! (غالب)

ان پہاڑیوں میں کوئی صنمیاتی تقدیس نہیں، نہ کسی خاص شخصیت ہی سے کوئی خاص تعلق ہے۔ یہ قدرتی نشانات ہیں۔ جو شخص بیت حرام کا حج یا عمرہ کرے تو ان کو قدرتی نشان سمجھ کر ان میں بھی چلے پھرے اور سیر کرے اور ان کے فطری عجائبات میں تفکر کرے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں، لیکن یہ کوئی نیکی بھی نہیں۔ البتہ کوئی شخص دلی رغبت سے کوئی کارِ خیر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا قدردان اور علیم ہے جیسا کہ آیت صفا و مروہ کے آخری الفاظ سے ظاہر ہے۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ - ۱۵۸)

جو شخص شوق سے کوئی نیک کام کرے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ قدرداں، علم والا ہے۔

جو لوگ قرآن حکیم کی ایسی بینات و ہدایات کو چھپا کر توہمات پھیلاتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ اور کارکنان قدرت کی لعنت کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو لعنت کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ سوائے اس کے کہ ایسی حرکات سے تائب ہو کر اصلاح کریں اور وحی الٰہی کے ارشادات کو صاف صاف بیان کریں ـــــ چنانچہ صفا و مروہ کے ذکر کے ساتھ ہی فرمایا ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَأَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَأُولٰٓئِكَ أَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ (البقرہ ۱۵۹-۱۶۰)

جو لوگ چھپاتے ہیں ان واضح آیات اور ہدایات کو جو ہم نے نازل کیں، بعد اس کے کہ ہم نے انہیں کتاب میں کھول کر بیان کر دیا۔ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار ہے اور تمام پھٹکارنے والوں کی پھٹکار۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کر لی اور ٹھیک ہو گئے اور (وحی کو) صاف صاف بیان کرنے لگے، تو میں ان کی طرف مہربانی سے متوجہ ہوتا ہوں اور میں توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہوں۔

لعنت کے معنی رحمت سے دوری ہے۔ ایسے لوگ خلق و خالق ہر دونوں کی نظر میں رُسوا ہوتے ہیں اور کسی کے بھی نیک برتاؤ اور مہربانی کے مستحق نہیں رہتے۔ اس لیے دارین میں ملعون ٹھہرائے جاتے ہیں۔

حج وعُمرہ کی معنویت

خواجہ صاحب کا خیال ہے کہ عمرہ یا حج قدیم مذاہب کے میلوں کی قسم کا کوئی میلہ یا بے معنی جشن نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بے حد اہم اور بامقصد اجتماع ہے، جو مسلمانانِ عالم کے دینوی اور آخروی منافع پر حاوی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر ملک کے لوگوں کے انتظام، امن اور انصاف کے لیے سالانہ کانفرنسوں اور خاص جلسوں کو معقول اور مفید قرار دیا ہے۔ ایسے ہی حج بھی اہلِ عرب کی ایک سالانہ ملکی کانفرنس ہے اگر ایک ملک کے دوسرے علاقوں کے لوگ منتظمہ کمیٹی کو مدعو کرکے اپنے علاقے کی ضروری باتوں پر بحث کریں اور وہ تجاویز عام اجلاس میں پیش ہونے کے لیے مرکزی دفتر میں چھوڑ جائیں، تو ایسی کمیٹی عمرہ کہلاتی ہے۔

حج کے اغراض ومقاصد کے متعلق ارشاد ہے:۔

يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ط (المائدہ۔۲) لوگ حج میں اللہ تعالیٰ کا فضل اور رضا مندی طلب کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۔ (ایضاً) نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے معاون بن جاؤ۔

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (الحج ۲۸) حج میں ہر قسم کے منافع حاصل کرنے چاہئیں۔

حج میں قدیم قریش کی طرح صرف بزرگ پرستی اور توہم پرستی ہو، تو وہ ابراہیمی اور قرآنی حج نہیں ہے۔ کنکر مارنے، حجراسود کو چومنے قربانیوں کو دبا دینے اور وہاں سے (متبرک) مٹی اور پانی کو لانے کی رسموں کا قرآن مجید میں کوئی ذکر نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ــــ ہم نے مسجد حرام[1] کو ملک کے قیام و انتظام کا مقام اور باعث بنایا ہے۔ یہاں[2] بہت سی (محسوس ومشہود) برکتیں اور تمام قوموں کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اس[3] جگہ ملکی اور غیر ملکی لوگ یکساں ہیں۔ ہر ایک کو رائے دینے کا یکساں حق ہے۔

عرفات عرفہ کے معنی ہیں واقفیت وشناسائی۔ تعارف اسی سے ہے۔ میدانِ عرفات میں مختلف علاقوں کے مندوب جمع ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے متعارف ہوتے اور معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور اہم امور کا فیصلہ کرکے مسجد حرام میں جاکر تمام لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس میدان کا نام عرفات مشہور ہو گیا۔

المشعرالحرام جس پہاڑی پر صدر یا امام اپنے نمائندوں کی شمولیت میں متعلقہ امور کا فیصلہ کرتا ہے اسے مشعرالحرام کہا جاتا ہے، یعنی شعور ومشورت کا قابلِ احترام مقام۔

---

[1] مائدہ ـــ ۹۷ [2] آل عمران ۹۶، ۹۷ [3] حج ـ ۲۵ـ

رویائے خلیل

اللہ تعالیٰ اپنی وحی میں بچہ کُشی کا حکم ہرگز نہیں دیتا۔ اگر کسی کو خواب میں اس کے نیک بچے کو ذبح کرتے ہوئے دکھلایا جائے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ بچہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہمیشہ قربان ہوتا رہے۔ اُسے اللہ کی رضامندی کے کاموں میں لگایا جائے ـــــ یہ ایسی قربانی ہے، جس سے بچہ ترقی کی اعلیٰ منازل پر پہنچتا اور دوسروں کو بھی پہنچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو سکھایا کہ ظاہر خواب پر نہیں، بلکہ اس کی تعبیر پر عمل کرنا چاہیئے۔ کسی اونٹ یا مینڈھے کو ذبح کر دینا اور اس کو "ذبح عظیم" کہنا، روح قرآن و اسلام سے ناواقفیت کا مظاہرہ ہے۔ حج کے موقع پر نسل حیوانات کا اتلاف قطعاً غیر قرآنی اور غیر عقلی فعل ہے۔

حج کی میعاد تین دن مقرر فرمائی گئی ہے۔ ایک دن "المشعر الحرام" کی کمیٹی اور چند لیکچروں کے لیے، دوسرا دن مکے سے باہر خط بنانے، نہانے دھونے، کپڑے صاف کرنے، استراحت کرنے اور ممکن ہو تو اہل علم و تجربہ کے لیکچروں کے لئے ہوگا۔ تیسرے دن "المسجد الحرام" میں پہنچ کر چندہ (ھدی) ادا کیا جائے گا۔ اور تمام کارروائی سے سب کو مطلع کیا جائے گا۔ اہل شوریٰ اور حکام کو اختیار ہوگا کہ اپنی صوابدید کے مطابق ان دنوں سے فائدہ اُٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی باتیں بشری عقل و حکمت اور شوریٰ پر بھی چھوڑی ہیں۔

تفسیر سورہ حج کی تمہید میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں۔

اس وقت مسلمانوں نے بھی (زمانہ قبل بعثت کی طرح) حج کو خیالی رسوم کا مجموعہ بنا لیا ہے .....

بڑی خوشی کی بات ہو اگر مسلمان تمام کانفرنسوں سے اوپر اپنے حج کی کانفرنس کو عالمگیر بنائیں اور اس میں ایسا نقشہ دکھائیں جو توحید، رواداری، ترقی علم اور امن پسندی کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہو، لفظی اور رسمی مظاہروں سے بالاتر ہو کر دنیا کو دکھا دیں کہ سچ مچ مسلمانوں کا یہ اجتماعِ عظیم دنیا بھر کے امن و امان کا ضامن ہے۔

حج ابراہیمی

سورہ حج کی دو آیتیں جو حج ابراہیمی پر روشنی ڈال رہی ہیں، خواجہ صاحب نے ان کا تفسیری ترجمہ کیا ہے۔ وھو ہذا۔

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ
كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۔

(الحج - ۲۷)

اور تو (اے ابراہیم) لوگوں میں ایسے حج کا اعلان کر دے جس سے لوگوں میں حریت و مساوات قائم ہو جائے تاکہ لوگ تیرے پاس پیادہ چل کر آئیں اور ہر اس سانڈنی پر آئیں جو دور دور سے آتی ہے۔

لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ
اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم
مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا
الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ۔

(الحج - ۲۸)

"تاکہ لوگ اپنے نفعوں پر حاضر ہوں (اپنی خوراک جانوروں کی صورت میں اپنے ساتھ لے جائیں اور ان کو غیر اللہ کے نام پر ذبح نہ کریں) اور روزی کے لیے ان کو جو جانور اللہ نے عطا فرمائے ہیں۔ حج کے معلوم دنوں میں ان کو اللہ کے نام پر ذبح کریں۔ پھر تم اس گوشت کو کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاجوں کو بھی کھلاؤ (ضائع کر کے گڑھوں میں نہ دباؤ۔)

کھیتی اور جانوروں کی نسل کی تباہی اللہ کو پسند نہیں۔ کیوں کہ یہ فساد ہے۔

يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (البقرہ۔۲۰۵)

بعض سخت جھگڑالو قسم کے منافق احرث و نسل کو ضائع کرتے ہیں اور یہ فساد ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

یہ آیۃ[1] حج ہی کے ذکر میں وارد ہوتی ہے۔

نساؤکم حرث لکم

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ص فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ط وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

(البقرہ۔۲۲۳)

تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتی ہیں (اگر کھیتی کا فائدہ کسی اور طرف سے بھی مل سکتا ہے تو) اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو آؤ اور (ان گندے خیالات سے توبہ کرو۔ بلکہ) اپنی جانوں کے لیے کچھ آگے بھیجو اور اللہ سے ڈرو۔ جان رکھو کہ تم اس (قدوس خدا) سے ملنے والے ہو۔ اور ایمان والوں کو خوشخبری دیجئے۔

---

[1] حج وقربانی کی مزید تفصیل کسی مقام پر آگے بھی آئے گی۔

عورتوں پر مردوں کا درجہ

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔

(البقرہ ۲۲۸)

عورتوں کے لیے ویسے ہی حقوق ہیں، جو دستور کے مطابق عورتوں پر ہیں اور مردوں کے لیے (جو شوریٰ سے مقرر ہوں، نہ کہ شوہروں کے لیے) ان پر درجہ ہے۔ اور (اگر وہ اس درجے کا ٹھیک استعمال نہ کریں تو) اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے

یہاں شوہروں کا ذکر نہیں، بلکہ مردوں کو عورتوں پر نگرانی اور حفاظت کا درجہ دیا گیا ہے۔ شوریٰ کے ذریعے نیک لوگ منتخب کئے جائیں اور ان کے ہاتھ معاشرے کا انتظام سونپا جائے۔ مرد عموماً فوجی خدمت کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں سے زیادہ قوت بخشی ہے۔ عورتیں ان کے مقابلے میں صنف نازک کہی جاتی ہیں۔ مرد زیادہ تجربہ کار بھی ہو سکتے ہیں۔ تجارت و محنت کر کے مال کما سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کمیٹی جو قوت، تجربہ اور مال سے مدد دے سکیں، منتخب اشخاص پر مشتمل ہونی چاہیے۔ اس کمیٹی میں عورتیں بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد کم ہی رہے گی۔ لہٰذا حکومت قدرتی طور پر مردوں ہی کے ہاتھ میں رہے گی۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے "الرجال" فرمایا ہے نہ کہ شوہر ان رجال منتظمین کو تنبیہ کی ہے کہ واللہ عزیز حکیم۔ اللہ کے غلبے کو فراموش نہ کریں اور اس کی مبنی بر حکمت مہلت سے صحیح کام لیں۔

خلع وطلاق

طلاق یافتہ عورتیں عدت گزر جانے کے بعد بھی اگر میاں بیوی دونوں چاہیں حدود اللہ کی پابندی کر سکیں، توان کا رجوع ممکن ہے ضرر پہنچانے اور تعدی کرنے کے لیے عورتوں کو روکنا نہیں چاہیئے۔ جو لوگ عدت گزرنے کے بعد ان کو شوہروں کی طرف رجوع کرنے سے روکتے ہیں۔ ان کو ایسے ارتکاب سے منع کیا ہے۔ اور سابق شوہر کے وابستہ رہنے کو "ازکی واطہر" (بقرہ۔۲۳۱) فرمایا ہے:۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ۔

(البقرہ۔ ۲۲۹)

پھر اگر اس (مرد) نے اس (عورت) کو طلاق (بائن) دے دی تو (یاد رکھیئے کہ) وہ اس کے لیے پیچھے کو حلال نہیں ہوگی جب تک وہ کسی اور شوہر سے نکاح (قائم) رکھے گی جو اس کا غیر ہے۔ سو اگر اس نے اس کو طلاق دے دی ہے۔ توان دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ ہے کہ وہ پھر رجوع کریں۔ بشرطیکہ وہ حدود اللہ کو قائم رکھنے کا خیال رکھیں۔

مزید تاکید اور مزید وضاحت کچھ اضافے کے ساتھ:

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا۔

(البقرہ۔ ۲۳۱)

اور جب تم بیویوں کو طلاق دے دو پھر وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں۔ تو تم ان کو نیکی کے ساتھ (اپنے نکاح میں) تھام رکھو یا نیکی کے ساتھ رخصت کر دو اور انہیں ضرر دینے کے لیے نہ روک رکھو کہ ان پر زیادتی کرو۔

اس مقصد کے حصول میں جو رکاوٹیں پیش آئیں ان کا سدِّ باب:

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۗ ..... ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ

(البقرہ۔ ۲۳۲)

جب تم عورتوں کو طلاق دو۔ پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو اگر گذشتہ آیت کے مطابق ان کے شوہر انہیں رکھ سکتے ہیں۔ لہذا اے رشتہ دارو! تم ان عورتوں کو اپنے شوہروں کے ساتھ نکاح رکھنے سے نہ روکو۔ جب کہ وہ آپس میں دستور کے ساتھ راضی ہو جائیں ..... یہ بات تمہارے لیے زیادہ فائدہ اور زیادہ پاکیزگی کی ہے۔

نئے شخص سے نکاح کرنا پھر اس سے طلاق لینا۔ اس کے بعد سابق شوہر کے نکاح میں آنا ازکیٰ اور اطہر کیسے ہو سکتا ہے؟ ان مراحل سے گزرنے میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ جو ازکیٰ اور اطہر کے منافی ہوں گی پہلے سے متعارف جوڑا اپنی خامیوں پر نظر کر کے مائل بہ صلح و اصلاح ہو جائے۔ تو کیا کہنا یہ ہے ازکیٰ اور اطہر۔

ان آیتوں میں دو لفظ ایسے ہیں۔ جن میں خواجہ صاحب نے عام مترجمین و مفسرین سے قدرے اختلاف کیا ہے۔ وہ لفظ حسب ذیل ہیں۔

"تَنْكِحَ" زَوْجًا غَيْرَهٗ — نکاح (قائم) رکھے گی نئے شوہر سے

"يَنْكِحْنَ" أَزْوَاجَهُنَّ — نکاح (قائم) رکھیں سابق شوہروں سے

عام ترجمہ یہ ہے کہ "نکاح کرے گی" اور "نکاح کریں گی نئے شوہروں ...... سے" ___ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ عورت ناکحہ نہیں ہوتی۔ بلکہ منکوحہ ہوتی ہے اور ناکح صرف مرد ہی ہوتا ہے۔ لہذا جب عورت اس فعل کی فاعل ہو گی تو اس کا مطلب نکاح میں رہنا، نکاح قائم رکھنا یا نکاح میں آنا ہو گا ___ ان کا کہنا یہ ہے کہ پہلی دو طلاقیں جنہیں "رجعی" کہا جاتا ہے ان میں خاوند اپنی بیوی کو لوٹا لینے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ (احق بردھن فی ذالك) اور طلاق بائن کے بعد اس کا وہ حق فائق سلب ہو گیا۔ اب دونوں کی مساوی رضا مندی ہو گی تو رجوع ہو سکے گا۔ (اذا تراضوا بینھم بالمعروف) "کا صیغہ ہے۔ اس میں زوجین کے علاوہ ان کے اقرباء کی رضا و مشورت بھی شامل ہے۔ خواجہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں کہ "مرد ہی عورتوں سے خطبہ کر کے نکاح کیا کرتے ہیں۔ لیکن اگر نکاح کی نسبت عورت کی طرف ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں۔ نکاح والی ہونا یا نکاح کو قائم رکھنا..... " انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے، لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ..... (البقرہ) تم پر اس میں کچھ گناہ نہیں کہ تم بیوہ عورتوں کو اشارۃً نکاح کا پیغام دو (یا کہو)

صلوٰۃ وسطیٰ[1]

صلوٰۃ وسطیٰ کے متعلق روایات اختلافات سے بھری پڑی ہیں۔ کوئی معقول شخص ان کو پڑھ کو کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ جو شخص اس کی تفصیل دیکھنا چاہے، وہ قدیم تفاسیر (رازی وغیرہ) کا مطالعہ کرے۔

خواجہ صاحب سیاق و سباق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اظہار خیال کرتے ہیں کہ عورت مرد کے حقوق و معاملات جن کا ذکر صلوٰۃ وسطیٰ والی آیت سے پہلے چلا آ رہا ہے۔ اور پھر اس آیت کے بعد بھی یہی مذکور ہے۔ یہ تمام احکام نماز میں شامل ہیں ——— ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"ان تمام نمازوں کی (یعنی احکام الٰہی کی جو اوپر بیان ہوئے اور جو آگے بھی آتے ہیں) حفاظت کرو اور "الصلوٰۃ الوسطیٰ" کی (بھی حفاظت کرو)

صلوٰۃ وسطیٰ کے معنی ہیں۔ وہ نماز جو سب سے افضل و اکبر ہے، وہ کیا ہے؟ وہ ذکر الٰہی ہے (ولذکر اللہ اکبر) ..... ذکر الٰہی بندے کو خدا کے نزدیک کرنے کا واسطہ و وسیلہ ہے .... ظاہر ہے کہ واسطہ درمیانی چیز کو کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ذکر الٰہی "صلوٰۃ وسطیٰ" کہلاتا ہے۔ صلوٰۃ وسطیٰ کے معنی علیٰ اختلاف اقوال، فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا، تہجد، جمعہ وغیرہ نہیں، بلکہ مطلق نماز کے ہیں۔ مطلب یہ کہ دیگر احکام الٰہی کی تعمیل کے دوران خاص ذکر الٰہی بھی کرو (جو تمہارے اور خدا کے درمیان واسطہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مودب اور چپ چاپ ہو کر اللہ کی طرف لگ جاؤ۔ خاص نماز میں کسی سے بات کرنا ادب خداوندی کے منافی ہے۔ اب آپ آیت پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔

(البقرہ ۲۳۸)

(احکام طلاق و مہر کے بعد ارشاد ہوتا ہے) ان نمازوں (احکام) کی حفاظت کرو اور اس نماز کی بھی جو فاضل تر ہے (یعنی ذکر الٰہی والی نماز قائم کرو) اور اللہ کے حضور مودب ہو کر جم جاؤ۔

اس کے بعد ایک آیت متعلقہ خوف و بے امنی چھوڑ کر پھر میاں بیوی کے احکام شروع ہو جاتے ہیں — ان احکام کی تاکید کے لیے اور خوف خدا کی یاد دہانی کے لیے صلوٰۃ وسطیٰ کو بطور تمہید لایا گیا ہے کہ اگر تم عبادت الٰہی کے ساتھ ان احکام و حقوق کا بھی خیال رکھو گے، تو تمہاری نماز تمہیں خدائے تعالیٰ سے ملا دے گی۔

---

[1] صلوٰۃ وسطیٰ کا بیان (ایک اور مقام پر بھی) مگر غلطی سے لکھا گیا ہے لیکن اس میں کچھ مزید باتیں بھی آ گئی ہیں

اس خاص ذکر یا صلوٰۃ وسطیٰ کا طریقہ بھی ساتھ ہی سکھا دیا ہے کہ قوموا للہ قٰنتین ۔ قیام یلشئ کے معنی ہیں : مراعاۃ لہ، ۔ اگر وہ شئے عظیم القدر ہے، تو اس کی مراعات اور عظمت کو ملحوظ رکھ کر خدمت میں لگ جانا ہے ۔ اور اگر وہ شئے ادنیٰ ہے ؛ تو اس کی مراعات کا مطلب اس کی حفاظت اور اس کے حقوق کی نگہداشت ہو گا ـــــ اس معنی کی سند آیۂ ذیل میں ملتی ہے :

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۔ (سبا۔ ۴۶)

کہہ دیجئے کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ کہ تم دو۔ دو ایک ایک کرکے خدا کی طرف لگ جاؤ، پھر سوچو....

اس آیت میں تقوموا للہ کے معنی خدا کا لحاظ کر کے اسے سامنے رکھ کر سوچنے کے ہیں نہ کہ کھڑے ہو کر سوچنے کے ـــ

سابقہ آیات میں بہت سی ایسی باتیں (معاملات زوجین سے متعلق) سکھائی ہیں ۔ جو ہمارے لیے دنیا و آخرت میں بہت مفید بکار آمد اور نہایت قابل قدر اصلاحات ہیں ۔ ان کے تعہد کے لیے فرمایا کہ تم ان تمام (اصلاحات) کی حفاظت کرو ۔ اور ان کی قدر دانی اور عملی شکر گزاری کے لیے صلوٰۃ وسطیٰ ، (ذکر الٰہی والی نماز) کی حفاظت کا فرمان بھی جاری کر دیا کہ مودّب ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف لگ جاؤ ۔

بزدلی موت ہے

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۳ اور ۲۴۶ میں بظاہر دو الگ الگ واقعات کا ذکر ہے۔ مفسرین نے اسے ایسا ہی سمجھا ہے، لیکن خواجہ صاحب نے دوسرے واقعہ کو پہلے کی تفصیل کہا ہے۔ توجہ فرمایئے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ط (البقرہ - ۲۴۳)

کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو ہزار ہا ہونے کے باوجود موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل بھاگے (جب انہوں نے دشمن کے مقابلے میں یہ بزدلی دکھائی) تو اللہ نے انہیں کہا (جاؤ) مرے رہو ـــ پھر انہیں زندگی (ہمت) بخشی (آخرہ فتح مند ہوئے)[1] (مفسرین یہاں حقیقی موت و زندگی فرماتے ہیں)

اب اس کی تفصیل سنئے!

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰىۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (البقرہ - ۲۴۶)

کیا تو نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک بڑی جماعت کو نہیں دیکھا! جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے کوئی بادشاہ مقرر کر دے تاکہ ہم خدا کی راہ میں لڑیں۔

خواجہ صاحب نے آیت ۲۴۳ سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ جب کوئی جماعت ہزاروں کی تعداد تک پہنچ جائے تو اس کے لیے موت سے ڈرنا اور چھپتے پھرنا موت کے مترادف ہے ـــ ان کو ڈٹ کر میدان میں نکل آنا چاہیئے۔

اس تاریخی قصے کی تفصیل قرآن کے مطابق یہ ہے۔

قوم :۔ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم راہ خدا میں جنگ کریں"

نبی :۔ "اگر جنگ کا حکم آ گیا تو خطرہ ہے کہ تم بزدلی کا مظاہرہ کرو گے"

قوم :۔ " ہم کیوں نہ لڑیں گے۔ جب کہ ہم اپنی اولاد و جائداد سے محروم کر دیئے گئے ہیں"

---

[1] راغب اور دوسرے ائمۂ لغت نے موت وحیات کے الگ الگ بہت سے معنی بیان کئے ہیں۔ اور دلیل میں آیات و اشعار عرب پیش کئے ہیں۔

پھر جب جنگ کا حکم آ گیا تو تھوڑے ہی ثابت قدم رہے۔
یہ تھی ان کی پہلی بزدلی۔
نبی:۔ اللہ نے طالوت کو تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔
قوم:۔ ہم بادشاہ ہونے کے زیادہ مستحق ہیں کیوں کہ وہ مال دار نہیں ہے۔
نبی: اللہ نے اس کو علم و جسم میں تم پر فضیلت بخشی ہے ..... الخ

پھر جب طالوت لشکروں کو لے کر آگے بڑھا اور نہر کے پانی سے قوم کا امتحان لیا کہ جو ایک گھونٹ سے زیادہ پئے گا وہ ہمارا ساتھی نہیں ہے، تو بہتوں نے جی بھر کر پیاس بجھائی۔ اور تھوڑے سے امتحان میں پورے اترے۔
یہ تھی ان کی دوسری بزدلی۔
جب نہر سے پار ہوئے تو بہتوں نے ہمت ہار دی اور کہا کہ ہم دشمن (جالوت) کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔
یہ تھی ان کی تیسری بزدلی۔
غور فرمائیے۔ کس طرح چھانٹی ہوتی جا رہی ہے۔ اب رہ گئے وہ تھوڑے سے ایمان دار مجاہد جو میدان میں ڈٹ گئے، تو ان کی قلیل جماعت نے دشمن کی بڑی تعداد پر اپنی ثابت قدمی سے فتح پائی۔

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ	بسا اوقات چھوٹی جماعت، اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب
وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ۔ (البقرہ-۲۴۹)	آجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کا مددگار ہے۔

مذکورہ بالا بار بار کی بزدلی قومی موت تھی اور آخر کار ایمان اور ثابت قدمی کی فتح قوم کی دوبارہ زندگی ہوئی۔ یہ تفصیل ہے۔ اس اجمال کی کہ "فَقَالَ لَهُمْ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ۔

(اللہ نے انہیں کہا (جاؤ) مرے رہو۔ پھر انہیں زندگی (رحمت) بخشی (آخر وہ فتح مند ہوئے۔)
اس قصے کے ہیرو طالوت طویل القامت اور جسیم آدمی تھے، اسی وجہ سے انہیں طالوت کہتے تھے اور جالوت بھی جنگ میں جولانی دکھانے والا دلیر تھا۔

تابوتِ سکینہ

اس قصے میں طالوت کے حکومت پر فائز ہونے کا نشان یہ بتایا ہے۔

يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ط۔ البقرہ - ۲۴۸)

تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جن میں تمہارے رب کی طرف سے تسکین اور آلِ موسیٰؑ و ہارونؑ کے متروکات ہوں گے۔ جن کے حامل فرشتے ہوا کرتے تھے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ اس صندوق میں انبیائے بنی اسرائیل کے تبرکات تھے۔ لڑائی میں اس کو آگے رکھتے تو اس کی برکت سے فتح پاتے تھے۔ جالوت جب ان پر غالب آیا تو اسے چھین کر لے گیا۔ اب وہ صندوق نحوست بن گیا جہاں اسے رکھتے وبا اور بلا نازل ہو جاتی، اس طرح پانچ شہر ویران ہو گئے ناچار دو بیلوں پر اس کو لاد کر ہانک دیا۔ فرشتے بیلوں کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچا گئے۔ (عثمانیؒ)

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ

طالوت کے انتظام کے سبب دشمنوں نے ڈر کر تابوت سکینہ بنی اسرائیل کی طرف واپس کر دیا۔ یہ ان کا علمی خزانہ تھا، جسے دشمن لوٹ کر لے گئے تھے۔ اس صندوق میں وہ تمام علوم تھے جو آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون چھوڑ گئے تھے۔ اس میں خدا کی طرف سے تسلیات اور معقول دائمی حقائق تھے جو انہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ملے تھے۔ "تحملہ الملائکہ"، کے یہی معنی ہیں کہ فرشتے ان باتوں کو خدا کی طرف سے لایا کرتے تھے۔

ایمان — جبری یا اختیاری ؟

مندرجہ عنوان مسئلہ نہایت اہم اور نہایت نازک ہے۔ بظاہر جتنا سادہ ہے، اس کی تفہیم اتنی ہی مشکل اور پیچیدہ بھی ہے۔ کفار کے بار بار کے مطالبہ معجزات و خوارق میں یہی خواہش پنہاں ہے کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں۔ جو ان کو ایمان لانے پر مجبور کردیں۔ ویسے وہ برضا و اختیار سے ایمان لانے پر تیار نہیں ——— دوسری طرف سخت گیر اور متعصب اہل مذاہب نے اس قسم کی خواہشات کا سدباب یوں کرنا چاہا کہ بزور تشدد لوگوں پر اپنا مذہب مسلط کرنا چاہا۔ جس کے نتیجے میں سخت فسادات برپا ہوئے اور خون ریزیاں ہوئیں۔ تاریخ ایسے ہولناک سانحات کو فراموش نہیں کر سکتی۔ اس بیسویں صدی میں بھی جب کہ انسان گذشتہ زمانوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو مہذب اور ترقی یافتہ کہتا ہے، ایسی بے شمار مثالیں سامنے آتی رہتی ہیں کہ اختلاف مذہب کی بنا پر خون کی ندیاں بہائی جاتی ہیں۔

قرآن حکیم کی تعلیم، پیغمبرؐ قرآن کے اسوۂ حسنہ اور ان سچے پیروؤں کی سنّت اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ انہوں نے نہ تو معجزات و کرامات کے زور پہ لوگوں کو مسلمان بنایا اور نہ تلوار ہی کی زبان سے تبلیغ اسلام کی۔ ان کے سامنے صاحب خلق عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی تھی۔ حضور کی ہر ادا معجزہ تھی۔ [1]

رُو و آواز پیمبر معجزہ اُست (رومی)

حضورؐ کو بلا واسطہ وحی الٰہی سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ وحی میں تبلیغ کے اعلیٰ سے اعلیٰ طریقے سکھائے گئے ہیں۔ اسی ضمن میں یہ ارشاد سامنے آتا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ۔ ۲۵۵)	دین میں کوئی جبر نہیں۔ ہدایت، گمراہی سے واضح اور متمیز ہو چکی ہے۔

ہر شخص کو برضا و رغبت خود سوچ سمجھ کر اسلام کو قبول کرنا چاہیئے۔ جبر مذہبی جو فساد کے سرچشموں میں سے ایک بڑا سرچشمہ ہے اس آیت نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ جو شخص خلوص اور معقولیت سے قرآن مجید کا مطالعہ کرے گا، اس کے سامنے ہدایت و ضلالت کا فرق ضرور ہی واضح ہو جائے گا۔ وہ کسی شک و شبہ کا شکار نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو شبہات کی تاریکیوں سے نکال کر نور یقین کی طرف رہنمائی فرمائے گا جیسا کہ مسطورہ بالا آیت کے ساتھ ہی اگلی آیت میں فرمایا ہے۔

---

[1] رومی نے یہ بھی کہا ہے۔ ع "موجب ایمان نباشد معجزات"

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (البقرہ-۲۵۶) اللہ تعالیٰ ایمان داروں کا سرپرست ہے۔ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔

جو شخص جان بوجھ کر کفر ونفاق کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، وہ اپنے حق میں جو چاہے کرے، اس پر جبر کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ دینی صداقتوں کو کسی کے اندر جبراً ٹھونسا نہیں جا سکتا، یہ قطعاً خلاف فطرت ہے۔کوئی مادی غذا بھی بھوک کے بغیر نافع نہیں ہوتی، بلکہ الٹا نقصان ہی پہنچاتی ہے۔اسی طرح دین کے لیے بھی طلب کی ضرورت ہے۔

مکالمۂ ابراہیمؑ و بادشاہ اگلی آیات میں اس مقصد کے لیے تین نمونے پیش فرمائے گئے ہیں۔جن میں جبری ہدایت کی نفی، اختیاری قبولِ ہدایت کا اثبات اور مومنوں کے لیے ظلمات سے نکال کر نور کی طرف رہنمائی کا بیان ہے۔ ملاحظہ ہو۔

۱۔ ابراہیم علیہ السلام بادشاہ وقت کو توحید کی دعوت دیتے ہیں کہ میرا رب وہ ہے، جو زندگی اور موت دونوں پہ قدرت رکھتا ہے بادشاہ نے کہا "میں بھی ایسا کر سکتا ہوں" اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو مزید روشنی بخشی۔انہوں نے دوسری دلیل پیش کر دی کہ "اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے لاتا ہے۔تم مغرب سے لا کر دکھاؤ" کافر بادشاہ حیران رہ گیا۔

واللہ لا یھدی القوم الظالمین۔ اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت سے محروم رکھتا ہے۔ظلمت پسند طبائع بین دلائل کے باوجود مستفید نہیں ہو سکتیں ۔۔۔ یہ تو ایک واقعہ تھا اس کے بعد کا دوسرا نمونہ خواجہ صاحب کے خیال میں ایک مثالی بیان ہے۔

او کالذی مر علیٰ قریۃ اپنے اس خیال کے لیے وہ جو دلائل پیش کرتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

۲۔ اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ وَّھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا ۔۔۔۔ الخ مثال کے طور پر گویا ایک شخص کسی بستی کے پاس سے گزرا اور وہ بستی اپنی چھتوں پہ گری ہوئی تھی۔اس نے کہا، اللہ تعالیٰ اس (بستی) کو اس کی موت کے بعد کس طرح زندہ (آباد) کرے گا۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو سو سال تک موت کی نیند سلا دیا۔ پھر اسے اٹھا کھڑا کیا اور کہا ۔۔۔ "تو اس حالت میں کتنی مدت رہا؟" وہ بولا "ایک دن یا اس سے بھی کم (یعنی جو اعجازی کیفیت اس مثالی یا فرضی شخص پر گزری خود اس پر چھپا دی گئی اور دنیا میں بھی کسی کو معلوم نہ ہو سکی اللہ تعالیٰ پھر اس کو بطور مثال بتاتا ہے۔کہا تو سو سال تک پڑا رہا۔ لیکن اخفائے اعجاز کے دوسرے شواہد کو دیکھ کر تیرے کھانے پینے کی چیزیں بالکل متغیر نہیں ہوئیں اور تیرا سواری کا گدھا بھی ویسا ہی کھڑا ہے۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ باتیں حضرت ابراہیم کو سمجھائی جا رہی ہیں۔آگے انہی کو خطاب ہے کہ "ہم تجھے لوگوں کے لیے آیت (یعنی امام) بنانا چاہتے ہیں۔ (وَ لِنَجْعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ) تاکہ لوگوں کو سمجھائے کہ معجزات کے ذریعے جبری ایمان اللہ تعالیٰ کی حکمت کے منافی ہے۔موت کو زندگی میں تبدیل کرنا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے لہٰذا اے ابراہیم! بہ نظر غور ان ہڈیوں کو دیکھ (جو رحم مادر میں تیار

ہوئی ہیں، ہم انہیں کیسے ابھارتے ہیں۔ پھر انہیں گوشت کا لباس پہناتے ہیں) اس طرح زندگی بخشنا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ جب ابراہیمؑ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تو انہوں نے کہا میں (پہلے سے) جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔

خواجہ صاحب "کالذی" میں کافِ تشبیہ کے ثبوت میں متعدد آیات پیش کرتے ہیں۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ۔ (البقرہ۔ ۱۷، ۱۸)

منافقوں کی مثال اس شخص کے مانند ہے۔ جس نے آگ جلائی، پھر جب اس آگ نے اس کے اردگرد کو روشن کیا تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا۔ اور انہیں تاریکیوں میں چھوڑ دیا وہ کچھ نہیں دیکھتے، بہرے۔ گونگے اور اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹتے۔

یہاں کوئی شخص نہیں کہتا کہ واقع میں کسی شخص نے آگ جلائی تھی۔ اور اس کا اردگرد چمک اٹھا تھا الخ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (النحل۔ ۹۲)

اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے محنت کر کے اپنا کاتا ہوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

بظاہر صیغہ ماضی (نَقَضَتْ) سے کوئی گزرا ہوا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ صرف تعلیم کے لیے ایک مثال ہے۔

كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ فِي الْأَرْضِ حَيْرَانَ لَهُ أَصْحَابٌ يَدْعُونَهُ إِلَى الْهُدَى ائْتِنَا (الانعام۔ ۷۱)

اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے زمین کے اندر حیران بنا کر راستہ بھلا دیا۔ اس کے رفیق اسے بلاتے ہیں کہ ہدایت کی طرف آجا ہمارے پاس۔

یہاں بھی "کالذی" کوئی واقعی شخص نہیں تھا۔ اس قسم کی تفہیمی مثالیں بہت سی ہیں، جن کا واقع میں کوئی وجود نہیں۔
جو مفسر "کالذی مَرَّ" سے تمثیلی قصے کو واقعی سرگزشت بناتے ہیں۔ انہیں تکلف کرنا پڑتا ہے۔ پہلے کاف تشبیہ کو زائد مانا۔ پھر الفاظ میں تقدیم و تاخیر نکالی۔

طلب معجزہ

اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے۔ کہ کسی کو ایمان لانے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ہر شخص دل سے سوچ سمجھ کر، شبہات کا مقابلہ کر کے سچا مومن بنے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو لوگوں کو معجزے دکھا کر ایمان پر مجبور کر سکتا تھا۔ اور اس طرح سب لوگ ہدایت یافتہ ہو جاتے اور کوئی بھی کافر یا شریر نہ بن سکتا!

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (الانعام۔ ۳۷)

اور کہتے ہیں کہ "کیوں نہ اترا اس (رسول) پر کوئی نشان" (معجزہ) کہہ دے کہ "اللہ تعالیٰ نشان اتارنے پر قادر ہے، لیکن ان لوگوں میں سے اکثر علم سے محروم ہیں۔"

یعنی نشان یا معجزے کے ذریعے ایمان لانے کا مطالبہ ایک جاہلانہ مطالبہ ہے ـــــ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب

مبارک پر اسی قسم کے مطالبات کا جو اثر ہوتا، وہ آیت ماقبل میں بیان کیا گیا ہے۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاۗءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَي الْهُدٰي فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ

اگر تجھ پر ان کی روگردانی گراں گزرتی ہے، تو اگر تو زمین میں سرنگ نکال سکے یا آسمان میں سیڑھی لگا سکے تا کہ ان کے پاس کوئی معجزہ لے آئے، (تو لے آ) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو ہدایت پر جمع کر دیتا، سو تو نادانوں میں سے نہ بن! (الانعام - ۳۵)

مولانا عثمانی رح لکھتے ہیں:

"کفار کا مطالبہ تھا کہ یہ نبی ہیں تو ان کے ساتھ ہمیشہ ایک نشان رہنا چاہیئے۔ جسے ہر کوئی دیکھ کر یقین کرنے اور ایمان لانے پر مجبور ہو جایا کرے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام دنیا کی ہدایت پر حریص تھے۔ شاید آپ کے دل نے چاہا ہو گا کہ ان کا یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے یہ تربیت فرمائی کہ تکوینیات میں مشیت الٰہی کے تابع رہو۔ تکوینی مصالح اس کو مقتضی نہیں کہ ساری دنیا کو ایمان لانے پر مجبور کر دیا جائے۔ ورنہ خدا تو اس پر بھی قادر تھا کہ بدون توسط پیغمبروں اور نشانوں (معجزوں) کے شروع ہی سے سب کو سیدھی راہ پر جمع کر دیتا۔ جب خدا تعالیٰ کی حکمت ایسے مجبور کن معجزات اور فرمائشی نشانات دکھلانے کو مقتضی نہیں، تو مشیت الٰہی کے خلاف کسی کو یہ طاقت کہاں ہے کہ وہ زمین یا آسمان میں سے سرنگ یا سیڑھی لگا کر ایسا فرمائشی اور مجبور کن معجزہ نکال کر دکھلا دے۔ خدا کے قوانین حکمت وتدبیر کے خلاف کسی چیز کے وقوع کی امید رکھنا نادانوں کا کام ہے۔ (حاشیہ آیہ ۳۵ سورۂ انعام)

ایسا ہی خیال صحابہ کرامؓ کے دل میں بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ کہ کوئی معجزہ ہو جائے جس کو دیکھ کر یہ لوگ ایمان لانے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کا ذکر آیہ ذیل میں ملتا ہے۔

اَفَلَمْ يَايْـــــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ

کیا مومن (اس بات کو سمجھ کر معجزات سے) مایوس نہیں ہوئے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو (خود ہی) ہدایت پر جمع کر دیتا۔

اس پر مولانا عثمانی رقم طراز ہیں:

"شاید بعض مسلمانوں کو خیال گزرا ہو گا کہ ایک مرتبہ ان (کفار) کی فرمائش ہی پوری کر دی جائے، شاید ایمان لے آئیں (اللہ تعالیٰ نے) ان (مسلمانوں) کو سمجھایا کہ خاطر جمع رکھو خدا چاہے تو بدون ایک نشان دکھلائے ہی سب کو راہ پر لے آئے۔ یہ اس کی عادت وحکمت کے خلاف ہے اس نے ایک حد تک انسان کو کسب واختیار کی آزادی دے کر ہدایت کے کافی اسباب فراہم کر دیئے جو چاہے ان سے منتفع ہو۔ باوجود کافی سامان ہدایت موجود ہونے کے اگر معاندین نہیں مانتے

اور اپنے ایمان کو بے ہودہ فرمائشوں پہ معلق کرتے ہیں تو ہم نے یہ ارادہ بھی نہیں کیا کہ ساری دنیا کو ضرور ہی منوا دیا جائے "
جبری اور معجزاتی ایمان کی بار بار تردید فرمائی ہے۔ اس بحث پر ایک مقام اور دیکھ لیجئے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْـــِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۔

(الانعام ۱۱۰/۱۱۱)

کافر لوگ اللہ تعالیٰ کی پختہ قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشان آئے تو وہ ضرور اسے مان لیں گے؛ کہہ دے! نشان صرف اللہ کے پاس ہیں اور (مسلمانو) تمہیں کیا خبر ہے کہ جب نشان آ جائے تو وہ پھر بھی نہیں مانیں گے اور اگر بالفرض معجزے دکھا دیئے جائیں تو ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو (اسی پہلی حالت میں) پھیر دیں گے، جیساکہ وہ پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور ہم انہیں، ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیں گے۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں۔
جب بادشاہ نے ابراہیمؑ کے جواب میں کہا کہ میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں تو دوسرے لوگوں کے علاوہ خود حضرت ابراہیمؑ کے دل میں دو خیال پیدا ہو سکتے تھے۔
اول یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کافر (بادشاہ) کے سامنے کسی صد سالہ مردے کو زندہ کرکے دکھا دیتا تو وہ میری پہلی ہی دلیل سے مبہوت اور ساکت ہو جاتا اور کٹ حجتی نہ کرتا!
دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے کوئی ایسی بات سمجھا دیتا جس سے میں یہ ثابت کر سکتا کہ زندہ کرنا اور مارنا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے اور کافر (بادشاہ) اللہ تعالیٰ کی طرح (رحم مادر میں) نہ زندہ کر سکتا ہے اور نہ قانون قدرت کے مطابق مار سکتا ہے۔
اس تمثالی قصے میں یہ دونوں باتیں سمجھائی گئی ہیں۔
۱۔ معجزانہ طور پر صد سالہ مردے کو زندہ کرنا مفید ایمان نہیں۔
۲۔ اپنے قانون کے مطابق زندہ کرنا خدائے تعالیٰ کا خاصہ کس طرح ہے؟
بحث میں نیک اور مخلص آدمی کامیاب ہونے کے بعد اپنے طور پر نظر ثانی کرتا اور مزید تکمیلی دلائل مہیا کرتا ہے۔ تقریباً یہی حالت اس وقت حضرت خلیلؑ کی ہے پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مشرق سے طلوع آفتاب کی دلیل سمجھائی جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اب اور زیادہ نور کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔
اَوْ كَالَّذِىْ ـــــ یا دوسرے درجے پر اے ابراہیم یوں سمجھ لو گویا ایک شخص کسی ویران بستی کے پاس سے گزرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ کیوں آباد کرے گا؟ اللہ تعالیٰ اس پہ سو سال تک موت کی حالت طاری کر دیتا ہے۔ پھر اسے زندگی

بخشتا ہے۔ اس کے سوال کا جواب تو ہو گیا۔ لیکن خود اس سے مخفی رہا، یعنی ایک خارق امر کو دوسرے متعدد خوارق سے چھپا دیا گیا۔
وہ فرضی شخص مر تو گیا، لیکن اس کے جسم پر کوئی تغیر واقع نہ ہوا۔ اس کے ناخن اور بال نہیں بڑھے، کپڑے نہیں گلے۔ کسی نے اس کے مردہ جسم کو نہیں دیکھا کہ وہ اس کی اطلاع دوسروں کو دے کر کفن دفن کا اہتمام کرتا، کسی حاکم کو بھی اس کی موت کی خبر نہیں پہنچی کہ وہ تفتیش کرتا۔ اتنے طویل عرصے میں کسی درندے نے بھی اسے نہیں پایا۔ ورنہ وہ اس سے اپنے تنور شکم کو گرم کرتا۔ اس ایک معجزے کو ڈھانپنے کے لیے بیک وقت کتنے معجزے برپا کر دیئے گئے۔ اب اسے کیسے یقین آ سکتا ہے کہ وہ سو سال تک یکساں غیر متغیر حالت میں پڑا رہا؟ وہ تو یہی کہے گا۔ کہ مجھ پر ایک دن یا اس سے بھی کم عرصہ گزرا ہو گا۔ جیسا کہ اس کے قول سے دکھلایا گیا ہے
(لبثتُ یوماً او بعض یوم (بقرہ ۲۵۸)

یہ چھ سات معجزوں سے مرکب معجزہ ہو بھی گیا اور سب لوگوں سے بالخصوص جس پر گزرا اس سے بھی پنہاں ہی رہا۔ پھر وہ شخص لوگوں کے لیے آیت (نشان) کس طرح بن سکتا ہے؟ (ولنجعلکَ اٰیَۃً لِلنّاس۔ ایضاً)
اب اس مثالی یا فرضی شخص سے کہا جاتا ہے کہ "تو سو سال تک اس حال میں رہا"، اس کے بعد اخفائے معجزہ کے دوسرے قرائن کی طرف اسے متوجہ کیا جاتا ہے!
اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھ ان پر سو سال تو کیا، ایک سال بھی نہیں گزرا (لم یَتَسَنَّہ) وہ نہ سڑیں نہ بسیں اور نہ ان کا ذائقہ بگڑا۔ سو سال تک کسی مکھی مچھر، بلی، کتے وغیرہ نے ان کی بو بھی نہیں پائی۔ اب وہ اس معجزات بھرے معجزے کو دیکھنے کے بغیر خدائے تعالیٰ کے کہنے سے مان لے کہ واقعی سو سال تک مرا رہا اور شہر میں جا کر لوگوں کو اپنی شنیدہ گواہی پر اس کی اطلاع دے اور ثبوت میں سو سال قبل کی کوئی بات بتائے تو کون مانے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ جیسے ہم کو سن سنا کر ماضی کا کچھ علم ہے۔ ایسے ہی اس نے بھی کہیں سے سن لیا ہو گا۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ وہ لوگوں کے لیے نشان نہیں بن سکتا۔
طعام و شراب کی طرح اسے اپنی سواری کے گدھے کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ گدھے کی ہڈیوں کی طرف دیکھ۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ اپنے گدھے کی طرف دیکھ (وانظر الیٰ حمارک) اس سے معلوم ہوا کہ گدھے پر بھی سو سال نہیں گزرا وہ بھی جوں کا توں موجود ہے۔ نہ کہیں بھاگ گیا، نہ اسے شیر بھیڑیئے نے پھاڑا۔ نہ کوئی ضرورت مند راہی کھول کر لے گیا۔
اس بیان سے معلوم ہوا کہ ایسے معجزے جن کو کئی معجزوں کے نیچے دبانا پڑے، بے معنی ہیں۔ حکمت الٰہی کے قطعاً منافی ہیں۔ صد سالہ مردے کو زندہ کرنا باطل ہے۔ جیسا کہ اوپر آیت ۱۱۰ سورۂ انعام میں آ چکا ہے۔ کہ ہم معجزات دکھانے کے بعد ان کے دلوں اور آنکھوں کو ایسا پھیر دیں گے کہ وہ معجزات کو معجزات ہی نہ سمجھیں اور قبل معجزات کی حالت پر قائم رہتے ہوئے ایمان سے محروم رہیں۔
(کما لم یومنوا اوّل مرّۃ)
تفسیر فتح البیان فی مقاصد القرآن[1] (نواب صدیق حسن خان) میں اس قسم کے اشارے ملتے ہیں۔

---

[1] مطبوعہ مصر ۱۳۰۱ھ ص ۲۲۵ ، ۲۲۶ جزء اوّل

(۱) انظر الی حمارك (اختلف المفسرون فی معناه ...... وقال الضحاك ووهب بن منبه انظر الی حمارك قائما فی مربطه لم یصبه شی بعد ان مضت علیه مائة عام ...... ذکر سبحانه عدم تغیر طعامه وشرابه بعد اخباره انه لبث مائة عام مع ان عدم تغیر ذالك الطعام والشراب لا یصلح دلیلا علی تلك المدة الطویلة۔

(اپنے گدھے کی طرف دیکھ!) اس کے معنی میں مفسروں نے اختلاف کیا ہے ...... ضحاک اور وھب نے کہا ہے کہ اپنے گدھے کو دیکھ صحیح سالم اپنی جگہ بندھا ہوا کھڑا ہے۔ سو سال کی مدت گزرنے پر بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے سو سال گزرنے کی خبر دینے کے بعد شراب وطعام کے تازہ و درست رہنے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے سو سال کی طویل مدت پر دلیل نہیں بن سکتی۔

فانه اذا رای طعامه وشرابه لم یتغیر مع کونه قد ظن انه لم یلبث الا یوما او بعض یوم زادت الحیرة وقویت علیه الشبهة۔

پھر جب وہ اپنے طعام وشراب کو غیر متغیر دیکھتا ہے اور اُسے یہ بھی خیال ہے کہ وہ دن یا دن کا کچھ حصہ اس حالت میں رہا تو اس کی حیرت بڑھ جاتی ہے اور شبہ قوی ہو جاتا ہے۔

وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ۔

اسے ابراہیم تجھ کو لوگوں کے لیے نشان یا امام بنانا چاہتے ہیں۔

خواجہ صاحب اس آیت پارے کو (انی جاعلك للناس اماما) کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

اس تعلیم وتلقین کا مقصد یہ ہے کہ اسے ابراہیم! تو لوگوں کو خارق طلبی اور اعجاز پسندی سے منع کر کے برضا واختیار ایمان کی طرف دعوت دے۔

اب رہی یہ بات کہ ایسا زندہ کرنا جو خدا کا خاصہ ہو اور کسی دوسرے سے نہ بن پڑے، اس کی تشریح یہ ہے کہ

وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا۔ (البقرہ - ۲۵۹)

ان ہڈیوں کی طرف توجہ کر جو ماؤں کے پیٹوں میں تیار ہوتی ہیں۔ ہم ان کو کس طرح نشوونما دیتے ہیں پھر ان پر گوشت پہناتے ہیں۔

لوگوں نے خدائے تعالیٰ کے جو شریک بنائے ہیں سب اسی طرح پیدا ہوئے ہیں۔ ان سب کی ولادت سے پہلے یہ قانونِ ولادت جاری ہو چکا تھا ـــــ کیا انکا رہی بادشاہ ایسا کر سکتا ہے؟ نہیں کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ لہذا زندگی بخشنے کا یہ فعل خاصۂ خداوندی ہوا۔ جب یہ حقیقت حضرت ابراہیم پر روشن ہوئی تو آپ پکار اٹھے۔

اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

میں جانتا ہوں کہ اللہ اپنی ہر چاہی ہوئی چیز پر قدرت رکھتا ہے

طیورِ ابراہیمؑ

اب اس دلیل کی تکمیل کا وقت آیا سا اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو نور پر نور عطا فرماتا ہے چنانچہ جب ابراہیمؑ نے اس زندگی کا آغاز رحم مادر سے ، سمجھنے کے بعد دوسری (اُخروی) زندگی کی کیفیت دریافت کرنا چاہی تو عرض کیا :۔

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی۔ — اے میرے پروردگار! تو مردوں کو (دوبارہ) کیسے زندہ کرتا ہے

ارشاد ہوا :

اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؟ ـــــ کیا تو (حیاتِ اُخروی کو) نہیں مانتا ؟

عرض کیا ـــــ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ۔ کیوں نہیں ۔ میں قلبی اطمینان کے لیے اس کی کیفیت سمجھنا چاہتا ہوں (کَیْفَ تُحْیِ)

فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ط وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ (البقرہ ـ ۲۶۰)

چار پرندے لے کر پھر انہیں اپنی طرف مائل کر (یعنی سدھالے) پھران میں سے ایک ایک کو ہر پہاڑ پر چھوڑ دے ۔ پھر انہیں بلا ۔ تیرے پاس دوڑتے آئیں گے اور سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے ۔

خواجہ صاحب اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

چار پرندے لے کر اُن کو سدھا یعنی اپنے سے مانوس کر ۔ پھر اس میں سے ایک ایک کو اردگرد کے چاروں پہاڑوں پر چھوڑ دے ، پھر ان کو اپنی آواز سے جو ان کے لیے مانوس ہو چکی ہے ، بلا ، شوق سے دوڑتے ہوئے تیرے پاس آئیں گے ۔ مطلب یہ کہ تیرا ان سے صرف چند روزہ سدھانے کا واسطہ رہا ۔ اتنے ہی سے وہ تیرے کہنے سے تیرے پاس آ کر جمع ہو جاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ تمام گرم ، سرد ، خشک اور تر کا حقیقی خالق ہے ۔ اُس کا تعلق چاروں عناصر سے خالقانہ ہے ۔ پھر کیا یہ عناصر اپنے سچے خالق کے حکم سے جمع ہو کر زندگی کی شکل اختیار نہیں کر سکتے ! اے ابراہیمؑ جان رکھ کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء پر غالب اور حکمت والا ہے ۔ وہی تعالیٰ تنہا ساری کائنات پر فوق الفطرت متصرف ہے ـــــ "عزیز حکیم" کی صفات خارق کی بجائے غلبہ و حکمت کی تائید کرتی ہیں ۔

تفسیر رازی | خواجہ صاحب کی اس تفسیر کی تائید قدیم تفاسیر سے بھی ملتی ہے چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے :۔

سبب السوال انہ مناظرتہ مع نمرود لینکشف ھذا المسألۃ عند نمرود واتباعہ ...

اس سوال کی وجہ وہ مناظرہ تھا جو نمرود کے ساتھ ہو چکا تھا ۔ تاکہ نمرود اور اس کے پیروؤں پر اللہ تعالیٰ کے زندہ کرنے اور

ليطمئن قلبي بقوة حجتي وبرهاني وان عدوى منها الى غيرها ما كان بسبب ضعف تلك الحجة بل كان بسبب جهل المستمع ص۴۱

مارنے کی حقیقت واضح ہو جائے ..... ابراہیمؑ دلیل و برہان کی قوت سے اپنے دل کو مطمئن کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے نمرود کے سامنے اپنی پہلی دلیل (زندگی و موت) کو چھوڑ کر دوسری دلیل (طلوع آفتاب) اس لیے اختیار نہیں کی تھی۔ کہ پہلی دلیل کمزور تھی، بلکہ نمرود کی جہالت کے سبب ایسا کیا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

خواجہ صاحب چار پرندوں اور چار عناصر میں مناسبت پیدا کرتے ہیں کہ "جس طرح چار عناصر کے مزاج گرم، سرد، خشک اور تر چار قسم کے ہیں اور ان کے ذرے پرندوں کی طرح فضا میں اُڑ رہے ہیں، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے خالق کے حکم سے ذرات جمع ہو کر نئی نئی ترکیب پائیں، خالقانہ تعلق سب سے قوی اور موثر ہے۔" تفسیر رازی میں ہے:

ان الطيور الاربعة اشارة الى الاركان الاربعة التي منها تركيب الابدان الحيوانات والنباتات ص۴۳

چار پرندوں کا اشارہ چار عناصر کی طرف ہے جن سے حیوانات اور نباتات ترکیب پاتے ہیں۔

(صُرهن) کے معنی خواجہ صاحب نے سدھانا اور مانوس کرنا کئے ہیں۔ عام مفسرین "قیمہ کرنا" فرماتے ہیں۔
تفسیر رازی میں ہے:

ان المشهور في اللغة في قوله (فصرهن) املهن[1] واما التقطيع والذبح فليس في الآية ما يدل عليه فكان ادراجه في الاية الحاقا لزيادة بالاية ولم يدل الدليل عليها وانه لا يجوز۔

"صرهن" کے مشہور و معروف لغوی معنی سدھانا، مائل کرنا، مانوس کرنا ہیں۔
قیمہ کرنا اور ذبح کرنا آیت میں بالکل نہیں ہے! اس کو آیت کے ذمے لگانا آیت کے ساتھ زیادتی ہے۔ جس پر کوئی دلیل نہیں، اور آیت میں ایسا اضافہ جائز نہیں ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

انه لو كان المراد بصرهن قطعهن لم يقل اليك فان ذالك لا يتعدى بالى وانما يتعدى بهذا الحرف اذا كان بمعنى الامالة ص۴۲

اگر "صرهن" کے معنی قیمہ کرنا ہوتا تو اس کے آگے "الیک" نہ کہا جاتا (یعنی "ان کو قیمہ کر اپنی طرف" بالکل بے معنی ہے) یہ لفظ "صر" الی کے ساتھ متعدی نہیں ہوتا۔ جب اس کے بعد الی آئے گا اس کے معنی امالہ ہی ہوں گے۔

یعنی ان پرندوں کو اپنی طرف مائل کر، اپنے ساتھ مانوس کر۔ اس اعتراض سے بچنے کے لیے بعض نے "تقدیم تاخیر" کی پناہ لی ہے۔

---

[1] تفسیر خازن اور تفسیر نسفی میں کل مشہور تفسیر کے ساتھ یہ معانی بھی ملتے ہیں۔ املهن واضممهن (نسفی) املهن ووجههن (خازن)

فان قیل: لم لا یجوز ان یقال فی الکلام تقدیم وتاخیر- والتقدیر: فخذ الیك اربعة من الطیر فصرھن- ذالك من التکلفات۔

اگر کہا جائے کہ کلام اللہ میں تقدیم وتاخیر کیوں نہ مان لیا جائے۔ اور یوں سمجھ لیا جائے کہ "پس لے آ اپنی طرف چار پرندے پھر ان کا قیمہ کر" قیمہ بنانے کے لیے بعض نے پیش کی جگہ زیر پڑھا ہے۔ فصِرھن ـــــ اور بعض نے قطعھن کا اضافہ کیا ہے اور اس کو سمجھا ہے۔ وغیرہ یہ تکلفات میں سے ہے۔

* * *

امام رازی اس تقدیم وتاخیر کو صحیح نہیں سمجھتے۔

قلنا: التزام التقدیم والتاخیر من غیر دلیل ملجئ الی التزامه خلاف الظاهر..... الضمیر فی قوله (ثم ادعهن) عائد الیها لا الی اجزائها[ل]۔

ہم کہتے ہیں کہ بلا دلیل تقدیم وتاخیر کا التزام ظاہر الفاظ کے خلاف ہے..... (اللہ کے قول (ثم ادعھن) میں ضمیر پرندوں کی طرف ہے۔ ان کے قیمہ شدہ اجزا کی طرف نہیں ہے۔

بے شک جمہور مفسرین اسی بات کے قائل ہیں کہ پرندوں کو ذبح کرنے کا حکم ملا تھا، لیکن ان کو آیت سے "قیمہ" نکالنے میں مشکلات پیش آئی ہیں۔ جیسا کہ اوپر آپ دیکھ چکے ہیں۔ اب ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر بھی دیکھ لیجیے جو تفسیر کبیر ہی سے ماخوذ ہے۔

تفسیر ابو مسلم اصفہانی

"ابراہیم علیہ السلام نے مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے متعلق سوال کیا ہے اگر پرندوں کو مار کر زندہ کر دینا ہی مقصود ہوتا تو ایک پرندے کو مار کر زندہ کر دینا کافی تھا۔ چار کو لے کر انھیں ذبح کرنے اور پھر گوشت کے اجزا باہم ملا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اصل میں صُرھن کے معنی ہلانے اور سکھانے کے ہیں۔ یعنی چاروں پرندوں کو ہلا لیں اور پھر ان میں سے ہر ایک کو قریب کے پہاڑوں پر چھوڑ دیں۔ پھر ان کو بلائیں۔ وہ بھاگتے آئیں گے۔ اور اس محسوس مثال کے ذکر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بلانے سے روحیں دوڑتی آئیں گی۔

۱۔ آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے۔ جس سے ذبح کرنے اور ٹکڑے کرنے کا مفہوم لیا جا سکے۔ اپنی طرف سے کچھ الفاظ داخل کرنا جن کا کوئی قرینہ بھی نہ ہو، قطعاً ناجائز ہے۔

۲۔ اگر شاذ قراءت صِرھن بھی مان لیں اور اس کا مفہوم قطع کرنا لیں تو "الیک" کے کیا معنی ہوں گے ...... ؟ کیا کوئی دکھا سکتا ہے کہ (صِرھن) کے ساتھ "الی" کا صلہ آئے اور پھر اس کا مفہوم کاٹنا ہو؟

۳۔ (ادعھن) صاف پرندوں کی طرف راجع ہے۔ ظاہر ہے کہ پرندے زندہ ہوں گے۔ کیونکہ گوشت کے ٹکڑوں کو بلانا مقصود ہوتا تو ضمیر انہیں کی طرف راجع ہوتی۔ اگر بعض اجزا بھاگ کر بعض کے پاس آتے تو (یاتینک) کی ضمیر اجزا کی طرف ہوتی۔ مگر وہ پرندوں کی طرف ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر "جزء" کا لفظ نہیں آنا چاہیے تھا۔ تو یہ بھی کوئی دقیق سوال نہیں۔ کیوں کہ جزءٍ کی ضمیر اضافت چاروں طرف

لہ۔ التفسیر الکبیر۔ رازی الجزء السابع مطبوعہ مصر ۱۹۳۸ء

کی ہے اس لیے ضروری ہے کہ "جزء" سے مراد ان چاروں میں سے ایک ہو۔ (ص۱۱۵ و ۱۱۶ اردو ترجمہ تفاسیر ابو مسلم اصفہانی)

"جزء" کے متعلق خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ

"مجموعے کا ہر فرد اس کا جزء ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے۔

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ط لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (الحجر ۴۴)

جہنم کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازے کے لیے ان (دوزخیوں) کا ایک حصہ (جزء) الگ کیا ہوا ہے۔"

"چار پرندوں کی تشبیہ کیفیات اربعہ (گرم، سرد، خشک، تر) اور عناصر اربعہ (خاک، باد، آب، آتش) میں زندگی پیدا کر دینے سے بہت مناسبت رکھتی ہے۔

یہ تمثیلی بیان محض ذہن نشین کرنے کے لیے ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سچ مچ سیدنا ابراہیمؑ نے فلاں فلاں چار پرندے لیے اور ان کو سدھایا اور بلایا، وہ پیغمبر جلیل کی عقل و خرد کا مناسب احترام نہیں کرتے۔ یہ بات تو ایک عام آدمی کو بھی محض لفظوں کے ذریعے سمجھائی جا سکتی ہے۔ چہ جائے کہ پیغمبر ــــ کیا ہم سب لوگ جو اللہ تعالیٰ کے مُردوں کو زندہ کرنے پہ یقین رکھتے ہیں، پرندوں کو سدھا سدھا کر اس کے متعلق اطمینان حاصل کرتے ہیں"؟

مادر مریمؑ

خواجہ صاحب جمہور کے خلاف مسیح علیہ السلام کی ولادت و وفات کے متعلق اس قلیل گروہ کے ہم نوا ہیں، جو ان کو یوسف نجّار کے فرزند اور طبعی موت مرنے والے سمجھتے ہیں، لیکن وہ اپنے معاصرین اور پیش روؤں سے الگ کچھ اپنے خاص دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ اُن کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے:

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ...... اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔

آل عمران ۲، ۳۲، ۳۳)

جب عمران کی بیوی نے کہا۔ اے میرے پروردگار! جو کچھ میرے پیٹ میں ہے۔ میں اسے خالصتاً تیرے نذر کرتی ہوں میری طرف سے قبول فرما۔ جب لڑکی پیدا ہوئی تو کہا میں نے اس کا نام مریم (خادمہ) رکھا اور (اے خدا) میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں سونپتی ہوں۔

عمران ایک غریب آدمی تھا اس کی حاملہ بیوی نے اپنے پیٹ کے بچے کو بیت المقدس میں دے دینے کی نذر مانی۔ چنانچہ لڑکی کو قومی غریب خانے کے حوالے کر دیا گیا۔ ایسے اداروں، خانقاہوں وغیرہ کے متولی عموماً بدکردار شیطان قسم کے لوگ ہوتے۔ جن سے بیوہ عورتوں اور یتیم لڑکیوں کو خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے والدہ مریم نے خدا سے دعا کی کہ میری بچی اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے دخل سے محفوظ رکھنا۔ اس کو علم تھا کہ یہ مجاورین بالغ لڑکیوں کا نکاح اپنی ولایت سے کرا دیا کرتے ہیں ...... دعا قبول ہوئی فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا مریمؑ و مسیحؑ شیطانی دخل سے بچائے گئے۔ لیکن خدائے تعالیٰ کے حکم سے نکاح کرنا شیطانی دخل سے بالکل الگ شے ہے۔ البتہ بغیر نکاح حاملہ کے ہاں بچے کا متعارف طریق سے پیدا ہونا دخل شیطانی کی دلیل ہے۔ "ذریت" کے لفظ میں واحد، جمع، نر اور مادہ سب اولاد شامل ہے۔ والدہ مریم کے خیال میں مریم کے پہلے بچے کے بعد اور بھی بھائی بہن ہونے ممکن تھے۔

محکم و متشابہ

محکمات سے معنی ایسی ثابت شدہ باتیں ہیں جو فطرت و حکمت کے مطابق ہوں، اہل دانش کے نزدیک مسلّم و محکم ہوں اور بطور حقائق مانی جاتی ہوں، جیسے توحید، صدق، صبر، ذکر الٰہی، صفات عفو وغیرہ مستقل اقدار ہیں اور تمام منعم علیہم لوگوں نے انہی کی تعلیم دی ہے انعام، بنی اسرائیل، لقمان، روم، شوریٰ وغیرہ سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے نمونے پیش فرمائے ہیں۔

اہلِ زیغ (کج طبع) متشابہات کو بنیاد بنا کر محکمات کو بگاڑ کر ان کے پیچھے چلاتے ہیں اور فتنہ و کجی پیدا کرتے ہیں تاکہ الٰہی تعلیمات میں اختلاف پیدا کریں۔

متشابہات کی اصل حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ لیکن اہل فکر و دانش، جتنا جتنا رسوخ فی العلم بڑھتا جاتا ہے متشابہات سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی ستائش کرتے ہیں۔ اس آیت (والرّاسخون فی العلم: آل عمران - ۷) سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن فہمی کسی خاص شخص کا خاصہ نہیں۔ بلکہ مسلمانوں کے علاوہ اہلِ کتاب میں بھی راسخون فی العلم موجود تھے۔ کما قال تعالیٰ:

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ ۔۔۔۔۔ الخ   اور اہلِ کتاب میں سے جو لوگ علم میں پختہ ہیں ۔۔۔۔۔

(النساء - ۱۶۲)

ولادتِ مسیح

خواجہ صاحب اس تمہید کے بعد دلائل پیش کرتے ہیں:

۱۔ کفار بعض مخلوق کو اللہ تعالیٰ کا جزو کہتے تھے۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جزو اسی کا ہو سکتا ہے جو مرکب ہو اور محدود بھی ہو اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک مجموعہ عناصر نہیں۔ اس لیے اس کا جزو نہیں ہو سکتا۔

جَعَلُوْا لَہٗ مِنْ عِبَادِہٖ جُزْءًا (الزخرف۔۱۵) کفار نے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اس کے اجزا ٹھہرا رکھا ہے۔

اپنے بزرگوں کو خدا کی اولاد کہتے ہیں۔ "ولد" نسبتی لفظ ہے، جو قوائے عاقدہ و منعقدہ یا مثبت و منفی بجلیوں کا متقاضی ہے۔ جو ایک ہی نوع کے دو افراد میں موجود ہوں۔ اسی حقیقت کی بنا پر فرمایا ہے:

اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَکُنْ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ جب کہ اس کی بیوی نہیں ہے؟ (الانعام۔۱۰۲)

یہ آیت صریح دلیل ہے اس بات پر کہ والد و والدہ کے بغیر ولد کا وجود میں آنا محال ہے ــــ یہی وجہ ہے کہ قادر مطلق خدا کے ہاں بھی ولد کا ہونا قطعاً محال ہے۔ اگر اس کو ممکن سمجھتے ہو تو اس کی ہم نوع صاحبہ (بیوی) پیش کرو ــــ اس دلیل میں کوئی استثناء نہیں ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو آدم و حوا کی طرح ماں باپ کے بغیر پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے ولد نہیں ہوں گے اور نہ حوا، آدم کی ولد ہوگی ــــ دو افراد کا اکٹھے تیار ہونا اور مرد کا حرارت کے سبب پہلے مکمل ہو جانا اور عورت (حوا) کا برودت کے باعث بعد میں تکمیل پا کر الگ ہو جانا نسبی ولد کی تعریف میں نہیں آتا۔

قرآن پاک میں مسیحؑ کا ولد ہونا تسلیم کیا گیا ہے۔ (اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ) جو متقاضی ہے والد اور والدہ دونوں کو۔ لہٰذا ایسا شخص خدا یا ابن خدا نہیں ہو سکتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں مریمؑ میں عاقدہ و منعقدہ دونوں قوتیں موجود تھیں۔ اس لیے حضرت مسیح کی پیدائش کے لیے باہر سے کسی چیز کا داخل ہونا ضروری نہیں تھا، لیکن اس کے خلاف خدا فرماتا ہے۔

فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا (التحریم۔۱۲) ہم نے متعارف راستے سے اس کے اندر اپنی روح پھونکی۔

"فیہ" میں ضمیر مذکر ہے۔ جو مریم کی طرف راجع نہیں ہو سکتی۔ اس سے قبل "اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا" فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ ضمیر بالکل واضح طور پر "فرج" ہی کی طرف جائے گی جو انعقادِ حمل کا متعارف راستہ ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے (کلمۃ ج القھا الی مریم) (النساء۔۱۷۲) مسیح (عام کلمات یعنی مخلوقات کی طرح) ایک کلمہ تھے جن کو مریم کی طرف ڈالا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ بطن مریم کے اندر

ہی اندر تخلیق نہیں ہوئے تھے جسب دستور باہر ہی سے بطریق معمول داخل کئے گئے تھے۔ سورۂ مریم میں ہے۔

فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم۔۱۷) خواجہ صاحب جمہور کے خلاف اس کا نثری بھی ترجمہ کرتے ہیں۔

ہم نے اس (مریمؑ) کی طرف اپنی ایک (سعید) روح کو بھیجا تو وہ اس (مریم) کی مانند بن کر اس حال میں اس کے سامنے آیا کہ وہ تندرست بشر تھا (تندرست بشر میں بشری خواہشیں موجزن ہو سکتی ہیں۔ وہ مریم کے پاس ایسے حال میں آیا کہ اس کو اپنے مثل حقوق دے (وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ بقرہ۔۲۲۸) وہ شخص اس وقت بشر نہیں بن گیا تھا بلکہ پہلے ہی سے بشر تھا۔۔۔۔ "مغنی اللبیب" میں اس مثال کے علاوہ ایک اور مثال دی گئی ہے۔ جاءنی زید رجلاً محسناً۔ زید میرے پاس اس حال میں آیا کہ وہ احسان کرنے والا مرد تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زید پہلے مرد نہیں تھا اور اب مرد بن کر آیا ہے۔ اسی طرح وہ سعید روح پہلے سے بشر ہی تھا۔ خدا نے اسے بھیجا تھا وہ مریم کے اہل سے مل کر، ان کی اجازت سے مریم کے پاس آیا تھا۔ مسیح اس روح سعید کا فرزند ہونے کے سبب "روح منہ" کہلاتے تھے اگر وہ روح ہونے کی وجہ سے اِلٰہ تھے تو ان کا باپ بھی معاذ اللہ اِلٰہ ہونا چاہیئے۔

اس تندرست بشر نے کہا کہ اللہ نے مجھے بھیجا ہے کہ تجھے ایک پاک بیٹا دوں لاھب لک غلاماً ذکیا۔ (مریم۔۱۹) مریم نے اس بیٹے کو پیٹ میں اٹھا لیا (فحملتہ (مریم۔۲۲) اس سے بھی اس بیٹے کا باہر سے جانا ہی ثابت ہوتا ہے۔ پھر وہ بیٹا سخت درد زہ کے بعد متعارف راستے ہی سے حسب معمول باہر آیا۔ تو اس سے بھی ثابت ہوا کہ ولوج و خروج کا راستہ ایک ہی ہے۔

۲۔ سورہ انعام آیت ۸۴ تا ۸۶ میں سترہ انبیائے کرام کا ذکر ہے۔ جن میں عیسٰیؑ بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد آیت ۸۷ میں ارشاد ہوتا ہے: (ومن آبائھم)۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان تمام نبیوں کو ہدایت دی اور ان کے باپوں میں سے بھی بعض کو ہدایت دی، یعنی ان سب کے باپ تو تھے، لیکن ہدایت یافتہ ان میں سے بعض ہدایت سے محروم ہے۔ (مثلاً والد ابراہیمؑ)

۳۔ جب حضرت مریمؑ، حضرت عیسٰیؑ کو قوم کی طرف لائیں، تو قوم نے کہا تو نے ایک ناجائز اقدام کیا ہے یہ بدکاری ہے۔ تیرے ماں باپ بدکار نہیں تھے ۔۔۔ اس تنقید سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یوسف کے ساتھ مریم کے نکاح کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اگر تو نے بے باپ کا بچہ جنا ہے تو اس کا کوئی ثبوت پیش کر۔ حضرت مسیح کے جواب سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی ولادت کو جائز ثابت کر رہے ہیں۔ جھگڑا صرف اس بات میں تھا کہ یہ نکاح جائز ہے یا ناجائز، حرام ہے یا حلال! یہ بحث اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ باپ موجود ہو۔ اگر باپ یا بے باپ کی بحث ہوتی تو اس کا رنگ اور ہوتا۔ اس بحث سے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ اگر یہ نکاح شریر مجاورانِ ہیکل کے بقول ناجائز ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس سے ایسا نیک بخت، بلند مرتبہ نبی پیدا نہ کرتا۔

۱؎ مریم آیت ۲۷ کی تفسیر میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ مجاور مریم کو کہتے تھے کہ "تو نے بیت المقدس کے متولیوں کے بغیر نکاح کر لیا ہے بلکہ اپنے بڑے بھائی ہارون کی ولایت کا بھی خیال نہیں کیا۔ (یا اخت ہارون) متولیوں میں ہر ایک خوب صورت بالغ مریم کا سرپرست بننا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ فال نکالتے اور جھگڑتے تھے۔ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ ۔۔۔۔ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ (آل عمران ۴۴)

اعتراض کرنے والے مجاوروں کا غلط کار بداعمال ہونا، آیت ذیل سے ظاہر ہے۔ ذکریا کہہ رہے ہیں:

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ (مریم-۵)
میں بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں اپنے بعد۔

۳۔ سورۂ آلِ عمران اور سورۂ مریمؑ میں ولادتِ مسیحؑ کا ذکر ہے۔ مفسرین نے ان دو بیانوں کو یہاں پیش خبری سمجھا ہے۔ لیکن قرآن کے الفاظ دونوں جگہ مختلف ہیں۔ آلِ عمران میں ملائکہ اور بشارت کا ذکر ملتا ہے۔ جو مریم میں نہیں۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ (آلِ عمران-۴۵)
جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ تعالیٰ تجھے بشارت دیتا ہے۔

اور سورۂ مریم میں جیسا کہ اوپر آچکا ہے (بشراً سویاً) تندرست بشر پہنچتا ہے۔ اور بشارت کی بجائے پاک بیٹا دینے کے لیے آتا ہے (لِاَھَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا) آخر اس فرق میں کیا حکمت ہے؟

نیز وہاں ملائکہ بصیغہ جمع ہے اور یہاں "روحنا" اور "بشراً سویاً" واحد ہے۔

(۴) اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ (آلِ عمران-۵۸)
عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسے آدم کی مثال، اس کو مٹی سے بنایا۔

اس آیت سے بھی مسیح کے بے باپ پیدا ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب اس کی تفسیر آیۂ ذیل سے کرتے ہیں:

بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَہٗ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ (السجدہ-۷-۸)
اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا آغاز مٹی سے کیا پھر اس کی نسل کو ذلیل پانی کے نچوڑ یعنی نطفے سے جاری کر دیا۔

ظاہر ہے کہ مسیحؑ پہلے انسان نہیں تھے جو مٹی سے پیدا کئے جاتے۔ آدم کے بعد آیت کے مطابق نسل آدم نطفے سے جاری ہوئی۔ حضرت مسیح نسل آدم سے ہونے کی وجہ سے یقیناً نطفے ہی سے پیدا ہوئے۔

۵۔ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا یَذْرَؤُکُمْ فِیْہِ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (الشوریٰ-۱۱)
اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے جوڑے بنائے اور مویشیوں سے بھی جوڑے بنائے (جوڑوں کے ذریعے تمہاری نسلیں پھلتی پھیلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ بے مثل ہے۔

آدم و حوا علیہما السلام جوڑا ہی تھے۔ ان کے بعد بھی جوڑے ہی چلے آئے ہیں۔ اسی ذریعے سے افزائش نسل کا سلسلہ جاری ہے۔ حضرت مریمؑ کے وقت بھی انسان جوڑے ہی سے پیدا ہوتے تھے مسیحؑ اس قانون خداوندی سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ ہاں اس سے مستثنیٰ صرف ایک ذات ہے جس پر یہ آیت ختم ہوتی ہے۔

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (ایضاً)
صرف وہی ایک ہے جو بے مثل و بے نظیر ہے (یعنی جوڑے سے پاک ہے) اور وہ سمیع و بصیر ہے (یہ صفات بھی بے مثل ہیں انسانوں کی طرح نہیں)

۶۔ قرآن پاک میں مسیحؑ کے ساتھ ان کی والدہ مریمؑ کا ذکر تو بار بار آتا ہے۔ لیکن والد کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ اس سے بھی ان کے بے باپ ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ عدم ذکر، عدم شے کی دلیل نہیں۔ ابن مریم کہنے میں یہ حکمت بھی ہے کہ ماں بیٹا دونوں الٰہ سمجھے جاتے تھے دونوں کو الوہیت کی تردید کی جائے۔ کیا دردِ زہ کا دکھ اٹھا کر جننے والی اور اس کا جنا ہوا بیٹا خدا ہو سکتے ہیں؛ دوسری بات یہ بھی ہے کہ مریم ہیکل کی نذر ہونے کی وجہ سے معروف تھیں۔ اور یوسف نجار ناصرہ کا رہنے والا یہاں ایک غیر معروف شخص تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی ماں کا ذکر قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے۔ بلکہ باپ کا کام بھی ماں ہی کرتی نظر آتی ہے۔ باپ کی طرف کہیں اشارۃً تک نہیں ملتا۔ اس کے باوجود کوئی شخص اس کا قائل نہیں ہے کہ موسیٰؑ، ہارونؑ اور اُختِ ہارون بے باپ تھے۔

۷۔ ایک دلیل مسیح کے بے باپ ہونے پر یہ بھی پیش کی جاتی ہے۔ کہ اس پر امت کا اجماع ہے۔ اس کا جواب خواجہ صاحب یہ دیتے ہیں کہ:

"کوئی شخص آدم سے لے کر نوعِ انسان کے خاتمے تک کے تمام مردوں کو اپنے خیال میں حاضر کرے اور ان میں سے ہر ایک سے دریافت کرے کہ کیا تم مردوں کے ہوتے ہوئے صرف ماں ہی سے پیدا ہوئے ہو؟ تو ایک فرد بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کہ میں بے باپ پیدا ہوا ہوں۔ اگر اجماع کوئی چیز ہے تو اس عظیم، لامحدود اور محسوس اجماع کے مقابلے میں مسیح کو بے باپ کہنے والوں کا اجماع کیا وزن رکھتا ہے؟"

کذالک جب فرشتے مریمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتے ہیں، تو وہ کہتی ہیں میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ (آل عمران۔ ۴۷) اسی طرح اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب مریم ہیکل میں حضرت زکریاؑ کی نگرانی میں رہتی تھیں۔

اس کے بعد دوسرا دور آتا ہے، جب وہ اپنے اہل میں آجاتی ہیں اس وقت ان کے پاس ایک بشر سوی (تندرست بشر) پہنچتا ہے تو وہ دبشارت نہیں بلکہ، بیٹا دینے کو کہتا ہے۔ اس موقع پر بھی وہ یہی کہتی ہیں کہ "میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا؟ جب کہ مجھے (اس وقت تک) کسی نے نہیں چھوا اور میں بدکار بھی نہیں"۔ جواب میں وہ جو بیٹا دینے آیا تھا، کہتا ہے۔ كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ۔ اسی طرح، تیرے رب نے فرمایا ہے کہ مجھ پر آسان ہے" (مریم۔۲۱)

اس کی تفسیر میں کہا جاتا ہے کہ:

"اسی طرح بدون مسِ بشر کے ہو جائے گا۔" (شیخ الاسلام عثمانیؒ)

اس سے قبل حضرت یحییٰؑ کی ولادت کا ذکر دونوں جگہ (آل عمران اور مریم میں) اسی التزام سے آیا ہے۔ حضرت زکریاؑ بیٹے کے لیے

دعا مانگتے ہیں۔ جب وہ قبول ہو جاتی ہے، تو تعجب کرتے ہیں کہ بیٹا کیسے ہو گا! جب کہ میں بوڑھا اور بیوی بانجھ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی یہی جواب دیتا ہے۔ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۤءُ (آل عمران - ۴۰) اسی طرح اللہ تعالیٰ جو چاہے کرتا ہے۔ دوسرے مقام پہ بھی یہی عذر منقول ہے اور جواب وہی ہے جو حضرت مریم کو دیا ہے — " قَالَ كَذٰلِكَ ج قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ۔ یونہی ہو گا، فرما دیا تیرے رب نے، وہ مجھ پر آسان ہے۔

یہاں بھی تفسیر وہی ہے۔

"اس تعالیٰ کی قدرت و مشیت سلسلہ اسباب کی پابند نہیں" (عثمانی)

خواجہ صاحب اس تفسیر سے اختلاف کرتے ہیں۔ اور اثبات مدعا کے لیے دوسری طرف رُخ فرماتے ہیں۔

"جب حضرت مریمؑ کو بیٹے کی خبر ملی، تو انہوں نے کہا کہ بغیر خاوند کے میرے ہاں بیٹا کس طرح ہو سکتا؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ کذالک اللہ یخلق ما یشاء یعنی جس (بیٹے) کو اللہ تعالیٰ بنانا چاہتا ہے، اسے اسی طرح پیدا کیا کرتا ہے (جیسا تیرے بیان سے ظاہر ہے) اللہ تعالیٰ کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت مریم کو بیٹا ملا ہر بیٹا اسی طرح پیدا ہوتا ہے۔ پس حضرت عیسیٰ بالضرور باپ سے پیدا ہوئے،[1]

اس (کذالک) سے آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں کسی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو میں اس کے اسباب اور سامانوں کو حکم دیتا ہوں تو وہ حکم کے مطابق کام کرتے ہیں اور وہی نتیجہ پیدا ہو جاتا ہے (اذا قضیٰ امراً فانما یقول لہ کن فیکون آل عمران ۴۴) یہ حکم تمام امور پر حاوی ہے۔ کسی امر یا شے کی تیاری اس سے مستثنیٰ نہیں۔ گویا حضرت مریم سے کہا جاتا ہے ہم تیرے نکاح کے لیے خود ہی سامان پیدا کر دیں گے اور وہ شخص آ کر کہے گا کہ میں تجھے بیٹا دینے کے لیے خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہوں اَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم ۱۷) وَ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا۔ ایضاً۔ ۱۹) اے مریم! تو میری بات کا امتحان کر کے اس کی تصدیق کرے گی۔ بے شک مسیحؑ اللہ کی روحوں میں سے ایک روح تھے، جیسا کہ ان کا باپ بھی روح ہی تھا (روح منہ۔ نساء — روحنا۔ مریم) اس انداز بیان سے ان کا خدا یا فرزند خدا یا بے باپ ہونا ثابت نہیں ہوتا"

خواجہ صاحب اب ذکریا علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:۔

"حضرت ذکریا کو "کذالک" کہا گیا تو اس کے معنی تھے کہ تیری رکاوٹوں[2] کو دور کر کے تجھے بیٹا ملے گا۔ اگر اس جگہ کذالک کے معنی خرقِ عادت نہیں۔ بلکہ قانون خداوندی کے مطابق ہیں تو مریم کے جواب میں اسی کذالک کے معنی خلافِ قانون کیوں لیے جاتے ہیں!

---

[1] یعنی واقعی بقول مریم مس بشر کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا مس بشر ہی قانون الٰہی ہے۔ مرتب

[2] یعنی بیوی کی اصلاح و صحت مندی اور زکریا کی تقویتِ بدن کے بعد بیٹا پیدا ہو گا۔ انہوں نے یہی دو رکاوٹیں پیش کی تھیں (اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ہم نے اچھا کر دیا اس کی بیوی کو انبیاء ۹۰ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا، میں کمزور اور بوڑھا ہو گیا ہوں مریم ۴) مرتب

مہدِ مسیح

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا۔ (آلِ عمران ۴۶) لوگوں سے باتیں کرے گا ماں کی گود میں اور جب پوری عمر کا ہوگا۔

یہ معنی معروف ہیں، لیکن خواجہ صاحب اس کا حسب ذیل ترجمہ کرتے ہیں۔

"وہ مہد میں (یعنی بچپن میں جب کہ نیک بچے نیکی کی باتیں کر سکتے ہیں) اور ادھیڑ عمر میں (یعنی وہ بچپن سے کہولت تک اپنے فرائض رسالت انجام دے کر شیخوخت سے قبل فوت ہو جائے گا) لوگوں سے اپنی دانش کے مطابق نیکی کی باتیں کرے گا۔"

اس تشریحی ترجمے کے علاوہ مزید لکھتے ہیں۔

"جب حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف رسول بن کر آئے اور ان کی ماں انہیں سوار کر کے لائی تو وہ اس وقت مہد میں نہیں تھے۔ وہ عاقل، بالغ اور جوان تھے، نبی بن چکے تھے، تورات کے عالم تھے، انجیل ان پر نازل ہو رہی تھی، وہ اکثر جگہ اپنی برکت پھیلاتے آئے تھے۔ ان پر نماز و زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ اگر میری ماں (نعوذ باللہ) بدکار ہوتی تو خدا تعالیٰ مجھے خصوصیت سے اس کے ساتھ نیک سلوک کا حکم کیوں دیتا۔ وہ ہرگز بغی اور مجھے بدنام کرنے والی نہیں ہو سکتی۔"

خواجہ صاحب کو یہ تمام باتیں آیات ذیل میں نظر آ رہی ہیں۔

قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۝ وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي۔ (مریم۔ ۳۰ تا ۳۲)

(مسیح اعتراف کرتے ہیں کہ) میں اللہ کا بندہ ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا اور جہاں جہاں میں رہا ہوں مجھے بابرکت ہی بنایا ہے اور مجھے صلوٰۃ و زکوٰۃ کا زندگی بھر کے لیے حکم فرمایا ہے اور اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کا حکم دیا ہے۔

مترجمین اور مفسرین کہتے ہیں یہ کلام اس وقت کا ہے جب حضرت مسیح گہوارے یا ماں کی گود میں تھے۔ کیوں کہ اوپر مخالفین کا قول ہے۔

كَيْفَ نُكَلِّمُ مَن كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا (مریم۔ ۲۹) ہم اس سے کیوں کر بات کریں جو گود میں لڑکا ہے۔

"کان" کے معنی "ہے" کئے گئے ہیں۔ جب کہ خواجہ صاحب اس کو ماضی پر منطبق کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"ہم ایسے شخص سے کیوں کر کلام کریں جو بچپن میں دوسرے بچوں کی طرح) ہنڈولے میں کھیلا کرتا تھا اس میں الوہیت کی کوئی شان

نہیں پائی جاتی)

آیات بالا میں تمام صیغے ماضی کے لائے گئے ہیں جن سے خواجہ صاحب ثابت کرتے ہیں کہ وہ اس کلام کے وقت نبی بن چکے تھے۔ علماء کو بھی اس جگہ ماضویت کا احساس واعتراف ہے لیکن وہ اس کو متیقن الوقوع مستقبل بنا دیتے ہیں۔ جیسا کہ شیخ الاسلام عثمانی لکھتے ہیں:۔

"یہ سب جملے جو بصیغہ ماضی لائے گئے ہیں، بے شک اس کے معنی ماضی ہی بیے جائیں گے۔ لیکن اس طرح کہ مستقبل متیقن الوقوع کو گویا ماضی فرض کر لیا گیا ہے" (حاشیہ آیت ۲۲۔ مریم)

علماء اپنی تفسیر و ترجمہ کی دلیل میں یہ آیت بھی پیش فرماتے ہیں۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ط (مریم۔۲۷) پھر لائی (مریم) اس (مسیح) کو اپنے لوگوں کے پاس گود میں۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ "اپنی قوم کی طرف سوار کر کے لائی" وہ اس معنی کی سند اس آیت سے نکالتے ہیں،

اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ۔ (توبہ۔۹۲) جب وہ (غریب صحابہ) تیرے پاس آئے کہ تو انہیں (جہاد کے لئے) سواری دے، تو نے کہا میرے پاس کوئی شے نہیں، جس پر تمہیں سوار کر دوں۔

قرطبی میں مشہور تفسیر کے ساتھ یہ الفاظ بھی ملتے ہیں۔ جو خواجہ صاحب کے موید ہیں:۔

وقیل المعنیٰ ویکلم الناس صغیراً وکهلاً (ص۹۱ جز۴) کلام کرے گا (مسیح) بچپنے میں اور ادھیڑ عمر میں۔

وفات وحیات مسیح

عیسٰی علیہ السلام نے کہا:

"اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ توریت کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک رسول کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمدؐ ہو گا۔ مُبَشِّرًا م بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ‌ؕ)

خواجہ صاحب "من بعدی" کے معنی کرتے ہیں، "میری وفات کے بعد" وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید الوہیت مسیح کی بحث میں نہیں پڑتا۔ اس کے پیش نظر "الوہیت مسیح" کی تردید ہے۔ جو شخص بطن مادر سے پیدا ہوا، بچپن سے گزر کر جوانی تک پہنچا، اور کہولت کی عمر میں شیخوخت سے قبل فوت ہوا، وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر یہ بھی واضح ہے کہ وہ اپنی دنیوی زندگی میں غذا کا محتاج تھا، بازاروں میں چلتا پھرتا تھا اور غذا کے اثرات و نتائج بھی اس پر مترتب ہوتے تھے۔ وہ اپنی موت تک صلوٰۃ و زکوٰۃ کا پابند تھا (اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۳۲۔ مریم) وہ اپنی بندگی کا معترف تھا (اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ مریم۔ ۳۰) پھر اس نے اپنے بعد ایک رسول "احمدؐ" نام کی بشارت بھی دی۔ وہ اپنے آپ کو صرف بنی اسرائیل کی طرف رسول کہتا ہے اور احمد رسولؐ ساری دنیا کی طرف رسول ہے۔ اب دوبارہ مسیحؑ کا ساری دنیا کی طرف رسول بن کر آنا، احمد رسولؐ کی عالمگیر رسالت کے منافی ہے۔

اگر مسیح کو دنیا میں دوبارہ[1] آنا تھا تو اس کے لیے بہت موزوں وقت وہ تھا کہ وہ جس رسول کی آمد کی خوش خبری دے رہے تھے، اس کے عہد میں تشریف لے آتے، اس وقت کے یہود و نصاریٰ کو دعوت اسلام دینے میں ان سے گراں بہا مدد ملتی! بڑی بڑی جنگوں اور مقابلوں کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ حضرت مسیح مٹی کے پرندے بنا کر اور پھونک مار کر ان کو بحکم الٰہی اڑا دیتے۔ مادر زاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو باذن الٰہی شفا بخشتے۔ عہد نوحؑ کے مرے ہوؤں کو باذن اللہ زندہ کر دیتے۔ اس سے دین اسلام کو بے حد تقویت پہنچتی —— ایک حاضر و موجود امداد کو وقت ضرورت روک دینا اور اسے قیامت کبریٰ کے لیے اٹھا رکھنا!

"بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست"

---

[1] سورۂ مائدہ ۱۱۷۔ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ۔ کا ترجمہ خواجہ صاحب اس طرح کرتے ہیں: میں (مسیح) ان (اپنی امت) پر اس وقت تک گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا جب تو (خدا) نے مجھے فوت کر دیا تو اس کے بعد تو ہی ان پر نگران تھا... الخ (اگر مسیح دوبارہ دنیا میں آئے ہوتے تو مسیحیوں کے اس شرک کا ان کو ضرور علم ہوتا، لیکن وہ بڑی صفائی سے کہتے ہیں کہ مجھے ان سے الگ ہونے کے بعد کا آج عالم آخرت تک کوئی علم نہیں ہے۔ میں اس وقت تک ان پر گواہ تھا جب تک ان کے بیچ تھا (منزل دوم ص۹۶)

خواجہ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ :

ایسا شخص جو دوسرے عالم کے حالات جزا و سزا کے متعلق چشم دید گواہی دے سکتا ہے اور ایسے معجزات دکھا سکتا ہے۔ جو چشم عالم نے اس سے پہلے اور پیچھے کبھی نہ دیکھے۔ ایسا شخص تو تنہا ہی ساری دنیا کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے احمد رسولؐ یا کسی بھی اور مصلح و مبلغ کی قطعاً ضرورت نہیں ۔۔۔ کیونکہ اس مسیح کے سوا تو جو بھی اس میدان میں اترے گا، عام انسانی عمر پاکر دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ جاودانی کے ہوتے ہوئے آنی وفانی کو کیسے ترجیح دی جا سکتی ہے؛ بشارت والی آیت میں "بین یدی" اور "من بعدی" پر خواجہ صاحب نے خاص توجہ کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :

مسیحؑ نے کہا میں تصدیق کرنے والا ہوں اس (تورات) کی جو مجھ سے پہلے ہے۔ "مجھ سے پہلے" کا مطلب بلا اختلاف ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ مسیحؑ کی ولادت سے پہلے۔ اس کے مقابلے میں "من بعدی" آیا ہے۔ "بین یدی" کے قرینے سے اس کے معنی لازماً یہی ہوں گے کہ "میری موت کے بعد" ۔۔۔ لہٰذا بشارت والے احمد رسولؐ کی تشریف آوری حضرت مسیحؑ کی موت کے بعد ہوئی۔ انہوں نے اس پیش گوئی سے قبل بنی اسرائیل سے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ :

میں ہزار ہا برس آسمان پر زندہ رہوں گا اور آسمان پر چڑھ جانے کے بعد احمد رسولؐ کو حضرت ہارون کی طرح اپنا خلیفہ بنا کر بھیجوں گا۔ اور آخر کار حضرت موسیٰؑ کی طرح خود آکر اپنا کام سنبھال لوں گا ۔۔۔ کیا بنی اسرائیل نے "من بعدی" کے یہی معنی سمجھے تھے؛ ہرگز نہیں۔

قرآن مجید میں "من بعد" کے استعمالات ملاحظہ فرمایئے ،

جن کہہ رہے ہیں ۔۔۔ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى (احقاف ۔ ۳۰) ہم نے سنی ہے ایک کتاب (قرآن) جو موسیٰؑ کے بعد اتری ہے۔ یہاں "من بعد موسیٰ" کے معنی بلا اختلاف موسیٰؑ کی وفات لیے جاتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى (بقرہ ۲ ۔ ۲۴۵)

کیا تو نے موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا؛ ۔ اس آیت میں بھی وفات موسیٰؑ کے سوا اور کوئی معنی نہیں لیے جا سکتے۔

یعقوبؑ اپنی رحلت کے وقت اپنے بیٹوں کو وصیت کر رہے ہیں مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ بقرہ ۱۳۳ ۔ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ یہاں "من بعدی" کے معنی موت کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں؛ یہی "من بعدی" مسیح علیہ السلام کی زبان سے بنی اسرائیل کو خطاب کرتے وقت ادا ہو رہا ہے، جس کے معنی قائل و سامع دونوں کے نزدیک موت اور صرف موت ہی تھے۔

جہنم ــــ ہسپتال

خواجہ صاحب جہنم کو روحانی واخلاقی امراض کا شفاخانہ سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، جن لوگوں نے یہاں اپنی اصلاح یا تزکیہ نہیں کیا، اُن کو بقدر مدت علاج جہنم میں رہنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ شافی مطلق ہے۔ کوئی مرض ایسا نہیں، جو اُس کی دست رس سے باہر ہو۔ اس کی شان یہ ہے۔ کہ اس نے اپنی ذات پر رحمت کو فرض کر لیا ہے۔ (کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ انعام ۱۲) اور اس کی رحمت ایسی شے ہے جو ساری کائنات کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ (وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ رَحْمَۃً۔ مومن ۸) جہنم بھی اس "کل شی" سے باہر نہیں۔ بچہ جو اپنی ضرورت کو بیان کر سکنا تو کجا سمجھ ہی نہیں سکتا، اس کے لیے مہادری اور شفقت پدری کے ساتھ سب کچھ اس کی ولادت سے پہلے ہی تیار کر رکھا ہے۔ اسی طرح ہر جماد و نبات، حیوان اور انسان کی نشو و نما، بقا و قیام، اور غذا و علاج کے اسباب فراہم کر رکھے ہیں۔

ابرار کی آئندہ ترقیات اور اشرار کی اصلاح کا انتظام بھی اُس نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ اسی کا نام جنت و جہنم ہے جو عین حکمت و رحمت کے مطابق ہے۔ جہنم کے ہسپتال میں تلخ ترین اکل و شرب اور چیر پھاڑ کینے اور دشمنی کی بنا پر نہیں ہوگا۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ رحمت و محبت ہی کے ظہور کی ایک شکل ہے،

طفل می نالد بہ نیش احتجام
مادر مشفق دراں دم شاد کام

کوئی رسول موت سے مستثنیٰ نہیں

غزوہ احد میں عارضی شکست ہوئی اور افواہ پھیل گئی کہ رسول کریمؐ قتل ہو گئے۔ اس امتحانی وقت میں کئی شخص ترکِ اسلام پر آمادہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مخاطب فرماتا ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ (آل عمران۔ ۱۴۴)

محمدؐ ایک رسول ہیں۔ تمام سابقہ رسول ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اگر وہ بھی وفات پا جائیں۔ یا قتل کئے جائیں، تو کیا تم (اسلام سے) برگشتہ ہو جاؤ گے؟

یہاں "الرسل" پر الف لام استغراقی ہے اور رسول کریمؐ کی وفات ثابت کرنے کے لیے ان کو الگ کیا گیا ہے۔ اگر یہاں استغراق نہ ہوتا تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا۔ کہ مسیح کی طرح محمدؐ بھی زندہ رہنے والے ہیں لیکن ایسا نتیجہ علم الحکمت، تجربہ، مشاہدہ اور قرآن کریم کی رو سے قطعاً غلط ہوتا۔ اس سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ مسیحؑ وفات پا چکے ہیں۔

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰـكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًاۢ ۙ‏ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا‏ ۞ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُـؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ‏

(النساء۔ ۱۵۷ تا ۱۵۹)

(یہود عذاب الٰہی کے مستوجب ہوئے) اپنے اس قول کی وجہ سے کہ "ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کیا، حالانکہ انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی مصلوب کیا، لیکن وہ ان کے نزدیک (مصلوب کی) مانند بنایا گیا۔ جن لوگوں نے اس کے متعلق اختلاف کیا، وہ اس کے بارے میں شک میں گرفتار ہیں۔ انہیں اس کا کچھ علم نہیں۔ صرف ظن کے پیچھے چل رہے ہیں۔ اور انہوں نے اس کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف لے گیا اور وہ عزت و حکمت والا ہے اور اہل کتاب (جو اس وقت موجود تھے) میں سے کوئی نہیں ہے، مگر وہ اس (عدم قتل مسیح) پر اپنی موت سے پہلے ایمان لائے گا اور قیامت کے دن وہ (خدا تعالیٰ) ان (جیسے لوگوں) پر گواہ ہوتا ہے (انتہیٰ ترجمہ خواجہ صاحب)

اس آیت کی تفسیر میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسیحؑ کو انہوں نے ہرگز قتل نہیں کیا اور اسے صلیبی موت سے مار کر مصلوب بھی نہیں بنایا۔ ہاں وہ ان

کے لیے مصلوب کی مانند بنائے گئے یعنی انہوں نے خیال کیا وہ صلیب پر مر چکے ہیں ـــــ خود ان میں بھی اختلاف تھا۔ یہ صرف ظن ہی کی پیروی تھی۔ ان کو اور ان کے اجداد کو اس واقعہ کا کوئی علم نہیں۔ صلیبی موت ان کے نزدیک مشکوک ہے۔ اور یہ جو زمانہ نزول قرآن کے یہود نے صاحب قرآن (صلعم) کو دھوکا دینے کی نیت سے کہا کہ ہم نے اس کو یقیناً قتل کر دیا ہے۔ یہ تو بالکل ہی جھوٹ ہے۔ انہوں نے یقیناً اس کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے حواریوں کے ذریعے اس کو اس جگہ (صلیب گاہ) سے اٹھوا منگایا جہاں اس کا علاج کرنا مقصود تھا اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اپنے قانون کے مطابق کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ غالب اور دانا ہے (عزیز حکیما)

قتل مسیح کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے اہل کتاب میں کوئی ایسا نہیں ہو سکتا جو اپنی موت سے قبل لوگوں کے روبرو تسلیم نہ کرے کہ ہم نے مسیح کو قطعاً قتل نہیں کیا۔ اور روز قیامت جب یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ یا مسیح ان کے خلاف شاہد ہوں گے کہ تم نے جھوٹا پروپیگنڈا کیا ہے اور نادانوں کی آنکھوں میں دھول ڈال رہے ہو۔

"یومنن بہ" میں واحد، مذکر، غائب ضمیر کا مرجع خواجہ صاحب کے نزدیک "یقینی عدم قتل" ہے جو "ما قتلوہ یقیناً" میں مذکور ہے۔ یہ ضمیر "مسیح" کی طرف ہرگز نہیں پھر سکتی۔ کیا دنیا بھر کے اہل کتاب رسول کریم کے زمانے میں موجود تھے اور کیا وہ سب مسیح پر ایمان لے آئے تھے! لہٰذا یہ خیال قطعاً باطل ہے۔ اس آیت میں رسول کریم کے مخاطب اہل کتاب کا ذکر ہے، جو اس قسم کے دعوے کر رہے تھے کہ ہم نے مسیح کو قتل کیا ہے" ـــــ اس میں مستقبل کے اہل کتاب کی شمولیت ضروری نہیں۔

یہود کی سنگ دلی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ انہوں نے مسیح جیسے بے ضرر مصلح کو جھوٹے الزام لگا کر مصلوب بنا دینے کی کوشش کی تھی اس ظالمانہ فعل سے نادم نہیں تھے، نزول قرآن کے وقت بھی بڑے فخر سے کہتے تھے کہ "ہم نے مسیح کو قتل کیا" اس قول باطل سے ان کی غرض یہ تھی کہ استثنا (باب ۲۱ آیت ۲۳) کے مطابق مسیح کو مصلوب و مقتول ٹھہرا کر (معاذ اللہ) ملعون ثابت کریں اور اس طرح نبوت سے خارج کر دیں۔ وہ اپنے جھوٹ کو جھوٹ ہی جانتے تھے۔ لیکن بات کی پچ میں بلند بانگ دعوے کرتے تھے۔ آخر اس بہتان کے مدعی اسی دنیا کی زندگی میں مان گئے کہ ہم نے مسیح کو قتل نہیں کیا، ان کو قرآن حکیم کے دباؤ کے سامنے جھکنا اور تاریخی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔

صوبے کا غیر یہودی حاکم مسیح کو راست باز جانتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کو صلیب پر زیادہ دیر لٹکایا جائے اور اتمام موت کے لیے ان کی ہڈیاں اور دست و پا کو توڑا جائے۔ اس کے سپاہیوں نے اس کے ایما سے مشہور کر دیا کہ صلیب پر مسیح کی موت واقع ہو چکی ہے، لیکن دوسرے اخلاقی مجرموں کی سزا مکمل کی گئی۔ ان کی ہڈیاں توڑ کر انہیں ختم کر دیا گیا ـــــ مسیح صلیب پر بے ہوش ضرور ہو گئے جس سے وہ مصلوب کی مانند کر دیئے گئے (شُبِّہَ لَہُم) ایسی حالت میں وہ اپنے پاؤں پر چل کر کہیں جا نہیں سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حواریوں کے ذریعے وہاں سے اٹھوا کر امن کے علاقے میں پہنچا دیا۔ جہاں انہیں صحت عطا فرمائی اور ظالموں کے جور و ستم سے نجات ملی۔ "بل رفعہ اللہ" کا یہی مطلب ہے۔ خواجہ صاحب اپنے اس خیال کی تائید میں متعدد آیات پیش کرتے ہیں اور نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ

"آدمی اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا ہی خدائے تعالیٰ کی طرف آجاتا ہے اور اسے جسمانی طور پر ایک قدم اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں۔

اے آں کہ زمعرفت بفرقت تاج است — بانسست شبے کہ عاشق محتاج است

بکشائے نظر کہ ہر نظر دیدار است — بردار قدم کہ ہر قدم معراج است (سحابی نجفی)

مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے۔

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (صافات۔۸۴) — جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر حاضر ہوئے۔

یعنی ہر قسم کے اعتقادی و اخلاقی روگ سے دل کو پاک کر کے اور دنیوی غرضوں سے آزاد ہو کر انکسار و تواضع کے ساتھ اپنے رب کی طرف جھک پڑا۔ (عثمانیؒ)

ہر شخص جو سچے دل سے اللہ پر ایمان لاتا ہے، وہ قلب سلیم لے کر اللہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (شعرا۔۸۹)

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (الانعام۔۷۹) — میں نے اپنے رخ کو زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی طرف موڑ لیا ہے۔

اس قول ابراہیمؑ کا بھی یہی مطلب ہے۔

آیۂ زیر غور "بل رفعہ اللہ الیہ" میں "الی" وارد ہوا ہے، اس کی مثالیں بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ (ذاریات۔۵۰) — پس دوڑو اللہ تعالیٰ کی طرف۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو —— اس کے امر و نہی کی تعمیل کرو —— یہاں کسی ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ جانے کا خیال تک پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے ہی یہ آیت۔

سَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ (آل عمران ۱۳۳) — دوڑو اپنے رب کی بخشش کی طرف۔

اور یہ آیت بھی:

قَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ۔ (عنکبوت۔۲۶) — (لوطؑ یا ابراہیمؑ نے) کہا۔ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔

خود مسیحؑ نے بھی جب یہود کی شریرانہ تجویزوں کو محسوس کیا، تو حواریوں سے خطاب فرمایا:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ (آل عمران۔۵۲) — جب عیسیٰ نے (ظاہری حواس سے) ان کا کفر محسوس کر لیا اور سمجھا کہ یہ مجھے مار کر چھوڑ جائیں گے اور اللہ تعالیٰ مجھے بچا لے گا) تو کہا اللہ کی طرف (اٹھائے جانے میں) میرا کون مددگار ہوگا، ؟ حواریوں نے کہا ہم تکمیل ارشاد میں اللہ کے مددگار ہوں گے۔ ہم اللہ پر ایمان لائے۔" (ترجمہ خواجہ صاحب)

حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں:

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ۔ (الصّٰفّٰت۔۹۹) اور جب دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور مخالفتوں کی انتہا ہو گئی تو آپ نے بابل سے شام کی طرف ہجرت کا فیصلہ کر لیا جو کام اللہ کی رضا کی خاطر کیا جائے وہ اللہ کی طرف ہجرت ہے) کہا میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں، وہ جلد ہی مجھے (کامیابی کی) راہ دکھائے گا۔ (تفسیری ترجمہ خواجہ صاحب)

اس آیت سے یہ مطلب کسی نے نہیں لیا کہ ابراہیم آسمان کی طرف چلے گئے تھے۔ اس ہجرت الی اللہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے مقام کی طرف چلے جاؤ۔ جہاں اللہ تعالیٰ بندے کو اپنی رحمت کی پناہ میں لے آئے۔ یہی معنی یہاں کی آیات میں ہیں۔

"انّہ، لعلم للساعۃ"، کا مطلب

آیہ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ (زخرف - ۶۱) کا مطلب ہمارے مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ مسیحؑ کا دوبارہ دنیا میں تشریف لانا قیامت کا نشان ہوگا ــ اب ربط آیات کی روشنی میں خواجہ صاحب کی تفسیر دیکھیے۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ۭ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝ وَلَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰۗىِٕكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ (الزخرف - ۵۷ تا ۶۱)

جب بطور مثال ابن مریم کا ذکر کیا جاتا ہے تو تیری قوم (قریش) کے لوگ تالیاں بجانے میں اور کہتے ہیں کہ ہمارے معبود (فرشتے) بہتر ہیں یا وہ (مسیحؑ)؟ (یہ اعتراض نصاریٰ پر ہونا چاہئے تھا جو اسے الٰہ مانتے ہیں) تیرے ساتھ ایسی بات محض بغرض جدال کرتے ہیں۔ بلکہ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو۔ (ہمارے نزدیک اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ) وہ ایک بندہ ہے، جس پر ہم نے انعام کیا تھا اور اُسے (سنگ دل) بنی اسرائیل کے لیے (نرم دلی اور اعلیٰ اخلاق کا) ایک نمونہ بنایا تھا۔ اور فرشتوں کو معبود ماننے والو! اگر ہم چاہتے تو تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین میں خلیفہ بناتے (انسانی خلافت کا مطلب یہ ہے کہ اُسے خلیفہ بنانے والے کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا کہ اس خلافت کا حق ادا کیا یا نہ۔) اور یہی (خلافت) پیشی کے لیے ایک دلیل ہے۔ لہٰذا تم پیشی (یا قیامت) میں شک نہ کرو۔ اور میری پیروی کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔ اس آیت میں مسیح کی آسمانی زندگی اور دوبارہ نزول کا کوئی ذکر نہیں۔

"خلدِ بشر" کا مطلب

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ (انبیاء-۳۴) (خواجہ صاحب کا تفسیری ترجمہ)
(ان لوگوں نے بشروں کو خدا بنا رکھا ہے حالانکہ سب بشر مرنے والے ہیں۔ ان میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے نظام و قانون سے باہر نہیں نکل سکتا۔ جیساکہ فرمایا) اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کے لیے دیرپا رہنا نہیں بنایا۔ پھر کیا اگر تو مر جائے گا تو یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟ (جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے تو آپ جیسے دوسرے انسانوں مسیح علیہ السلام، خضرؑ، الیاسؑ، ادریسؑ وغیرہ کو آج تک زندہ ٹھہرانا حیرت انگیز ہے۔)

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (انبیاء-۳۵) ہر متنفس موت کو چکھنے والا ہے.....

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح رسولِ کریمؐ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اسی طرح آپؐ سے پہلے کا کوئی ایک بشر بھی موت کے قانون سے مستثنیٰ نہیں ہوا۔

اسی سورۂ انبیاء کے آغاز میں ارشاد ہے کہ کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن خواب ہائے پریشان کا مجموعہ ہے —— بلکہ اس پیغمبر نے اسے خود ہی گھڑ لیا ہے —— بلکہ یہ شاعر ہے —— اگر یہ سچ مچ کا رسول ہے تو پہلے رسولوں کی طرح کوئی نشان دکھائے۔

اس قسم کے سوالوں کے جواب میں فرمایا،

ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ایسے جسم نہیں بنایا تھا جو بشری خصائص سے بالاتر تھے۔ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (انبیاء-۸) اور ہم نے ان (سابقہ رسولوں) کو ایسے نہیں بنایا تھا جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہیں تھے وہ خالد مدتوں تک اپنے مادی جسم کو قائم نہیں رکھ سکتے تھے) ترجمہ مناسب

ان آیات سے واضح ہے کہ مسیحؑ رسولِ کریمؐ سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔ لہٰذا ان کی دوبارہ تشریف آوری متوقع نہیں ہو سکتی۔

مولانا ابوالکلام اور مسیح کی آمد ثانی

اس موضوع پر اسی طور بیسویں صدی کے نصف اول) کے بعض دوسرے علماء نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔

سید فضل شاہ مالک شاہجہاں محل ہوٹل بمبئی کے ایک استفسار کے جواب میں مولانا نے دو خط لکھے ہیں۔ ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"... اگر ایک زمانے میں مسلمانوں کے لیے کسی نئے ظہور (نزول مسیح) پر ایمان لانا ضروری تھا، تو کیا ضروری نہ تھا کہ قرآن اس کا صاف وصریح حکم دیتا۔ کم از کم اتنی صراحت کے ساتھ جتنی صراحت کے ساتھ اقیموا الصلوٰۃ اور اٰتوا الزکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ اچھا قرآن کی ایک ایک آیت دیکھ جائیے، کہیں آپ کو یہ حکم ملتا ہے کہ ایک زمانے میں کوئی نیا نبی یا مسیح یا مجدد یا محدث (بالفتح) مبعوث ہوگا اور مسلمانوں کے لیے ضروری ہوگا کہ اُسے پہچانیں اور اس پر ایمان لائیں؛ اگر کوئی ایسا حکم نہیں ملتا، تو پھر آپ پر کون سی مصیبت آپڑی ہے کہ بیٹھے بٹھائے اس (قادیانیت کے) جھگڑے میں پڑیں اور ایک نئے ایمان اور نئی شرط نجات کے سراغ میں نکلیں۔"

مولانا لکھتے ہیں۔

قرآن اور مرزائیت

"اس بارے میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، تیسری کوئی بات نہیں۔ یا نجات کے لیے وہ عقائد کافی ہیں جو قرآن نے صاف صاف بتلا دیئے ہیں ـــ یا پھر کافی نہیں ـــ اگر کافی ہیں تو قرآن نے کہیں یہ حکم نہیں دیا ہے کہ کسی نئے ظہور پر بھی ایمان لاؤ ـــ اور اگر کافی نہیں ہیں اور نئے شرائط کی گنجائش ہے تو پھر قرآن ناقص نکلا اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ اپنے اعلان الیوم اکملت لکم دینکم میں صادق نہیں۔ ہر مسلمان کے سامنے دونوں راہیں کھلی ہیں۔ جو راہ چاہے، اختیار کرے۔ اگر قرآن پر ایمان ہے تو نئی شرط کی گنجائش نہیں۔ اگر نئی شرط نجات مانی جاتی ہے تو قرآن اپنی جگہ باقی نہ رہا" (ابوالکلام ۱۸۔ مارچ ۳۶ء)

اگر قرآن ہی باقی نہ رہا تو اس کی اساس پر مسیح و مہدی و مجدد بننے والا کہاں باقی رہے گا؟ کیا وہ ہوا میں معلق ہوگا! (ناقل عفی عنہ)

دوسرے مکتوب میں مولانا رقم طراز ہیں؛

مجدد کی کوئی ضرورت

"جو لوگ کہتے ہیں، مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ہر صدی کے کسی مجدد پر ایمان لائیں، ان سے پوچھیے کہ یہ حکم کس قرآن میں نازل ہوا ہے؟ اگر قرآن سے مقصود وہ قرآن ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے تو بتلائیے، کس پارہ، کس سورت اور کس آیت میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ہر صدی میں ایک مجدد آئے گا اور مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ اس کی معرفت حاصل کریں اور اس پر ایمان لائیں؛ اگر نہیں کہی گئی تو ہمیں کون سی ضرورت ہے کہ اس لغویت میں پڑیں۔ ہم نہیں جانتے مجدد کیا بلا ہوتی ہے ہم جو کچھ جانتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ کی آخری اور کامل ہدایت آچکی ہے جس کا نام قرآن ہے اور جس کے مبلغ محمد رسول اللہ ؐ تھے، جو انسان اس پر ایمان لاتا ہے اور اس کے بتائے ہوئے احکام پر عمل کرتا ہے اس کے لیے

نجات ہے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ جاننے کی ہمیں ضرورت ہے۔

اسلام پر بہتان

جو شخص یہ کہتا ہے کہ نجات وسعادت کے حصول کے لیے یہ کافی نہیں کسی اور مجدد پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، وہ یا تو اسلام پر بہتان لگاتا ہے یا اسلام کی بو بھی اس نے نہیں سونگھی ہے۔ باقی رہا نزول مسیح کا معاملہ تو یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے اور اگر کسی زمانے میں مسلمانوں کی نجات وسعادت اس پر موقوف رہنے والی تھی۔ تو ضروری تھا کہ قرآن صاف صاف اسے بیان کر دیتا، اسی طرح صاف صاف جس طرح اس نے تمام مہمات دینیہ واعتقادیہ بیان کر دی ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن میں کوئی تصریح موجود نہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس اعتقاد پر مجبور رہوں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ اب نہ کوئی بروزی مسیح آنے والا ہے اور نہ حقیقی۔ قرآن آچکا ہے اور دین کامل ہو چکا ہے۔ اگر آپ طالب حقیقت ہیں تو ان جھگڑوں میں نہ پڑیئے۔ نہ ان خرافات کے بارے میں سوالات کیجئے۔ ہمیں تلاش نجات کی ہے۔ اگر نجات کے لیے قرآن کامل ہے تو پھر وہ عقائد کافی ہیں جو قرآن نے بتلا دیئے ہیں۔ زیادہ کاوش میں ہم پڑیں بھی کیوں؟

"ابو الکلام" ۵ر جون ۳۶ء

بحوالہ "بلاغ" امرتسر۔ اگست ۱۹۳۶ء

سرسیدؒ اور مسیحؑ

سرسید پہلے شخص ہیں جنہوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں مسیح کی ولادت و وفات اور معجزات پر عقلی رنگ میں غور کیا اور اس کو اپنی نامکمل تفسیر[1] میں شامل کیا۔ اس کی تلخیص[2] حسب ذیل ہے

ولادت مسیحؑ

پادری رچارڈ واٹسن نے تفسیر انجیل لوک (لوقا) میں لکھا ہے "یہ عام یقین تھا کہ حضرت عیسیٰ یوسف کے بیٹے ہیں۔ اور ان کا معجزے سے پیدا ہونا مشہور نہیں کیا گیا تھا، بلکہ یوسف اور مریم کے دلوں ہی میں مخفی تھا۔۔۔ یہ بات حواریوں پر بھی ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے وہ اور نیز اور (لوگ) بھی ان کو یوسف اور مریم کا بیٹا سمجھتے تھے ص۲۶

اس بات کو خود حواری حضرت عیسیٰ کے، اور تمام عیسائی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مریم کا خطبہ (منگنی) یوسف سے ہوا تھا۔۔۔ اگر بعد اس رسم (منگنی) کے اور قبل رخصت کرنے (بیوی) کے ان دونوں سے اولاد پیدا ہو تو وہ ناجائز اولاد تصور نہیں ہوتی تھی، شاید خلاف رسم بات ہونے سے معیوب گنی جاتی ہوگی ص۲۷

یونانی انجیل متی باب (۱) ورس ۱۶۔۔۔ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ

"یعقوب سے پیدا ہوا یوسف شوہر مریم جس سے عیسیٰ پیدا ہوا" ص۲۹

لوک (لوقا) کی انجیل باب۲ ورس ۳۳ کے موجودہ نسخوں میں یہ لفظ (موجود) ہیں "تب یوسف اور اس (مسیح) کی ماں" ایضاً۔

لوک کی انجیل کے اسی باب کے ۴۳ ورس میں بھی قدیم نسخے الکزنڈر یانوس میں بھی "گونیس" کا لفظ ہے، جس کے معنی "والدین" کے ہیں ص۳۰

لوک کی انجیل باب۲ ورس ۴۸ میں حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ

"دیکھ! تیرا باپ اور میں غم گین ہو کر تجھے ڈھونڈتے تھے"

لوقا کی انجیل باب۲ ورس ۲۷ و ۴۱ میں یوسف اور مریم کو حضرت عیسیٰؑ کا ماں باپ تعبیر کیا ہے۔

متی کی انجیل باب۱۳ ورس ۵۵ میں لکھا ہے کہ "لوگوں نے حضرت عیسیٰ کی نسبت کہا کہ، کیا یہ بڑھئی (یوسف) کا بیٹا نہیں ہے؟ کیا اس کی ماں مریم نہیں کہلاتی؟"

---

[1] ناقل کے پیش نظر "تفسیر القرآن" جلد دوم مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۹۰۳ء ہے۔

[2] یہ تفصیل ص۲۶ سے ص۵۱ تک پھیلی ہوئی ہے۔

اور انجیل یوحنا باب ۶ ورس ۴۲ میں ہے کہ لوگوں نے حضرت مسیح کی نسبت یہ کہا کہ "کیا یہ یسوع یوسف کا بیٹا جس کے ماں باپ کو ہم پہچانتے ہیں، نہیں ہے؟"

انجیل یوحنا باب ۱ ورس ۴۵ میں لکھا ہے کہ "فلپ نے نتھنیل کو کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ نے توریت میں اور نبیوں نے کیا ہے، ہم نے اُسے پایا ہے، وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے۔

اعمال حواریین باب ۲ ورس ۳۰ میں پطرس حواری نے حضرت عیسیٰ کے داؤد کی نسل میں ہونے کی نسبت کہا کہ "خدا نے اس (داؤد) سے قسم کھا کر کہا کہ میں تیرے تخت پر بیٹھنے کے لیے جسم کے طور پر تیری کمر سے مسیح کو پیدا کروں گا۔ صت۳۰

سرسید ان تمام انجیلی اقتباسات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "ان تمام سندوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیحؑ کے زمانہ کے سب لوگ اور خود حواری بھی جانتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے باپ یوسف کے تخم سے پیدا ہوئے ہیں نہ کہ بغیر باپ کے، مگر وہ حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا روحانی اعتبار سے کہتے تھے ..... جیسے یونانی اپنے بزرگوں کو خدا کا بیٹا کہتے تھے .... (بقول سینٹ پال) زمانہ کے گزرنے پر وُہ خیال جس سے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہا، محو ہو گیا اور لوگ حضرت مسیح کو (سچ مچ) خدا کا بیٹا سمجھنے لگے اور اسی کے ساتھ یہ قرار دیا کہ وہ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے ... تیسری صدی میں اس خیال میں زیادہ تر غلو ہو گیا تھا۔ صت۳۱

انجیلی بیانات کے بعد سرسید قرآن حکیم کی طرف آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

"قرآن مجید نے عیسیٰؑ کے بے باپ ہونے کے متعلق کچھ بحث نہیں کی ــــ اس وقت دو مخالف فرقے موجود تھے۔ ایک نہایت نالائق اور بدی سے ان کو ناجائز مولود کہتا تھا (یعنی یہودی) دوسرا فرقہ ان کو خدا، ابن خدا اور ثالث ثلاثہ مانتا تھا (یعنی نصاریٰ) قرآن مجید نے دونوں کو رد کر دیا اور حضرت مسیح کے مقدس اور روح پاک ہونے اور حضرت مریم کی عصمت و طہارت پر گواہی دی۔ اور اس بات کو کہ وہ خدا یا ابن خدا یا ثالث ثلاثہ ہیں، جھٹلا دیا اور بتلا دیا کہ وہ مثل عام انسانوں کے خدا کے بندے ہیں۔ قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ صت۳۱

اس کے بعد سرسید سورۃ آل عمران اور سورۃ مریم کی متعلقہ آیات نقل کرتے ہیں جو ہم خواجہ صاحب کے ضمن میں لکھ آئے ہیں خواجہ صاحب نے ان کو دو الگ الگ موقعے سمجھا ہے اور سرسید نے عام مفسرین کے مطابق ایک ہی موقع کا مکرر ذکر خیال کیا ہے۔ حالانکہ آلِ عمران میں بصیغہ جمع ملائکہ، مریم کو مخاطب کرتے ہیں اور صرف بشارت دیتے ہیں۔ (یبشرک) اور سورۃ مریم میں ملائکہ کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف "روحنا" کے لفظ سے جو مفرد ہے، فرشتہ سمجھ لیا گیا ہے اور یہاں بشارت بھی نہیں۔ "ہبہ" ہے (لاہب لک غلاما) وہاں بشر کا کوئی اشارہ تک نہیں۔ یہاں صحیح و سالم بشر سامنے آ رہا ہے (بشراً سویا) سرسید نے علماء اور خواجہ صاحب کے خلاف دونوں واقعات کو ایک ہی رؤیا سمجھا ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔

"مجھ کو کچھ شبہ نہیں کہ ... امر بشارت جو اس سورۃ (آل عمران) اور سورۃ مریم میں بیان ہوا ہے، وُہ ایک ہی واقعہ ہے اور رؤیا میں واقع ہوا تھا۔ صت۳۲

"کیا عجب ہے کہ اس خواب کے بعد ہی حضرت مریم کو اور ان کے مربیوں کو حضرت مریم کی شادی کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو جو آخر کار یوسف کے ساتھ عقد ہونے سے پورا ہوا" ص۳۳

"بشر سوی" کو جب مریم نے جواباً کہا کہ "مجھے بیٹا کیسے ہوگا، جب کہ مجھے کسی بشر نے نہیں چھوا اور نہ میں بدکار ہوں" تو اس نے جواب الجواب میں کہا "کذالک قال ربک ھو علیّ ھیّن" (یہی ہوگا تیرے پروردگار نے کہا ہے کہ وہ مجھ پر آسان ہے) اس سے ہمارے مفسرین نے بے باپ ہونے ہونے پر استدلال کیا ہے، لیکن سرسید اپنے مذاق کے مطابق لکھتے ہیں:

"وہ (کذالک... تا... کن فیکون - آل عمران) کسی امر کے ہونے پر بلا اسباب قدرتی و فطرتی کے دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ ہر شئے کو خدا اسی طرح فرماتا ہے "اذا ارادہ شیئاً انما یقول لہ کن فیکون" پس ہر شئے "کن" کے حکم سے ہمیشہ قانون قدرت اور قاعدۂ فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ پس یہ الفاظ کسی طرح اس بات پر کہ مسیحؑ کی ولادت فی الفور بلا قاعدۂ فطرت اور بغیر باپ کے ہوئی تھی، دلالت نہیں کرتی۔"

سورۂ مریمؑ - ۲۱ میں ارشاد ہے: "ولنجعلہٗ آیۃ للناس" اور ہم اس (مسیح) کو لوگوں کے لیے نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے بھی مفسرین مسیح کو بے باپ ثابت کرتے ہیں۔ سرسید اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"آیۃ للناس" کے لفظ سے سمجھا کہ حضرت مسیحؑ کو بغیر باپ کے بطور ایک نشانی معجزہ کے پیدا کیا تھا محض بے جا ہے۔ اس سبب سے کہ بے باپ کے پیدا ہونا (اگر بالفرض ہوا بھی ہو) ایسا امر مخفی ہے، جو کسی طرح "آیۃ للناس" نہیں ہو سکتا۔

(یعنی عام لوگوں کے لیے معجزہ یا نشانی تو جب ہو سکتا ہے کہ عام لوگوں کو بذریعہ اعلان پہلے سے اطلاع دی جائے کہ فلاں باکرہ کو بے مس بشر اتنے دنوں کے اندر اندر بچہ پیدا ہوگا۔ بے شک اس کا طبی معائنہ کرا لیا جائے اور اسے نہایت قابل اعتماد نگرانی میں رکھا جائے اور وہ بچہ پیدا ہوتے ہی رسولوں کی سی الہامی باتیں کرنے لگ جائے گا۔

اگر واقعتہً معجزہ ہی کرنا تھا، تو ایسا ہو جاتا، جس سے دنیا بھر کے لوگ ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں الٹا اثر ہو رہا ہے۔ بڑی دوڑ دھوپ سے چند آدمی جو ایمان لاتے ہیں۔ ان میں سے بھی بعض صلیب کے ابتلا کے وقت منحرف ہو جاتے ہیں، بلکہ اپنے معجزوں بھرے نبی کو گرفتار کرا دیتے ہیں۔ لہٰذا اس "آیۃ" کو "آیۃ للناس" کی بجائے "آیۃ للمریم" کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ مریمؑ کے سوا اس کی اعجازیت سے کوئی واقف نہیں ہوا۔ یا للعجب۔ ناقل عفی عنہ

سرسید کہتے ہیں کہ

"آیۃ" کا لفظ قرآن مجید میں، فرعون، اصحاب الکہف والرقیم، قوم نوح اور اصحاب سفینہ پر بھی اطلاق ہوا ہے۔ حضرت مریم بوجہ اپنی عبادت اور خدا پرستی اور نیکی کے اور حضرت عیسیٰ بہ سبب اس رحمدلی کے جو انجیل میں پائی جاتی ہے، خدا کی عمدہ نشانی کے لقب کے مستحق تھے۔" ص۳۴

"بکلمۃ منہ" (آل عمران - ۴۵) اور "کلمتہ، القاھا الی مریم" سے بھی یہی مطلب سمجھا گیا ہے کہ

"ان (مسیح) کی پیدائش باپ کے توسط کے بغیر عام سلسلۂ اسباب کے خلاف محض خدا کے حکم سے ہوئی" (عثمانیؒ)

سرسید کہتے ہیں کہ

"(یہ) الفاظ بھی کسی طرح بن باپ کے پیدا ہونے پر دلالت نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد جگہ لفظ "کلمہ" کو اپنی طرف منسوب کیا ہے مثلاً تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۔ وَكَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوا ۔ ایسے ہی اور بھی بہت سی جگہ آیا ہے۔ اور کلمۃ اللہ سے وہ امور محققہ مراد ہیں، جو ہونے والے تھے، اور ہوئے، اور ہوں گے۔ حضرت مسیح کا مریم سے پیدا ہونا ایک امر محقق اور معین تھا، یا یوں کہو کہ موجود تھا... الخ صہ۲۳

روح منہ

"روح منہ" سے بھی بن باپ کے پیدا ہونا نہیں ثابت ہوتا تمام جانداروں کی نسبت ...... "روح منہ" کا اطلاق کیا جا سکتا ہے ۔ تفسیر کبیر میں ہے کہ حضرت عیسیٰ لوگوں میں دینی زندگی کا سبب تھے، اس لیے ان کو روح سے تعبیر کیا ہے۔ خدا نے قرآن کی صفت میں فرمایا ہے "روحاً من امرنا" اسی طرح حضرت عیسیٰ کو بھی روح کہا گیا ہے۔ اس سے ان کی بزرگی ظاہر ہوتی ہے۔

اور (تفسیر کبیر میں) یہ بھی لکھا ہے کہ "روح منہ سے رحمت مراد ہے۔ جیسے "ایدہم بروح منہ" " اسے برحمتہ منہ، جیسے کہ حضرت عیسیٰ خلق کے لئے رحمت تھے۔ اس لیے ان کی نسبت "روح منہ" اطلاق کیا گیا ہے۔ سورہ مجادلہ میں تمام ایمان والوں کی نسبت كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ "کہا گیا ہے ...... الخ صہ۲۵

حمل مریم

سرسید کہتے ہیں کہ حمل اور وضع حمل بالکل عام طریقے کے مطابق واقع ہوا۔ اس میں کسی معجزے کا دخل نہیں تھا چنانچہ لکھتے ہیں:

"فَحَمَلَتْهُ ۔ فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ" میں "فے" سے اتصال زمانی مستنبط نہیں ہو سکتا ...... کیونکہ ان کے حاملہ ہونے اور دردِ زہ شروع ہونے میں اتصال زمانی نہیں تھا۔ لوقا کی انجیل میں بھی لکھا ہے کہ "مریم کے جننے کے دن پورے ہوئے، وہ اپنا پہلوٹا بیٹا جنی" ۔ تفسیر کبیر میں بھی مدت حمل نو مہینے یا آٹھ مہینے یا سات مہینے لکھے ہیں۔ ابن عباس کی روایت نو مہینے کی ہے، جو صحیح معلوم ہوتی ہے ...... الخ صہ۲۵

خواجہ صاحب خارجی شواہد کی بجائے براہ راست قرآن حکیم سے حمل و وضع حمل کی مدت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس سے ان کی عمیق قرآن فہمی محیر العقل حد تک پہنچی ہوئی ثابت ہوتی ہے۔ وہ اس موقع پر مریم رکوع اول کی دو آیتوں کو پیش کرتے ہیں۔

إِذِ انتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۔ جب (مریم) جدا ہوئی اپنے لوگوں سے شرقی مکان میں ۔ یہ عام ترجمہ ہے۔

خواجہ صاحب کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

"جب کہ وہ (مریم) اپنے اہل سے دھوپ والے مکان میں الگ ہوئی"، اب وضع حمل پر قرآن کا بیان دیکھئے،

فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ ۔ "درد زہ اُسے ایک کھجور کے تنے کی طرف لے آیا"

خواجہ صاحب "مکاناً شرقیاً سے نتیجہ نکالتے ہیں کہ "اس وقت سردی کا موسم تھا، جس کے لیے حضرت مریم دھوپ والی جگہ جا بیٹھیں۔ اور آیتوں (جذع النخلہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی کی ولادت کے وقت کھجوریں بالکل پختہ تھیں۔ اس سے بات کا صاف پتا لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی حمل کی مدت کس قدر تھی ـــــ هُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا، یعنی درخت کے تنے کو حرکت دیتے سے پکی ہوئی کھجوریں خود ہی گرنے لگیں گی (تفسیر بیان للناس منزل ۴ صفہ ۲۱ و صفہ ۱۰۱)

سردی کے موسم سے کھجوریں پکنے کے موسم تک کی مدت اعجازی حمل کی پابند نہیں کرتی۔

مریمؑ مسیحؑ کو لے کر قوم کے پاس آتی ہیں

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ (مریم۔ ۲۷) پھر لائی اس کو اپنے لوگوں کے پاس گود میں ـــــ یہ عام معنی ہیں۔

سرسید اس کی تفسیر اپنے مذاق کے مطابق کرتے ہوئے تفسیر کبیر کی یہ عبارت نقل کرتے ہیں۔

اختلف الناس فیه فالجمهور علی انه قال هذا الکلام حال صغره وقال ابو القاسم البلخی انه انما قال ذالك حین کان المراهق الذی یفهم وان لم یبلغ حد التکلیف۔ اس میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ جمہور تو گود کی عمر میں کلام کرنے کے قائل ہیں اور ابو القاسم بلخی جوان ہونے کے قریب کا واقعہ بتاتے ہیں۔ جب کہ وہ صاحب فہم ہو چکے تھے، اگرچہ حد تکلیف کو نہیں پہنچے تھے (ترجمہ ناقل)

سرسید کہتے ہیں کہ "قرآن مجید سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ (تکلم فی المہد) مسیح کے نبی بن جانے کے بعد کا ہے، کیوں کہ وہ صاف کہتے ہیں (اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۭ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا۔ مجھے اللہ کی طرف سے کتاب مل چکی ہے۔ اور اللہ نے مجھے نبوت کے مقام پر سرفراز فرما دیا ہے ـــــ

اب رہی یہ آیت کہ كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا لوگوں نے کہا ہم اس سے کس طرح کلام کریں جو گود میں لڑکا ہے یا تھا؟ سید کہتے ہیں کہ "کان" کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے شخص سے ہم کیوں کر کلام کریں جو مہد میں تھا، یعنی کم عمر لڑکا ہماری گفتگو کے لائق نہیں یہ اسی طرح کا محاورہ ہے کہ جیسے ہمارے محاورے میں ایک بڑا شخص ایک کم عمر لڑکے کی نسبت کہے کہ ابھی اس کے ہونٹ پر سے دودھ بھی خشک نہیں ہوا کیا یہ ہم سے مباحثے کے لائق ہے؟ "کان" صاف دلالت کرتا ہے کہ اس وقت وہ مہد میں نہیں تھے، نہ مہد کے لائق تھے صفہ ۳۲

واقعی "کان" معجزے میں روک بن رہا تھا اس لیے معجزے کے شائقین نے اس کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی۔ تفسیر قرطبی میں ہے۔ "قال ابو عبیدہ "کان" ھنا لغو[1]۔ ابو عبیدہ کا قول ہے کہ "کان" اس مقام پر بے کار ہے (ناقل)

آل عمران کی آیت ام "یکلم الناس فی المهد" کا ترجمہ سرسید کرتے ہیں، "کلام کرے گا لوگوں سے گہوارہ میں (یعنی بچپنے میں)"

---

[1] القرطبی جزو ۱۱ صفحہ ۱۰۲ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۶۰ھ

والتی احصنت فرجہا

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء - ۹۱)

اور وہ عورت جس نے قابو میں رکھی اپنی شہوت پھر پھونک دی ہم نے اس عورت میں روح اپنی۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اس کا عام مطلب یہ ہے کہ وہ حلال وحرام دونوں طریقوں سے محفوظ تھی۔

سید کہتے ہیں کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ احصنت فرجہا من کل رجل، بلکہ اس کے معنی ہیں۔ احصنت فرجہا من غیر زوجہا۔ یعنی اپنے شوہر کے سوا دوسروں سے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ بقول تفسیر کبیر "احصنت اسے عن الفواحش" اسی تفسیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ حصان کے معنی عفیفہ عورت کے ہیں۔ امام رازی سند میں یہی آیت لاتے ہیں۔

الحصان بالفتح المرأۃ العفیفہ لمنعہا فرجہا من الفساد وقال تعالٰی و مریم ابنت عمران التی احصنت فرجہا۔

حصان زبر کے ساتھ عفت مآب عورت جو اپنی عصمت کو ناجائز سے بچائے جیسا کہ اللہ تعالٰی نے فرمایا۔ اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا (ترجمہ ناقل)

اس آیت سے مریم کا تہمت بد سے بری ہونا نکلتا ہے کہ حضرت عیسٰی کا بن باپ کے پیدا ہونا ص۲۸

محصنات کے معنی عفاف کے اور جگہ بھی آئے ہیں جیسے کہ "محصنات غیر مسافحات "محصنین غیر مسافحین" شوہر دار عورت کو بھی محصنہ کہا گیا ہے " والمحصنات من النساء" تفسیر کبیر میں ہے۔ یقال امرأۃ محصنۃ اذا کانت ذات زوج (امرأۃ محصنۃ شوہر دار عورت کو کہا جاتا ہے۔ ترجمہ ناقل) ص۲۹

آگے فرماتے ہیں نفخ روح حضرت عیسٰی میں اس کے بن باپ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ ہر انسان میں اسی طرح نفخ روح ہوتا ہے خلق الانسان من طین..... ونفخ فیہ من روحہ (سجدہ ۲۲) انسان کو مٹی سے پیدا کیا . . . . اور اس میں اپنی روح پھونکی ــــ پس جس طرح تمام انسانوں میں اللہ اپنی روح نفخ کرتا ہے، اسی طرح عیسٰی میں بھی کی تھی ص۲۹

مثل عیسٰی کمثل آدم

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (آل عمران - ۵۹)

عیسٰی کی مثال اللہ کے نزدیک جیسے مثال آدم کی، بنایا اس کو مٹی سے، پھر کہا اس کو کہ ہو جا، وہ ہو گیا۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اس سے بھی عیسٰی کے بے باپ ہونے کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ سید کہتے ہیں کہ مماثلت دونوں (آدم و عیسٰی) کی خلقت میں تو ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ آدم مٹی سے یا پانی سے پیدا ہوئے تھے۔ اور نہ وہ نو مہینے کسی عورت کے پیٹ میں رہے اور نہ مثل ایسے انسانوں کے جو نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں ماں کا حالت نطفہ سے جنین ہونے تک نشوونما ہوا، برخلاف حضرت عیسٰی کے..... پس اگر مماثلت ہے تو یا تو نفخ روح میں ہے کہ آدم کی نسبت کیا ہے کہ "نفخت فیہ من روحی" اور حضرت عیسٰی کی نسبت کہا ہے " فنفخنا فیہ من روحنا" اور یا صرف مخلوق

ہونے میں ہے جیسے آدم خدا کے بندے اور مخلوق تھے ، اسی طرح عیسٰی بھی ..... جیسا کہ فرمایا لَن یَّستَنکِفَ المَسِیحُ اَن یَّکُونَ عَبدًا لِلّٰہِ (نساء - ۱۷۲) (مسیح کو ہرگز اس سے عار نہیں کہ وہ اللہ کا بندہ ہو) پس کوئی وجہ نہیں کہ اس آیت سے مسیح کے بن باپ ہونے پر استدلال کیا جائے۔ (صـ۴ـ)

"ابنِ مریم" "بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر جگہ حضرت عیسٰی کو "ابن مریم" کہا گیا ہے ۔ اگر ان کے کوئی باپ ہوتا، تو ان کی ابنیت باپ کی طرف منسوب ہوتی نہ کہ ماں کی طرف"

سید کہتے ہیں ــــ " یہ دلیل نہایت بودی ہے ۔ کیوں کہ جب قرآن نازل ہوا تو حضرت عیسٰی یہود اور نصاریٰ دونوں میں ابن مریم کے لقب سے مشہور تھے ۔ وہی مشہور لقب ان کا قرآن میں بھی بیان کیا گیا (صـ۵ـ)

اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مریم اس علاقے کی متوطن تھیں اور ہیکل پر چڑھا دا ہونے کی وجہ سے بھی معروف تھیں اور یوسف وہاں کے اصلی باشندے نہیں تھے ۔ اس اجمال کی تفصیل سید کی تفسیر سورۂ آلِ عمران میں انجیل اور مغربی مصنفوں کے حوالوں سے مندرج ہے ۔

وفاتِ مسیح سر سید کتب ذیل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انسان صلیب پر چڑھا دینے سے مر نہیں جاتا ۔

کتاب سطیری کان صـ۱۱۱ـ ۔ تفسیر انجیل متی از ازبجیریں صـ۹۳ـ

اونسطرنیان کی کتاب صـ۲۹۰ـ جو مسیح کے حالات میں لکھی ہے اور یوسی بیس کی تاریخ کلیسا صـ۲۹۱ـ

یہ مصنفین لکھتے ہیں کہ مصلوب کے مرنے کا سبب یہ ہوتا تھا کہ اس کو چار چار پانچ پانچ دن تک صلیب پر لٹکائے رکھتے تھے اور ہاتھ پاؤں کے میخ زدہ چھیدوں اور بھوک پیاس اور دھوپ کا صدمہ اٹھاتے اٹھاتے کئی دن میں مرتا تھا ۔

حضرت عیسٰی کو یہودیوں کے تہوار عید فصح بروز جمعہ بوقت دوپہر صلیب پر چڑھایا گیا ۔ ان کی ہتھیلیوں میں کیلیں ٹھوکی گئیں ۔ عید فصح کے خاتمے پر سبت شروع ہونے والا تھا ۔ مذہب یہود کے مطابق عید فصح کے دن کے ختم ہونے اور سبت کے شروع ہونے سے قبل ہی مصلوب کی لاش کو دفن کرنا ضروری تھا ۔ اسی وجہ سے انہوں نے درخواست کی کہ مسیح کی ٹانگیں توڑ کر فی الفور ختم کر دیا جائے ۔ لیکن ٹانگیں نہیں توڑی گئیں ۔ جب لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ، عیسٰی مر گئے تو یوسف[1] نے حاکم سے دفن کرنے کی درخواست کی ۔ وہ اور عیسائی متعجب ہوئے کہ ایسے جلد مر گئے ؟ صرف تین چار گھنٹے صلیب پر رہنے کے بعد دفن کی اجازت لی گئی ۔ یوسف نے ان کو لحد میں رکھا اور ایک پتھر سے ڈھانک دیا ــــ وہ صلیب پر مرے نہ تھے لیکن ایسی حالت طاری ہوئی کہ لوگوں نے مردہ سمجھ لیا ۔

---

[1] یوسف ایک دولت مند شخص تھا جس نے پیلاطس (گورنر یروشلم) کی اجازت سے مسیح کی لاش کو دفن کیا تھا ۔ (متی) یہ شخص یا تو مسیح کا پیرو تھا یا آپ کے مشن سے ہمدردی رکھتا تھا اس یوسف کے باغ میں حواریوں نے خفیہ مسیح کا علاج کیا اور تیسرے دن (اتوار) اسے ساتھ لے کر چل دیئے ۔" معارف القرآن صـ۲۵ـ

اس کے بعد سید صاحب نے کئی تاریخی مجرموں کے حوالے دیئے ہیں، جو صلیب پر لٹکائے جانے کے بعد زندہ رہے۔
حضرت علی رضؓ کا جنازہ بھی خوارج کے خوف سے مخفی طور پر دفن کیا گیا۔ حالاں کہ خوارج کا خوف یہود کی بہ نسبت کم تھا۔ بعض شیعہ فرقے کہتے ہیں کہ علیؓ آسمان پر چلے گئے صـ۴۶ـ

اس مقام پر سید نے وہ آیات نقل کی ہیں جن میں الفاظ "متوفیک[۱] ورافعک" (آل عمران ۵۴) "فلما توفیتنی[۲]" (مائدہ ۱۱۷) "ما دمت[۳] حیا" (مریم ۳۳-۳۲) "بل رفعہ[۴] اللہ الیہ" (النساء ۱۵۶) وارد ہوئے ہیں اور ان کی شرح اپنے مذاق کے مطابق کی ہے ـــــ "متوفیک" کے معنی تفسیر کبیر کے حوالے سے "ممیتک" کئے ہیں یعنی "اے عیسٰی میں (خدا) تجھے موت دینے والا ہوں" یہی معنی دوسری آیت کے ہیں۔ پہلی اور چوتھی آیت میں رفعک رفعہ رفع کا لفظ آیا ہے جس سے حضرت عیسٰی کی قدر و منزلت مقصود ہے نہ کہ ان کے جسم کو اٹھا لینا۔ تفسیر کبیر میں بعض علماء کا قول لکھا ہے کہ لفظ "رفع" تعظیماً اور تفخیماً بولا گیا ہے (صـ۴۸-۴۷ـ) (تمت کلمۃ سید فی المسیحؑ)

سید کے بعد ہمارے ملک میں جو عقلیین ہوئے ہیں، وہ سب کے سب سید سے متاثر ہوئے ہیں۔ انہی میں سے ایک مولوی محمد علی لاہوری بھی ہیں۔ ذیل میں ان کے خیالات ملاحظہ فرمایئے۔

محمد علی اور مسیحؑ

کفالتِ مریم

اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَھُمْ اَیُّھُمْ یَکْفُلُ مَرْیَمَ (آل عمران-۴۴) جب وہ (ہیکل کے مجاور اپنی قلمیں ڈالتے تھے کہ ان میں کون مریم کا کفیل بنے ..... (ترجمہ محمد علی) — اس مقام کی تفسیر میں محمد علی لکھتے ہیں " یہاں جس کفالت کا ذکر ہے اس سے مراد کفالت نکاح ہے۔ ایک سن بلوغ کو پہنچی ہوئی عورت کے لیے اب یہ ضروری تھا کہ اس کے نکاح کا فکر کیا جاتا اور مریم کی ماں نے مریم کو خدمت دین کے لیے نذر کر دینے کے بعد یہ دعا مانگ کر اِنِّیْ اُعِیْذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا بتا دیا تھا کہ تارک کر بٹھانا اس کا منشاء ہرگز نہ تھا۔ نہ تارک بٹھانے کا بنی اسرائیل میں کوئی دستور معلوم ہوتا ہے۔ ہیکل کے لیے وقف ہونے کی وجہ سے انہیں، ان کے والد یا والدہ کو ان کے نکاح کا اختیار نہ تھا اس لیے عام رواج کے مطابق قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنا مناسب سمجھا گیا مثؒ ج اول " بیان القرآن "۔

ولادتِ مسیح

ولادت مسیح کے متعلق مولوی محمد علی لکھتے ہیں کہ

" معجزے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر کسی کی شہادت ہو۔ کوئی دیکھنے والا اس کا گواہ ہو مگر بغیر خاوند کے حمل ہونے کی گواہی سوائے مریم کے کوئی دوسرا دے ہی نہیں سکتا۔ یہ کرامت یا معجزہ کیا ہوگا؟ ..... جب تک اللہ تعالیٰ بالتصریح یہ نہ فرمائے کہ عیسیٰ کو ہم نے اپنے قانون کے خلاف یا الگ رنگ میں پیدا کیا تھا اس وقت تک یہی ماننا ہوگا کہ وہ اسباب جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے وہ اسی رنگ کے تھے ..... میرے نزدیک یہ نتیجہ (بے باپ پیدا ہونا) الفاظ قرآنی سے نہیں نکلتا۔

مسِ بشر

" لم یمسسنی " میں گزشتہ کا ذکر ہے کہ مجھے بشر نے نہیں چھوا۔ اس میں آئندہ کا کوئی ذکر نہیں ..... یہ کہنے کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ انہیں ابھی علم بھی نہیں تھا کہ ان کا نکاح ہونے والا ہے۔

اناجیل سے ثابت ہے کہ حضرت مریم علیہ السلام کے ساتھ یوسف کا تعلق زوجیت کا تھا۔ اسی تعلق سے آپ کے ہاں بہت سی اولاد بھی ہوئی صـ۳۱۴

وَالَّتِیْ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا (انبیاء-۹۱) میں " احصان " کے معنی قید نکاح میں آنا ہے۔

شہادتِ حدیث

" حدیث ایک بھی ایسی نہیں ملتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے۔

---

[1] مولوی محمد علی لاہوری کی تفسیر " بیان القرآن " سے تلخیص و اقتباس۔ منہ[2] الفاظ نقل کیے ہیں۔

[2] میں اس لڑکی کو اس کی اولاد کو (اے خدا) تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

نجران کے ساتھ گفتگو کے دوران میں آپ کے یہ صاف الفاظ مروی ہیں:

الستم تعلمون ان عیسٰی حملتہ امہ کما تحمل المرأۃ۔ — کیا تم نہیں جانتے کہ عیسٰی کو اس کی ماں نے حمل میں لیا جس طرح عورتیں بچوں کو حمل میں لیا کرتی ہیں۔

اور عورتیں بچوں کو اپنے خاوندوں سے ہی حمل میں لیتی ہیں ..... جب عیسائیوں نے یہ سوال کیا کہ "و قالوا لہ من ابوہ" یعنی اس کا باپ کون تھا؟ تو آپ نے یہ جواب نہیں دیا کہ اس کا باپ کوئی نہیں، بلکہ فرمایا الستم تعلمون انہ لایکون ولد الا وھو یشبہ اباہ۔ کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں مگر وہ اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے ___ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے یہ بتا دیا کہ حضرت عیسٰی کا باپ انسانوں میں سے ہی کوئی ہے، کیونکہ اس کی شکل انسانوں سے ملتی ہے۔ اگر بغیر باپ کے کہنا ہوتا تو یوں فرماتے کہ وہ آدم کی طرح بن باپ ہے۔ یا کلمہ "کن" سے پیدا ہوا ہے ..... (ص۲۱۵)

مسیحؑ صرف بنی اسرائیل کے لیے

آیہ مبارکہ۔ وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (آل عمران۔) کی تفسیر میں محمد علی صاحب لکھتے ہیں۔

"یہ آیت فیصلہ کرتی ہے کہ حضرت مسیحؑ امت محمدیہ کی اصلاح کے لیے نہیں آ سکتے۔ نہ ہی دین اسلام کی توسیع تمام اقوام میں ان کا کام ہو سکتا ہے۔ اگر انہوں نے امت محمدیہ کے لیے بھی رسول ہونا ہوتا تو قرآن کریم میں یہ لفظ (رسولاً الی بنی اسرائیل) جو ان کی حد بندی کرتے ہیں وارد نہ ہوتے۔ پس جس شخص پر یہ حکم لگ چکا ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کے لیے رسول ہوگا، اس کا ساری دنیا کی طرف رسول بننا محال ہے (ص۱۲۷)

سورہ مریم میں ولادت مسیحؑ

"خود مفسرین نے ایسے اقوال نقل کئے ہیں۔ جیسے کا قول۔ ان مریم لما حملت کان معہا ابن عم لہا یسمی یوسف النجار[1] ___ یعنی جب مریم کو حمل ہوا تو ان کے ساتھ ان کے چچا کا بیٹا یوسف نجار تھا ___ اور یہ یوسف نجار وہی ہیں جو بروئے اناجیل و تاریخ حضرت مریم کے شوہر تھے اور جن کے ساتھ مریم کا تعلق زوجیت ..... خود عیسائیوں کو مسلّم ہے ..... ج۲ ص۱۲۰۸۔

مسیح آیۃً للناس

"ولنجعلہ آیۃ للناس ورحمۃ" (مریم ۔۲۱) (اور تاکہ ہم اس (مسیح) کو لوگوں کے لیے نشان اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں) ہر چیز جو بطور ایک دلیل نشان کے ہو آیۃ کہلاتی ہے۔ وَجَعَلْنَا الَّیْلَ وَالنَّھَارَ اٰیَتَیْنِ (بنی اسرائیل ۔ ۱۲) اور ہم نے دن اور رات کو دو آیتیں بنایا۔ حالانکہ دن رات معمولی طور پر آتے جاتے ہیں۔ ہر داعی حق کا وجود ایک آیت ہے۔ مخالفین حق کی ہلاکت بھی آیت ہے۔ یوسف اور برادران یوسف کا معاملہ بھی آیت ہے۔ لقد کان فی یوسف واخوتہ آیات للسائلین بلکہ کئی آیات ہیں ..... درحقیقت اللہ تعالیٰ کی سب مخلوق ہی نشان ہے وَکَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَۃٍ

---

[1] بحوالہ "روح المعانی"

فی السماوات والارض (زمین و آسمان آیتوں ہی آیتوں سے بھرے ہوئے ہیں) حضرت مسیح کس معنی میں آیت تھے؟ ..... ہو سکتا ہے کہ آیت میں ان کی رسالت کی طرف اشارہ ہو .... اللہ کا نبی بلکہ صالح بندے بھی اس کے وجود پر آیت بن جاتے ہیں ص۲۰۸

مسیح کی سواری

فاتت به قومها تحمله (مریم - ۲۷) پھر وہ (مریم) اسے سواری کئے ہوئے اپنی قوم کے پاس لائی —— تَحمِلہٗ سے مراد گود میں اٹھانا ہی نہیں بلکہ سواری دینا بھی ہے یا سوار کرنا ص۱۲ اس کی سند میں سورہ توبہ کی آیت ۹۲ پیش کی ہے "لتحملھم" تاکہ تو انہیں سواری دے ص۹۲۔

کلمۃ اللہ سے مراد

ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ (آل عمران - ۴۴) اے مریم! اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلام کے ساتھ خوشخبری دیتا ہے (ترجمہ محمد علی)

اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلام کے ذریعہ بشارت دیتا ہے ..... مسیح کو کلمۃ منہٗ کہا ہے یعنی اپنی طرف سے ایک کلمہ ..... کلموں میں سے ایک کلمہ کو کان البحر مدادا لکلمت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمت ربی (کہف - ۱۰۹) اگر میرے رب کے کلمات کے لیے سمندر بھی سیاہی بن جائیں تو سمندر بھی ختم ہو جائیں، مگر وہ (لاتعداد) کلمات ختم نہیں ہوں گے ... ص۲۰۹ خدا نے ایک بات کہی، وہ مسیح کے آنے سے پوری ہو گئی — پس مسیح کے آنے سے گویا خدا کا کلام آ گیا چنانچہ یہ توجیہ مفسرین نے پسند کی ہے امام رازی کہتے ہیں — انہ قد وردت البشارۃ فی کتب الانبیاء الذین کانوا قبلہ فلما جاء قیل ہذا ہو تلک الکلمۃ — سابقہ نبیوں کی کتابوں میں مسیح کے متعلق جو بشارت تھی، جب وہ آ گئے تو کہا کہ وہ کلام آ گیا۔

دوسری توجیہ

یہ بعینہٖ اسی طرح ہے، جیسے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ کی بشارت ملی تھی "بشرناک بالحق" ہم تمہیں حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں - اب "یبشرک بکلمۃ منہ" اور "بشرناک بالحق" ایک جیسی مثالیں ہیں - اگر ایک کے ذریعے مسیح "کلمۃ اللہ" بن سکتا ہے، تو دوسری کے ذریعہ اسحاق علیہ السلام "حق" بن سکتا ہے - حالانکہ بات صرف اس قدر ہے کہ ایک جگہ تو مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ساتھ بشارت دیتا ہے اور دوسری مراد ہے کہ ہم تم کو حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں - اس کا نام مسیح ہے تو کلمۃ منہ سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کی پیش گوئی ہے اور اسی کی مؤید یہ بات ہے کلمۃ منہ کے بعد فرمایا "اسمہ" حالاں کہ کلمہ مونث ہے - پس اسمہ میں ضمیر مبشر بہ کی طرف جائے گی - یعنی اس کا نام جس کی بشارت دی جاتی ہے ج ۱ ص۱۰۱

جھولے میں باتیں کرنا

"سب بچے عموماً جھولے میں ہی باتیں کرنا سیکھتے ہیں کیوں کہ دو سال کی عمر تک جھولے میں رہتے ہیں اگر یہ معجزہ تھا تو کس کا تھا؟ مسیح تو ابھی نبی نہیں بنے تھے؛ کیا مریم کا؟ تو وہ نبی نہیں - جھولے میں تو کلام ان سے منسوب کیا گیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ جھولے کے بچے کا کلام نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں ہے۔

"اللہ نے مجھے کتاب دی ہے، مجھے نبی بنایا ہے ..... نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے ..... الخ یہ سب کلام ایک بالغ انسان کا ہے جو نہ صرف مکلف ہو چکا ہے، بلکہ جس کو کتاب و نبوت مل چکی ہے - کتاب، حکمت، تورات انجیل، لکھنا پڑھنا وغیرہ سب کچھ سیکھ چکے ہیں - کیا یہ ایک دن سے بچے کے کام ہیں؟ ص۱۲۱

وفات مسیح

اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ ۔ (نساء ۔ ۵۴) اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور اپنی طرف تیرا رفع کرنے والا ہوں (ترجمہ محمد علی)

"متوفیك" ۔ توفاہ اللہ ۔ اذا قبض روحہ (تاج العروس) قبض نفسہ (لسان العرب) اس کے کوئی معنی سوائے قبض نفس یا روح کے کسی لغت میں نہیں آئے ۔ خود قرآن نے بھی صراحت فرمائی ہے ۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (الزمر ۔ ۴۲) ..... توفاہ اللہ میں صرف نفس یا روح کا لینا اہل لغت کا فیصلہ ہے اور اشعار جاہلیت کی، قرآن کریم کی، حدیث کی، علم ادب کی ایک بھی مثال اس کے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی ص ۲۳

اگر یہ ممکن ہے کہ ایک شخص مع جسدِ عنصری آسمان پر چلا جائے تو اس پر بروئے لغتِ عرب "توفاہ اللہ" کا محاورہ بولنا جائز نہیں۔ اس کے لیے کوئی اور لفظ چاہیئے۔ ..... امام المفسرین حضرت ابن عباس سے خود بخاری میں "متوفیك" کے معنی "ممیتك" مروی ہیں ۔ یعنی تجھے موت دینے والا ہوں ص ۲۳۱

حضرت مسیح کی وفات کے نام پر بعض لوگ قرآنی تصریحات کے باوجود بہت گھبراتے ہیں ۔ اور اس کو نیا عقیدہ خیال کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ قرآن شریف اور احادیث میں حضرت عیسیٰ کے زندہ آسمان پر ہونے کا ذکر ہے ۔ حالاں کہ قرآن شریف اور حدیث میں حیات مسیح کا مطلق کوئی ذکر نہیں، بلکہ دونوں جگہ آپ کی وفات کا ذکر ہے اور حیات مسیح پر جو اجماع امت سمجھا جاتا ہے ۔ اس کا یہ حال ہے کہ چار ائمہ میں سے ایک امام مالک کھلے طور پر وفات مسیح کے قائل ہیں چنانچہ ان کا یہ عقیدہ "عتبیہ" اور "مجمع البحار" میں صاف الفاظ میں لکھا ہوا موجود ہے قال مالک مات ۔ اور باقی تین اماموں میں سے صراحت سے کوئی حیات مسیح کا قائل نہیں ۔ پس اصل عقیدہ اہل سنت والجماعت کا وفات مسیح ہے نہ کہ حیات مسیح ... مسلمانوں کے اس مشہور خیال سے کہ مسیح زندہ آسمان پر ہیں، عیسائی فائدہ اٹھا رہے ہیں اور مسلمانوں کو یہ کہہ کر گمراہ کر رہے ہیں کہ تمام رسول بروئے قرآن کھانے پینے کے محتاج تھے ۔ مگر مسیح کا جسم ایسا ہے کہ وہ دو ہزار سال سے خورد و نوش کے بغیر آسمان پر زندہ موجود ہے ص ۲۳۲

حدیث میں وفات مسیح

کوئی مرفوع حدیث مسیح کے جسدِ عنصری سمیت زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کی مؤید موجود نہیں ہے ۔ بلکہ وفات کی تائید میں حدیثیں ملتی ہیں ۔ مثلاً حدیث معراج میں وفات یافتہ انبیاء کے ساتھ حضور نے مسیح کو ایک ہی جگہ دیکھا اور وہ مشہور حدیث، لو کان موسیٰ وعیسیٰ حیین لما وسعہما الا اتباعی ۔ اگر موسیٰ و عیسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں میرا اتباع کرنا پڑتا، اور وہ حدیث جس میں ہے "اِنَّ عیسیٰ عاش عشرین ومائۃ سنۃ" ۔ عیسیٰ ایک سو بیس برس زندہ رہے، یہ وہ بات ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، مجھے جبریل نے بتائی ۔ ص ۲۳۲

رفع مسیح

وَرَافِعُکَ اِلَیَّ (نساء ۵۴) اے مسیح اپنی طرف تیرا رفع کرنے والا ہوں (ترجمہ ایضاً) اس سے مراد قرب و درجہ کی بلندی ہے عربی زبان میں کہتے ہیں نساء مرفوعات اے نساء مکرمات (لسان العرب) یعنی معزز عورتیں ۔ قرآن میں ہے ۔ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (واقعہ ۔ ۳) قیامت گنہگاروں کو ذلیل اور فرماں برداروں کا رفع کرے گی یعنی ان کے مراتب بلند کرے گی ۔ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ

اَنْ تُرْفَعَ (نور-۳۶) یہاں ترفع کے معنی تعظیم ہیں (لسان العرب) یعنی ان گھروں کی تعظیم کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ لَوْشِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا۔ (اعراف-۱۷۶) اگر ہم چاہتے تو آیات کے ذریعے اس شخص کو (مرتبہ کی) بلندی بخشتے تفاسیر میں بھی لکھا ہے۔ رفع الی منازل الابرار (بیضاوی) یا الی منازل العلماء یا الی الجنۃ (فتح البیان) یعنی نیکوں یا علماء کے مقام کی طرف یا جنت کی طرف اسی آیت (رافعك) کے نیچے ابن جریر لکھتے ہیں۔ (الرفع یعم معانی کثیر منھا الرّفع فِی المنزلۃ عندہٗ ومنھا رفع الشرف الدنیا ومکارمھا ومنھا الرفع فی الذکر الجمیل والثنا الرفیع یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور مرتبہ بلند، دنیا میں عزت و مکرمت، اچھی شہرت وغیرہ سب رفع میں داخل ہیں۔

حدیث رفع

حدیث میں رفع کے معنی کا قطعی فیصلہ کیا گیا ہے۔ دو سجدوں کے درمیان جو دعا کی جاتی ہے۔ اس میں یہ لفظ آتا ہے وارفعنی (اسے خدا مجھے رفع دے) کیا آج تک کسی کے وہم میں بھی گزرا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جسم سمیت آسمان پہ اٹھالے؟ کیا آج تک کوئی غازی اس دعا کے نتیجے میں آسمان پر گیا ہے؟

ترمذی میں ہے یرید الناس ان یضعوہم ویابی اللہ الا ان یرفعہم۔ لوگ ان کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے رفع کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا ـــ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو مع جسم آسمان پہ اٹھالے جانا چاہتا ہے ـــ تواضع کرو اللہ تمہیں بلند کرے گا۔ فاذا تواضع رفعہ اللہ بالسلسلۃ الی السماء السابعۃ (کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۲۶) جب بندہ تواضع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے زنجیر کے ساتھ ساتویں آسمان پر رفع کرتا ہے۔ یہاں رفع بھی ہے، ساتواں آسمان بھی اور زنجیر بھی۔ مگر پھر بھی رفع جسم مراد نہیں۔ بلکہ قرب مراد ہے۔

قرآن میں رفع عیسیٰ کا ذکر اللہ کی طرف ہے۔ آسمان کی طرف بالکل نہیں۔ اللہ کوئی جسم نہیں جو آسمان پر ہو۔ اللہ کا مکان میں ہونا بالاتفاق ممتنع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی اللہ یا رب کی طرف جانے کا ذکر ہوتا ہے انتقال جسمانی نہیں بلکہ قرب روحانی مراد ہوتا ہے۔ جیسے ارجعی الی ربك۔ انا الیہ راجعون۔ انی ذاھب الی ربی۔ اتخذ الی ربہ سبیلا۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں صفائی سے لکھ دیا ہے۔ رفعہ فی قولہ ورافعك ھوالرفعۃ بالدرجۃ والنقبۃ لا بالمکان والجہۃ۔ یعنی رافعك الیّ سے مراد درجہ اور مرتبہ میں بلندی ہے نہ کہ مکان اور جہت کی بلندی ص ۲۲۳۔

سورۂ نساء میں ذکرِ مسیح

مَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ (نساء ۴، ۱۵۷) نہ اسے قتل کیا اور نہ اسے صلیب پہ مارا، مگر وہ ان کے لیے اس جیسا بنا دیا گیا۔ (ترجمہ محمد علی) اس کے معنی غلطی سے یوں کیے جاتے ہیں کہ کوئی شخص مسیح کا مشابہ بنا دیا گیا.... الفاظ قرآنی اس مفہوم کو ہرگز برداشت نہیں کرتے ضمیر جو شُبِّہَ میں ہے وہ صرف حضرت مسیح کی طرف جا سکتی ہے، جن کا ذکر چل رہا ہے اور کسی ایسے شخص کی طرف ہرگز نہیں جا سکتی جس کا ذکر قرآن شریف میں کہیں بھی نہیں۔ بلکہ صحیح حدیث میں بھی نہیں جو مسیح کی جگہ قتل و صلیب کی موت سے مرا ہو..... کسی دوسرے مقتول یا مصلوب کا یہاں اشارہ تک نہیں۔

تاریخ بھی نہایت صفائی سے کہتی ہے کہ مسیح صلیب پر چڑھائے گئے، مگر مصلوب نہیں ہوئے بلکہ زندہ اترے۔ البتہ.... وہ مصلوب یا مقتول کے مشابہ ہو گئے، مرقس ۱۵، ۲۵ کے مطابق چھ گھنٹے اور یوحنا ۱۹: ۱۴ کے مطابق تین گھنٹے سے بھی کم صلیب پر رہے.... مسیح کو دفن نہیں کیا گیا، بلکہ ایک کھلی جگہ میں رکھ کر سامنے ایک پتھر رکھ دیا گیا، جس سے ہوا اندر جاتی رہی (مرقس ۱۵: ۴۶) حالانکہ جس کو دفن کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے ہوا کے آنے جانے کا راستہ نہیں رکھا جاتا..... تیسرے دن جب مریم مگدلینی وغیرہ آئیں تو پتھر کو دروازہ سے ہٹا ہوا پایا (مرقس ۱۶: ۴) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کو ہٹا کر مسیح کو اندر سے نکالا گیا.... یوحنا ۲۰: ۱۵ سے ثابت ہوتا ہے کہ مریم مگدلینی نے حضرت مسیح کو دیکھا تو انہیں باغبان سمجھا، جس سے معلوم ہوا کہ آپ نے بھیس بدلا ہوا تھا، کئی دن بعد جب حواریوں نے مسیح کو دیکھا تو ان کے ہاتھوں پر کیلوں کے زخموں کے نشان باقی تھے۔ (یوحنا ۲۰: ۲۵ سے ۲۸) لوقا ۲۴: ۳۹ - ۴۴ سے ثابت ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد حواریوں کے ساتھ مل کر آپ نے مل کر بھونی ہوئی مچھلی اور شہد کھایا ــــ جلیل تک پیدل سفر کیا (متی ۲۸: ۱۰)

مسیح صلیب پر چڑھے مصلوب کی طرح مگر مصلوب نہیں ہوئے یعنی صلیب پر مرے نہیں.... یہ تاریخی واقعات ہیں، جن پر ساری انجیلیں متفق ہیں۔ ان سے عیسائیوں پر اتمام حجت ہو سکتا ہے، کیوں کہ یہ اسناد ان کے نزدیک مسلّم ہیں:

اگر ان کے سامنے ایک نئی کہانی بنا کر رکھ دیں کہ ان کا ہم شکل مصلوب ہوا اور وہ آسمان پر چلے گئے، تو اس سے کہانی کا مصنف صرف اپنا دل خوش کر سکتا ہے۔ دوسری قوم پر اتمام حجت نہیں کر سکتا۔ یہ روایت نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں، نہ انجیل میں اور نہ کسی تاریخ میں.... اگر کسی کو ہم شکل بنائے بغیر خدا تعالیٰ مسیح کو اٹھا لیتا تو کیا یہودی اس کو آسمان سے پکڑ لاتے، جو خدا نے ایک ہم شکل بنا کر ان کو دھوکے میں ڈال دیا؟ پھر اس روایت کی کئی متضاد شکلیں ہیں:

۱۔ مسیح کے کہنے پر ایک حواری نے ہم شکل ہونا قبول کیا۔ ایک نبی کی شان کے خلاف ہے کہ ایک بے گناہ کو بے ضرورت مروائے۔

۲۔ وہ ایک منافق تھا۔

۲۔ جو پکڑنے آیا تھا وہ ہم شکل بنا دیا گیا۔

تعجب ہے۔ ان دونوں صورتوں میں کوئی واویلا نہ ہوا اور نہ بتایا کہ میں کون ہوں؟

۴۔ یہود نے جب مسیح کو نہ پایا تو خود ہی ایک یہودی کو پکڑ کر صلیب دے دیا تا کہ لوگوں کو پتا نہ لگ جائے کہ مسیح آسمان پر چلا گیا۔ اور کسی کو قریب نہ آنے دیا۔

یہ سب اٹکل پچو روایتیں ہیں۔ ایک بات پر اعتراض ہوا تو دوسری بنا لی، دوسری پر ہوا تو تیسری بنا لی ..... آج تک کسی جیل خانے کے مفرور کی نسبت یہ خیال کسی شخص نے نہیں کیا کہ وہ آسمان پر چلا گیا ہوگا۔ آسمان پر جاتے ہوئے تو ایک شخص نے بھی نہ دیکھا اور یہود ان کے حوالات سے غائب ہو جانے پر سب لوگ سمجھ لیتے کہ ضرور آسمان پر ہی گئے ہیں یہ کس قدر بعید از قیاس ہے۔

خود قرآن سے ثابت ہے کہ جب یہود نے ان کو مصلوب کرنے کی تدبیریں کیں تو خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ میں تجھ کو طبعی موت ماروں گا۔ "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي (جب تو نے مجھے طبعی وفات دی) آسمان پر زندہ لے جانے کا نہ کہیں وعدہ ہے نہ ذکر پس نفی قتل و صلب کر کے مقتول و مصلوب کی شبیہ قرار دے کر اور پھر طبعی وفات کا ذکر کر کے معاملہ صاف کر دیا ہے۔

"مَا قَتَلُوهُ يَقِينًا"، (راغب) یعنی اس کے مصلوب ہونے کو علم یقینی کے ساتھ نہیں جانا ..... کسی دوسرے کے قتل کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ یہود و نصاریٰ دونوں شک میں رہے بقول قرآن "لَفِي شَكٍّ مِنْهُ" کسی کو بھی قتل کا یقین نہیں ہوا۔ تین گھنٹے کے اندر اندر صلیب سے اتر آنا، ٹانگیں نہ توڑا جانا، پیلاطوس کا شک کرنا، پتھر کا ہٹا ہوا پایا جانا۔ حواریوں سے خفیہ ملاقاتیں۔ کیا یہ صریح امور نہیں۔ جن کا لازمی نتیجہ شک ہونا چاہیے۔ جو دونوں گروہوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ اگر وہ آسمان پہ چلے گئے تھے اور ان کا ہم شکل مصلوب ہوا تھا تو شک کیسا اور علم کا نہ ہونا کیا معنی "مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ" ان کو کوئی علم نہیں۔ صرف گمان کے پیچھے چلتے ہیں۔ النساء ۔ ۱۵۷) تفصیل کے لیے دیکھیے ص ۵۰ تا ۵۹

وَإِذْ قَالَ يَا عِيسَى ..... الخ (مائدہ ۱۱۶ تا ۱۱۹) جب اللہ نے عیسیٰ سے کہا "اے عیسیٰ ابن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود بنا لو"؟ کہا "تو پاک ہے مجھے کہاں شایان تھا کہ میں وہ کہوں جس کا مجھے حق نہیں؛ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے ضرور علم ہوتا تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تو مخفی رکھتا ہے کیونکہ تو غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔ میں نے انہیں کچھ نہیں کہا مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا، کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے اور میں ان پہ گواہ تھا جب تک میں ان میں تھا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو، تو ہی ان پر نگہبان تھا ..... الخ (ترجمہ محمد علی)

یہ کلام عالم برزخ کا ہے، جو نزول قرآن سے پہلے ہو چکا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں اس کی تفسیر میں حدیث ہے کہ قیامت کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے بعض لوگوں کو دوزخ کی طرف جاتے دیکھیں گے۔ آگے لفظ ہیں "فَأَقُولُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ" میں کہوں گا جیسے عبد صالح یعنی عیسیٰ نے کہا ـــ یہاں اپنے لیے صیغہ مضارع (اقول) اور عیسیٰ کے لیے صیغہ ماضی (قال)

استعمال کیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے۔

یہ آیت (فلما توفیتنی) حضرت مسیح کی وفات کو قطعی طور پر ثابت کرتی ہے، کیوں کہ عیسائیوں کا عقیدہ بگڑنے کا زمانہ حضرت مسیحؑ کی وفات کے بعد قرار دیا ہے اور چونکہ وہ عقیدہ نزول قرآن سے پہلے بگڑا ہوا تھا اس لیے حضرت عیسیٰؑ کی وفات بھی نزول قرآن سے پہلے ہو چکی تھی.... بخاری کی یہ حدیث اس آیت کی فیصلہ کن تفسیر کرتی ہے۔

"جب قیامت کے دن میری امت کے بعض لوگ پکڑ کر دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نہیں جانتا کہ تیرے بعد انہوں نے کیا کیا۔ فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم۔ یعنی وہی بات کہوں گا جو عیسیٰ نے کہی تھی "اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تو ہی ان پر نگہبان تھا"، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انہی الفاظ کو استعمال کرنا صاف بتاتا ہے کہ آپؐ کے نزدیک عیسیٰ کی امت آپ عیسیٰ کی وفات کے بعد بگڑی۔ اس قطعی الدلالۃ آیت اور اس حدیث صریح کے ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ کی وفات کا انکار کرنا نصوص صریحہ کو رد کرنا ہے اور "توفیتنی" کے معنی سوائے وفات کے کچھ اور کرنا لغت کے خلاف ہے..... الخ (ص ۶۵۹، ۶۶۰)۔

سورۃ زخرف میں ذکرِ مسیحؑ

وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ (زخرف ۶۱) اور یقیناً یہ (موعود) گھڑی کے لیے علم ہے (ترجمہ محمد علی)

"اِنَّہٗ" میں ضمیر ابن عباس (وغیرہ) کے نزدیک ابن مریم کی طرف جاتی ہے (جیسا کہ آیت ۵۷ زخرف میں ہے ولما ضُرِبَ ابنُ مَرْیَمَ) ان کی قرأت میں عَلَمٌ عین کی زبر کے ساتھ ہے۔

حسن اور قتادہ سے مروی ہے ضمیر قرآن کی طرف ہے (ابن جریر) اس پر اعتراض ہے کہ یہاں قرآن کا ذکر پہلے موجود نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کئی جگہ قرآن کے پہلے ذکر بغیر قرآن کی ضمیر آئی ہے۔ مثلاً لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (قیامہ ۱۶) یا جیسے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (قدر ۱) اور حق یہی ہے کہ قرآن ہی ساعۃ کا علم دیتا ہے —— اگر حضرت عیسیٰ ہی کی طرف ضمیر راجع کی جائے تو اس سے یہ مراد ہوگی کہ "گویا حضرت عیسیٰ کا آنا ایک نشان تھا کہ اب نبوت ان (بنی اسرائیل) میں سے نکل کر دوسری جانب جاتی ہے" "ساعۃ" سے مراد ساعت یا قیامت وسطیٰ ہوگی۔ یعنی وہ ساعت آگئی کہ نبوت ان سے لے لی گئی جیسا کہ مسیح نے خود کہا ہے۔

"..... میں تم سے کہتا ہوں کہ بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے گی، دے دی جائے گی (متی ۲۱، ۴۳) (یعنی عمل کرے گی۔ ناقل)

قیامت کا نشان اگر ہے تو خود عیسیٰ ہے نہ کہ نزول عیسیٰ۔ اور یہاں نزول کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ ہم اپنی طرف سے قرآن میں اضافے کا کوئی حق نہیں رکھتے کہ خواہ مخواہ عیسیٰ سے مراد نزول عیسیٰ لیں اس آیت کی تفسیر میں کوئی حدیث بھی نہیں جس کی وجہ سے اس قدر تصرف جائز ہو اور پھر اس معنی کے لیے قرأت مشہورہ کو چھوڑنا پڑتا ہے اور اپنی طرف سے نئی قرأت ماننی پڑتی ہے۔ جو قرآن میں نہیں۔ (یعنی عِلْم بکسر عین کی جگہ عَلَم بفتح عین) لہٰذا پہلے معنی ہی قابل قبول ہیں کہ قرآن پاک قیامت کا علم ہے (انہ علم للساعۃ) درمیان میں قرآن کے "علم ساعۃ" کے طور پر پایا جانے کی وجہ سے جب دوبارہ حضرت عیسیٰ کا ذکر آیا تو ان کا نام لے کر آغاز فرمایا وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ..... الخ (زخرف ۶۳) (اور جب عیسیٰ کھلی دلیلیں لے کر آیا) اگر ضمیر عیسیٰؑ ہی کی طرف موڑی جائے تو پھر بھی نزول عیسیٰ مراد نہیں ہو سکتا۔ اور ساعت سے مراد یہودیوں کی تباہی ہے۔ نہ کہ قیامت کبریٰ۔ قیامت کبریٰ کا نشان ہمارے نبی کریم ہیں جو فرماتے ہیں۔ انا والساعۃ کھاتین (میں اور قیامت میری ان دو انگلیوں کی طرح ہیں۔ جن کے درمیان کوئی حائل نہیں۔

پرویز اور مسیح[1]

ولادت مسیح "آلعمران" میں

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ (آل عمران - ۴۵)

..... ملائکہ نے مریم سے کہا تھا کہ خدا تمہیں، اپنی طرف سے ایک بات کی خوش خبری دیتا ہے، یعنی ایک بیٹے کی جس کا نام مسیح (اور) عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا (۴۵/۳) چھوٹی عمر میں خوب باتیں کرنے والا اور پختہ عمر تک پہنچنے والا" قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ ..... الخ (۴۶/۳)

اس پر مریم نے تعجب سے کہا، "یہ کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ میں ایک کنواری راہبہ ہوں۔ — راہبہ کے ہاں اولاد کا کیا سوال"؟ — اس کے جواب میں وہی کچھ کہا گیا جو ذکریا سے کہا تھا (۳/۴۷) کہ یہ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوگا، جس کی رو سے عام تخلیق ہوتی ہے۔

معجزات مسیح کی توجیہ

اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (آل عمران - ۴۸)

(مسیح) (مردہ قوم (یہود) سے کہے گا کہ میں تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے زندگی بخش پیغام لے کر آیا ہوں۔ میں اس وحی کے ذریعے تمہیں ایسی حیات نو عطا کروں گا۔ جس سے تم اپنی موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی۔

یہ آسمانی روشنی تمہاری بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کر دے گی جس سے تم زندگی کے صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ اس سے تمہاری ویران کھیتی، جس پر تر و تازگی کا کوئی نشان باقی نہیں رہا، پھر سے سرسبز و شاداب ہو جائے گی۔ تمہاری وہ کمینہ خصلتیں دور ہو جائیں گی، جن کی وجہ سے کوئی تمہیں پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔

مختصراً یہ کہ ذلت و خواری کی وہ موت جو اس وقت تم پر چاروں طرف سے چھا رہی ہے (۲/۱۱۱) ایک نئی زندگی میں بدل جائے گی (۶/۱۲۲)

---

[1] چودھری غلام احمد پرویز کی تصنیف "مفہوم القرآن" سے ماخوذ

میں (تمہارے موجودہ نظام سرمایہ داری کی جگہ) ایسا نظام قائم کروں گا جو اس کا جائزہ لیتا رہے گا کہ تم کھانے پینے کی چیزوں میں سے کس قدر اپنے مصرف میں لانے ہو اور کس قدر ذخیرہ (HOARDING) کرتے ہو، کہ اس سے ناجائز نفع کمایا جائے ص ۱۲۹ تا ۱۳۱)
"مفہوم القرآن"

ولادت مسیح "مریم" میں

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۚ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۚ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۚ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۚ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۚ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۔

(مریم - ۱۶ تا ۲۱)

اے رسول! اب تو اس کتاب (قرآن) میں لوگوں سے مریم کا قصہ بیان کر اور سلسلۂ کلام کا آغاز اس وقت سے لے کر جب وہ خانقاہیت کی زندگی اور وہاں کے ناخوش آئند واقعات نے اس کے دل پر ایسا اثر چھوڑا تھا کہ وہ وہاں بھی لوگوں سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ ہم نے (ان اثرات کو مٹانے کے لیے، اسے زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کے متعلق تقویت بخش اشارہ کیا (جو اس کے خواب میں) ایک اچھے بھلے انسان کی شکل میں سامنے آیا۔

(مریم اسے دیکھ کر گھبرائی اور اس سے) کہا کہ، " اگر تو خدا کے قانون کا احترام کرتا ہے، تو میں تجھ سے، خدائے رحمان کی پناہ میں آنا چاہتی ہوں"

اس نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں تو تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں (۳/۴۲) اور وہ پیغام یہ ہے کہ وہ تجھے نہایت عمدہ نشوونما یافتہ بچہ عطا کرے گا۔

اس پر مریم نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؛ جب تک میں ہیکل میں رہی پاک باز راہبہ کی زندگی بسر کی۔ وہاں کسی انسان نے مجھے چھوا تک نہیں۔ وہاں سے نکلی ہوں تو میں نے شادی نہیں کی، کیونکہ یہ چیز ضابطۂ خانقاہیت کے خلاف ہے ۳/۴۷، ۱۹/۲۰۔

اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ قانون تخلیق کے مطابق ہی ہوگا (۳/۴۷)۔ یہ اس کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں (کہ جو موانعات تیرے ذہن میں ہیں، اور تمہیں اس طرح پریشان کر رہے ہیں، انہیں دور کر دے (۱۹/۹) خدا نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ بچہ عام بچوں جیسا نہیں ہوگا۔ وہ ہماری طرف سے لوگوں کے لئے موجب رحمت اور حق و باطل کے پرکھنے کی نشانی ہوگا۔ (جو شخص اس کی نبوت پر ایمان لائے گا، وہ حق پر سمجھا جائے گا جو اس سے انکار کرے گا، وہ باطل پر ہوگا۔) اور یہ بات طے شدہ ہے (کہ وہ بچہ ہمارا پیغمبر بنے گا ۳/۴۸ (اب متن قرآن کو چھوڑ کر صرف مفہوم آیات نمبر وار دیا جاتا ہے۔

۲۲۔ (چنانچہ رفتہ رفتہ وہ موانع دور ہوتے گئے۔ ادھر مریم کے دل سے خانقاہیت کی غلط رسم کی خلاف ورزی کا خوف دور ہو گیا، اُدھر ہیکل کے احبار و رہبان کی تنبیہ و تخویف کے باوجود ایک شخص مریم کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہو گیا) مریم کو ہونے والے بچے

کا حمل قرار پاگیا۔ اس پر ان دونوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ گاؤں سے کہیں دور چلے جائیں (تاکہ بچے کی ولادت کسی ایسی جگہ ہو جہاں ان کی جان پہچان کا کوئی نہ ہو اور یوں وہ احبار و رہبان کے طعن و تشنیع کے نشتروں سے محفوظ رہیں)

۲۳۔ وضع حمل کا وقت آیا تو دردِ زہ کا اضطراب مریم کو ایک کھجور کے درخت کی طرف لے گیا (آئینِ خانقاہیت کے خلاف متاہل زندگی پہلے بچے کی ولادت، پردیس کا معاملہ، بے سروسامانی کا یہ عالم کہ سر پر چھت تک بھی نہیں۔ مریم گھبرا گئی۔ اور کہنے لگی کہ) اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور بالکل بھولی بسری ہو چکی ہوتی!

۲۴۔ اس کرب و یاس کے عالم میں اُسے اس مقام کے نشیب کی طرف سے آواز آئی کہ اے مریم! گھبراؤ نہیں۔ اس طرف ایک (خوشگوار) پانی کی ندی ہے۔ اور اوپر کھجور کے درخت میں پکی ہوئی کھجوروں کے خوشے لٹک رہے ہیں۔)

۲۵ و ۲۶۔ تو اس پیڑ کی شاخ کو دور سے ہلا۔ تازہ اور پکی ہوئی کھجوریں تیرے قریب جھڑ پڑیں گی۔ تو ان تازہ کھجوروں کو کھا۔ ندی کا ٹھنڈا پانی پی (پھر بچے کے نظارے سے) اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر (باقی رہا تیرا یہ اضطراب کہ لوگوں کی باتوں کا کیا جواب دوں گی، تو تم منت کا روزہ رکھ لینا) اور اگر کوئی آدمی تجھ سے کچھ پوچھے تو اشارہ سے کہہ دینا کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لیے اپنے اوپر روزہ واجب کر رکھا ہے۔ اس لیے میں آج کسی شخص سے بات چیت نہیں کر سکتی۔

۲۷۔ اس طرح عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی۔ میاں بیوی اس بچے کو لے کر کسی دور مقام میں جا بسے، وہ بڑا ہوا تو شرفِ نبوت سے سرفراز کیا گیا تو اس کی والدہ اسے ساتھ لے کر اپنے وطن واپس آئی (ایک تو لوگوں کے نزدیک مریم کی یہ حرکت ہی کچھ کم قابلِ اعتراض نہ تھی کہ اس نے راہبہ بن جانے کے بعد ہیکل کے ضابطے کے خلاف اس طرح متاہل زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی، اس پر عیسیٰ کی طرف سے ان کی خود ساختہ شریعت اور ان کی سیرت و کردار کے خلاف سختی سے نکتہ چینی ہوتی تھی) چنانچہ وہ مریم سے کہتے کہ تم نے پہلے خود بھی عجیب و غریب حرکت کی اور اس کے بعد اس قسم کا انوکھا بیٹا لے کے آگئی۔

۲۸۔ وہ اسے کہتے کہ اے اختِ ہارون! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا، نہ ہی تیری ماں نے کبھی ہیکل کے قوانین و ضوابط سے سرکشی اختیار کی تھی۔ (تم تو ایک شریف، مذہب پرست، پابندِ شریعت گھرانے کی لڑکی تھی۔ تم نے یہ کیا کیا اور اپنے بیٹے کو کس قسم کی تعلیم دلائی؟)

۲۹۔ اس کے جواب میں وہ خود کچھ نہ کہتی۔ بلکہ عیسیٰ کی طرف اشارہ کر دیتی کہ اپنی باتوں کا جواب اس سے لو۔ بوڑھے احبار و رہبان، اپنی پیشوائیت کے گھمنڈ میں، نہایت نخوت و تکبر سے کہتے کہ کیا ہم اس سے بات کریں جو ابھی کل تک جھولا جھولتا تھا!

۳۰۔ اس پر عیسیٰؑ ان سے کہتے کہ یہ بھی کوئی انصاف کی بات ہے کہ چونکہ میں عمر میں تم سے چھوٹا ہوں، اس لیے تم مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہ کرو۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اُسے بگوشِ ہوش سنو۔ میں خدا کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا ہے۔

۳۱۔ اس نے مجھے زندگی کے ہر گوشے میں بابرکت بنایا ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں (تمہاری خود ساختہ شریعت کی جگہ) صلوٰۃ و زکوٰۃ کا صحیح نظام قائم کروں، اور عمر بھر میرا یہی شعار رہے۔

۴۲۔ (تم میری والدہ کے خلاف اس طرح زبان درازی کرتے ہو؟ اس نے جو کچھ کیا ہے، خدا کی سچی شریعت کے عین مطابق کیا ہے۔ اس لیے) میں اس سے ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آؤں گا۔ میں (معاذاللہ) ایسا شقی و بدبخت نہیں کہ (تمہارے پیچھے لگ کر ایک بے گناہ خاتون سے سختی سے پیش آؤں)

۴۳۔ (تم میری پیدائش کو بھی قابل اعتراض قرار دیتے ہو! یہ تمہاری خود ساختہ شریعت کا فیصلہ ہے۔ میں جس خدا کا پیغام لے کر آیا ہوں، اس کے نزدیک) میری پیدائش بھی سلامتی کی مظہر ہے، میری ساری زندگی، آخری دم تک سلامتی کی حامل ہوگی۔ اور حیات اخروی میں بھی میں امن و سلامتی میں ہوں گا۔

۴۴۔ یہ ہے عیسیٰ ابن مریم کی صحیح صحیح سرگذشت جس کے بارے میں یہ اس قدر اختلاف کر رہے ہیں (کہ ایک گروہ اگر تفریط کی طرف، اس کی پیدائش کو قابل اعتراض ٹھہرا رہا ہے، تو دوسرا گروہ، عیسائی، افراط کی طرف اُسے خدا کا بیٹا قرار دے رہا ہے)

وجہ تسمیہ ابن مریم

پرویز صاحب ماں کے نام سے مسیحؑ کی شہرت کے متعلق عیسائی مورخ رینان کی کتاب حیاتِ مسیح کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"آپ (مسیح) کے والد کا انتقال جلد ہی ہوگیا اور اس کے بعد مریم ہی خاندان کی سرپرست رہ گئیں۔ یہ وجہ ہے کہ (حضرت) مسیح عام طور پر "ابن مریم" کے نام سے مشہور ہوئے۔ یعنی جب آپ کو آپ کے ہم نام بچوں سے متمیز کرنا ہوتا تھا، تو یسوع ابن مریم کہا جاتا تھا صـ۱ (صـ۴۶ نیابت صـ۹)

ذیل میں پرویز صاحب کی کتاب "معارف القرآن" جلد سوم سے ولادت مسیح کے متعلق بعض اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

حضرت مسیحؑ کے متعلق اناجیل میں مذکور ہے کہ وہ حضرت داؤدؑ کی نسل سے تھے اور یہ سلسلہ یوسف نجار کی وساطت سے حضرت داؤدؑ تک پہنچتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان نسب ناموں کی رو سے بھی حضرت مسیح، یوسف کے بیٹے ہی قرار پاتے ہیں صـ۵۴۴۔

ابن اللہ (یا بغیر باپؑ کے پیدائش) کا عقیدہ بہت بعد کی پیداوار ہے صـ۵۴۵۔ قرآن کریم میں بالتصریح کہیں نہیں لکھا کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی۔ نہ ہی یہ لکھا ہے کہ آپ یوسف کے بیٹے تھے (قرآن کریم میں کئی ایک انبیاء کرام ایسے ہیں جن کے والد کا کوئی ذکر نہیں۔ حضرت موسیٰ کے والد کا نام بھی مذکور نہیں۔ والدہ ہی کا ذکر ہے) صـ۵۴۷

سورۂ مریم میں حضرت مسیح کے قوم سے خطاب کو نقل کرکے پرویز صاحب لکھتے ہیں۔ "اس میں حضرت عیسیٰ نے اپنی پیدائش کے متعلق ایک حرف تک نہیں کہا" صـ۵۵۵

صـ۱ تفصیل کے لئے دیکھئے پرویز صاحب کی کتاب معارف القرآن جلد سوم صـ۴۸۶ مطبوعہ ۱۹۴۵ء ترکمان روڈ دہلی۔

۲ ناقل نے استاذ العلماء مولانا غلام علی قصوری رحمہ اللہ کی قلمی تفسیر میں یہ فقرہ دیکھا ہے (مسیح کی "ولادت من غیر اب قرآن سے ثابت نہیں")

بیٹے کی بشارت پر جب مریم کہتی ہیں کہ مجھے بیٹا کیسے ہوگا جب کہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ..... الخ (۴۷/۳، ۱۹/۲۰-۲۱) تو جواب ملتا ہے۔ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۴۷/۳) اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔ — (اسی طرح ہوگا جس طرح ہوتا ہے — اللہ اپنے قانون مشیت کے تحت جو چاہتا ہے، کرتا ہے) یعنی اسی طرح ہوگا (كذالك) جس طرح مشیت کے کام ہوتے ہیں۔ جو کچھ مشیت کے تابع ہونا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اسباب پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح رکاوٹیں رفع ہو جاتی ہیں۔

آیہ "کن فیکون" کی شرح فرماتے ہیں۔

جب وہ (خدا) کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیتا ہے، تو اس کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ کہہ دے کہ "ہو جاؤ" اور وہ ہو جاتا ہے..... اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسا کہنے سے شے مطلوبہ خود بخود زمین سے پھوٹ کر باہر نکل آتی ہے۔ بلکہ مفہوم یہ ہے کہ اس سے اس شے کی ابتدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ ضروری مراحل طے کرنے کے بعد اپنی تکمیل تک جا پہنچتی ہے ص۵۵۵ ..... اگلی آیت میں ان مراحل کی تشریح فرما دی۔ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا (۱۹/۲۲) پھر اس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھہر گیا۔ وہ (اپنی یہ حالت چھپانے کے لیے) لوگوں سے الگ ہو کر دور چلی گئی ..... ہر شخص جانتا ہے کہ حمل کس طرح قرار پایا کرتا ہے (كذالك) اسی طرح جس طرح ہر شخص جانتا ہے اور جس طرح حضرت مریم کے دل میں خیال گزرا تھا کہ اس کے لیے بشر کے ساتھ تمسک کی ضرورت ہے ص۵۵۱

"کلمہ" کے معنی

قرآن مجید میں جہاں کہیں کلمہ یا کلمات کے لفظ آتے ہیں۔ پرویز صاحب نے قریباً ان سب کو جمع کر دیا ہے اور یہ معانی بتائے ہیں۔

عام بات، خاص بات، حکم، مقصد، قانون، احکام، وعدہ ۵۵۹ تا ۵۶۶

حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ تھے۔ آیہ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ (۴/۱۷۱) کا ترجمہ کرتے ہیں۔" اس (خدا) کے کلمہ (بشارت) کا ظہور ہے جو مریم پر القا کیا گیا تھا — دوسری آیت اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ (۳/۴۵) کا ترجمہ بھی دیکھئے — اے مریم! اللہ تجھے اپنے کلام کے ذریعے (ایک لڑکے کی) بشارت دیتا ہے۔

کلمہ کے معنی تدبیر، حکم، وعدہ، قانون، بشارت کچھ بھی لیجئے۔ مفہوم واضح ہے، یعنی، حضرت عیسیٰ تدبیر الٰہیہ کے سلسلۂ زریں کی ایک کڑی تھے جس انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے حضرات انبیاء کرام کی شکل میں دنیا میں بھیجا جا رہا ہے — یا آپ اس وعدہ کی تکمیل تھے، جو حضرت مریم سے کیا گیا تھا (کہ انہیں ایک ارجمند بیٹا عطا کیا جائے گا) — یا امر الٰہی جو قانون مشیت کے تابع پورا ہوا، جیسے اللہ کا ہر امر ایک قاعدہ اور قانون کے ماتحت پورا ہوتا ہے۔ ص۵۶۷

کائنات کی ہر شے کلمۃ اللہ ہے اور انہی میں سے حضرت عیسیٰؑ ہیں ص۵۶۹

مثل آدم سے مفہوم

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ (۳/۵۹) اللہ کے نزدیک تو عیسیٰ ایسا ہی ہے، جیسے آدم — پرویز صاحب یہاں آدم سے مراد انسان یا نوع انسان لیتے ہیں۔

جیسا کہ لکھتے ہیں:

(اے عیسائیو!) تم اپنے ذہن میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے متعلق کچھ بھی عقائد رکھو۔ اللہ کے نزدیک تو ان کی پیدائش نوعِ انسانی کی پیدائش کے مثل ہے، جو اپنی ابتداء سے انتہا تک مختلف مدارج طے کر کے تکمیل تک پہنچی۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہوا۔ ص۵۷۔

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اس قسم کے غیر عملی مسائل مسلمانوں میں اجنبی سازشوں کے نتائج ہیں، تاکہ امّتِ مسلمہ کے قوائے عمل مفلوج ہو کر نظری مسائل میں بیکار وقت ضائع کرتے رہیں۔ ان کے الفاظ دیکھئے۔

"یہود و نصاریٰ (اسلام کے مقابلے میں) اپنی ناکامیوں کے انتقام کے لیے صف آرا ہو گئے۔ اب میدانِ جہاد کی جگہ مناظروں کے اکھاڑوں نے لے لی اور قرآنی نظام کی جگہ عجمی تصوراتِ زندگی نے ..... انہوں نے اپنے عقائد کو اس طرح غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی ذہنیت پر منعکس کرنا شروع کیا کہ کچھ عرصہ بعد وہی عقائد ان کے اجزائے دین بن گئے اور یہود و نصاریٰ کی منظم سازشوں سے روایات کی شکل اختیار کر گئے۔ قرآن پیچھے چلا گیا اور اس قسم کی وضعی روایات آگے بڑھ آئیں اور یوں

"حقیقت خرافات میں کھو گئی"

اس کے بعد معاند قوتوں کی مسلسل کوشش رہی کہ مسلمان ان نظری مسائل کی خاردار جھاڑیوں سے نکلنے نہ پائیں ... ان کی پوری قوم حصولِ قوت و سطوت میں سرگرمِ عمل رہتی، لیکن کچھ لوگ (پادری) اس غرض کے لیے الگ کر دیئے جاتے کہ وہ مسلمانوں کو مناظروں کی تھپکیاں دے کر سلاتے رہیں ..... گزشتہ پچاس برس سے جب کہ پوری دنیا ایک پورے انقلاب سے گزر کر یکسر نئی دنیا میں تبدیل ہو چکی ہے ..... ہندی مسلمان کی ساری قوتیں اس عقدے کے حل کرنے میں صرف ہو رہی ہیں۔

"ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے" ص۵۴

"جدید نبوت"

جدید نبوت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں!

اس طلسم پیچ و تاب کا ذمہ وار کون ہے! وہ چند روایات جن میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بجسدِ عنصری آسمان پر زندہ ہیں اور قیامت کے قریب دوبارہ نازل ہوں گے۔ ان چند روایات نے آج تک مسلمانوں کے پاؤں کہیں ٹکنے ہی نہیں دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ہر صدی کے اخیر پر ایک مجدد اور پھر ایک "مہدی آخر الزمان" کی آمد سے متعلقہ روایات — مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ایک "آنے والے" کے لیے کھڑکی خود کھول دی۔ لیکن جب کوئی اس کھڑکی کے راستہ اندر آیا تو اس کے ساتھ گتھم گتھا ہونا شروع ہو گئے ص ۵۷، ۵۸، ۵۹

"حقیقت خود ہمارے ہاں کے اربابِ مذہب کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہے ..... ان کے نزدیک بھی "نجات" کا

لہ یاد رہے کہ یہ نگارشات دہلی ہیں ۱۹۴۵ء کی تصنیف ہیں۔ منہ

دارومدار آمین بالجہر و خفی، رفع یدین، فاتحہ خلف الامام، حیات و ممات مسیح کے مسائل پر ہے ص۵۷۶

خزفے بود کہ از ساحل دریا چیدیم — دانۂ گوہر یکتانہ تو داری ورنہ من ص۵۷۷

کنواری سے پیدائش کا عقیدہ کفر ہے

انسائیکلوپیڈیا بیلیکا کے عیسائی مقالہ نگار کا یہ فقرہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔

"اس میں کچھ شک نہیں کہ کنواری سے پیدا ہونے کا عقیدہ ہمیں کفار کے دائرہ میں لے جاتا ہے" ص۵۸۱

فرشتے کی آواز

سورۂ مریم کی آیت ۲۴۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَا کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نیچے کی طرف سے مریم کو فرشتے نے آواز دی" ـــ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اگر یہ آواز کسی فرشتہ کی تھی تو "مِن تحتہا" کے الفاظ کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی ..... فرشتے کی آواز کے لیے جہت کا متعین کرنا ضروری نہ تھا ... ربط مضمون سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ آواز نومولود کی تھی، جسے اللہ تعالیٰ نے طاقت گویائی عطا فرمائی تھی تاکہ حضرت مریم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ یہ بچہ عام بچوں جیسا نہیں ہے (حاشیہ ص۴۹۲

رفع مسیح

پرویز صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ مسیح نہ گرفتار ہوئے نہ صلیب پر چڑھائے گئے۔ وہ کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بکمال حکمت و تدبیر حضرت مسیحؑ کو یہودیوں کی مشوم چال سے محفوظ رکھا اور لعنتی موت کی بجائے عزت و تکریم کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا جو ایک رسول کا صحیح مقام ہے۔

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (۴/۱۵۸) بلکہ اللہ نے اُسے اپنی طرف اٹھا لیا۔

ان تک یہودیوں کا ہاتھ پہنچنے ہی نہیں دیا۔ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ (۵/۱۱۰) (اے عیسیٰ! میں (خدا) نے ان (یہودیوں) کی سازشوں کو ناکام بنا دیا اور تمہیں ان کی دست درازیوں سے محفوظ رکھا... (ترجمہ پرویز)

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ ... الخ (۳/۵۵) ..... اللہ نے فرمایا تھا "اے عیسیٰ! میں تیرا وقت پورا کروں گا، تجھے اپنی طرف اٹھاؤں گا، تیرے منکروں (کی تہمتوں) سے تجھے پاک کر دوں گا ... الخ

... اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ گرفتاری سے پہلے ہی محفوظ کر دیئے گئے تھے ..... معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیوں کی سازش کا علم ہو جانے کے بعد حضرت عیسیٰ بحکم خداوندی خاموشی سے کسی اور مقام کی طرف تشریف لے گئے" ص۵۲۳)

پرویز صاحب کا گمان ہے کہ کسی اور فدائی نے مسیح کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو صلیب کے لیے پیش کر دیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں!

... شاید .... فدائیوں کی اس جماعت نے باہمی مشورے سے، خود اپنے میں سے ایک سچے جانباز کو تیار کر رکھا ہو کہ وہ حضرت مسیحؑ کا بھیس بدل کر اپنے آپ کو، یہود کی سراغ رسی کے بعد جو خود اس تدبیر کا ایک جزو تھی، گرفتار کرا دے، تاکہ دشمن

حضرت مسیح کی تلاش میں سعی و کاوش نہ کریں ... یہ جاں نثار مومن صلیب پر مرا نہیں .... نہ دوسرے مصلوب مجرموں کے ساتھ اسے دفن کیا گیا ص۵۲۴ ... جسے صلیب دی گئی (اور جسے عیسائی اب تک حضرت مسیح ہی خیال کرتے چلے آرہے ہیں) بُری طرح صلیب پر چیخا اور چلایا ... (ایلی ایلی لما سبقتنی - متی ۴۶/۲۷) اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ... یہ کچھ کہنے والا مسیح نہیں ہوسکتا کہ خدا کے ایک برگزیدہ رسول سے یہ نا ممکن ہے کہ وہ اس قسم کی مصیبت اور آزمائش میں ایسا پست ہمت ثابت ہو.... ص۵۲۵

رفع سے مقصود بلندی درجات و عروج مراتب ہوتا ہے ص۵۲۳

وفاتِ مسیح قرآن حکیم کی بہت سی آیات کو جن میں "وفات" کے مشتقات وارد ہوئے ہیں، نقل کرکے پرویز صاحب نتیجہ نکالتے ہیں کہ:-

"جو شخص ان تصریحات (مندرجہ آیات) پر خالی الذہن ہوکر غور کرے گا وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ نزول قرآن کے وقت حضرت عیسیٰؑ کے زندہ ہونے کی تائید قرآن کریم کی نصوص صریحہ سے نہیں ملتی۔ بلکہ اس کے برعکس آپ کے "گذر جانے" اور وفات پاجانے کی شہادت قرآن میں موجود ہے ص۵۲۸

ان تصریحات (مندرجہ آیات) سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اب تک زندہ ہونے کی تائید قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ قرآن کریم آپ کے وفات پاجانے کا ذکر بصراحت کرتا ہے ص۵۲۲

سورۂ نساء کی آیت ۱۵۹ وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (اور دیکھو اہل کتاب میں سے کوئی نہ ہوگا جو اپنی موت سے پہلے اس پر ضرور ہی یقین نہ لے آئے اور قیامت کے دن وہ اللہ کے حضور ان پر شہادت دینے والا ہوگا) ــــ کے متعلق پرویز صاحب لکھتے ہیں:

اس آیت مقدسہ کا صحیح مفہوم ابھی تک سامنے نہیں آسکا۔ یہ آیت قرآن کریم کے مشکل مقامات میں سے ہے، جس کا یقینی مفہوم مزید علمی انکشافات کا منتظر ہے ص۵۸۵ ۱۹۵۳ء

کچھ مدت بعد جب پرویز صاحب کی تصنیف مفہوم القرآن شائع ہوئی تو اس میں غالباً صحیح مفہوم ان کے سامنے منکشف ہوگیا چنانچہ پہلے وہ آیت "شُبِّهَ لَهُمْ" (نساء ۱۵۷) کے متعلق لکھتے ہیں "ان (یہود) پر اصل بات مشتبہ ہوکر رہ گئی" ــــ حاشیے پر اس کی شرح کرتے ہیں کہ "حضرت عیسیٰؑ ان کے ہاتھ ہی نہیں آئے تھے" ــــ آگے بڑھ کر "مشکل مقام" والی آیت کا مفہوم یہ لکھتے ہیں:-

اور عیسائیوں کا تو یہ عالم ہے کہ (باوجودیکہ حقیقت حال کا انہیں بھی یقینی طور پر علم نہیں) وہ مسیح کے صلیب پر جان دینے اور اس طرح ان کے گناہوں کا کفارہ بن جانے پر ایسا محکم یقین رکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی موت کے وقت اسی کا اقرار کرتا ہے (خود پادری آکر اس سے کفارہ پر ایمان کا اقرار کرالیتا ہے)۔ لیکن جب یہ لوگ مسیح کے کفارہ پر ایمان کی بنا پر اپنی بخشش کے لیے خدا

ص۱ جزو اول ۱۹۶۱ء میں طبع ہوا۔ اور سطور زیر نظر جزو ۵ سے ماخوذ ہیں یعنی اس سے چند ماہ بعد منہ

کے حضور جائیں گے تو خود مسیح ان کے خلاف شہادت دیں گے کہ انہوں نے ان سے اس قسم کے عقائد رکھنے کا نہیں کہا تھا۔ یہ عقائد سب ان کے وضع کردہ ہیں۔۔۔ اس کے بعد پرویز صاحب نے سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۶ اور ۱۱۷ کا حوالہ دیا ہے۔ جہاں اللہ تعالٰے مسیحؑ سے استفسار فرماتا ہے۔

"اے عیسٰی ابن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ "مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود ٹھہرا لو"، تو وہ ان لوگوں کے خلاف شہادت دیتے ہیں کہ میں نے کوئی ناحق بات ان سے نہیں کہی تھی۔ آپ تعؐ کے حکم کے مطابق صرف آپؐ کی بندگی کی تبلیغ کی اور اپنی وفات تک میں ان پر شہید (نگراں) رہا۔ بعد کا حال آپ تعؐ کو معلوم ہے۔

اب اس ضمن میں سورۂ زخرف کی آیت ۶۱ رہ گئی، جس سے مسیح کی آمد ثانی ثابت کی جاتی ہے۔ اس مقام کا مرکزی نقطہ یہ الفاظ ہیں ـــــ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ "یعنی حضرت عیسٰی "الساعت" کی نشانی تھے۔ پرویز اس کو عام مفسرین کے خلاف ماضی میں گزری ہوئی گھڑی کہتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یسوع نے ہیکل سے نکلتے ہوئے شاگردوں کو اس کی عمارتوں کے بارے میں کہا۔

۔۔۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے گا (متی ۲۴-۲) اس طرح ڈیڑھ ہزار برس کے گہوارہ عروج و زوال کے بعد بنی اسرائیل کا نام زندہ قوموں کی فہرست سے مٹ گیا۔۔۔۔

یہ انقلاب بنی اسرائیل کے لیے قیامت سے کم نہ تھا کہ ایسی عظیم الشان قوم کا اس طرح مٹ جانا، قیامت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی وہ الساعۃ (موت کی گھڑی) تھی۔ جس کے لیے حضرت عیسٰیؑ کو بطور نشانی بھیجا گیا تھا وَاِنَّهٗ لعلم للساعۃ (۴۳-۶۱) اور گھڑی اس طرح سر پہ آ پہنچی کہ انہیں خبر تک بھی نہ ہوئی۔ (ص ۵۲۹ و ۵۳۰ معارف القرآن ج ۲)

معجزاتِ مسیحؑ خواجہ احمد الدین کی نظر میں

خواجہ صاحب معجزاتِ مسیحؑ کے متعلق تمہیداً فرماتے ہیں کہ "قوانینِ قدرت، الٰہی سُنتیں ہیں، جن میں تبدیلی ناممکن ہے" اس دعویٰ کے ثبوت میں آیت ذیل پیش کرتے ہیں۔

كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ (رعد - ۱۴)

اگر کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے تاکہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے، تو ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

ہر کام اپنے ذریعے ہی سے ہوسکتا ہے۔ ایسے خوارق جن سے قوانینِ قدرت کا توڑنا لازم آئے یا سنت اللہ بدل جائے، کبھی واقع نہیں ہوسکتے۔ اگر تمام طبعی اثرات، اوزان اور مقادیر خاص حالات میں معینہ طرز پہ کام نہیں دیں گے تو تمام علوم اور تجربات ناقابلِ اعتماد ہو جائیں گے۔ کوئی بات ثابت نہ ہوسکے گی اور نہ ہی کوئی سوال حل کیا جاسکے گا۔

اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں :-

صلیب کے وقت حضرت مسیحؑ کی زندگی نہایت کم زور اور قابلِ رحم تھی۔ مذہب داروں نے اس بے بسی کی زندگی کو بڑے بڑے معجزات سے بھرپور کر رکھا ہے۔ ان فوق الفطرت عجائبات کا اثر نہ تو قبل صلیب کے زمانے میں کہیں نظر آتا ہے اور نہ عملاً کوئی معجزہ آج تک چلا آیا ہے۔ (جیسے کہ قرآن ایک عظیم معجزہ ہے جو عملاً آج تک چلا آرہا ہے اور ہمیشہ تک قائم رہے گا (ناقل)) اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کے اخیر میں حضرت مریمؑ و عیسیٰؑ پر جو انعام یاد دلائے ہیں۔ ان میں یہ انعام بالکل مذکور نہیں ہوا کہ "آسمان پر چڑھ جائے گا۔ مدتوں تک زندہ رہے گا اور زمین میں پھر واپس آئے گا" وغیرہ وغیرہ

آسمانی مائدہ

بلکہ ان انعامات میں آخری انعام یہ بتایا ہے کہ (تمام نبیوں کے معجزات سے بڑھ کر حیرت انگیز معجزات دیکھنے کے باوجود[1]) حواری بھی تجھ پر ایمان نہ لاسکے، جب تک ہم (خدا) نے ان کے دل میں تجھ پر ایمان لانے کی وحی نہ کی۔ حواریوں نے حضرت مسیحؑ سے ایک نشان مانگا کہ "کیا تیرا رب آسمان سے ایک خوان نعمت اتار سکتا ہے؟" (مائدہ ۱۱۲) اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے کوئی معجزہ نہیں دیکھا تھا۔ اگر وہ دیکھتے کہ مسیح کے پھونک مارنے سے مٹی میں باذن الٰہی جان پڑ سکتی ہے، اگر وہ مادر زاد اندھوں کو بینائی ملتی دیکھتے، اگر ان کے سامنے مُردوں کو دنیا میں واپس لایا جاتا، تو کیا وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ

---

[1] ناقل

"کیا تیرا رب آسمان سے ایک خوانِ نعمت اتار سکتا ہے؟"
حواریوں کے مطالبے میں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ جب مسیحؑ نے ان کو ایسے خوارق کی طلب سے باز رکھنے کے لیے ڈرایا قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ تو وہ اور زیادہ مُصر ہوئے اور اپنے چار مقاصد بیان کیے۔ قَالُوْا نُرِیْدُ اَنْ نَّاْکُلَ مِنْهَا ___ وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا ___ وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ (مائدہ ۵-۱۱۳)
اول: حصولِ خوراک۔ دوم: اطمینانِ قلوب۔ سوم: صداقتِ مسیحؑ کی جانچ ___ چہارم: عینی شہادت۔
اگر وہ مذکورہ بالا معجزات دیکھ چکے ہوتے، تو کیا ایسی باتیں کہہ سکتے تھے، خصوصاً مسیحؑ کے سچا نبی ہونے کے متعلق تسلی حاصل کرنا۔
اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس وقت تک کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی تھی۔ جس سے مسیحؑ کا سچا رسول ہونا ثابت ہو۔
مسیح علیہ السلام نے بھی ان کے آسمانی خوان مانگنے کے جواب میں یہ یاد نہیں دلایا کہ تم میرے سابقہ معجزات دیکھ چکے ہو:

۱۔ میں بغیر باپ کے پیدا ہوا ہوں۔
۲۔ میرا بچپن تمام بچوں سے قطعی مختلف قسم تھا۔
۳۔ میں مٹی کے کھلونوں میں پھونک مار کر ان کو زندہ کر دیتا تھا۔
۴۔ میں اب بھی مدتوں کے مرے ہوؤں کو زندہ کر سکتا ہوں۔
۵۔ میں غیب کی خبریں دے کر تمہیں قائل کر سکتا ہوں (وغیرہ وغیرہ)

کیا تم میرے ان تمام معجزات کے شاہد نہیں؟ کیا تمہیں ان کے وقوع میں شک ہے؟ کیا تم "مائدہ" اُترتا ہوا دیکھ کر ہی شاہد بنو گے؟ اور مجھے سچا رسول سمجھنے لگو گے۔ جیسا کہ تم کہتے ہو "نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ (مائدہ ۱۱۳)
اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے مطالبہ مائدہ پہ نہیں فرمایا کہ میں نے آج تک مسیحؑ کے ہاتھوں پہ جو معجزے ظاہر کیے کیا وہ سب بے کار تھے؟ کیا ان سے مسیح کی صداقت کا ثبوت نہیں ملتا تھا؟
ان تصریحات سے صاف ظاہر ہے کہ مسیح نے کوئی خلافِ فطرت خارق دکھایا ہی نہیں تھا۔ جس سے دیکھنے والے مرعوب ہو کر سچے مومن بن جاتے ___ اسی بیان کے آخر میں خارق کی ایک خوفناک شرط بیان کی گئی ہے۔ قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (مائدہ ۔ ۱۱۵) اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تم ایسے خوارق کے ذریعے سے ایمان لانے کے نقصان کو سمجھ کر سوال کرتے ہو، تو (میں اُسے تم پہ اتارنے والا ہوں، (سنو! اس میں نقصان یہ ہے کہ اگر میں نے اُسے (یعنی مائدہ کو) اتار دیا تو) پھر جو کوئی تم میں سے (جو ایسے خوارق کو دیکھنے والے ہوں گے) بعد کو کفر کرے گا، تو میں اسے وہ عذاب کروں گا، جیسے میں جہان والوں میں سے کسی کو نہیں کیا کرتا (اس نقصان کو سمجھ کر مسیحؑ اور حواری ایسے نشان مانگنے سے باز آگئے ..... الخ (تفسیری ترجمہ خواجہ احمد الدین۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ انبیاء کے زمانوں میں بھی کسی قوم کو بذریعہ خوارق ایمان لانے پہ مجبور نہیں کیا گیا، کیوں کہ خوارق

کے بعد کفر ایسے عذاب کو مستلزم ہے، جو کبھی دنیا میں واقع نہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر شخص کو ایسے عذاب سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔

خلق طیر وغیرہ کی حقیقت

اِنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (آل عمران۔ ۴۸، ۴۹)

تفسیر و ترجمہ خواجہ صاحب ـــ یہود سخت متعصب تھے۔ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی خاص قوم اور دوسروں کو جہنم کا ایندھن سمجھتے تھے۔ ان کی طبائع دوسرے انسانوں سے منقبض رہتی تھیں۔ انجیل نے ان میں (جو ایمان لائے) قوت پرواز پیدا کی اور اعلیٰ خیالات پیدا کئے۔ اگر کوئی شخص خوب کمائی ہوئی اور خوب گوندھی ہوئی مٹی سے پرندے کا ایک پتلا اور بڑا ڈھانچ تیار کرے، اور اس میں کوئی ہلکی سی گیس نفخ کردے، تو وہ ڈھانچ اڑنے لگ جاتا ہے پھر کیا انسان میں پاک روح (تعلیم) کے نفخ سے قوت پرواز پیدا نہیں ہوگی؟

(وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ۔ حشر۔ ۲۲)

قرآن سے ثابت ہے کہ آیات کے ذریعے انسان میں قوت پرواز پیدا ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْۤ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا ...... الخ (اعراف ۶)) لوگوں کو اس شخص کا حال سنادے جس کو ہم نے اپنی آیات دی تھیں۔ اس نے ان کی قدر نہ کی اور شیطان کے پیچھے لگ گیا اور گمراہ ہوگیا، اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعے اس کو بلندی بخشتے .... الخ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نیک عمل انسان کو عظمت و بلندی کے مرتبے پر پہنچا دیتا ہے وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ (فاطر۔ ۱۰)

اس تمہید کے بعد تفسیر ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

مسیح فرماتے ہیں۔ بلاشبہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک آیت لایا ہوں (یہ آیت یا حکم خالق و مخلوق کے ساتھ محبت کرنے کے متعلق تھا یہ محبت انجیل پر عمل کرنے والوں کا خاص نشان تھی۔ وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً (حدید۔ ۲۷) اور ہم نے اس کے پیروؤں کے دلوں میں نرمی اور مہربانی ڈال دی تھی ـــ یہ جواب تھا یہود کی سنگ دلی اور تعصب کا ـــ اب اس آیت رافت و رحمت کی تشریح فرماتے ہیں ـــ بلاشبہ میں تمہیں علو و ترقی دینے کے لیے) تمہاری طین (مٹی)، سے (الطین میں الف لام عوض مضاف الیہ ہے یعنی "طینکم" انسان طین ہی کی پیدائش ہے اس سے اس کی گری ہوئی مادی حالت ظاہر ہوتی ہے)، تمہارے لیے ایک ایسی کیفیت پیدا کرتا ہوں جو پرندے کے حال کے مانند ہوتی ہے (جس طرح پرندہ انڈے میں ایک بے بال و پر صورت حاصل کرلیتا ہے جو اڑ نہیں سکتی۔ لیکن اس میں اڑنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح میں تم کو تعلیم کے ذریعے بلند پروازی کا شوق دلاتا ہوں) پھر اس (مستعد قابل مٹی) میں میں (محبت کو درجہ بدرجہ) نفخ کرتا ہوں پھر وہ اللہ کے حکم کے مطابق (روحانی طور پر) بلند پرواز ہو جاتی ہے۔ اور (یہود سوختنی قربانی کو خدا تعالیٰ کی غذا سمجھتے تھے اور ان کے احبار ناقص

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

، لخلقت اندھے کانے وغیرہ لوگوں کے ذریعے سے رسوم عبادت وقربانی وغیرہ کا بجالانا جائز جانتے تھے۔ ان کو جماعت سے بھی الگ رکھتے تھے۔ پھر جب بھی کوئی شخص جسمانی عیب یا مرض سے نجات پاتا تو جماعت وعبادت میں شامل ہونے کے لیے اس پر کفاروں کا سخت بوجھ ڈال دیتے۔ جب تک وہ ان مذہبی قرضوں کو ادا نہ کر دیتا اپنے اندر اسے شامل نہ کرتے۔ مسیحؑ نے ان قیود کو اٹھا دیا، جیسا کہ ان کا ارشاد ہے کہ) میں مادر زاد اندھے اور پھلبہری والے کو پاک ٹھہراتا ہوں (اور کفّارے کی بوجھل رسم سے بری قرار دیتا ہوں) اور (یوں تمہارے) مُردوں کو اذن الٰہی کے مطابق زندگی[1] بخشتا ہوں اور تمہیں اُمیّوں کے ناجائز مال کھانے سے روکتا ہوں اور (تمہیں اس (مال) کے متعلق خبردار کرتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو (کہ وہ جائز ذرائع سے حاصل نہیں کیا جاتا) بلاشبہ تمہارے لیے (میری ان باتوں) میں (رحمت ورأفت کا) ایک نشان ہے۔ بشرطیکہ تم ایمان دار ہو ورنہ پتھر دل کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے)

لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا

جب حضرت مریمؑ اپنی ماں کے پیٹ میں تھیں، تو انہوں نے نذر مانی کہ اپنے پیدا ہونے والے بچے کو پروردگار (ہیکل) کی نذر کریں گی۔ لیکن ان کی خواہش کے خلاف جب لڑکی پیدا ہوئی تو انہوں نے عرض کیا کہ "میرے رب میں نے لڑکی کو جنا ہے" یعنی لڑکی مردوں کی طرح دینی خدمات کی مشقت برداشت نہیں کر سکتی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا تبصرہ یہ ہے کہ عاجزوں کی خدمت اور بیماروں کی تیمارداری میں) لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا۔ (لَيْسَ الذَّكَرُ

---

[1] مائدہ ۱۱۰ میں اللہ تعالیٰ مسیحؑ کو مخاطب کرکے اپنی نعمت یاد دلاتا ہے۔ اس میں یہی باتیں، خلق طیر وغیرہ دہرائی گئی ہیں۔ لیکن ترجمے میں تبدیلی آگئی ہے ملاحظہ فرمائیے۔ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ۔ جب کہ تو اپنی طین سے (کیونکہ انسان طین ہی سے پیدا ہوتا آیا ہے) میرے اذن (وقاعدہ) کے مطابق ایسی کیفیت پیدا کرتا تھا، جو اڑنے کی حالت کی مانند ہوتی تھی (یعنی پہلے تجھ میں اڑنے کی استعداد جیسی پیدا ہو جاتی تھی۔ تمام بشروں کے آئندہ ترقیات کرنے کا یہی قاعدہ رہا ہے) پھر تو اس (تیار شدہ کیفیت) میں (شوق ومحبت الٰہی کو) نفخ کرتا تھا تو تو (خود) اڑنے والا بن جاتا تھا (اور اگر اذن الٰہی ہوتا تو دوسرے لوگوں کی بھی اسی طرح تکمیل کرتا اور انہیں ادنیٰ سے اعلیٰ بنانا چاہتا تھا) بیان للناس۔ منزل ۲ صـ۹۱ ہمارے مترجمین فَتَنْفُخُ کا فاعل مسیحؑ اور "تکون طیرا" کا فاعل بصیغہ واحد مونث غائب "الطین کھیئۃ الطیر" قرار دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب اس کو فَتَنْفُخُ کے ساتھ ملا کر بصیغہ واحد مذکر مخاطب مسیحؑ ہی کو مخاطب بناتے ہیں۔ گرامر کی رو سے دونوں درست ہیں، لیکن حقیقت کیا ہے؟ اتفاق واجماع واحد مونث غائب ہی پر ہے واللہ اعلم بالصواب۔ (حاشیہ صفحہ ہٰذا)

[2] سورۂ مائدہ کی آیت۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا۔۔۔ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا جس شخص نے کسی جان کو بلا وجہ مار ڈالا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا اور جو کوئی کسی شخص کو زندہ کرے (کسی سخت بیماری یا سخت مصیبت وغیرہ سے رہائی دے) تو اس (رحم ودرد) نے کُل آدمیوں کو زندگی بخشی (زندہ کرنا اس معنی کے لحاظ سے تمام انسانوں پر لگ سکتا ہے مسیح علیہ السلام کی کوئی الگ خصوصیت نہیں) بیان للناس منزل دوم صـ۳۷

كَافِلُهَا زَكَرِيَّا ۔ آل عمران ۔ ۳۷)

رزق مریم

اللہ تعالیٰ نے مریمؑ کو حسنِ سیرت کے ساتھ حسنِ صورت سے بھی نوازا تھا (اَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۔ آل عمران ۔ ۳۷) اس وجہ سے زکریاؑ خاص طور پر اس کی حفاظت و نگرانی کرتے تھے۔ لیکن وہ ضرورتاً ہیکل سے باہر جاتے، تو بعض ہوس پیشہ مجاوران سے چوری چھپے مریمؑ کو عمدہ عمدہ کھانے دے جاتے۔ حضرت زکریا ایسے لوگوں سے پہلے ہی خائف تھے (اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ ۔ مریم ۔ ۵) اسی وجہ سے انہوں نے ایسے بیٹے کے لیے دعا کی تھی، جو پرہیزگار ہو اور ان کے بعد ہیکل کی تولیت کا حق ادا کر سکے: فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا (ایضاً) [1]

زکریا جب (بھی) اپنی محراب (حجرۂ امام) میں اس (مریمؑ) کے پاس آتے، تو اس کے پاس کچھ رزق پاتے، تو پوچھتے کہ اے مریم یہ تجھے کہاں سے ملا ہے؟ وہ (بھولی اور نیک لڑکی) جواب دیتی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے (اس تعالیٰ کی مہربانی سے) پہنچتا ہے۔ بلاشبہ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔ (اس قسم کی روزی بار بار دیکھ کر انہیں اپنے موالی کی طرف سے خوف پیدا ہوا کہ اس غریب خانے کے وارث ایسے شریر لوگ ہوں گے۔ اسی وجہ سے انہیں بیٹے کے لیے دعا مانگنے کی ضرورت محسوس ہوئی) چنانچہ زکریا نے اپنے رب کو پکارا کہ اے میرے رب مجھے اپنے پاس سے پاک اولاد عطا فرما۔ بے شک تو دعا سننے والا ہے (آل عمران ۳۷ تا ۳۸)

"حصور" کا مطلب

حضرت زکریا کی دعا قبول ہوئی۔ چنانچہ ان کو فرشتوں نے آواز دی کہ "اللہ تعالیٰ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کلمہ (یا وعدہ) کی تصدیق کرنے والا، سردار، حصور (غیر عورتوں سے بچنے والا) نبی اور نیکوکار ہوگا ــــ یاد رہے کہ "حصور" کے معنی عام طور پر راہب کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ترجمہ شیخ الہند میں ہے "عورت کے پاس نہ جائے گا"، اور مولانا عثمانی لکھتے ہیں "تمام دنیوی مشاغل اور قید نکاح وغیرہ سے آزاد رہ کر ہمیشہ خدا کی عبادت اور کلیسا کی خدمت میں لگا رہے گا"۔ (دیکھئے آیہ زیرِ نظر)

خواجہ صاحب کسی بھی رسول کو رہبانیت کا نمائندہ تسلیم نہیں کرتے۔ جیسا کہ آیہ ذیل سے صراحتاً ثابت ہے: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّیَّةً (رعد ۔ ۳۸) ہم نے تجھ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ان کے لیے بیویاں اور اولاد بنائی ــــ لہٰذا حضرت یحییٰ یا کوئی بھی اور رسول اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

پرویز صاحب نے "حصور" کے معنی "صاحب نظم و ضبط" کئے ہیں (ص ۱۲۷ مفہوم القرآن)

---

[1] حضرت زکریا نے اپنے ہاں اولاد نہ ہونے کی دو رکاوٹیں ظاہر کیں۔ اول اپنا بڑھاپا۔ دوم بیوی کا بانجھ پن۔ اللہ تعالیٰ نے بیوی کو شفا بخشی اور ان کو توانائی۔ جیسا کہ فرمایا اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ۔ اصلاح کا مطلب ہے کہ مرض دور ہو گیا۔ زکریا نے نشان مانگا، تو فرمایا، اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (مریم ۔ ۱۰) تو صحت مند ہو کر تین شب (و روز) لوگوں سے کلام نہیں کرے گا، یعنی شکر گزاری میں محو ہو کر دنیوی باتوں میں شامل نہیں ہوگا۔ بعض اوقات سست بوڑھے آدمیوں میں خواہش کی رو پیدا ہو جاتی ہے جس سے اولاد ہونے کا امکان ہو جاتا ہے۔ منزل چہارم صـ ۱۳۵

سر سید اور رزق مریمؑ

قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۔ اس امر کی نسبت مفسرین نے عجیب عجیب روائتیں نقل کی ہیں حالانکہ یہ کوئی عجیب بات نہیں یہ تو روزمرہ کے محاورے کی بات ہے۔ ابوعلی جبائی (بحوالہ تفسیر کبیر) نے لکھا ہے۔ خدا تعالیٰ ایمان والوں کے ہاتھ سے جو زاہد و عابد عورتوں کی خبر گیری کرتے تھے، حضرت مریم کو رزق پہنچاتا تھا (تلخیص از ص ۱۸ و ۱۹ جلد دوم تفسیر القرآن)

محمد علی اور تذکرہ مریمؑ

لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى : محمد علی کہتے ہیں کہ الذکر اور الانثیٰ میں لام عہد کا ہے یعنی وہ لڑکا جیسے تو چاہتی ہے، اس لڑکی جیسا نہیں ہے ـــــ وہ تو صرف ایسا لڑکا چاہتی تھی جس کی زندگی خدمت دین کے لیے وقف ہو اور یہ معمولی خواہش تھی ... خادم دین لڑکے ہر حیثیت کے ہو سکتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ایک بہت بلند مرتبہ لڑکی عطا فرمائی جسے اس زمانے کی ساری عورتوں پر بلند مرتبہ دیا جیسے " وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ " سے ظاہر ہے (ص ۲۹۴ ج ۱)

محمد علی اور رزق مریمؑ

مفسرین کہتے ہیں کہ فاكهة الصيف في الشتاء و فاكهة الشتاء في الصيف۔ گرمی کے پھل سردی میں اور سردی کے پھل گرمی میں ـــ اور یہ بھی لکھا ہے کہ زکریا اس (مریمؑ) پر سات دروازوں پر قفل لگایا کرتے تھے۔ ان قفلوں میں تو معمولی پھلوں کا پہنچنا بھی اعجاز تھا خلاف موسم بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور مجاہد سے روایت ہے کہ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا اے عِلْمًا او قال صحفاً فيها علم (ابن کثیر) رزق سے مراد یہاں علم یا صحیفے ہیں، جن میں علم تھا (۲۹۸ ج ۱)

جب زکریاؑ نے پوچھا کہ یہ رزق تجھے کہاں سے ملا؟ تو مریم نے جواب دیا " مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ " اللہ کے پاس سے۔ یعنی یہ چیزیں اللہ کے حکم سے پہنچتی ہیں۔ مفسرین کا خیال ہے بلا واسطہ بشر پہنچتی تھی حالانکہ ہر چیز کے متعلق ارشاد ہے " كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (النساء - ۷۸) سب کچھ اللہ ہی کے پاس سے آتا ہے مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (آل عمران - ۱۲۵) حالانکہ نصرت اسباب کے ساتھ آتی ہے۔ اگر مسلمان قتال نہ کرتے اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں کی طرح انکار کر دیتے تو یہ نصرت بھی نہ ملتی۔ پس بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ ہر چیز مِنْ عِنْدِ اللّٰه ہی ہے۔

مریم کو بے موسم کے پھل پہنچ جانا، نہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہ رسول اللہ نے ظاہری الفاظ سے اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ مریم کے پاس کچھ رزق پہنچ جاتا تھا۔ ممکن ہے زائرین پہنچاتے ہوں۔ جیسا کہ دستور ہے، جو لوگ خلوت نشینی اختیار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں ڈال کر انکو پہنچا دیتا ہے ـــــ اللہ والے سب کچھ اللہ کی طرف سے سمجھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم تو یہاں تک فرماتے ہیں وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ (شعراء - ۷۹) وہ اللہ ہے جو مجھے کھانا کھلاتا ہے اور پانی پلاتا ہے۔ حالانکہ اپنے ہاتھ سے کھاتے اور پیتے تھے۔ ص ۲۹۹

پرویز اور تذکرہ مریم

لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى (آل عمران - ۳۵) خدا کو خوب معلوم تھا کہ اس (والدہ مریم) کے ہاں جو لڑکی پیدا ہوئی تھی، وہ کن خوبیوں کی مالک تھی، اور اسے آگے چل کر خانقاہیت کی غیر خداوندی قیود کو توڑنے میں کتنے بڑے انقلاب کا موجب بننا تھا۔ مفہوم القرآن - ص ۱۲۶

راہبات کی شادی ہیکل کے پیشواؤں کی جماعت کے اندر ہو سکتی تھی .... حضرت مریم نے اسی (غیر خداوندی) رسم خانقاہیت کو توڑا تھا (حاشیہ ایضاً)

پرویز اور رزق مریم مریم اپنے زہد و ریاضت کی بنا پر اس درجہ مرجع انام بن گئی کہ اس کے پاس نذر نیاز کی چیزیں آنی شروع ہو گئیں۔ چنانچہ جب کبھی زکریا عبادت گاہ (قربان گاہ) میں آتا تو مریم کے پاس کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھتا۔ وہ (بربنائے احتیاط) پوچھتا کہ اے مریم! تجھے یہ چیزیں کہاں سے ملتی ہیں؟ وہ اس کے جواب میں کہہ دیتیں کہ (انہیں یہ چیزیں ہیکل کا کوئی آدمی نہیں دیتا بلکہ) یہ اللہ کی طرف سے آجاتی ہیں (یعنی جو لوگ اللہ کی نذریں مانتے ہیں، وہ دے جاتے ہیں) ۳۷ ایضاً۔

اصطفائے مریم خواجہ احمدالدین۔ آیہ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ .... (آل عمران-۴۲) کی شرح میں لکھتے ہیں ـــــ اے مریم بلاشبہ اللہ نے تجھ کو (تیرے دلی اخلاص کے سبب) چن لیا اور (ان شیاطین مجاوروں) سے بچا کر ان کی پہنچ سے) تجھ کو پاک کیا (وَطَهَّرَكِ) یعنی چھڑایا اور تجھے تمام عورتوں کے لیے نمونہ بنانے کو (تمام قوموں کی عورتوں پر منتخب کرلیا۔ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ)

دوبارہ کفالت مریم حضرت مریم کے بچپن میں حضرت زکریا قرعہ اندازی کے بغیر ہی امام ہونے کی وجہ سے اس کے کفیل بنے تھے، لیکن جس قرعہ اندازی کا ذکر یہاں آیا ہے وہ بالغ ہونے کے بعد واقع ہوئی تھی۔ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ (آل عمران-۴۴) ہر مجاور چاہتا تھا کہ میں ہی مریم کا کفیل (شوہر) بنوں اور اپنی شیطنت کا اس کو شکار بناؤں۔ حضرت یحییٰؑ اس وقت صبی (بچے) تھے۔ مجاوروں نے اس وقت سے فائدہ اٹھانا چاہا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مریم کو ان کے شر سے بچالیا۔

یہ بات پوشیدہ خبروں میں سے ہے ہم (اللہ) اسے تیری طرف وحی کرتے ہیں، تو ان مجاوروں کے پاس نہیں تھا جب وہ (بطور قرعہ اندازی ایک برتن میں) اپنے قلم ڈالتے تھے کہ ان میں سے کون مریم کا سرپرست بنے (منشاء یہ تھا کہ کوئی شخص اس برتن سے چپکے سے قلم کو نکال لائے اور جس کا نام اس پر ہو وہی مریم کا کفیل بنے وہ خود ہی اس فیصلے پر راضی نہ ہو سکے اور لگے آپس میں جھگڑنے۔ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ (ایضاً-۴۴)

خلق طیر وغیرہ محمد علی کی نظر میں

اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَهَیۡـَٔةِ الطَّیۡرِ (آلِ عمران ۔ ۴۹) مولوی محمد علی کی تحقیق یہ ہے کہ خلق کے مختلف معنی ہیں ۔ (بقول راغب) پیدا کرنا، اندازہ کرنا، جھوٹ گھڑنا ۔ انہوں نے آیات سے تینوں معانی کے ثبوت دیئے ہیں مثلاً خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ (فرقان ۔ ۲) ہر شے کو پیدا کیا ۔ اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ (مومنون ۔ ۱۴) یعنی احسن المقدرین ۔ سب اندازہ کرنے والوں سے بہتر اندازہ کرنے والا تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡکًا (العنکبوت ۔ ۱۸) تم جھوٹ گھڑ لیتے ہو ۔

خلق کا لفظ پیدا کرنے کے معنی میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے پر بولنا جائز نہیں بیضاوی نے قول مسیح اَخۡلُقُ لَکُمۡ کے معنی کئے ہیں اقدر لکم (اندازہ کرتا ہوں تمہارے لیے) اور یہی درست ہیں ص۳۱ قرآن میں بار بار ایسی آیات آئی ۔ اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَکَآءَ خَلَقُوۡا کَخَلۡقِهٖ (الرعد ۔ ۱۶) کیا انہوں نے اللہ کے شریک ٹھہرالئے ہیں ۔ جو اسی کی طرح خالق ہیں ؟ وَالَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡـًٔا وَّهُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ (النحل ۔ ۲۰) اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کے خالق نہیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں ص۹۱ (مسیح سمیت)

اگر کہا جائے کہ مسیح خدا کے اذن سے "خالق طیر" تھے، تو اس لیے قابلِ تسلیم نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے خلاف اذن نہیں دیتا اور کسی مخلوق کو اپنی کسی خاص صفت میں شریک نہیں کرتا ۔ اگر ایسا ہو سکے تو یہ اپنی صفت ہی کو باطل کرنا ہوگا ۔

اصل بات یہ ہے کہ مسیح کے کلام میں مجاز، استعارہ اور تمثیل سے بہت کام لیا گیا ہے ۔ شاگردوں نے اس پر اعتراض بھی کیا تھا کہ ـــــ "آپ تمثیلوں میں لوگوں سے باتیں کرتے ہیں ۔ جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں" تو مسیح نے کہا ـــــ "اس لیے میں ان سے تمثیلوں میں بات کرتا ہوں کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے ۔ اور سنتے ہوئے نہیں سنتے" (متی ۔ ۱۳ ۔ ۱۳) حالاں کہ یہ بھی تمثیل ہی ہے ۔ پھر لکھا ہے کہ "یہ سب باتیں یسوع نے ان جماعتوں کو تمثیلوں میں کہیں اور بے تمثیل ان سے نہ بولتا تھا ۔ ۔ ۔ (متی ۱۳ ۔ ۳۴ ۔ ۳۵)

قرآن مجید اور کتب مقدسہ میں مجاز کا استعمال اکثر جسمانیات سے روحانیت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ہوا ہے ۔ مثلاً اندھوں اور بہروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو چشم و گوش سے کام نہیں لیتے ۔ تاریکی سے مراد جہالت ہے، دن اور روشنی سے نور ایمان مقصود ہے ۔ چار پالوں سے کسی قوم کی مشابہت، عقل و فہم سے کام نہ لینا مراد ہے کسی کو گدھا کہا تو مراد یہ ہے کہ عالم بے عمل ہے ۔ اسی طرح طیر پرواز کی وجہ سے دوسرے جانوروں سے ممتاز ہے ۔ جب کسی نبی کے کلام میں اس کا استعمال ہو، تو اس سے ایسے لوگ مراد ہوں گے، جو زمینی اور سفلی خواہشات سے اوپر اٹھ کر خدا کی طرف پرواز کر سکیں ۔ اس کے مقابلے میں اَخۡلَدَ اِلَی الۡاَرۡضِ (اعراف ۔ ۱۷۶) (زمین کی طرف جھک گیا) سے ایسا شخص مراد ہے، جس نے پست خواہشوں کو اپنا نصب العین ٹھہرالیا یہ بات بآسانی سمجھی جاسکتی ہے

کرنبی کے نفخ سے انسان زمینی خیالات کو ترک کرکے عالم روحانیت میں پرواز کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ احادیث میں شہداء کو جو اعلیٰ سے اعلیٰ مقام روحانیت پر پہنچ چکے ہیں، طیر یعنی پرندوں سے مشابہت دی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وہ بہشت میں سبز پرندوں کی شکل میں پھر رہے ہیں" ارواح الشهداء فی اجواف طیر خضر" یعنی شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں (صحیح مسلم) "ارواح الشهداء عند الله کطیر خضر" یعنی شہیدوں کی روحیں اللہ تعالیٰ کے ہاں سبز پرندوں کی طرح ہیں۔ ابن ماجہ بعض روایات میں شہید روحوں کو سبز اور بعض میں سفید پرندے کہا گیا ہے۔

پس احادیث کی روشنی میں طیر مسیح سے مراد شہداء کی قسم کے لوگ ہیں یعنی وہ لوگ جو عالم روحانیت میں پرواز کرنے والے ہوں یا سفلی تعلقات سے بلند ہوکر پرواز کرتے ہوں۔

طین کا لفظ استعارہ کے رنگ میں فرماں برداری کو چاہتا ہے طینی مخلوق میں اطاعت کی استعداد زیادہ ہے۔ اب کلام مسیح اِنِّیْۤ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَهَیْـٴَةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِ اللّٰهِ سے استعارہ کے رنگ میں یہ مراد ہوئی کہ حضرت مسیح طین کی استعداد والوں کو طیر کی ہیئت پر اندازہ کرتے ہیں اور ان کے اندر بلند خیال پیدا کرنے کی تجویز کرتے ہیں۔ اور زمین سے ان کے تعلقات کم کرنا چاہتے ہیں۔ پس وہ ان کے اندر روحانی نفخ کرتے ہیں۔ کیونکہ نبی روحانی نفخ ہی کے لیے آتے ہیں اور اس سے قابل استعدادوں کو اعلیٰ مقام پر پہنچا دیتے ہیں ص۲۲

اکمہ۔ اندھا وغیرہ

وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران۔ ۴۹) اور اللہ کے حکم سے شب کور اور پھلبہری والے کو اچھا کرتا ہوں اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں۔ (ترجمہ محمد علی)

اکمہ وہ ہے جو دن کو دیکھتا ہے اور رات کو نہیں دیکھتا (لسان العرب) روحانی رنگ میں ایسے لوگ جو سورج کی تیز روشنی میں تو حق کو دیکھ لیتے ہیں۔ مگر ذرا سی مشکلات پیش آتی ہیں تو کچھ نہیں دیکھتے۔

ابرص: برص والا

برص اس سفیدی کو کہتے ہیں جو جسم میں نمودار ہوتی ہے۔ جسے پھلبہری کہا جاتا ہے۔ اور روحانی رنگ میں ایسی بدی جو ظاہر میں نیکی معلوم ہو۔

انجیل روحانی امراض کے لیے نازل ہوئی تھی، نہ کہ جسمانی عوارض کے علاج کے لیے۔ جیسا کہ مسیح خود فرماتے ہیں۔

"اس قوم کا دل موٹا ہوا اور وے اپنے کانوں سے اونچا سنتے ہیں اور انہوں نے اپنی آنکھیں موند لی ہیں تا ایسا نہ ہووے کہ وے آنکھوں سے دیکھیں اور کانوں سے سنیں اور دل سے سمجھیں اور رجوع لاویں اور میں انہیں چنگا کروں (متی۔ ۱۳۔ ۱۵)

مزید فرماتے ہیں بھلے چنگوں کو حکیم درکار نہیں، بلکہ بیماروں کو (متی۔ ۹۔ ۱۲) اس سے مراد روحانی طبیب، روحانی صحت اور روحانی بیماروں کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی ــــ یوحنا نے دو آدمی مسیح کی دریافت کے لیے بھیجے، تو یسوع نے ان سے کہا "جو کچھ تم دیکھتے اور سنتے ہو جاکے یوحنا سے بیان کرو کہ اندھے دیکھتے، اور لنگڑے چلتے، کوڑھی پاک وصاف ہوتے اور بہرے سنتے اور مُردے جی اٹھتے ہیں اور غریبوں کو خوش خبری سنائی جاتی ہے"

یہاں بھی مراد روحانی بیماریاں ہیں - قرآن سے بھی ایسا ہی ثابت ہے لَا تعمی الْاَبصارُ ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور (الحج - ۴۶) آنکھیں اندھی نہیں، دل اندھے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں ـــــ اس نابینائی کا ذکر قرآن بار بار فرماتا ہے - اور روحانی امراض کے ساتھ ساتھ روحانی شفا کا ذکر بھی اسی رنگ میں آیا ہے هُدًی وَّشِفَاء (حٰم -۴۴) قرآن ہدایت ہے اور شفا بھی ہے - ہدایت سے شفا کو متصل کر کے بتایا کہ روحانی شفا مراد ہے - شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (یونس - ۵۷) سینوں کے اندر کی بیماریوں کے لیے شفا ہے -

انجیل اور قرآن دونوں متفق ہیں کہ انبیاء روحانی امراض کے لیئے شفا کا پیغام لاتے ہیں -

احی الموتیٰ راغب نے موت کے بہت سے معنی بیان کئے ہیں - ان میں سے ایک معنی "جہالت" ہے - مولوی محمد علی نے یہاں یہی معنی سمجھے ہیں اس کی سند قرآن اور حدیث دونوں سے پیش کی ہے - مثلاً اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ . . . (الانعام - ۱۲۳) کیا جو شخص مردہ ہے پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اسے ایک روشنی عطا کی جس کے ساتھ وہ چلتا پھرتا ہے . . . الخ یہاں زندہ اور مردہ دونوں لفظ آئے ہیں - اس کے بعد نور ایمان کا ذکر آیا ہے - ایسی ہی اور متعدد آیات آئی ہیں -

احادیث میں دو حدیثیں ہیں جن میں شہید موت کے بعد دنیا میں دوبارہ آنے اور جہاد میں شہید ہونے کی آرزو کرتے ہیں - ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملتا ہے - قد سبق منی انهم لا یرجعون (نسائی و ابن ماجہ) انی کتبت انهم الیها لا یرجعون (صحیح مسلم) میری (خدا کی) طرف سے پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ مرنے والے دوبارہ دنیا میں نہیں لوٹائے جائیں ـــــ میں (خدا) لکھ چکا ہوں کہ ان (مردوں) کو نہیں لوٹایا جائے -

پس جب مردوں کے لیے دنیا میں دوبارہ آنے کا دروازہ بند ہو چکا اور روحانی مردوں کو مردہ ہی فرمایا گیا اور انبیاء کا کام ہی یہ بتایا گیا کہ وہ روحانی مردوں کو زندہ کریں، تو ہم "احی الموتیٰ" کے ایک ہی معنی لے سکتے ہیں کہ میں (مسیح) اللہ کے اذن سے روحانی مردوں کو زندگی دیتا ہوں -

دراصل یہ تین فقرے خلق طیر، شفائے اکمہ و ابرص اور احیائے موتیٰ مختلف مدارج کے تین قسم کے لوگوں کے لیے وارد ہوتے ہیں -

۱ - وہ جن میں قبولیت کی استعداد زیادہ ہے، اُن میں جلدی ہی قوت پرواز پیدا ہو جاتی ہے -

۲ - ان کے دوسرے درجے پر وہ مریض الطبع ہیں، جو علاج پذیر ہو کر چنگے بھلے ہو جاتے ہیں -

۳ - سب سے ردی حالت ان کی ہے، جن میں روحانی زندگی ختم ہو چکی ہے نبی کی قوت قدسی ان کو از سر نو زندگی عطا کرتی ہے -

یہاں ان تینوں کو ایک ہی آیت قرار دیا ہے اِنّی قد جئتکم بآیۃ من ربکم - تینوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے "یعنی" قوت قدسی، صفحہ ۲۲۵

بماتا کلون

مسیح فرماتے ہیں۔ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ (آل عمران۔۴۹) اور جو تم نے کھانا اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ رکھا ہے۔ اس کی خبر دیتا ہوں (ترجمہ محمد علی)

مفسرین فرماتے ہیں کہ مسیح گذشتہ و آئندہ کے بعض غیب بتا دیتے تھے۔ عملی معجزات جو اوپر بیان ہوئے، ان کے بعد یہ علمی معجزہ ہے۔ (عثمانی رح) اس کے علاوہ اور بھی کئی اسرائیلیات تفسیروں میں منقول ہیں۔ محمد علی کہتے ہیں کہ:

آیت کے معنی صاف اس قدر ہیں کہ حضرت مسیح ان کو بتاتے ہیں کہ کیا چیزیں کھاؤ اور کس قدر ذخیرہ کرو گویا حلال و حرام کے کچھ احکام دیتے تھے۔۔۔۔۔ دنیا کے مال کا زیادہ ذخیرہ مت کرو اور اپنے لیے زمین پر خزانے جمع مت کرو (متی ۶: ۱۹ تا ۲۱) میں ہے "اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو، جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لیے آسمان پہ مال جمع کرو، جہاں نہ کیڑا اور نہ زنگ خراب کرتا ہے اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں۔ کیوں کہ جہاں تیرا مال ہے، وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا"

آسمانی دسترخوان

محمد علی کہتے ہیں کہ "حواری معمولی درجے کے لوگ تھے ـــــ ایسے لوگ عموماً بلند خیالات کے مالک نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کھانے کی درخواست کرتے جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ سچ مچ قبروں سے سے مردے نکال کر زندہ کر دیا کرتے تھے۔ اور مٹی کی شکلیں بنا کر ان کو سچ مچ کے پرند بنا دیتے تھے۔ ان کے لیے بھی یہاں سبق ہے، کہ اگر ایسے کھلے معجزات ہوتے ہوتے تو حواری حضرت مسیح کو سچا جاننے کے لیے ایک مائدہ کے اترنے کے کیوں محتاج ہوتے! قبروں سے مُردوں کا نکلنا اور مٹی کی شکلوں کا پرندہ بن جانا تو مائدہ کے اترنے سے بہت زیادہ کھلے معجزے ہیں۔ جو لوگ یہ دیکھ چکے ہوں، وہ مائدہ کے محتاج نہیں ہو سکتے۔"

دعائے مائدہ

آخر حضرت عیسیٰ دعا کرتے ہیں اور اپنی قوم کی خواہش کو پورا کرتے ہیں۔۔۔۔ مگر بجائے مائدہ کے جو صرف حواریوں پر نازل ہو آپ ایسے مائدہ کی درخواست کرتے ہیں جو پہلوں اور پچھلوں کے لیے یکساں موجب سرور ہو عِيدًا لِّأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا۔ (مائدہ ۷-۱۱۵) اس دعا کی قبولیت میں موجودہ حالات کچھ شک باقی نہیں رہنے دیتے۔ کھانے کے معاملے میں عیسائیوں کے ہاں عید ہی ہے۔ پہلوں اور پچھلوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ان کو روٹی کے ساتھ کچھ فکر آخرت بھی تھی۔ اب (بیسویں صدی میں) روٹی اور پیٹ کی پوجا ہی باقی رہ گئی ہے ص۶۵

معجزات مسیح سرسید کی نظر میں

خلق طیر سرسید نے "خلق طیر" کے متعلق نہایت مفصل نحوی، تاریخی اور روایاتی بحث کی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید سے یہ بات تو ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بچپنے کی حالت میں مٹی سے جانوروں کی مورتیں بناتے تھے اور پوچھنے والے سے کہتے تھے کہ میرے پھونکنے سے وہ پرند ہو جاویں گے، مگر یہ بات کہ وہ درحقیقت پرند ہو بھی جاتی تھیں، نہ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے۔ نہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ پس حضرت عیسیٰ کا یہ کہنا ایسا ہی تھا جیسے کہ بچے اپنے کھیلنے میں بمقتضائے عمر اس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ الخ میں پیدا کرتا ہوں تمہارے لیے مٹی سے پرند کی صورت کی مانند پھر میں اس میں پھونکتا ہوں تاکہ ہو جاوے پرند اللہ کے حکم سے۔

(آل عمران ۳-۴۳۔ ترجمہ سرسید) ص ۴۰ تفسیر القرآن جلد ۲)

آیت ربانی مسیح کہتے ہیں قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (آل عمران ۳-۴۳) میں لایا ہوں تمہارے پاس نشانی اپنے پروردگار سے (یعنی خدا کا حکم یا انجیل) (ترجمہ سرسید)

آیت، اور آیات اور آیات بینات سے خدا تعالیٰ کے احکام مراد ہوتے ہیں جو انبیاء کو وحی کیے جاتے ہیں۔ پس اس مقام پر بھی ہم یہی معنی قرار دیتے ہیں اور آیت سے جنس مراد لیتے ہیں نہ کہ فرد۔ بقول امام رازی المراد بالایۃ الجنس لاالفرد (ص ۴۱ ایضاً)

اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا جو لوگ برص سے ناپاک قرار پاتے تھے، مطلقاً اور وہ لوگ جو اس مرض سے بری کیے جاتے تھے، معینہ قربانیاں ادا کرنے کے بغیر معبد میں عبادت کے لیے داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

اندھے، لنگڑے اور چوڑی ناک والے کو، یا جس میں کوئی عضو زائد ہو اور ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے کو اور کبڑے اور آنکھ میں پھلی والے کو معبد میں جانے اور معمولی طور پر قربانیاں کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ سب ناپاک اور گنہگار سمجھے جاتے تھے اور عبادت کے لائق یا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لائق نہ متصور ہوتے تھے۔

حضرت عیسیٰ نے یہ تمام قیدیں توڑ دی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب کو خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کی منادی کی تھی کسی کو خدا کی رحمت سے محروم نہیں کیا اور کسی کو عبادت کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے سے نہیں روکا، پس یہی ان کوڑھیوں اور اندھوں کو اچھا کرنا تھا یا ان کو ناپاکی سے بری کرنا ہے، جہاں جہاں انجیلوں میں بیماروں کے اچھا کرنے کا ذکر ہے اس سے یہی مراد ہے۔ قرآن مجید میں جو یہ آیتیں ہیں

ان کے یہی معنی ہیں ص۲۴۶، ۲۴۷۔

مُردوں کو زندہ کرنا

انسان کی روحانی موت اس کا کافر ہونا ہے۔ حضرت عیسیٰ خدا کی وحدانیت تعلیم کرکے ..... لوگوں کو موت سے زندہ کرتے تھے ..... قرآن مجید میں کافروں کو مردے کہا گیا ہے۔ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا (نمل۔ ۸۱) تو مردوں کو نہیں سنا سکتا ..... تو نہیں سنا سکتا، مگر اس کو جو ہماری نشانیوں پر ایمان لایا ہے۔ موتیٰ کے مقابلے میں "لا یؤمن" کا لفظ کہہ رہا ہے کہ اس کا اطلاق کفار پر ہوا ہے۔ مفسرین بھی یہاں کفار ہی مراد لیتے ہیں (ایضاً)

اس آیت کے علاوہ سرسید نے مزید متعدد آیات اس کے ثبوت میں پیش کی ہیں۔

غیبی خبریں

وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ ..... الخ (آل عمران۔ ۴۲) میں تم کو بتا دیتا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کر لیتے ہو۔

اس کا مطلب نہایت روشن ہے۔ علماء یہود طرح طرح کے حیلوں اور فریبوں سے ناجائز طور پر لوگوں کا مال مارتے تھے ..... اپنے گھروں میں دولت جمع کرتے تھے جو بالکل حرام اور ناواجب تھا۔ جیسا سورۃ نساء۔ ۱۵۹ میں ہے وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ اور ان کی سود خوری جس سے انہیں روکا گیا تھا اور دھوکے سے لوگوں کا مال کھا جانا۔ اسی حرام خوری کی نسبت عیسیٰ نے فرمایا کہ میں تم کو بتاؤں گا کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو ص۲۴۹

نزول مائدہ

تفسیر کبیر اور تفسیر کشاف اور اسی طرح اور تفسیروں میں یہ روایت لکھی ہے کہ جب حواریوں نے سنا کہ اگر مائدہ اترنے کے بعد کوئی کفر کرے گا تو اس کو سخت عذاب ہوگا، تو انہوں نے کہا، ہم مائدہ کا اترنا نہیں چاہتے۔ پس کوئی مائدہ نہیں اترا۔ وَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ (المائدہ ۱۱۵) جو شخص تم میں سے (مائدہ کے اترنے کے) بعد کو کافر ہوا تو بے شک اس کو عذاب دوں گا، ایسا عذاب کہ ایک کو بھی عالم کے لوگوں میں سے ویسا عذاب نہ دیا ہوگا۔ (ترجمہ سرسید)

کشاف میں لکھا ہے کہ حضرت حسن بصری نے کہا کہ "واللہ ما نزلت" (خدا کی قسم نہیں اُترا) قرآن مجید میں بھی نہیں بیان کیا گیا ہے کہ بعد اس گفتگو کے مائدہ اترا تھا۔ بلکہ ذکر کے موقع پر ذکر کا نہ ہونا کافی دلیل اس بات پر یقین کرنے کی ہے کہ نزول مائدہ وقوع میں نہیں آیا۔ (ص۱۱۱)

معجزاتِ مسیح پرویز کی نظر میں

اِنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ: وہ (مسیح) اس مردہ قوم (یہود) سے کہے گا کہ میں تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے زندگی بخش پیغام لے کر آیا ہوں۔

اِنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ: میں اس وحی کے ذریعے تمہیں ایسی حیاتِ نو عطا کروں گا، جس سے تم اپنی موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی۔

وَاُبْرِیُٔ الْاَکْمَہَ: یہ آسمانی روشنی، تمہاری بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کردے گی، جس سے تم زندگی کے صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔

وَالْاَبْرَصَ: اس سے تمہاری قوم کی ویران کھیتی، جس پر تروتازگی کا کوئی نشان باقی نہیں رہا، پھر سے سبز و شاداب ہو جائے گی اور تمہاری وہ کمینہ خصلتیں دور ہو جائیں گی، جن کی وجہ سے تمہیں کوئی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔

وَاُحْیِ الْمَوْتٰی: مختصراً یہ کہ ذلت و خواری کی وہ موت جو اس وقت تم پر چاروں طرف سے چھا رہی ہے ایک نئی زندگی میں بدل جائے گی۔

وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ: میں (تمہارے نظام سرمایہ داری کی جگہ) ایسا نظام قائم کروں گا جو اس کا جائزہ لیتا رہے گا کہ تم کھانے پینے کی چیزوں میں سے کس قدر ذخیرہ (HOARDING) کرتے ہو، کہ اس سے ناجائز نفع کمایا جائے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ: اس قانون اور نظام میں تمہارے لیے بازآفرینی (ایک نئی زندگی حاصل کر لینے) کی بہت بڑی نشانی ہے۔ بشرطیکہ تم اس کی صداقت پر یقین کرو (مفہوم القرآن ص ۱۳۰، ۱۳۱)

پرویز صاحب اپنی مبسوط کتاب "معارف القرآن" (مطبوعہ ۱۹۴۵ء) میں بھی ان آیات پر روشنی ڈال چکے ہیں، اس کی تلخیص دیکھئے۔

حضرت عیسیٰ کے زمانے میں ایسینی فرقہ نے طبابت اور قوت ارادی کے عملیات وغیرہ میں بڑی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ خدمت خلق کی وجہ سے وہ ہر جگہ مقبول تھے ـــــ حضرت عیسیٰؑ اپنے شاگردوں کو تبلیغ کے لیے بھیجتے، تو تاکید کرتے تھے کہ بیماروں کو اچھا کرنا، مُردوں کو جلانا، کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا، بدروحوں کو نکالنا، ان تمام خدمات کے معاوضہ میں کچھ نہ لینا، تم نے مفت پایا ہے، مفت دینا (متی ۸/۱۰)

قریہ قریہ بستی بستی اللہ کا پیغام پہنچانے والوں کے لیے اپنے زمانہ اور ماحول کے تقاضوں کے اعتبار سے اس سے بہتر طریق کار اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا......تخلیق طیر تو یونہی سمجھئے، جیسے حضرت موسیٰؑ کے عصا (خشک لکڑی) کا سانپ کی شکل میں دکھائی دینا - اندھوں اور جذامیوں کا اچھا کر دینا - یہ بھی کچھ "بعید از عقل" نہیں - باقی رہا غیب کی باتوں کی خبریں دینا..... اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو بعض امورِ غیبیہ کا علم عطا کر دیتا ہے - مُردوں کے متعلق البتہ قرآن کریم میں یہ صراحت موجود ہے کہ وہ اس دنیا میں پھر نہیں آ سکتے - ..... متعدد امراض ایسے ہیں جن میں مریض پر موت کی علامات طاری ہو جاتی ہیں، لیکن وہ مرض ہی ہوتا ہے - موت نہیں ہوتی اور اس طرح کی زندہ انسان دفن کر دیئے جاتے ہیں - اس لیے اس قسم کے مُردوں کا زندہ کرنا در حقیقت مریضوں کے علاج میں شامل ہے، لیکن اگر اس سے سچ مچ کے مردے ہیں تو بھی باذن اللہ کیا کچھ نہیں ہو سکتا؟ ..... جو لوگ معجزہ کو استعارہ کی زبان میں لیتے ہیں، وہ ان معجزات کی یوں تاویل کر لیتے ہیں کہ رسول کا پیغام حیات آور، مُردوں کی بستی میں صور اسرافیل پھونک دیتا ہے (تخرج الموتی) وہ بے بال و پر انسانوں کو بازوئے شاہیں عطا کرتا ہے (کھیئۃ الطیر) وہ آنکھوں پر سے جہل و تعصب کے ظلمت انگیز پردے اٹھا کر انہیں نور بصیرت عطا کرتا ہے، وہ ان کے قلوب کے امراض کو شفا بخشتا ہے اور اس طرح ایک پیکر آب و گل کو جیتے جاگتے تندرست و توانا انسان کی شگفتہ و شاداب صورت عطا کر دیتا ہے -

ان سطور کے حاشیے پر پرویز صاحب لکھتے ہیں -

جن لوگوں میں کوئی عضوی نقص ہوتا، یہودی انہیں ناپاک تصور کیا کرتے تھے اور انہیں مذہبی رسومات میں شریک ہونے اور قربان گاہوں میں داخلے کی اجازت نہیں دیتے تھے - (احبار ۲۱/۱۶-۲۴) - اسی طرح برص کے مریضوں کو ناپاک تصور کیا جاتا تھا (احبار باب ۱۳)

حضرت عیسیٰ نے یہود کی ان خود ساختہ پابندیوں کی مخالفت کی تا کہ اس قسم کے مریض پھر سے انسانوں کے زمرے میں شمار ہونے لگ جائیں - ان لوگوں کے نزدیک ان مریضوں کی شفا یابی سے یہ بھی مقصود ہو سکتا ہے ص ۵۱۵-۵۱۶-۵۱۷

باقی رہا وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ..... (الخ ۳/۴۸) ...... اس کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ آپ (مسیح) نے فرمایا کہ میں وہ احکام خداوندی بیان کروں گا، جن سے واضح ہو جائے کہ کن کن چیزوں کا ذخیرہ رکھنا جائز ہے اور کون کون سی چیزیں ایسی ہیں - جن کا احتکار و اکتناز جائز نہیں ص ۵۱۷

مائدہ کے معنی

مائدۃ مِّنَ السَّمَآءِ کے معنی یہ نہیں کہ اوپر سے کوئی چنا چنایا خوان اترتا تھا بلکہ جیسا کہ صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے لیے انتظام ہوا تھا، یا ہیکل میں مریم کے لیے، "من جانب اللہ" سامان معیشت پہنچ جاتا تھا، اس قسم کا انتظام اس جماعت مومنین کے لیے کیا گیا تھا ص ۵۲۰

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں ایسے لوگ بھی موجود تھے، جو اس جماعت میں کھلے بندوں شامل تو نہ تھے، لیکن انہیں ان

کے مشن سے ہم دردی پیدا ہو چکی تھی اور موبدین کی یہ جماعت، مجاہدین کی ضروریات زندگی کی کفیل تھی ص ۵۰۰

مزید تحقیق

وادیٔ "مسیحیت" میں قلم کا مسافر یہاں پہنچا تو خواجہ احمد الدین صاحب کا ایک اور بیان معجزات مسیحؑ کے متعلق سامنے آگیا۔ اس کو چھوڑ دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ لکھتے ہیں۔

"مذکورہ آیات (اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر ۔۔۔ الخ) سے لوگوں نے خوارق نکالے ہیں کہ مسیح نے بحکم خدا کھلونوں میں پھونک مار کر کچھ پرندے بنائے تھے، حالانکہ خود خدا بھی کسی کھلونے میں پھونک مار کر اسے زندہ نہیں کرتا۔

لازم ہے کہ ان (مسیحی) پرندوں کی نسل و اولاد آج تک موجود ہو اور ان کا تعلق معجزات مسیحؑ کے ساتھ واضح ہوتا ہو۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس آیت کو کہاں لے جائیں گے! اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ (الرعد۔ ۱۶) (کیا انہوں نے اللہ کے شریک بنائے ہیں؟ جنہوں نے خدا کی مخلوق کی طرح مخلوق پیدا کی ہے پھر ان کو ان کے خالق ہونے کا شبہ ہونے لگا۔)

اگر کہا جائے کہ وہ پرندے نسل چلانے کے بغیر ہی مر جاتے تھے، تو جب تک وہ زندہ رہے کیا اس آیت مبارکہ کے خلاف نہیں رہے؟ لیکن اگر ان کو حقیقی نہیں بلکہ مجازی طور مان لیا جائے تو آیت پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

ایک اور نکتہ غور طلب ہے۔ سیاق آیات کہہ رہا ہے کہ یہ تمام باتیں (مسیح کے فضائل و معجزات وغیرہ) حضرت مریم کو حضرت مسیح کی ولادت سے پہلے بطور بشارت بتائی جا رہی ہیں کہ تیرے ہاں ایسا اور ایسا بیٹا پیدا ہوگا۔ اگر انہوں نے اپنے سراپا اعجاز فرزند کے متعلق اس اعجازی بشارت کا مطلب یہی سمجھا تھا جو ہمارے معجزہ پسند اصحاب سمجھ رہے ہیں تو ضرور رہے کہ انہوں نے مسیح کے رسول ہونے سے پہلے ان عجیب و غریب باتوں کو لوگوں میں پھیلایا ہوگا اور ان کی عام شہرت ہو گئی ہوگی۔ پھر مسیح کے دعویٔ رسالت پر انہوں نے درخواست کی ہوگی کہ مٹی کے کھلونوں میں پھونک مار کر زندہ کرو۔ پھر وہ اس قسم کے خوارق دیکھ کر متحیر و مرعوب بلکہ خائف بھی ہو گئے ہوں گے ——

لیکن ہم اس کے برعکس دیکھتے ہیں کہ

جب عیسیٰ نے اپنے ظاہری حواس سے ان کا کفر محسوس کر لیا احسّ منھم الکفر (اور ان کی معاندانہ کارروائیوں سے اندازہ کر لیا کہ وہ مجھے اپنی طرف سے صلیب کی موت مار کر چھوڑ جائیں گے) تو کہا کہ اللہ کی طرف (مجھے اٹھائے جاتے ہیں) میرا کون مددگار ہوگا! (من انصاری الی اللہ) حواریوں نے کہا ہم اللہ کے (حکم کی تعمیل میں) مددگار ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لائے۔ اس کے بعد یہود کے مکر کا ذکر ہے کہ کس طرح خفیہ خفیہ قیصر کے پاس جا کر، مسیح پر بغاوت کا الزام لگا کر صلیب کا حکم لے آئے (ص ۷۷، ۷۸ منزل اول "بیان للناس")

وحی و مشورہ

آیہ مَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى (نجم-۳) کی تفسیر میں کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کی زبان مبارک سے جو کچھ بھی صادر ہوتا تھا، وحی الٰہی سے ہوتا تھا۔ ای ما یخرج نطقہ، عن رائیہ، انما ھو بوحی من اللہ عزوجل لِانّ بعدہ "اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" (قرطبی ص ۸۵ جز سابع عشر) وفیھا ایضاً دلالۃ علی ان السنۃ کالوحی المنزل فی العمل (ایضاً) یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ سنت بلحاظ عمل نازل شدہ وحی کی مانند ہے۔

کوئی کام تو کیا ایک حرف بھی آپ کے ذہن مبارک سے ایسا نہیں نکلتا تھا جو خواہش نفس پر مبنی ہو۔ بلکہ آپ جو کچھ دین کے باب میں ارشاد فرماتے ہیں، وہ اللہ کی بھیجی ہوئی وحی اور اس کے حکم کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں وحی متلو کو قرآن اور غیر متلو کو حدیث کہتے ہیں (عثمانیؒ)

آخری اقتباس میں وحی کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ قرآن حکیم اور کسی بھی سابقہ پیغمبر کے زمانے میں وحی کی دو قسمیں نہیں پائی گئیں۔ ہمارے بعض فقہاء نے خیر القرون کے صدیوں بعد یہ تقسیم اور اصطلاحیں قائم کی ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے خیال کی تائید میں قرآن حکیم کے متن ہی سے دلائل پیش کرتے ہیں۔

آل عمران کی آیت ۱۵۹ کے الفاظ "شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ" (ان مسلمانوں سے مشورہ کیجئے) سے استدلال کرتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر وحی والے لوگوں کے ساتھ مشورہ کرنے کا حکم دینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ کریم صلعم کی ہر بات وحی نہ تھی اور وحی الٰہی کے ساتھ شکلہ معہ، نہیں بن سکتی تھی، ورنہ ماننا پڑے گا کہ قرآن مجید نبی صلعم کے مشوروں سے ہی تحریر ہو کر وحی بن گیا ہے۔

رسولؐ کے وہ کلمات والفاظ جو دین سے متعلق ہوں اور ان میں مشورہ و قیاس بھی شامل ہو، اگر وہ سب کے سب وحی کا مرتبہ رکھتے ہیں، تو ایسے سراپا وحی رسول پر الگ قرآن نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اگر رسول کریم میں دوسرے لوگوں سے الگ قسم کی کوئی عقل، قوتِ فہم یا ملکہ نبوت ہوتا جس سے تمام دوسرے انسان محروم تھے، تو آپ یہ اعلان کس طرح کر سکتے تھے کہ

"تمہارے جیسا ایک بشر ہوں۔ اگر میں نے قرآن اپنی طرف سے بنا لیا (یا افترا کر لیا) ہے، تو تم ایسی ہی دس سورتیں یا کم از کم ایک ہی سورت بنا کر دکھاؤ!"

اگر رسول کریم کی ہر بات یا ہر دینی بات وحی منزل ہے، تو آیات ذیل کا کیا مطلب سمجھا جائے گا؟

لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ ․․․․ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا (بنی اسرائیل - ۸۶) اگر ہم چاہیں تو جو وحی تیری طرف نازل کر رہے ہیں، چھین لے جائیں پھر کوئی تجھ کو واپس نہ دلا سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور بخشش تجھ پر بہت ہے ——— وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ (یوسف - ۳) اور تو تھا اس سے پہلے البتہ بے خبروں میں (ایضاً) مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (هود - ۴۹) تجھ کو اور تیری قوم کو قبل ازیں (اخبار غیب کا) کوئی علم نہیں تھا ——— مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ (زخرف - ۵۲) تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (طٰہٰ) پایا تجھ کو بھٹکتا، پھر راہ سجھائی (ترجمہ شیخ الہند)

جس ہستی کی ہر ہر بات وحی ہو کیا اس کو غافل، بے خبر، بے علم اور ایمان و کتاب کو نہ جاننے والی کہہ کر خطاب کیا جا سکتا ہے! یاد رہے کہ یہ آیات، قرآن مجید بطور منقصت ہرگز پیش نہیں کر رہا، بلکہ یہ آپؐ کی صداقت اور قرآن کے ربانی کلام ہونے پر اٹل دلائل ہیں۔ کہ ایک ان پڑھ شخص ایک ایسی بے مثل و بے نظیر کتاب پیش کر کے دعویٰ کر رہا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ جس کی مثال مخاطبین مخالفین کے اعلیٰ سے اعلیٰ قابل، فاضل، فصحاء بلغاء پیش کرنے سے عاجز ہیں۔

خواجہ صاحب ایک اور دلیل دیتے ہیں:

جو لوگ حضورؐ کے ہاں کھانے کے لیے مدعو کیے جاتے تھے وہ قبل از وقت وہاں جا بیٹھتے تھے۔ اور طعام سے فراغت کے بعد بھی دیر تک بات چیت کے لالچ میں بیٹھے رہتے تھے۔ حضورؐ کو اس سے اذیت پہنچتی تھی۔ یہ اذیت رسانی (غیر شعوری ہی سہی) دینی تعلیم کے خلاف ہے، لیکن اس دینی و اخلاقی تعلیم کو وحی نہیں سمجھتے تھے اور اس کے اظہار سے حیا کرتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآنی وحی کے ذریعے مدعو لوگوں کو اس اذیت رساں ارتکاب سے روک دیا، تو آپ کی سابقہ حیا مانع نہ ہو سکی۔ آپ نے پوری وضاحت سے اس کا اعلان کر دیا ——— یہ واقعہ سورۂ احزاب آیت ۵۳ میں مع دیگر ہدایات کے مفصل مذکور ہے ——— اگر آپ (خدانخواستہ) وحی کے کسی ایک لفظ کے اظہار و اعلان میں جھجک محسوس فرماتے، تو اس امر عظیم کی واضح خلاف ورزی ہوتی جو ایک نبی کی شان کے ہرگز شایان نہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (المائدہ - ۶۷)

اے رسول! جو کچھ تجھ پر اترا ہے، رب کی طرف سے بلا کم و کاست آگے پہنچا دے۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا، تو تو نے اللہ کا پیغام کچھ نہ پہنچایا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ دین کا وہ حصہ جو وحی سے متعلق ہے، قرآن مجید میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ احادیث جو عقل و درایت کی میزان میں پوری اتریں، بسر و چشم قبول کی جانی چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشورے کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا ہے مَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ (آل عمران ۱۶۱) کسی نبی کے لیے شایاں نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ ہر نبی، رسول امین ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی وحی بلا کم و کاست پہنچا دیتا ہے۔ کسی حکم ربانی کی تبلیغ میں کوتاہی نہیں کرتا۔ وہ مبلغ امین ہوتا ہے۔

وہ لوگ جن پر وحی نازل نہیں ہوتی۔ ان سے مشورہ کرنے والا رسول مجلس مشاورت میں انہی کی طرح ایک رکن مجلس ہوتا ہے۔ ایسے مشورے انتظامی لحاظ سے قابلِ قدر اور قابلِ تسلیم ہوتے ہیں، لیکن ان کو وحی یا دائمی اصول کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ مشورے ایک دوسرے کا بدل بھی ہوسکتے ہیں۔ ایک مشورے کو بدل کر دوسرے کو اس پر ترجیح بھی دی جاسکتی ہے، لیکن وحی کا مقام ایسے تغیرات سے بالاتر ہے۔

(اس کی توضیح خود رسول اکرم نے یہ کہہ کر فرما دی کہ انتم اعلم با مور دینا کم۔ [(وحی کے علاوہ باقی) اپنے دنیوی معاملات کے متعلق تم زیادہ بہتر جانتے ہو، یہ آپ نے اس وقت فرمایا جب کھجوروں میں گابھا لگانے کا مشہور واقعہ پیش آیا (صحیح مسلم) ناقل]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بہت سے واقعات، مقامات اور جنگوں کا ذکر ان کے وقوع کے بعد قرآن حکیم میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اگر آپ کی حدیثیں اور دینی باتیں قرآن ہی کی طرح ابداً واجب التعمیل تھیں تو ان کو قرآن سے باہر راویوں کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑا گیا؟ اور پھر ان کے مرتب کرنے کے لیے صدیوں کے بعد کے جامعینِ حدیث کا انتظار کیوں کیا گیا؟ ص ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵

مثال کے طور پر جنگ اُحد کی جزئیات تک کا ذکر قرآن میں لایا گیا ہے یہ تمام واقعات مصدقہ الٰہی ہونے کی وجہ سے شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ اگر حدیثوں کی ایسی ہی ضرورت تھی، تو ان کے لیے بھی تصدیق خداوندی لازم تھی ص۵۰۲

سورہ انعام رکوع ۱۰، آیت ۸۳ تا ۹۰ میں ۱۹ نبیوں کا نام لے کر اور ان کے بعض آباء، ذریات اور اخوان کا نام لیے بغیر ذکر فرمایا ہے۔ آخر میں ارشاد ہوتا ہے، ہم نے ان کو سیدھی راہ پر چلایا۔ اگر وہ شرک کرتے، تو ان کا کیا دھرا سب اکارت ہو جاتا۔ ہم نے ان کو کتاب، حکم نبوت بخشی۔ اگر مخاطبین ان کا انکار کریں، تو ہم (خدا) نے دوسرے لوگوں (مہاجرین و انصار کو ان پر ایمان لانے کے لیے مقرر کر دیا ہے، جو ان کے منکر نہیں ہوں گے۔ یہی (کتاب و نبوت والے جن کا اوپر ذکر ہوا) وہ لوگ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی سو (اے محمدؐ!) تو ان کے طریقے پر چل۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ ان تمام رسولوں کی پیروی اور ان کے اسوہ حسنہ کے لیے ہمیں قرآن مجید سے باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حالانکہ ان میں سے بعض کی کتابیں اب بھی موجود ہیں (مثلاً بائبل) اور خود قرآن ان کے متعلق فرماتا ہے کہ ان میں ہدایت و نور موجود ہے إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ (المائدہ ۴۴) وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ (۱۱-۴۶)

(ہم نے تورات اتاری، اس میں ہدایت اور نور ہے۔ ہم نے اس (مسیح) کو انجیل دی، اس میں ہدایت اور نور ہے)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور غیرہم علیہم السلام) انبیاء کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ بالکل اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم بھی دیا ہے۔ ان سب اطاعتوں کے لیے ہمیں قرآن مجید سے باہر کوئی رہنمائی تلاش کرنے کا مکلف نہیں ٹھہرایا گیا۔ قرآن کی پیروی کرنے سے ہم سب رسولوں، نیکوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والوں کے پیرو ہو سکتے ہیں۔ وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ (لقمان ۱۵) اس شخص کی پیروی کر جو میری (خدا کی) طرف رجوع کرتا ہے ـــــ کا یہی مطلب ہے۔ یعنی رجوع الی القرآن۔

اگر اس حکم کی تعمیل قرآن سے باہر ایسے اشخاص اور ان کی تعلیمات کی تلاش کے بعد ہو سکتی ہے، تو یہ غیر ممکن العمل ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کی عقلی ترقی کی راہیں مسدود کر دی گئی ہیں۔ خواجہ صاحب اس نکتے سے غافل نہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

اصل یہ ہے کہ وحی کے لحاظ سے صرف قرآن مجید ہی میں سب (انبیاء) کے اسوۂ حسنہ اور سب (داناؤں) کی حکمت کی پیروی آ جاتی ہے، لیکن عملی طور پر ترقی کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا صحیفہ فطرت (کائناتِ ارض و سما) موجود ہے۔ حدیث اور تاریخ کی کتابوں کو قرآن اور صحیفہ فطرت کی مطابقت کی شرط ہی پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ (ص ۵۱۴، ۵۱۵ منزل اول)

كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ ...(آل عمران ۱۵۴)

جنگ احد میں بعض مسلمانوں کی غلطی سے وقتی طور پر شکست ہوئی ۔مجاہدین دل شکستہ ہو گئے ۔کافروں اور منافقوں کو طعن و تشنیع کا موقع مل گیا ۔طرح طرح کی باتیں کرنے لگے ۔مثلاً یہ کہ اگر ہمارے مشورے پر عمل کیا جاتا ،تو اس قدر نقصان نہ اٹھانا پڑتا ۔ہماری برادری کے اتنے آدمی مارے گئے یہ نہ مارے جاتے ۔مدینے سے باہر لڑنے چلے گئے ۔آخر منہ کی کھائی لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۔اس کے جواب میں فرمایا ۔لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۔

اس کا مفہوم عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے ۔کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں گھسے بیٹھے رہتے اور فرض کرو کہ تمہاری رائے سنی جاتی :تب بھی جن کی قسمت میں اُحد کے قریب جس جس پڑاؤ پہ مارا جانا لکھا جا چکا تھا ،وہ کسی نہ کسی سبب سے ضرور ادھر نکلتے اور وہیں مارے جاتے (عثمانیؒ)

یہاں ۔کتب علیہم القتل کے معنی "مقتول ہونا" اور مضاجع کے معنی جنگی پڑاؤ سمجھے گئے ہیں ۔قرآن مجید اور لغت میں ضجع کے معنی لیٹ جانا یعنی اپنی کروٹ کو زمین کے ساتھ لگانا یا سو جانا ہیں لہذا مضجع کے معنی ہوئے لیٹنے یا سونے کی جگہ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (السجدہ ۱۶) ان (نمازیوں) کی کروٹیں اپنے سونے کی جگہ سے جدا رہتی ہیں ۔

خواجہ صاحب اس لغوی و قرآنی مفہوم کو قائم رکھتے ہوئے عام مترجمین و مفسرین سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

اس جنگ میں قصوروار وہ لوگ تھے ،جنہوں نے ناکے کو چھوڑ کر نافرمانی کی ۔اگر یہ لوگ اپنے گھروں میں رہتے اور ان کی جگہ رسول کریمؐ دوسرے مناسب (ڈسپلن کے پابند) لوگوں کو متعین کرتے تو یہ نقصان کبھی نہ ہوتا ۔چنانچہ ارشاد ہے اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ وہ لوگ جن پہ (زور توڑنے کے لیے ان کفار کا) قتل کرنا فرض تھا (کتب علیہم القتل) ان (کفار) کی خوابگاہوں تک نکل جاتے (اور انہیں ان کے گھروں میں پہنچا کر آتے) ص ۵۲۱-۵۲۲

اس مقام پہ مولوی محمد علی عامہ مفسرین کے ہمنوا ہیں ۔البتہ پرویز صاحب ،خواجہ صاحب سے ملتے جلتے ہیں ۔چنانچہ لکھتے ہیں ۔

(ان منافقین اکے دل میں دین ہی کی طرف سے شک ہے) یہ کہتے ہیں کہ اگر اس باب میں ہمیں کچھ اختیار دیا جاتا ، تو ہم اس مقام پہ آکر قتل نہ ہوتے (ہم اپنے گھروں میں رہتے) ان سے کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں رہنے کا فیصلہ بھی کر لیتے تو جماعت مومنین تمہاری تقلید نہ کرتی ۔جب ان پہ جنگ واجب قرار دی جاتی تو یہ خود بخود میدان جنگ کی طرف آ جاتے ص ۱۶۰

یہاں "مضاجع" کے معنی "میدان جنگ" کئے گئے ہیں —— اپنی "لغات القرآن" میں لکھتے ہیں "مضاجع سے مراد ان کی قتل گاہیں ہیں" ،لیکن اس کی سند کوئی نہیں دی ۔

ایک آیت میں تمام حروفِ تہجی

خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس آیت (ثُمَّ اَنزَلَ ..... اِلیٰ ..... الصُّدُوْرِ آل عمران ۱۵۴) میں تمام حروف تہجی آگئے ہیں اور اسی طرح سورہ فتح کی آخری آیت (محمد رسول اللّٰہ والذین معہٗ) کا بھی یہی وصف ہے۔ ص ۵۲۱

— ٥ —

غلامی بند

عام فقہاء و مفسرین کے خلاف خواجہ صاحب غلامی کے متعلق لکھتے ہیں:

"اسلام نے غلامی کو آئندہ کے لیئے قطعاً بند کر دیا ہے" (فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً ؕ محمد-۴) اس آیت میں دو ہی صورتیں ہیں۔ احساناً چھوڑ دینا یا بدلہ لے کر چھوڑ دینا۔ علماء ترجمہ تو یہی کرتے ہیں، لیکن تفسیر میں یہ بھی کہتے ہیں کہ "البتہ غلام یا رعیت بنا کر رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں" (عثمانیؒ)

خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

سورہ نساء میں۔۔۔ مرد عورت بلکہ آزاد غلام ہر ایک کو اپنے اپنے مال اور میراث اور مہر کا مالک قرار دیا گیا ہے! اسلام نے غلامی کو آئندہ کے لیے قطعاً بند کر دیا ہے (محمدؐ-۴) فرعون کے ماتحت بنی اسرائیل کی غلامی کو عذاب مہین (رسوائی) فرمایا ہے (دخان، ۳۰، شعراء ۲۲) باقی رہے (اُس وقت کے موجودہ لونڈی غلام، جن کو مال تجارت بنایا جاتا تھا، رسول کریمؐ کے پاس اتنا مال نہیں تھا کہ سب کو خرید کر آزاد کر دیتے۔ البتہ ان کو تدریجاً کم سے کم کرتے رہنے کا انتظام کر دیا۔

۱۔ غلاموں کو آزاد کرنا اعلیٰ درجے کی نیکی قرار دیا۔ قرآن مجید میں فرمایا "غلام کو آزاد کرنا، یتیم اور مسکین کو کھانا کھانا بڑی عظمت کا کام ہے" (بلد-۱۳ تا ۱۶) ان آیات میں غلام کی آزادی کو یتیم و مسکین نوازی پر مقدم ٹھہرایا ہے۔۔۔

۲۔ غلامی کو روکنے کے لیے ہمیشہ کے لیے بیت المال سے ایک حصہ مقرر کیا (اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ۔۔۔ وَفِی الرِّقَابِ۔ توبہ-۶۰)

۳۔ سزاؤں اور جرمانوں کی جگہ جابجا غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔

بعض لونڈی غلام اپنی بسر اوقات کے لیے اپنے مالکوں سے الگ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ مالک بھی انہیں اپنے خاندان کا رکن سمجھتے تھے۔ بوڑھے۔ بچے، مریض، پاگل، نکمے اور سست لوگ، فضول خرچی کرنے والے اور اِدھر اُدھر سے قرض لینے والے جو مالکوں پر ہر طرح بار تھے، اگر انہیں آزاد کر دیا جاتا تو وہ خود کفیل ہونے کی صلاحیت کا ثبوت نہیں دے سکتے تھے ان کے متعلق تاکید فرمائی کہ ان پر احسان کرو، اور انہیں اپنی اولاد کی طرح سمجھو، وہ گھروں میں دوپہر اور رات کے وقتوں کے علاوہ باقی تمام اوقات میں بلا اذن آتے جاتے تھے (نور-۵۸) گھر والیاں ان سے اپنی زینتیں نہیں چھپاتی تھیں (نور-۳۱) کوئی مالک یا مالکہ اپنے لونڈی غلام سے جنسی تعلق پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ایسی اجازت ہوتی تو پردے کے اوقات میں ان کو اذن لے کر اندر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ جب آزاد عورت اپنے غلام سے ایسا تعلق پیدا کرنے کی مجاز نہیں تو مرد اپنی لونڈی سے یہ ربط کیسے قائم کر

سکتا ہے۔

سورۂ نور آیت ۵۸ میں گھر کے نابالغ بچوں اور لونڈی غلام کو ایک ہی حکم میں یکساں قرار دیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کا اشارہ اسی طرف ہے۔ مزید لکھتے ہیں:

لونڈی کے مالکوں کو حکم دیا ہے کہ "اپنی لونڈیوں کے نکاح دوسرے لوگوں سے کرادیں۔ لیکن اگر وہ ان کا نکاح نہ کرائیں، تو لونڈی غلاموں اور دیگر بیواؤں کو حکم دیا گیا ہے۔ کہ عفت اختیار کریں۔ یعنی نکاح اور عفت کے سوا ان کے لیے کوئی تیسرا حکم ہے ہی نہیں جس سے یہ سمجھا جائے کہ وہ اپنے مالکوں یا مالکاؤں[1] سے بغیر نکاح کے جنسی تعلق پیدا کرسکیں۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ... الخ۔ (نور-۳۲)

اگر لونڈیاں نکاح میں آنا پسند کریں لیکن ان کی مرضی اور اسلامی قانون کے خلاف اپنے فائدے کے لیے ـــــ یا مہمانوں کو خوش کرنے کے لیے ـــــ یا روپیہ کمانے کے لیے انہیں جسم فروشی پر مجبور کیا جائے، تو یہ انتہائی شرمناک ظلم ہوگا۔ قرآن پاک صرف ان کے نکاح کرا دینے کے حق میں ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری صورت کی اجازت نہیں دیتا۔ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط (نور-۳۳)

مالک اور مالکہ اپنے لونڈی غلاموں کو آزاد کرکے باہمی رضامندی کے ساتھ ان سے نکاح کرسکتے ہیں، لیکن دوسرے لوگوں سے لونڈی غلام کا نکاح مالک کی اجازت سے ہوسکتا ہے فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

(النساء-۲۵)

جو شخص دوسرے مذہب کی عورت یا آزاد مسلمان عورت کے (مہر وغیرہ) مصارف کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اگر اسے خوف ہو کہ وہ اپنی جنسی خواہش کو ضبط نہیں کرسکتا تو وہ صرف ایک مومن لونڈی سے نکاح کرنے کا مجاز ہے، لیکن صبر و ضبط بہرحال اس سے بہتر ہے کیونکہ لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے میں کئی خطرات ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کا مالک مفلس ہوجائے اور وہ کسی دوسرے شخص کے پاس فروخت کردے۔ اور وہ اُسے دوسرے شہر میں لے جائے اور اس کا نکاح اپنے اذن سے کسی دوسرے شخص سے کرا دے ـــــ پہلے خاوند کی موجودگی میں دوسرا نکاح کئی خطرات کا موجب ہوسکتا ہے۔ غیر مذہب کی لونڈی سے نکاح کی اجازت نہیں ہے۔ اس میں مذہب مداخلت کا احتمال ہوسکتا ہے وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النور-۳۳) جن کو نکاح کی توفیق نہیں وہ اپنے آپ کو تھامے رکھیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے خوش حال کردے ـــــ لونڈی سے نکاح کی اجازت کے ساتھ اُسی آیت میں یہ شرط لگادی ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ط وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (النساء ۲۵) یہ اجازت صرف اس کے لیے ہے جس کو صابر و ضابط رہنا دشوار معلوم ہو۔

---

[1] یہ لفظ ناقل کا اضافہ ہے جو خواجہ صاحب کی چند سطور قبل کی تحریر سے مفہوم ہوتا ہے اس کو مکرر دیکھ لیں۔

الرق فی الاسلام یعنی اسلام میں غلامی کی حقیقت

یہ کتاب، مولانا سعید احمد ایم۔ اے کی تالیف ہے اس میں جمہور فقہائے اسلام کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ذیل میں اس کے بعض حصے تلخیص واقتباس کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

اسلام کا سب سے بڑا مستند اور جامع دستور العمل قرآن مجید ہے، اس لیے ہم کو سب سے پہلے اسی میں تلاش کرنا چاہیے کہ غلام بنانے کے جواز کا کہیں ذکر موجود ہے یا نہیں۔ بغور کرنے اور جستجو کرنے اور جستجوئے عمیق سے کام لینے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تمام قرآن میں کہیں غلام بنانے کا ذکر نہیں ... کسی عنوان اور کسی ابتدائے بیان کے ساتھ غلام بنانے کا ذکر صراحتہً نہیں ہے ص ۵۰

قرآن اس معاملے میں ساکت ہے۔ باندی غلام بنانے کے متعلق نفیاً یا اثباتاً اس میں کوئی صراحت نہیں..... احادیث اور تاریخ میں باندی غلام بنانا جائز ہے ص ۱۶۶ اسلام نے غلام بنانے کی صرف اجازت دی ہے، حکم نہیں دیا... لیکن اس کو بہ نظر پسندیدگی نہیں دیکھا... قرآن میں غلامی کے جواز سے متعلق کہیں ایک حرف بھی نہیں فرمایا گیا ص ۱۱۔

سید امیر علی کی کتاب "سپرٹ آف اسلام" کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"اگر یکایک اس (غلامی) کا انسداد کر دیا جاتا، تو اخلاقی اور اقتصادی اعتبار سے ایسا ہونا ناممکن تھا ص ۲۴"

عمرو بن العاص گورنر مصر نے قبطیوں پر تشدد کیا۔ حضرت عمرؓ کے پاس شکایت پہنچی تو انہوں نے فوراً لکھا۔

"اے عمرو! تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنانا شروع کر دیا، حالاں کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے آزادی کو ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھا ہے اور اس کو اصل اور غلامی کو محض ایک امر عارض قرار دیا ہے ص ۴۸۔

حدیث میں ہے ــــ "تم میں سے کوئی "میرا غلام"، یا "میری باندی"، نہ کہے۔ اور نہ غلام ہی اپنے مالک کو "میرا رب" کہے مالک کو "میرے بچے" یا "میری بچی"، کہنا چاہیے اور غلام کو "میرے سردار" یا "میری سردارنی" کہنا ہوگا۔ کیوں کہ تم سب اللہ تعالیٰ کے مملوک ہو اور وہی سب کا رب تعالیٰ ہے ص ۹۹ عربی میں سید (یعنی سردار) عموماً ایک دوسرے کو تعظیماً ذکر کیا جاتا ہے۔ حاشیہ ص ۹۹

حضرت عمرؓ کا عمل

"الفاروق"، علامہ شبلی کے حوالے سے لکھتے ہیں ــــ حضرت عمرؓ نے ..... اس رواج کو کم کر دیا اور جس قدر قائم رکھا، اس خوبی سے رکھا کہ غلامی، غلامی نہیں بلکہ برادری اور ہمسری رہ گئی ... عنانِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی قبائل مرتدہ کے جو لوگ عہد ابو بکرؓ میں لونڈی غلام بنائے گئے تھے۔ سب کو آزاد کر دیا۔

جاہلیت کے غلام

عہد جاہلیت کے غلاموں کے متعلق یہ رائے ظاہر کی وہ اپنی قیمت اپنے مولیٰ کو ادا کر دیں اور آزاد ہو جائیں..... آقا خواہ راضی ہو یا نہ ہو بہر حال غلام قیمت ادا کر کے آزاد سمجھا جائے گا۔

ذمی اور غلامی

حافظ ابن حجر حضرت عمرؓ کے ایک قول کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر ذمی عہد شکنی کریں، اور ان سے جنگ ہو، تب بھی ان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ ص ۱۰۹

مکاتبت

حضرت عمرؓ نے غلامی کے خاتمے کی دوسری تدبیر یہ کی کہ آیہ فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیراً کے مطابق غلاموں سے مکاتبت کرنے کو امر واجب قرار دیا، یعنی غلام میں صلاحیت دیکھے کہ وہ مقررہ مدت میں معینہ مقدار مال کما کر ادا کرے گا۔ اور آزادی اس کے حق میں بہتر ہوگی تو اس کا یہ عہد یا تحریر یہ مالک کو تسلیم کر لینی چاہیئے ص۱۱۰

ماستان، ورآباذ، جندیسابور اور شیراز کے معاہدے میں یہ الفاظ تھے،

"نہ ان کو قتل کیا جائے گا، نہ وہ باندی غلام بنائے جائیں گے اور نہ وہ اپنے طریقہ و مسلک سے روکے جائیں گے" ص۱۱۱

قرآن مجید کی سورۂ بقرہ میں، جہاں ایمان اور اعمال صالحہ کو بیان کیا گیا ہے، غلام کے آزاد کرنے کو نماز روزہ سے مقدم رکھا گیا ہے (ص۱۱۴) (بقرہ - ۱۷۷)

آیات و احادیث کی بناء پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ غلام کو آزاد کرنا تمام صدقات و مبرات سے افضل ہے۔ بحوالہ کتاب المیزان لعبدالوہاب شعرانی و روح المعانی۔ ص۱۱۶

محترم مؤلف نے حضورؐ کے متعلق بتفصیل لکھا ہے کہ آپ نے فلاں فلاں غلام خرید کر آزاد کئے اور جو اپنی خوشی سے آپ ہی کے پاس رہنا پسند کرتے تھے، ان کے ساتھ حضور کا سلوک پدرانہ تھا، مالکانہ نہیں تھا۔ پھر مشہور جاریہ ریحانہ بنت عمرو کا واقعہ لکھا ہے کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا اور ان کے ساتھ بالکل ازواج مطہرات کا سا برتاؤ فرماتے تھے ص۱۱۸،۱۱۷

قرآن حکیم کی وہ تمام آیات بھی درج کتاب کر دی ہیں جن میں مختلف وجوہ کی بناء پر غلام آزاد کرنے کا حکم یا ترغیب نکلتی ہے۔ مثلاً قتل خطا پر غلام آزاد کیا جائے۔ وہ کسی مسلم کا قتل ہو یا ذمی و معاہد کا ۔۔۔ کفارۂ ظہار (طلاق جاہلیت کی ایک قسم) میں سب سے پہلے غلام کو آزاد کرنے کا حکم ہے۔ بعد میں دوسری سزائیں ہیں، قسم توڑنے والے کو بھی غلام آزاد کرنا ہوگا یا دوسری سزائیں برداشت کرے گا۔ قصداً روزے کو فاسد کرنے والا بھی اسی سزا کا مستوجب ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک حدیث میں ہے۔

جس کسی نے اپنے غلام کے طمانچہ مارا یا اس کو زد و کوب کیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کرے۔ اس موقع پر ایک نہایت اثر انگیز اور رقت خیز واقعہ لکھتے ہیں۔

ایک شخص اپنے غلام کو مار رہا تھا، وہ بار بار یہ، "خدا کے لیے رحم کر! خدا کے لیے رحم کر" کہتا جاتا تھا۔ لیکن اس نے پھر بھی معاف نہیں کیا۔ حضور رحمۃ للعالمینؐ نے غلام کی فریاد سنی، تو اس کی طرف تشریف لائے، مارنے والے نے آپؐ کو دیکھتے ہی ہاتھ روک لیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"غلام نے تجھ کو خدا کی دہائی دی، تو نے پھر بھی نہ مانا۔ لیکن جب تو نے مجھے آتے دیکھا تو اپنا ہاتھ روک لیا" ۔۔۔۔ اس شخص نے کہا!

"یا رسول اللہ! یہ غلام خدا کے لیے آزاد ہے" ارشاد ہوا کہ

"اگر تو ایسا نہ کرتا، تو دوزخ کی آگ تجھ کو بھسم کر دیتی"

صحابہ اور غلامی صحابہؓ نے غلامی سے متعلق احکام و ترغیبات کی تعمیل کس جذبے سے کی، اس کا ثبوت سطور ذیل میں ملتا ہے۔

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر غفاری کو ایک غلام عنایت فرمایا اور اس کے ساتھ نیک برتاؤ کی ہدایت فرمائی۔ انہوں نے اس ہدایت کی تعمیل یوں کی کہ اسی وقت غلام کو آزاد کر دیا صفحہ ۱۳۰۔

"بلوغ المرام" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۳۹ ہزار ۲۵۹ تک پہنچتی ہے۔ مختصر فہرست دیکھئے:

حضرت عائشہؓ نے ۶۹ غلام آزاد کئے۔

حضرت حکیم بن حزامؓ نے ۱۰۰ آزاد کیے۔

حضرت عثمانؓ نے ۲۰ آزاد کئے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے ۳۰۰۰۰ آزاد کئے۔

حضرت عباسؓ نے ۷۰ آزاد کئے۔

حضرت ذوالکلاعؓ حمیری نے ۸۰۰۰ آزاد کئے (صرف ایک دن میں)

حضورؐ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۶۳ لکھی ہے۔ حضرت صدیقؓ نے بکثرت غلام آزاد کئے ——— صفحہ ۱۳۱

مؤلف ان اقدامات سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ "شریعت اسلام نے آزادی کو اصل سمجھا ہے ..... غلامی کو محض ایک عارضی چیز سمجھا ہے اور مختلف طریقوں سے کوشش کی ہے کہ ننگ و عار کا داغ انسانیت کے دامن سے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائے۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے جتنے طریقے ہو سکتے تھے، ان سب کو اختیار کر لیا گیا ہے۔

اس کے بعد ان طریقوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

غلاموں کا نکاح آیہ وانکحوا الایامی (نور ۳۲) اوپر درج کی جا چکی ہے۔ اس کی تفسیر میں قاضی بیضاوی کا قول نقل کرتے ہیں:

وفیہ دلیل علی وجوب تزویج المولیۃ والمملوک۔ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ غلام اور باندی کا نکاح کرنا واجب ہے ....

پھر غلام کے لیے یہ قید نہیں کہ وہ صرف باندی سے نکاح کرے، بلکہ آزاد اور شریف عورت سے بھی نکاح کر سکتا ہے۔ خود حضورؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام زید کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن زینب سے کیا تھا .....

اسی طرح شریف اور آزاد مرد باندیوں یا آزاد عورتوں کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ خود حضورؐ نے ثابت بن قیس کی جاریہ کو آزاد کرا کے اس کے ساتھ نکاح کیا۔

آپ نے یہاں تک فرمایا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر کوئی شخص اپنی باندی کو اچھی تعلیم و تربیت دے اور پھر اس کو آزاد کر کے خود اس سے نکاح کرے تو اس کو دو اجر ملتے ہیں صفحہ ۱۶۲ تا ۱۶۷

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریمؐ کا آخری کلام یہ تھا کہ نماز کا خیال رکھو، اور جو تمہارے باندی غلام ہیں ان سے معاملہ کرنے میں اللہ سے ڈرو صفحہ ۱۶۳

غلام و آزاد کا فرق مٹانے اور حسن قابلیت کی قدر دانی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ

غلام کی قیادت

حضورؐ نے شام کی مہم پر لشکر بھیجنا چاہا تو اس کی قیادت حضرت اسامہؓ کے سپرد کی، جو اس وقت صرف ۱۸ برس کے نوجوان غلام تھے۔ اس فوج میں کئی جلیل القدر صحابہ ان کی زیر کمان تھے۔ اسامہؓ گھوڑے پر سوار تھے اور خلیفہ اسلام حضرت ابوبکرؓ پیادہ ان کے ساتھ چل رہے تھے۔ ہر چند اسامہؓ اس کو خلاف ادب سمجھتے تھے لیکن خلیفہؓ کے منشاء سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے۔

غلاموں کی سرداریاں

عبدالملک بن مروان اور زہری کے ایک مفصل مکالمے میں مکہ، یمن، مصر، شام، جزیرہ، بصرہ وغیرہ علاقوں پر غلاموں کی سرداری کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخر میں عبدالملک کی زبان سے جو جملے نکلتے ہیں ان میں آخری فقرے یہ ہیں۔

"اللہ کی قسم غلاموں کو بڑے بڑے عہدوں پر سردار ہونا چاہیئے، یہاں تک کہ ان کے نام کے خطبے برسر منبر پڑھے جائیں اور عربان کے نیچے بیٹھے ہوئے ہوں" صفحہ ۱۹۷

لیبان کی مشہور کتاب "تمدن عرب" کے ایک اقتباس میں یہ فقرے ملتے ہیں:

غلامی کا یورپین تصور ان غریبوں کو پیش کرتا ہے جو زنجیروں میں بندھے ہوئے ہوں۔ اور ان پر کوڑے برسائے جا رہے ہوں۔۔ بقائے حیات کے لیے کافی غذا بھی نہ ملتی ہو، اندھیری کوٹھڑیوں میں رہتے ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ اسلام میں غلاموں کا جو تصور ہے، وہ عیسائیوں کے غلاموں سے بالکل مختلف ہے" صفحہ ۲۱۷

ڈچ اسکالر اور سیاح SNOUKE HURGRONAE جس نے مکہ معظمہ میں علماء اسلام کے ساتھ چھ ماہ گزارے تھے، لکھتا ہے۔

"آزاد ہونے کے بعد (مسلمان) غلاموں کے لیے کسی عہدہ یا منصب کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔ وہ آزاد ہو کر اصلاً آزاد لوگوں کے بالمقابل ہر قسم کے کاروبار زندگی میں نظر آتے ہیں اور نتائج بتاتے ہیں کہ وہ اس مقابلے میں کسی طرح بھی آزادوں سے پیچھے نہیں، سب سے زیادہ با اثر شہری گھروں اور دکانوں کے مالک وہی لوگ ہیں، جو پہلے غلام تھے۔ ان کی کالی کھال ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی صفحہ ۲۱۸ و صفحہ ۲۱۹۔

مسٹر جوزف تھامپسن جو افریقہ کا مشہور سیاح ہے، لنڈن ٹائمز مورخہ ۱۴ نومبر ۱۸۸۷ء کے نام ایک خط میں "مشرقی افریقہ میں غلامی" کے زیر عنوان لکھتا ہے:

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشرقی افریقہ سے متعلق جتنا وسیع میرا تجربہ ہے آپ کے اخبار کے کسی اور نامہ نگار کا نہیں ہے کہ اگر یہاں غلاموں کی تجارت کا بازار گرم ہے تو اس کی وجہ ایک بڑی حد تک یہ ہے کہ ان علاقوں میں اسلام کا پروپیگنڈا نہیں کیا گیا اور میرے پاس یہ یقین کرنے کے قوی اسباب ہیں کہ اگر یہاں اسلام کو روشناس کر دیا جاتا، تو بردہ فروشی کا کبھی کا مکمل خاتمہ ہو چکا ہوتا" ص۲۱۹

ایک متعصب عیسائی ڈاکٹر مارکس ڈاڈس کے ایک طویل اقتباس میں یہ جملے ملتے ہیں:

"افسوس ہے کہ عیسائی ملکوں میں اس (انسانی مساوات) پر عمل نظر نہیں آتا۔ حضرت عمرؓ اپنے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے نکلتے ہیں، اور ان کا غلام اونٹ پر سوار ہے۔

پیغمبر اسلام کی جگر گوشہ حضرت فاطمہ اپنی باندیوں کے ساتھ ساتھ چکی پیستی نظر آتی ہیں، یہ وہ نمونے ہیں، جن میں آپ کی تعلیم کی مکمل مثال ملتی ہے۔ ص۲۲۲

سید امیر علی لکھتے ہیں:

(اسلام کی رو سے) جو شخص غلاموں کی تجارت کرتا ہے، اس کو انسانیت سے خارج کر دیا گیا ہے ... خرید و فروخت کے ذریعہ غلامی اول چار خلفاء راشدین کے عہد میں قطعاً نامعلوم ہے۔ کم از کم ایک بھی مستند دلیل اس امر کی نہیں ہے کہ خلفائے اربعہ کے عہد میں کوئی ایک غلام بھی خرید کر حاصل کیا گیا ہو ــــ اولین خلفاء عباسیہ کے زمانے میں شیعہ امام حضرت جعفر صادقؒ نے غلامی کے خلاف بہت پُر اثر وعظ کیا۔ ص۲۲۱

اس بحث کا خاتمہ عہد حاضر کے نامور مفکر اسلام علامہ سید رشید رضا المصریؒ کے ایک اقتباس پر کیا گیا، جس کی آخری سطور حسب ذیل ہیں:-

"... اسلام نے نہ تو غلام بنانے کا حکم دیا ہے، نہ اس کو فرض قرار دیا ہے اور نہ سنت، بلکہ وہ ایک رواج تھا جو تمام قوموں میں پایا جاتا تھا۔ اس لیے اس کے متعلق اسلام نے ایسے حکمت آمیز احکام وضع کئے جو اس رواج کو محو کر دیں۔ ص۲۷۱

آخر میں صرف ایک سطر چیمبرس جرنل کی، جو ایک یورپین فاضل ہیں، ملاحظہ فرما لیجئے:

"یہ واقعہ ہے کہ مسلمان غلام کی حالت اکثر اوقات قدیم زمانے کے آئین کے نواب و بادشاہ کا مقابلہ کرتی ہے۔" ص۲۴۲

غلامی اور ابوالکلام

مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتبہ ابوسلمان شاہجہان پوری میں افتخار احمد بلخی صاحب کے نام ایک خط ہے جس میں مولانا لکھتے ہیں کہ، امامنا بعد و اما فداءً ابطال غلامی میں قول فیصل ہے اور قرآن کریم میں جہاں کہیں ما ملکت ایمانکم کا تذکرہ ہے وہ دور ماضی کی مملوکات کا ہے، آئندہ کے لیے یہ سلسلہ بہر حال ختم۔

غلامی مولوی محمد علی کی نظر میں

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ ... وَفِي الرِّقَابِ ... (توبہ-۶۱) صدقات صرف ناداروں اور مسکینوں کے لیے ... اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے ... الخ۔ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"..... فی الرقاب"، جس کے معنی گردنوں کا آزاد کرنا ہیں اور یہ تین طرح پر ہو سکتا تھا۔ اول یہ کہ حکومت کی طرف سے ان لوگوں کی امداد کی جائے جو غلامی کی حالت سے نکلنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ اسلام نے غلام کو یہ حق دیا تھا کہ وہ مکاتبہ کرے، لیکن اس کی آزادی مشروط ہو اس بات پر کہ ایک خاص رقم مالک کو جمع کر کے دے تو اس میں امداد دینا یا رقم کا مہیا کر دینا حکومت کا فرض ٹھہرایا کہ وہ بیت المال سے ان لوگوں کی امداد کرے۔

دوم یہ کہ حکومت خود مالکوں سے خرید کر ان کو آزاد کرے سوم یہ کہ اس سے اسیران جنگ کا فدیہ ادا کیا جائے۔ وہ اسیران جنگ ظاہر ہے کہ دشمن قوم میں سے اور پھر غیر مسلم ہوں گے یہ تعلیم اسلامی کی وسعت ہے" (بیان القرآن" جلد دوم ص۹۶۰)

مکاتبت کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کتابتہ جس سے مراد غلام کو تحریر کا لکھ دینا ہے کہ وہ اس شرط پر آزاد ہے، اسلامی لفظ ہے۔ اہل جاہلیت اسے نہ جانتے تھے (روح المعانی) نکاح کے ذکر میں غلاموں کی کتابت کا ذکر کیا ہے فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا (نور-۳۳) یعنی غلاموں کو آزاد کرنے کا منشاء یہ ہے کہ وہ آزاد ہو کر نکاح کو زیادہ پسند کریں گے اور یہاں مکاتبت کی شرط یہ رکھی ہے إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا اگر ان میں بھلائی کا علم ہو یعنی یہ دیکھ لو کہ وہ آزاد ہو کر اپنے لیے بھی اور قوم کے لیے بھی مفید ہو سکتے ہیں۔ یہ اس لیے فرمایا کہ غلامی انسان کو بعض وقت نہایت ذلیل حالت تک پہنچا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بھلے برے کو بھی نہیں سوچ سکتا۔ اور پھر ان کو صرف تحریر دے دینے کا حکم ہی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے کچھ انہیں بھی دو۔ یعنی مالی طور پر ان کی مدد کرو اور یہ حکم سب مسلمانوں کو ہے۔ اسی بنا پر بیت المال سے مدد کرنے کا حکم تھا وَآتُوهُمْ مِنْ مَالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ۔ (نور-۳۳) اور زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف غلاموں کی آزادی ہے۔ قرآن کریم کے اس حکم سے بڑھ کر کس نے غلاموں کی آزادی کا کچھ کام کر کے دکھایا ہے" (بیان القرآن" جلد سوم ص۱۳۵۱)

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ..... فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً الخ (محمد ۴)۔

جب تمہاری ان سے مٹھ بھیڑ ہو، جو کافر ہیں تو گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب تم ان پر غالب آ جاؤ تو قید میں مضبوط باندھ لو، پھر بعد میں یا تو احسان کے طریق پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے" (ترجمہ محمد علی)

اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں،

"...اگر غلامی کا نام اسلام کی رو سے آ سکتا ہے، تو انہی لوگوں پر آ سکتا ہے جنہیں غلبہ پا کر قید کر لیا گیا ہو۔ یہی مراد ما ملکت ایمانھم سے ہے اس کی پہلی شرط ہے۔ جنگ کا ہونا، جس کا ذکر "لَقِيتُمُ" میں ہے اور جنگ میں تو قتل ہی ہے۔ پھر جب دشمن مغلوب ہو جائے، تو جو پکڑے جائیں انہیں قید کر لینا ہے ..... دشمن کا قیدیں لینا صرف بعد جنگ اور غلبہ ہی جائز ہے۔ اور غلبہ کے بعد پھر قتل نہیں، بلکہ قید کرنا ہے۔ پھر قید کر کے بھی ہمیشہ کے لیے انہیں غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ بلکہ ان کا آزاد کر دینا ضروری ہے۔ خواہ دشمن قوم سے فدیہ لے کر آزاد کیا جائے اور خواہ فدیہ لئے بغیر محض بطور احسان، وہ ہمیشہ کے لیے قید یا غلامی میں نہیں رکھے جا سکتے اور اسلام کا یہ کھلا

کھلا قانون ہے اور اسی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے۔ آپ نے جنگ بدر میں قیدیوں سے فدیہ لے کر آزاد کیا اور بہت سی جنگوں میں بطور احسان آزاد کیا۔

حنین کی جنگ میں چھ ہزار قیدی بغیر ایک حبہ فدیہ لینے کے آزاد کئے۔ بنی مصطلق کی جنگ میں بغیر فدیہ کے قیدی آزاد کئے اور بنو نضیر کی مثال اس کے خلاف نہیں۔ اس لیے کہ وہ جنگ میں مغلوب ہو کر قید نہ ہوئے تھے، بلکہ اس شرط پر صلح کی تھی کہ جو فیصلہ سعد دیں، اُسے ہر دو فریق مانیں گے اور سعد نے ان کا فیصلہ توریت کے حکم کے مطابق کر کے ان کی غداریوں کی وجہ سے مروا دینے کا فیصلہ دیا اور اگر کبھی کسی ایک آدھ آدمی کو آپ نے مارنے کا حکم دیا تو وہ اس کے کسی اور جرم کی بنا پر تھا۔ نہ کہ جنگ کرنے کی وجہ سے۔ پس یہی صحیح اسلامی قانون ہے۔ جیسا کہ روح المعانی میں بھی ہے۔ وظاھر الایۃ علی ما ذکرہ السیوطی فی احکام القرآن العظیم امتناع القتل بعد الاسر۔ اور لکھا ہے کہ حجاج نے ابن عمر کے پاس ایک قیدی قتل کرنے کو بھیجا تو آپ نے فرمایا۔ "یہ حکم ہمیں نہیں اور یہی آیت پڑھی اور جن لوگوں نے قیدیوں کے قتل کو جائز کیا ہے، تو وہ ان کی اجتہادی غلطی ہے نص صریح اس کے خلاف ہے ص ۱۰۱۶"

فکّ رقبہ (بلد - ۱۳) اس آیت میں غلام کی آزادی کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ محمد علی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

غلام کی آزادی کو ترقی کی جدوجہد میں پہلا قدم قرار دینا اسلام کی تعلیم سے خاص ہے۔ اور کسی مذہب میں یہ تعلیم نہیں پائی جاتی۔ جو بات عیسائی دنیا کو آج سمجھ آئی ہے، وہ آج سے تیرہ سو سال پیشتر ایک اُمّی کی زبان سے ظاہر کی گئی۔ یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا ..... کیسا پُر حکمت کلام ہے کہ یہاں چونکہ اصل غرض یہ تھی کہ غلاموں کی آزادی، مساکین و یتامیٰ کی خبرگیری کی تعلیم دی جائے اس لئے "و تواصوا بالصبر" کے ساتھ "تواصوا بالمرحمہ" (بلد - ۱۷) بڑھایا (مومن) نہ صرف خود یہ کام کرتے ہیں، بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی یہی نصیحت کرتے ہیں کہ مخلوق خدا پر رحم کرنا سیکھیں ص ۱۹۵۸

اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ ؕ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ (الدخان - ۱۸) موسیٰ نے قوم فرعون سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں (بنی اسرائیل) کو میرے سپرد کر دو میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں۔ اس کی تفسیر کرتے ہیں کسی قوم کا کسی وقت کسی دوسری قوم کے ماتحت ہونا، محض ایک امانت ہے۔ اور دوسری قوم کو غلام بنانا کسی کا حق نہیں۔

غلامی پرویز صاحب کی نظر میں

ذیل کے اقتباسات پرویز صاحب کی کتاب "قتل مرتد اور غلام اور لونڈیاں" سے ماخوذ ہیں۔

قرآن کے سامنے دو مراحل تھے (۱) نزول قرآن کے وقت جو غلام اور لونڈیاں عربوں اور دیگر ممالک) کی معاشرتی زندگی کا جزو بن چکے تھے، ان کا کیا کیا جائے؟ (۲) آئندہ کے لیے اس دروازے کا بند کر دینا، جہاں سے غلام اور لونڈیاں آتے تھے۔

شق اول: اگر ان تمام غلاموں اور لونڈیوں کو (جو اس وقت موجود تھے) آن واحد میں آزاد کر کے چھوڑ دیا جاتا، تو نہ صرف یہ کہ وہاں کے معاشرے میں سخت انتشار واقع ہو جاتا۔ بلکہ خود ان غلاموں اور لونڈیوں کے لیے بھی مشکلات کا سامنا ہوتا ..... قرآن نے

ایسا طریق عمل اختیار کیا، جس سے وہ آہستہ آہستہ اس آزاد معاشرے میں جذب ہوتے چلے گئے۔ انہیں حق دے دیا گیا کہ وہ چاہیں تو کچھ فدیہ ادا کر کے پروانہ آزادی حاصل کر لیں۔ کہیں خود مسلمانوں کو تاکید کر دی کہ وہ بعض کوتاہیوں کے کفارہ کے طور پر غلاموں کو آزاد کر دیں۔ اسی طرح لونڈیوں کو آہستہ آہستہ آزاد عورتوں کا سا درجہ دے دیا۔ جب تک یہ غلام اور لونڈیاں جذب نہیں ہو گئے، ان سے حسن سلوک کا حکم دیا، قرآن کریم میں اس بحث سے متعلق تمام احکام اُنہی کی بابت ہیں جو اس وقت اس معاشرے میں موجود تھے کیونکہ ہر جگہ "ما ملکت ایمانکم" (جو تمہاری ملکیت میں آچکے ہیں) کے الفاظ آتے ہیں۔ یہ کہیں نہیں کہ جنہیں تم اس کے بعد لونڈی اور غلام بناؤ شق دوم: آئندہ کے لیے غلامی کا دروازہ قرآن نے ایسی وضاحت سے بند کیا ہے کہ شک کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ص ۱۰۱-۱۰۲

اسیران جنگ کے متعلق فرمایا فَاِمَّا مَنًّا م بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً، اس کے بعد یا تو انہیں احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔ سارے قرآن میں اسیران جنگ کے متعلق یہی ایک حکم ہے ..... اس میں کسی پہلو سے بھی انہیں غلام بنانے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے! یا ..... گمان بھی گزر سکتا ہے کہ انہیں غلام بناؤ اور ان کی عورتوں سے جنسی تمتع کرو ..... انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کر دو! ..... قرآن کا حکم بالکل صاف ہے ..... جب تک جنگی مصالح کا تقاضا ہو گا یہ قیدی رکھے جائیں گے، اس کے بعد ان کی (DISPOSAL) کا سوال سامنے آئے گا۔ اس کے لیے قرآن نے دو متبادل صورتیں (ALTERNATIVES) بیان کر دیں، یعنی یا فدیہ لے کر (جس میں قیدیوں کا تبادلہ بھی شامل ہے) یا بطور احسان ان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ قرآن نے نہ انہیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے نہ غلام بنانے کا ..... ص ۱۰۱

..... یہ قیدی انسان ہیں، ان سے انسانیت کا سلوک کرو ص ۱۱۲

پرویز صاحب نے "مفہوم القرآن" میں بھی اس بحث پر اظہار خیال کیا ہے۔ آیہ "فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ..... اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء-۳) کے تحت لکھا ہے۔ (جنگ وغیرہ کی وجہ سے) حالات کا تقاضا اور معاشرے کا فیصلہ ہو تو تم) دو دو، تین تین، چار چار بیویاں تک (نکاح میں لا سکتے ہو) ..... یا وہ لونڈیاں جنہیں تم اس سے قبل اپنے نکاح میں لا چکے ہو (کیونکہ اس کے بعد تو غلام اور لونڈیوں کا سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا ہے ص ۱۷۶

اس اقتباس سے دو نکتے مفہوم ہوتے ہیں۔

۱۔ بغیر نکاح کے لونڈی سے تمتع جائز نہیں۔

۲۔ یہ حکم ماضی سے متعلق ہے۔ آئندہ لونڈی غلام کا سلسلہ ہی بند ہے۔

آیہ "فی الرقاب" (توبہ-۶۰) کا مفہوم لکھتے ہیں:

صدقات درحقیقت ان لوگوں کا حق ہے ..... جو دوسروں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں، انہیں آزادی دلانے کے لیے ص ۴۴۳۔

آیہ "وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ

فَتَیٰتِکُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۔۔۔۔ فَانْکِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ (النساء - ۲۵) کا مفہوم لکھتے ہیں:
اگر تم میں سے کسی میں اس کی استطاعت نہ ہو کہ وہ آزاد مومن عورت سے شادی کرے، تو وہ کسی مومن عورت سے شادی کرے جو کسی کی لونڈی ہو (تاکہ وہ لونڈیاں جو اس وقت تمہارے معاشرہ میں موجود ہیں، رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنتی جائیں اور اس طرح غلامی کا خاتمہ ہو جائے) ۔۔۔ لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالک کی اجازت سے نکاح کرو ۔۔۔۔ ان کے مہر ادا کر دو، وہ ایک پاک باز منکوحہ بیوی کی حیثیت سے رہنے کے لیے نکاح کرے۔ محض تمہاری شہوت رانی کا ذریعہ بننے کے لیے نہیں، خواہ اس کے لیے رسم نکاح ادا کر لی گئی ہو، یا ان تعلقات کو پوشیدہ رکھا جائے، دونوں شکلیں ناجائز ہیں ص۱۸۴، ۱۸۵

آیہ ؎ وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَآئِکُمْ، (نور - ۳۲) کا مفہوم لکھتے ہیں: تمہارے معاشرہ کا یہ بھی فریضہ ہے ۔۔۔۔ تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو شادی کی صلاحیت رکھتے ہوں، ان کے نکاح کا بھی بندوبست کیا جائے (یعنی معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ لوگوں کو مناسب رشتہ تلاش کرنے میں آسانیاں ہوں، اور جسے متاہل زندگی بسر کرنے کے لیے معاشی امداد کی ضرورت ہو، اس کا بھی مناسب انتظام کیا جائے۔ ص۸۰۲، ۸۰۳ حاشیے میں لکھتے ہیں:۔
قرآن کریم میں جہاں بھی غلام اور لونڈیوں کا ذکر آیا ہے، ان سے مراد وہ غلام اور لونڈیاں ہیں جو اس زمانے میں عربی معاشرہ میں عام طور پر موجود تھے۔ قرآن نے انہیں آہستہ آہستہ آزاد معاشرہ کا جزو بنا دیا اور آئندہ کے لیے غلامی کا دروازہ بند کر دیا ص۸۰۲

آیہ ؎ وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ فَکَاتِبُوْھُمْ ۔۔۔ الخ (نور - ۳۳) کا مفہوم ملاحظہ فرمایئے۔
غلام اور لونڈیوں میں سے جو اپنی آزادی کے لیے تم سے تحریری سند لینا چاہیں، انہیں پروانہ آزادی دے دینا چاہیئے۔
بشرطیکہ تم دیکھو کہ وہ اس قابل ہیں کہ اپنی بہبودی کا خود خیال رکھ سکیں گے ص۸۰۳

تعدد ازواج اور خواجہ احمد الدین

سورہ نساء کی ابتدائی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے خواجہ صاحب تعدد ازواج کے مبحث پر روشنی ڈالتے ہیں:
تعدد ازواج سے جہاں تک ممکن تھا، منع کیا گیا ہے، جو عورتیں اپنے حقوق چھوڑ کر بھی الگ نہیں ہونا چاہتی تھیں اور بہنوں کی طرح گزارا کرنے پر راضی تھیں۔ وہی نکاح میں اکٹھی رہ سکتی تھیں۔ یہ بات عورتوں کو ظلم سے بچانے اور ان کی ضروریات کا انتظام کرنے کے لیے تھی۔ جنگوں میں اکثر مرد ہی مارے جاتے تھے۔ کمزور عورتوں کے لیے باہر جا کر شوہر تلاش کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے پس عورتوں کی حفاظت کی خاطر یہ بات عورتوں کی خوشی اور پسند پر چھوڑی گئی ہے۔ ورنہ مردوں کے لیے ہرگز اجازت نہ تھی کہ وہ اپنی خوشی سے خواہش نفسانی کو پورا کرنے کے لیے ایک سے زائد بیویاں رکھیں (" بیان للناس"، منزل اول ص۵۲۵)
اس تمہید کے بعد آیات متعلقہ کا تفسیری ترجمہ آتا ہے۔
یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا

وَ نِسَاۗءً (النساء - ۱۸)

یہود میں تعدد ازدواج کا بڑا رواج تھا - بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی کوڑیوں بیویاں اور حرمیں تھیں.
مجوس ایسے مذاہب ہیں ماں، بہن کی بھی تمیز نہیں ہے - اس لیے فرمایا کہ تم سب انسان ہو (یا ایھا الناس) انسانیت کو ملحوظ رکھو،
تمہارا رب ایک ہے (ربکم الذی خلقکم) وہ سب کی بھلائی چاہتا ہے تم سب ایک کنبہ ہو (من نفس واحدۃ) اپنی بیٹی کی
کی طرح دوسروں کی بیٹیوں کی بہتری چاہو ــــ یہ انداز ہے کثرت ازدواج سے روکنے کا ــــ تعدد ازدواج کے سبب میاں
بیوی میں یک جہتی اور اخلاص نہیں رہتا، بدگمانیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں .... زیادہ بیویوں کا خرچ پورا کرنے کے لیے انسان بہت سی بد
دیانتیاں کرتا ہے، یتیموں کا مال بھی کھا جاتا ہے - جو آگ کھانے کے برابر ہے -

اللہ تعالیٰ نے رکوع اول "نساء" میں تعدد ازدواج کے متعلق بہت کچھ اصلاح سے آغاز فرمایا ہے - آخر میں قطعاً منع کر دیا ہے
اور یتامیٰ کے مال کی حفاظت کا بیان بھی آ گیا ہے جیسا کہ فرمایا:

اے انسانو! اپنے پالنے والے (اور تربیت کرنے والے) سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس (کی جنس)
سے اس کی بیوی کو بنایا (حضرت آدم کے لیے خدا تعالیٰ نے صرف ایک ہی بیوی بنائی تھی، حالانکہ اس وقت آدمیوں کے پھیلانے کی بہت
ضرورت تھی - دیکھئے ایک بیوی سے بھی بکثرت اولاد حاصل ہو سکتی ہے) ان دونوں (آدم و حوا) سے مرد بہت سے اور عورتیں پھیلائیں
(مرد عورتوں سے کسی قدر زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور اسی قدر بچپن میں مر بھی جاتے ہیں - پس مرد و عورت کی تعداد قریباً یکساں رہتی ہے،
اس صورت میں تعدد ازدواج کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے) .... (یتیموں کا مال کھانا ہر شخص کے نزدیک سخت گناہ ہے - پھر بھی
اس کو چٹ کر جاتے ہیں - تعدد ازدواج سے روکنے کی تمہید میں اس سخت گناہ کا ذکر بطور تمہید لایا گیا ہے) وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى
اَمْوَالَهُمْ (تم ایسی حرکتیں بیویوں کی کثرت کے سبب ہی کر گزرتے ہو ــــ وہ لوگ یتیموں کے بارے میں بے انصافی کا خود
بھی اعتراف کیا کرتے تھے اور اس سے خائف بھی رہتے تھے - اس لیے فرمایا) اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا
مَا طَابَ لَكُمْ .... (النساء - ۳) اگر تم کو خوف ہو کہ تم (اس صورت میں) یتیموں سے بے انصافی کرو گے (تو تم پر کس نے یہ
مصیبت ڈالی ہے کہ تم اتنے زیادہ نکاح کر لیا کرو - ہاں اگر کبھی جنگوں کے دنوں میں بے پناہ عورتیں زیادہ ہو جائیں اور وہ دوسرے
علاقوں میں جانا پسند نہ کریں تو ایسے ضرورت کے وقت میں اجازت ہے کہ) تم لوگ ان عورتوں سے جو تمہارے (نکاح میں آنے کے)
لیے خوش ہوں (ما طاب لکم من النساء - (اپنے درمیان) دو دو اور تین تین اور چار چار کر کے بیاہ کرو (لیکن یہ نکاح بھی پسندیدہ
نہیں کیونکہ عورتوں کے درمیان عدل نہیں ہو سکتا) سو اگر تمہیں خوف ہو کہ تم (عورتوں کے درمیان) عدل نہیں کرو گے تو ایک آزاد
عورت سے یا (اگر ایک آزاد عورت بھی نہ مل سکے "النساء ۵") تو اپنی قوم کی ایک لونڈی سے نکاح کرو (نساء ۲۵) یہ بات (یعنی ایک
عورت سے نکاح) اس بات کے قریب ہے کہ تم سے ظلم نہیں ہو گا .... کوئی نیک آدمی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ دو عورتوں کے
ساتھ عدل پر قادر ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ تم حرص کے باوجود عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر

سکو گے (نساء ۱۲۹) ہاں اگر عورتیں سب کی سب کسی کے نکاح میں آنے کے لیے خود راضی ہوں اور عدل کو معاف کر دیں تو مرد کی خواہش کے لیے نہیں، بلکہ عورتوں کو مظلومیت اور کس مپرسی سے بچانے کے لیے چار کی حد تک نکاح صحیح ہو سکتا ہے) منزل اول ص ۵۵۸، ۵۵۹

سرسید اور غلامی[1]

قدیم انبیاء و حکماء کے نزدیک غلامی جائز تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں: زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ایک فیاض شخص، محمد رسول اللہ کا اصول مقررہ، جس نے غلامی کی جڑ کو کاٹا اور موجودہ غلاموں کی حالت کو سنوارا اور جہاں تک ممکن ہوا، ان کو آزادی کا خلعت پہنایا، ایسا غفلت میں پڑا رہا کہ بہت ہی کم اس (اصول) پہ خیال ہوا۔۔۔ ص ۱۶۸ مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ دنیا میں غلامی کا نشان باقی نہ رکھتے اور غلاموں کو آزادی کا فرمان مذہب اسلام کے مطابق جاری کرتے۔۔۔ مذہب اسلام کے مطابق غلاموں کی تجارت اور بردہ فروشی جائز نہیں یہ ایک گناہ عظیم ہے ص ۱۶۹۔۔۔ بانیٔ اسلام[2] نے جس طرح شراب خوری کو بتدریج ختم کیا تھا، اسی طرح غلامی کو بھی رفتہ رفتہ مسدود کر دیا۔۔۔ طرح طرح سے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی، اس کو تمام دنیا کی نیکیوں سے افضل بتایا۔ پھر ان کو آزاد کرانے کی مؤثر اور قابل عمل تدبیریں اختیار کیں۔ اور اس کے ساتھ ہی آئندہ غلامی کا انسداد فرمایا۔۔۔ چنانچہ عہد رسالت میں پھر کسی کو لونڈی یا غلام نہیں بنایا گیا ص ۱۷۱

غلامی ڈاکٹر عبدالحکیم خان[3] مفسر قرآن کی نظر میں

سورہ نور کی آیت ۳۳ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ ۔۔۔ الخ (اور تمہارے غلاموں سے جو تحریر چاہیں، ان کو تحریر لکھ کر دے دو، بشرطیکہ تم ان میں بہتری دیکھو) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

اگر غلام درخواست کرے کہ میں محنت مزدوری سے روپیہ کما کر دے دوں گا تم مجھے آزاد کر دینا ـــ اور مالک اس پر رضا مند ہو۔۔۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم ہے کہ تحریر (آزادی) دیئے پیچھے خود بھی سلوک کرتے رہیں۔ یا اپنا روپیہ دے کر ان سے کمائی کرالیں۔ اس کے سوا غلاموں کی آزادی کے لیے قرآن مجید نے اور بھی صورتیں مقرر فرمائی ہیں۔ اول، غلام آزاد کرنا عظیم کار ثواب ہے۔ دوم،

---

[1] سرسید کی کتاب "ابطال غلامی" غالباً نایاب ہو چکی ہے۔ راقم کو یہاں تک پہنچ کر ایک کتاب "سرسید اصلاح معاشرہ" از شاہد حسین رزاقی مل گئی۔ اس سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔

[2] بانی و شارع اسلام اللہ ہے۔ بعض مسلمان، مغربی مصنفین کی تقلید میں رسول اللہ کو بانی و شارع اسلام کہتے ہیں۔

[3] یہ صاحب، قادیانی مرزا صاحب کے اولیں مریدوں میں سے تھے، درم و قلم ہر طرح سے ان کی امداد کرتے تھے پھر جب ان کے دعاوی آگے سے آگے بڑھتے گئے اور انہوں نے اپنی ذات کو مدار ایمان قرار دے لیا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو اعتدال پہ لانا چاہا، لیکن ان پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی بھرپور تحریری مخالفت کی اور ان کی مریدیاں سے تائب ہو گئے۔ دونوں حریفوں میں الہامی پیش گوئیوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ جو دونوں کے خیال میں ایک دوسرے کے حق میں پوری ہوئیں۔ ایلوپیتھک (طب جدید) اور اسلامیات پہ انہوں نے متعدد مبسوط کتابیں لکھیں جواب ناپید ہیں۔ راقم کو ان کی تصنیف "تفسیر القرآن بالقرآن" ایک قدیم کتب خانے سے دستیاب ہوئی ہے۔ جو اس وقت پیش نظر ہے۔

مد زکوٰۃ وصدقات میں غلاموں کی آزادی کے لیے دائمی طور پر حصہ مقرر کر دیا۔ سوم قسم توڑنے اور ظہار[1] کا کفارہ، غلام کو آزاد کرنا مقرر فرمایا۔ چہارم، رسول اللہؐ نے تاکید فرمائی کہ غلاموں کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ، جو خود پہنتے ہو اور ان کے ساتھ مل کر کام کیا کرو۔ پنجم، حضورؐ اور صحابہؓ نے عملاً غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا نمونہ پیش کر دیا۔

آیہ اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (بعد میں احسان سے یا فدیہ لے کر اسیرانِ جنگ کو چھوڑ دو) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

.... پرانی رسم غلامی کا استیصال فرمایا گیا، جو رحمۃ للعالمین اور ہادی محسن کے واسطے نہایت ہی ضروری امر تھا .... جو لوگ غلامی میں رکھے جائیں، ان کی خلاصی کے واسطے بہت سے سبیل قائم کیے ....

مسٹر باسورتھ سمتھ کا ایک طویل اقتباس نقل کرتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

حضرت موسیٰ نے عادات ورسوم ملکی .... غلامی وغیرہ کو جیسا پایا ویسا ہی رکھا۔ اسی طرح مذہب عیسوی نے بھی اپنے زمانے کی کل قومی اور پولیٹیکل رسوم و دستورات کو ملیا میٹ نہیں کیا .... مگر نبی آخرالزمان محمدؐ نے غلامی کا انسداد نہایت دانائی اور حکمت سے کیا اور یہ اصول قرار دیا کہ جو قیدی مسلمان ہو جائے، وہ آزاد سمجھا جائے۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ حکم دیا کہ کوئی آزاد شدہ غلام دیانت دارانہ محنت و مشقت کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ذلیل نہ سمجھا جائے .... الخ"۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ہرگز کوئی یہ نہ کہے کہ میرا غلام اور میری لونڈی، تم سب خدا کے غلام ہو اور تمہاری سب عورتیں خدا کی لونڈیاں ہیں۔

غلامی سید قطب شہید مصری کی نظر میں

سید قطب شہید نے اپنی کتاب "اسلام اور جدید ذہن کے شبہات" (مترجمہ محمد سلیم کیانی) میں ۵۲ صفحات "اسلام اور غلامی" کے موضوع پر صرف کیے ہیں۔ تمہید میں عہد روما میں غلاموں کے ساتھ ہولناک وحشیانہ مظالم کا ذکر ہے۔ پھر اسلام کا انقلاب آفریں اعلان" ___ عادلانہ برتاؤ کی تعلیم اور باہمی تعلق کی بنیاد"، آیاتِ قرآنی سے واضح کی ہے۔ اس میں "یورپ کی شہادت" لاتے ہیں کہ

یورپ کے متعصب مصنفین تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کے دورِ اول میں غلاموں کو ایسا بلند مقام حاصل تھا، جس کی نظیر دنیا کی کسی اور قوم یا خطے میں نہیں ملتی۔ مسلم معاشرے نے انہیں ایسا باعزت مقام بخشا کہ بند غلامی سے رہائی کے بعد بھی کوئی غلام اپنے سابقہ آقاؤں کے خلاف غداری کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔[66]

احترام انسانیت

ایک غلام کی جان دلیسی محترم قرار پائی جیسے کسی آزاد انسان کی اور خود قانون نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اس کے خلاف قول یا عمل کی ہر زیادتی ممنوع قرار پائی۔ حضورؐ نے انہیں "غلام" کہہ کر پکارنے سے روک دیا تاکہ ان کا ذہنی بُعد ختم ہو اور وہ اپنے کو آقا کے کنبے کا فرد سمجھنے لگیں .... جسمانی تکلیف یا نقصان پہنچانے پر آقا اور غلام دونوں کے لئے یکساں تعزیرات بنائی گئیں ___ آقا کو غلام کے چہرے پر طمانچہ مارنے سے روک دیا گیا۔[67، 66]

---

[1] قدیم جاہلی طلاق کی ایک قسم۔

غلامی سے آزادی کے لیے دو طریقے اختیار کئے۔

۱۔ العتق، یعنی مالکوں کی طرف سے غلاموں کی رضا کارانہ آزادی۔

۲۔ مکاتبت، یعنی غلام اور آقا میں آزادی کا تحریری معاہدہ

عملاً حضورؐ نے اپنے تمام غلاموں کو آزاد کر کے بہترین نمونہ پیش کیا۔ پھر صحابہؓ نے بھی اسی کی پیروی کی۔ عتق کے اس طریقے سے غلاموں کی اتنی کثیر تعداد آزاد ہوئی کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

کفارہ گناہ کے طور پر بھی غلام آزاد کئے گئے ——— مکاتبت (تحریری معاہدے) کے بعد اگر غلام مطلوبہ رقم مالک کے حوالے کر دیتا تو مالک اسے آزادی دینے پر مجبور ہو جاتا۔ ورنہ بصورت انکار غلام عدالت سے رجوع کر سکتا تھا عدالت کو پورا اختیار حاصل تھا کہ طے شدہ رقم وصول کر کے پروانہ آزادی اس کے حوالے کر دے۔

خزانہ عامرہ سے آزادی کے طالب غلاموں کی مالی اعانت کی جاتی تھی اور یہ سب کچھ محض رضائے الہٰی کے حصول کے لیے ہوتا تھا۔

سید قطب بعض ذہنوں کے اس سوال کا کہ اسلام نے غلامی پر آخری ضرب کیوں نہیں لگائی! ——— مفصل جواب دیتے ہیں کہ

قبل اسلام غلامی معاشرتی اور معاشی نظام کا ایک ناگزیر جزو بن چکی تھی، ... دائمی غلامی میں گرفتار رہنے سے غلام کی نفسیاتی زندگی کا ایک مخصوص مزاج بن جاتا ہے، وہ آزادی اور ذمہ داری کے احساس سے خالی ہو جاتا ہے اور اس قابل نہیں رہتا کہ آزاد معاشرے کے ذمہ دار فرد کی طرح اپنی ذمہ داریاں کما حقہ بجا لا سکے نہ وہ آزادانہ سوچ سکتا ہے، اور نہ محض اپنے بل پر کوئی اقدام ہی کر سکتا ہے۔

دیکھئے غلامی کا منحوس سایہ آزاد ہونے کے بعد بھی کس طرح اہل مشرق کی روحوں پر اب تک مسلط ہے۔ ان کے عمال حکومت میں سے کوئی بھی آزاد مغربی سے آزاد فیصلے کرنے کا اہل نظر نہیں آتا ..... اگر ان لوگوں کی ذہنیت غلامانہ نہ ہوتی تو وہ یوں بے جان مشینیں بن کر نہ رہ جاتے ..... یہ لوگ بظاہر آزاد دکھائی دیتے ہیں، مگر درحقیقت ان کی حالت غلاموں سے کچھ بھی بہتر نہیں۔

غلامانہ ذہنیت محض غلامی کے خلاف حکم جاری کر دینے سے ختم نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے اندرونی انقلاب اور نئے حالات پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام نے ٹھیک انہی خطوط پر تدریجی کام جاری رکھا ..... جب ایک بار انسان آزادی اور انسانی عظمت کو پہچان لیتا ہے، تو پھر وہ اس کے تقاضوں اور ذمہ داریوں سے گھبراتا نہیں، اور نہ نو آزاد امریکی غلاموں کی مانند دوبارہ غلامی کی آغوش میں گوشہ عافیت ڈھونڈتا ہے۔

آپؐ نے مدینے میں آ کر عرب سرداروں کو آزاد کردہ غلاموں کا بھائی بنا دیا ..... اخوت کا یہ رشتہ حقیقی خونی رشتے سے کم نہ تھا۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے وارث قرار دئے گئے ——— اسی پر بس نہیں کیا۔ اپنی پھوپھی زاد بن زینب کو اپنے غلام زید کے حبالہ عقد میں دے دیا ۔۔ غلاموں کو فوجی وقومی سیادت کے مناصب بھی عطا کئے ..... حضرت عمرؓ کو جب اپنا جانشین منتخب کر لے

کی ضرورت پیش آئی تو فرمایا:

"اگر ابو حذیفہؓ کا غلام سالمؓ بقید حیات ہوتا، تو میں اس کو خلیفہ مقرر کر دیتا۔"

بے شمار ایسی مثالیں موجود ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلاموں کی روحانی اور ذہنی سطح بلند کرنے، ان کو آزادی کے لائق بنانے اور پھر عملاً آزاد کرنے پر پوری پوری توجہ دی جاتی تھی۔ یہ سب کچھ کسی خارجی دباؤ کے تحت نہیں ہوا، بلکہ معاشرے میں تعاون، محبت، خیر سگالی اور حصول رضائے الٰہی کے جذبے سے ہوا۔ اس کے برعکس یورپ میں شدید نفرت انگیز طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں غلام آزادی سے روشناس ہوئے۔ اس نفرت نے انسان کے روحانی ارتقا کو سخت صدمہ پہنچایا (تلخیص از ص۵۶ تا ۶۰)

طریقۂ میراث پر تنقید شدید

گذشتہ چودہ صدیوں میں خواجہ احمد الدین پہلے شخص ہیں جنہوں نے مروجہ طریق میراث پہ ایک ماہر حساب دان کی حیثیت سے قلم اٹھایا۔ اگرچہ اس طویل مدت میں امت میں بے شمار اکابر پیدا ہوئے، جن کی دینی و اصلاحی خدمات احیاو ابقائے اسلام کا ذریعہ بنتی رہیں۔ جن کے علمی، اخلاقی، روحانی مرتبہ اور مجاہدانہ مساعی نے اسلامی اقدار کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا، لیکن اس روزمرہ کے پیش آنے والے مسئلے کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوئی۔ خواجہ صاحب کے معاصرین میں کئی اصحاب شیخ الہند، امام الہند مجدد مائۃ حاضرہ اور مختلف القاب سے ملقب ہوئے۔ بعض نے بہت آگے بڑھ کر اپنی ذات کو منوانے کے لیے آسمانی والہامی دعاوی کا انبار لگادیا۔ لیکن طریق میراث کی مہلک اغلاط، یتیم کش اور خانہ برانداز مظالم کو کسی نے قابل اعتنا نہ سمجھا ــــ خواجہ صاحب نے بیسویں صدی کے آغاز میں ایک مفصل رسالہ لکھا۔ جس پر تقلید پسند جمہور نے کفر کے فتوے لگائے اور بعض اہل فکر نے اس کی تائید میں قلم اٹھایا۔

مولانا سید سلیمان ندوی ؒ نے معارف، میں اس پر فراخدلانہ تبصرہ[1] کیا اور اس کے مندرجات کو قابل غور و توجہ قرار دیا۔

تفسیر سرسید ؒ کے حاشیہ نویس "محمد علی بابا" نے بھی اس کی تائید کی ــــ مولانا حافظ اسلم جیراجپوری ؒ نے تو اس کا عربی میں ترجمہ "الوراثۃ فی الاسلام" کے نام سے کر دیا تھا۔

خواجہ صاحب نے اپنی تفسیر سورۂ نساء میں آیات توریث کا بامحاورہ ترجمہ کرتے ہوئے، مروجہ طریقہ توریث پر یہ تنقید کی ہے۔

"موجودہ طریقہ میراث یقیناً بے اصول اور بہت کچھ فضول ہے۔ یہ اس وقت کی ایجاد ہے، جب کہ مسلمانوں میں سینکڑوں قسم کے اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ قرآن حکیم فرماتا ہے کہ ہم نے سب حصے بیان کر دیئے ہیں۔ مناسب تو یہ تھا کہ علماء قرآنی اصول کے ماتحت وہ حصے نکال کر دکھاتے الٹا وہ قرآنی اصول کو حدیث اور اجماع سے منسوخ ٹھہرانے لگے۔

کمترین (خواجہ احمد الدین) نے موجودہ قواعد میراث کی بے شمار غلطیاں نکال کر علماء کی خدمت میں پیش کی ہیں اور نہایت ادب

---

[1] یہ تبصرہ اور الوراثۃ فی الاسلام مترجمہ جیراجپوری خواجہ صاحب کے خلف ارشید ڈاکٹر خواجہ نجا اللہ صاحب کے پاس موجود ہے۔

[2] راقم نے ان بزرگوار کو بڑھاپے کی عمر میں دیکھا ہے۔ ماہور میں رہتے تھے۔ جب امرتسر آتے تو خواجہ صاحب سے ضرور ملتے۔ خواجہ صاحب اکثر ان کے رفقاء ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے۔ آواز میں گداز ہوتا تھا۔ راقم کو متعدد مرتبہ ان صحبتوں اور نمازوں میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی۔

سے درخواست کی ہے کہ ان کا جواب دیا جائے۔ یہ حسابی مسئلہ ہے، حسابی غلطیوں کا پتا ہر شخص کو لگ سکتا ہے۔ حساب میں فضول تاویلوں سے کام نہیں نکل سکتا۔ اصول حساب میں خوارق و معجزات کو داخل کرنے سے بھی بات نہیں بنتی۔ کوئی روایت خوانی، تاریخ دانی اور چرب زبانی حسابی اصول کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا سکتی۔ بعض اصحاب نے اپنے آپ کو خواب میں خدا بنا ہوا بھی دیکھا اور سب کچھ بن بیٹھنے کا دعویٰ بھی کیا۔ انہوں نے بھی اس حسابی مسئلہ کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ بلکہ انہوں نے ایسے مسائل میں اپنی خلاصی اس اقرار کے ساتھ کرائی کہ ہم ایسے مسائل میں دوسرے مجتہدوں ہی کے مقلد اور تابع ہیں۔ افسوس ہے کہ انہیں ایسے (بڑے بڑے) دعووں کے ساتھ اس اقرار میں اپنی کمزوری نظر نہ آئی۔ اگر ان کا انکار مسلم کو کافر بنا دیتا ہے، تو جن مجتہدوں کے وہ ایسے دینی امور میں تابع ہیں۔ کیا ان کا انکار کافر بنانے والا نہیں ہوگا؟[1]

سال ہا سال گزر گئے، مگر کسی نے آج تک تقسیم میراث کی غلطیوں کا جواب تک نہیں دیا۔ اگر یہ سچ مچ غلطیاں ہیں تو امید ہے کہ اب علماء اپنی فضیلت کے دعووں کو ایک طرف رکھ کے یا ان دعووں کی عزت دکھلانے کے لیے ٹھنڈے دل سے اس طرف متوجہ ہوں گے اور قرآن حکیم کے پیش کردہ اصول سے ہی تمام حصے نکال کر دکھائیں گے۔"

---

[1]۔ ان سطور میں اشارہ ہے مرزا قادیانی صاحب کی طرف جن کی تصانیف کا بیش تر حصہ اپنی ذات کے متعلق متضاد قسم کے نئے نئے دعاوی، اثبات دعاوی اور تکفیر مسلمین پر مشتمل ہے۔

عورتوں کی اصلاح و حفاظت

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ۳۴ اس آیت کا عام ترجمہ یہ ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں مولوی محمد علی کہتے ہیں کہ " مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں "

مولانا ابوالکلام کا ترجمہ ہے " مرد عورتوں کی زندگی کے بندوبست کرنے والے ہیں۔

پرویز صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ " عورت بیشتر وقت کے لیے کسب معاش سے معذور ہو جاتی اور اس کی ضروریات کا مرد کفیل ہوتا ہے " (دیکھئے زیر نظر آیہ کا مفہوم صـ۱۸۸)

خواجہ احمد الدین لکھتے ہیں " مرد عورتوں پر محافظ ہیں " (یہاں مرد اور عورت سے مراد میاں بیوی نہیں ، بلکہ محافظ و منتظم لوگ ہیں ، وہ کیوں محافظ و منتظم بنائے گئے ہیں اس لیے کہ اللہ نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ وہ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۳۴)

اس کے بعد اپنے اس خیال کا اضافہ کرتے ہیں۔

" اگر عورتیں بھی قوت و مال سے مدد دے سکیں تو اس (منتظمہ) کمیٹی میں شامل ہو سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح عورتوں کی حفاظت کردی ہے "

عورتوں کو وعظ و سزا

وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۳۴ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ ـــ جن عورتوں کی سرکشی کا تمہیں ڈر ہو ، تو ان کو وعظ کرو ـــ اور خواب گاہوں میں ان کو الگ کردو ـــ اور ان کو مارو۔

قدیم و جدید مفسر و مترجم اس پر متفق ہیں کہ آیت میں شوہر مخاطب ہیں اور ان کو یہ حق حاصل ہے کہ بدرجہ آخر اپنی بیویوں کو مار پیٹ کر سکتے ہیں۔ اس معنی کی بنیاد متعدد احادیث ہیں ، جو قرطبی وغیرہ تفاسیر میں منقول ہیں۔

خواجہ صاحب آیت کا تشریحی ترجمہ حسب ذیل کرتے ہیں :۔

(اے منتظمو !) جن عورتوں کی سرکشی اور قانون شکنی کا تمہیں خوف ہو (کہ وہ اپنے شوہروں کو بے جا ستاتی رہتی ہیں) تو تم انہیں نصیحت کرو ، اور (اگر نصیحت کام نہ دے سکے ، تو) ان کو (ان کی) خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو (یعنی شوہروں سے کہو کہ ان کے پاس نہ جائیں) اور (اگر یہ بھی مفید نہ ہو سکے ، تو) انہیں مارو (یعنی سمجھدار عورتوں کے ذریعے سے انہیں پٹواؤ ۔)

جہاں تک راقم مرتب کے مطالعہ کا تعلق ہے۔ خواجہ صاحب اس میں منفرد ہیں لیکن وہ اپنی تائید میں اگلی آیت ۳۵ کو پیش

کرتے ہیں، جس میں منتظمین کو بصیغہ جمع اور میاں بیوی کو بصیغہ تثنیہ دیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے۔ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۔ ترجمہ خواجہ صاحب:

اور (اے حاکمو!) اگر تمہیں ان دونوں (یعنی میاں بیوی) کی مخالفت (یا مقابلہ) کا خوف ہو، تو تم ایک منصف میاں کے اہل سے اور ایک منصف بیوی کے اہل سے کھڑا کرو۔۔۔ الخ

اس موقع پر مفسرین بھی "خفتم" کا خطاب حاکموں ہی کی طرف سمجھتے ہیں۔ چنانچہ قرطبی میں ہے:

الجمهور من العلماء ان المخاطب بقوله: وان خفتم "الحكام والامراء ان يريدا اصلاحًا" يعنى الحكمين، فى قول ابن عباس ومجاهد وغيرهما، اى ان يريد الحكمان اصلاحًا يوفق الله بين الزوجين وقيل المراد الزوجان الجزء الخامس ص۱۷۵ (قاہرہ۔ مصر)

خواجہ صاحب کے بعد پرویز صاحب تنہا ان کے ہم نوا دکھائی دیتے ہیں۔

(عورتوں کی سرکشی کی صورت میں) ارباب حل و عقد کو چاہیے کہ انہیں سمجھانے کی کوشش کریں۔ (فعظوھن) اگر وہ اس سے بھی صحیح راستے پر نہ آئیں، تو اگلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ان کے خاوند ان سے علیحدگی اختیار کر لیں اور اس نفسیاتی اثر سے ان میں ذہنی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ اس پر بھی سرکشی سے باز نہ آئیں تو عدالت انہیں بدنی سزا بھی دے سکتی ہے"

(مفہوم القرآن ص۱۸۹)

○

حرمتِ رضاعت

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ ... أُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ [۴:۲۳] حرام ہوئی ہیں تم پر.... تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور دودھ کی بہنیں۔ اس کی عام تفسیر یہ ہے کہ محرمات رضاعی دو ہیں، ماں اور بہن اور اس میں اشارہ ہے کہ ساتوں رشتے جو نسب میں بیان ہوئے رضاعت میں بھی حرام ہیں یعنی رضاعی بیٹی اور پھوپھی اور خالہ اور بھتیجی اور بھانجی بھی حرام ہیں۔ چنانچہ حدیثوں میں یہ حکم موجود ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے قرطبی وغیرہ — حدیث کے الفاظ یہ ہیں "یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب"

خواجہ احمد الدین، اس حرمت کو قرآنی الفاظ تک محدود رکھتے ہیں:

"(تم پر حرام ہیں) تمہاری وہ مائیں، جنہوں نے تم کو (تمہارے ابتدائی دو سال میں) دودھ پلایا اور تمہاری وہ بہنیں، جو (تمہاری) رضاعت سے (رہی بنی) ہوں۔ (یہ مصنوعی مائیں بہنیں ہیں، اصل ماں تو وہ ہوتی ہے، جس کے پیٹ سے آدمی پیدا ہو۔ حرمت رضاعت کے سبب سے پیدا ہوتی ہے) (ص ۲۰۵)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف رضاعی حرمت کو ماں بہن سے آگے بڑھا کر نسبی حرمت کی طرح پھیلانے کے حق میں نہیں ہیں۔ اور یہ بھی کہ صرف ابتدائی دو سالوں میں محدود سمجھتے ہیں۔ یعنی زید نے ہندہ کا دودھ ۱۹۱۲ء میں اس کی بیٹی زینب کے ساتھ پیا۔ تو وہ زینب سے نکاح نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں دوسری دختر خالدہ نے ہندہ کا دودھ پیا تو زید چونکہ اس رضاعت میں شریک نہیں تھا۔ اس لیے وہ خالدہ کا دودھ بھائی نہیں ہوگا۔ اور اس سے کا نکاح بھی ممنوع نہیں ہوگا۔

راقم کا خیال ہے کہ خواجہ صاحب غالباً اس تفسیر میں منفرد ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

صلوٰۃ بمعنی محل صلوٰۃ

آیہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی ۴/۴۳ کی تفسیر میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں "اس آیت میں قرب سے قرب مکانی مقصود ہے، یعنی شمولیت نماز کے لیے اس جگہ کے قریب نہ جاؤ، جہاں نماز ہوتی ہے۔ یہاں نماز کے قریب ہونے سے فعل نماز کے قریب ہونا حرام نہیں کیا گیا۔ اگر کوئی شخص تنہائی میں بغیر وضو کے نماز پڑھ لے تو عام لوگ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کی خاص وضع والی نماز نہیں ہوئی اور اس نے فرض ادا نہیں کیا، لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس نے عام ذکر الٰہی بھی نہیں کیا۔ فرض نہ سہی، نفل ہی سہی، ذکر کو حرام تو نہیں کہہ سکتے"

خواجہ صاحب اس کی تائید میں آیات ذیل پیش کرتے ہیں:۔

"لَا یَأْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَھُمْ کُسَالٰی ۹/۵۴ منافق جب نماز کی طرف آتے ہیں تو بے دلی (اور سستی) کے ساتھ آتے ہیں یہاں گھر میں تنہا نماز ادا کرنا مراد نہیں ہے، بلکہ باجماعت نماز میں شامل ہونے کو "نماز کی طرف آنا" کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ارشاد ہے کہ

وَاِذَا قَامُوْآ اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی ۴/۱۴۲ یعنی جب نماز کی طرف اٹھ کر آتے ہیں تو بے دلی (اور سستی) کے ساتھ اٹھتے ہیں۔ اس جگہ بھی محل صلوٰۃ مراد ہے ـــ یہی مفہوم یدعون الی الصّلٰوۃ اور نادیتم الی الصلوٰۃ وغیرہ آیات کا ہے جن کا مطلب یہ ہے کہ جب حکام (امیر المومنین) نماز کی طرف بلائیں، تو حاضر ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سے مراد وہ نماز ہے، جس میں چل کر شامل ہونا پڑتا ہے" ائمہ لغت بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ مفردات میں ہے "ویسمی موضع العبادۃ الصلوٰۃ" (راغب) یعنی عبادت گاہ کو صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ قرطبی میں بھی اس کی تائید ملتی ہے۔ وقالت طائفۃ: المراد مواضع الصلوٰۃ وھو قول الشافعی۔ الجزء الخامس ص۲۰۲۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ صلوٰۃ سے مراد محل صلوٰۃ ہے۔ اور یہی شافعی کا قول ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

زنا حرام ہے۔ اس کے مبادی کا ارتکاب بھی حرام ہے، لیکن نماز اور اس کے مبادی کے متعلق ایسا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا نہانا دھونا، نشے کو زائل کرنے کے لیے دوا کھانا، سکر کی حالت سے ہوشیار بننے کی کوشش کرنا حرام نہیں ہو سکتا ـــ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ شرک کے قریب نہ جاؤ" "زنا کے قریب نہ جاؤ" لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ توحید الٰہی کے قریب نہ جاؤ۔ "فعل صلوٰۃ" کے قریب نہ جاؤ ـــ ایسے نواہی برے کاموں سے ممانعت کے لیے آتے ہیں نیک کاموں پر نہیں بولے جا سکتے۔ تنہائی کی نماز سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ بندے کو نماز سے روکنا ابوجہل کا کام ہے اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی ۵ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ۵ (علق ۹-۱۰) اللہ تعالیٰ نے اس جگہ "لا تقربوا الصلوٰۃ" کہہ کر باجماعت نماز سے روکا ہے نہ کہ مطلق نماز سے۔ تاکہ سکر، مرض، ناپاکی وغیرہ کی وجہ سے جماعت میں خلل و کراہت نہ واقع ہو منزل اول ص۵۸۶

وضو و تیمّم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا ۚ وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا ـــ

(النساء ۴۳)

دیکھیے آیت میں کتنی حالتیں ہیں اور کتنے حکم ہیں؟

سُکر۔ جنب۔ مرض۔ سفر۔ غائط۔ لمس نساء۔ یہ تو ہیں حالتیں۔ اب احکام دیکھیے۔ غسل۔ یا تیمم۔

جنب اور لمس نساء کو عام طور پر مترادف سمجھا گیا ہے ایک ہی آیت میں بات کو تکرار دو مختلف لفظوں میں لانا قرآن کی شان بلاغت کے خلاف ہے۔ چنانچہ جن بزرگوں نے اس کو محسوس کیا ہے، اس کے حل کی کوششیں بھی کی ہیں۔

والجنابة مخالطة الرجل المرأة (قرطبی جزء خامس ص۲۰۴) جنابت کے معنی میاں بیوی کا اختلاط ہے ـــ لمس کے معنی سنئے۔ اس میں تین قول ہیں۔ لمستم ۱۔ جامعتم یعنی جماع۔ باشرتم ۲۔ بوسہ وغیرہ۔ یجمع الامرین ۳۔ بیک وقت دونوں امر۔ ابوحنیفہ کہتے ہیں الملامسة ههنا مختصة باللمس الذی هو الجماع۔ آیت میں اس کے معنی جماع ہی ہیں۔ پھر اس تکرار کو محسوس کرتے ہیں:۔

ولو كان المراد باللمس الجماع كان تكرارًا فى الكلام۔ اگر لمس سے مراد جماع ہو تو کلام میں تکرار واقع ہوگا (ص۲۲۴)، پھر اس تکرار کو رفع کرنے کے لیے نہایت بسط و تفصیل سے بحث کی ہے اور احادیث و اقوال کا خاصا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

امام شافعی کے نزدیک لمس سے مراد چھو جانا ہے۔ از سر نو وضو کرنا پڑے گا ـــ (حقانی) خواجہ صاحب اس مشکل کو کس طرح حل کرتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ

جنب ہونا اور لمس نساء دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اب ان کا تفسیری ترجمہ ملاحظہ ہو،

اے ایمان والو!

۱ ـــ جس حال میں کہ تم نشہ میں ہو (موضع) نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ نہ جانو، کہ تم کیا کہتے ہو۔

(شراب کی ممانعت بقرہ میں آچکی ہے۔ لیکن اگر کسی نے پی لی ہو تو وہ گھر ہی میں بیٹھا رہے۔ اگر وہ باجماعت نماز میں حاضر

ہوگا تو دوسرے لوگوں کی نماز کو بھی خراب کرے گا۔ شراب کا گناہ الگ رہا اور لوگوں کو ستانا ایک علیحدہ خرابی ہے)

٢۔ اور نہ (جماعت سے) الگ رہنے کی حالت میں (جنبًا) جب تک کر (خوب طرح سے) نہا نہ لو، مگر راہ چلتے ہوئے (اگر ضرورتاً" پاس سے گزر جاؤ۔ تو معاف ہے) یہ ابنارمل حالت کا بیان ہے۔

٣۔ اور اگر تم (معمولی) مریض ہو۔

٤۔ یا سفر پر ہو۔

٥۔ یا تم میں سے کوئی پاخانہ سے آئے ("اَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ" میں تعلیم ہے کہ مرد و عورت اکٹھے بیٹھ کر رفع حاجت نہ کریں)

٦۔ یا تم عورتوں سے ملو ــــ سو تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی (خاکستر) کا قصد کرو۔ یعنی اول حکم پانی سے صاف ہونے کا ہے۔ دوسرا حکم بصورت مجبوری پاک مٹی یعنی خاکستر وغیرہ سے پونچھنے اور صاف ہونے کا ــــ اس کی صورت یہ ہے کہ "سو تم اس سے اپنے مونہوں اور اپنے ہاتھوں کو مل لو" (اور خوب صاف کر لو)

جنب کی تشریح

جُنُبًا کے متعلق فرمایا ہے کہ راہ چلنے کے سوا باقی تمام حالات میں نہا کر آنا چاہیئے۔ لیکن آیت کے دوسرے حصے میں ہے لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ (لمس نساء) کی صورت میں تیمم بھی کافی ہے۔ اگر جنب ولمس مترادف ہیں تو آیت کے دونوں حصوں میں سخت اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ پس جنب کے معنی ایسی حالت کے ہیں جس میں جماعت سے الگ رہنا لازم ہے۔ اس سے پہلے رکوع میں جنب اجنبی کے معنی میں آیا ہے وَالْجَارُ الْجُنُبِ) متعدی امراض کے مریضوں کے تیمارداروں کو اور مجرّد لوگوں کو جن کے جذبات مشتعل ہوں، نہا دھو کر اور ٹھنڈے ہو کر مسجد میں آنا چاہیئے۔ سخت مریض تو حاضر ہو ہی نہیں سکتے، لیکن معمولی مریض جن کے شمول جماعت سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔ پانی نہ ملنے کی صورت میں، مٹی سے صاف ہو کر باجماعت نماز میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اس کی خاص تاکید ہے ورنہ گندگی سے تو ہر حال میں جسم کو پاک ہی رکھنا چاہیئے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ سکر کی صورت میں ہوش میں آنا اور جنب کے لیے غسل واجب ولازم ہے۔ اس کے بغیر وہ جماعت کے لیے مضر ثابت ہو سکتے ہیں —— اس کے علاوہ دوسری حالتوں میں پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کی گنجائش ہے —— اور سکر وجنب انسان کی اس حالت کا نام ہے جو نارمل یا معمول کے مطابق نہ ہو۔ نشے کی وجہ سے یا اندرونی جذبات کے ہیجان کی وجہ سے یا متعدی جراثیم وغیرہ وجود سے صلاۃ ۵۸۶

عابری سبیل وعلیٰ سفر میں فرق

عابری سبیل اور علیٰ سفر بھی دو مختلف حالتیں ہیں —— جنب کے لیے عبور سبیل (جماعت کے پاس سے ضرورتاً گزر جانا) معاف ہے —— اور علیٰ سفر یعنی (مسافر) کا حکم جنب سے بالکل الگ ہے صلاۃ ۵۸۷

طمسِ وجوہ کی تشریح

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ (النساء ۴۷) (اہلِ کتاب حقیقی ہدایت، خصوصاً توحید سے روگردان تھے۔ انہیں حقیقت ایمان کی دعوت دی اور بصورتِ عدمِ قبولِ دعوت نتائج سے خبردار فرمایا) اے اہلِ کتاب! ایمان لاؤ، ہمارے نازل کردہ (قرآن) پر جو مصدق ہے تمہارے صحیفوں کا اس وقت سے پہلے کہ ہم (تمہاری قوم کے) مکھوں کو مٹا دیں پھر انہیں ان کی پیٹھوں پر (یعنی ان کی پہلی ذلیل حالت پر) موڑ دیں۔

قرآن مجید میں کئی جگہ وجوہ سے مراد اہلِ وجوہ ہیں، مثلاً

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ (۲۰/۱۱۱) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ ۝ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ (۷۵/۲۲) ، وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝ (۸۰) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰى نَارًا ۝ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۝ (۸۸) —— آیت زیرِ تفسیر میں وجوھًا سے مراد باوجاہت لوگ یعنی رئیس و سردار بالکھبا ہیں۔ راغب نے وجوہ کے معنی سردار لکھے ہیں —— تاج العروس اور لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ یہ لفظ نفسِ شے یا ذات کے لیے بھی بولا جانے لگا، جیسا کہ اس آیت میں۔ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ (۲/۱۱۲) سے مراد پورا اپنا آپ ہے نہ کہ صرف چہرہ اور لِيَسُوْٓءُا وُجُوْهَكُمْ (۱۷/۷) کا مطلب بھی یہ ہے کہ تمہارا یا تمہارے سرداروں کا بُرا حال کر دیں۔" وجہ القوم " قوم کے معزز، شریف انسان اور سردار کو کہتے ہیں (مؤلف) زیرِ تفسیر آیت میں لفظ وجوہ کے اعتبار سے ضمیر مؤنث (فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَا) لائی گئی ہے لیکن اس وجہ سے کہ وجوہ سے مراد اہلِ وجوہ ہیں بعد میں ضمیر جمع مذکر (نَلْعَنَهُمْ) آئی ہے۔ اس کا نمونہ ان آیات میں بھی ملتا ہے جو بطور استدلال مثالاً پیش کی گئی ہیں۔ اس اندازِ بیان سے قرآن خود ہی وجوہ کے معنی متعین کر دیتا ہے، لیکن ہمارے مفسرین نے قرآن حکیم کی اس نکتہ آرائی پر توجہ نہیں کی اور یہ مفہوم سمجھا ہے کہ

" اے اہلِ کتاب قرآن جو توریت کا مصدق ہے، اس پر ایمان لاؤ اس وقت سے پہلے کہ مٹا ڈالیں ہم تمہارے چہروں کے نشانات یعنی آنکھ ناک وغیرہ مطلب یہ کہ تمہاری صورتیں بدل دیں، پھر الٹ دیں تمہارے چہروں کو پیٹھ کی طرف یعنی چہرے کو مطموس اور ہموار کر کے پیچھے کی طرف اور گدی کو آگے کی طرف کر دیں ۔ ۔ ۔ ۔ یا تم کو مسخ کر کے جانور بنا دیں " (ملخصاً، عثمانی) ——

آیت کے آخری ٹکڑے (اَوْ نَلْعَنَهُمْ ... الخ) کا ترجمہ خواجہ صاحب کرتے ہیں :

یا ہم ان (وجوہ یا اہل وجوہ) پر ایسی لعنت کریں، جیسی کہ ہفتہ والوں پر کی تھی (اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب سبت پر جو لعنت ہوئی تھی، وہ ایک قدرتی فعل تھا، جو نتائج اعمال کی صورت میں ہمیشہ واقع ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ خاتمہ آیت سے ظاہر ہے) اور خدا کا کام (ہمیشہ اپنے موقع پر) کیا جاتا رہا ہے (وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا)

جبت وطاغوت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ (۴:۵۱) کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جن کو ملا ہے کچھ حصہ کتاب کا جو مانتے ہیں بتوں کو اور شیطان کو (ترجمہ شیخ الہند)

خواجہ صاحب اس کا تشریحی ترجمہ کرتے ہیں :

کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا، جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے (وہ ظاہری رسوم اور شکلوں اور رسوں وغیرہ پر بڑا زور دیتے ہیں، لیکن اخلاص واحسان کی کچھ پرواہ نہیں کرتے علم وانصاف سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، بلکہ علم کی بجائے جادو اور توہمات کو اور علم وانصاف کے مقابلے میں طغیان وبغاوت کو پسند کرتے ہیں) وہ جادو اور سرکشی (کے سامانوں) پر اطمینان ویقین رکھتے ہیں۔ اور (ان کے تعصب کا یہ حال ہے، کہ) وہ کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مقابلے میں بہتر راہ ہدایت پر ہیں مداوہ یعنی ایک خدا پر ایمان لانے والے ان کے نزدیک گمراہ اور توحید کے منکر ہدایت یافتہ ہیں۔ یہ ہے نتیجہ ضد، تعصب اور حسد کا۔

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (۴/۵۹)

خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ

لوگوں کے نزدیک اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ اے مومنو! قرآن اور حدیث اور فقہ کی پیروی کیا کرو۔ پھر اگر ان تینوں کے علم کے باوجود بھی تم میں تنازع باقی رہے تو قرآن و حدیث کی طرف لوٹو۔ــــ یہ ترجمہ یقیناً باطل ہے۔ جب کہ پہلے یہ تینوں اختلاف و نزاع کو دور نہیں کر سکے اور فیصلہ نہیں دے سکے۔ تو آخر کار ان میں سے دو کس طرح کفایت کر سکتے ہیں؟ صـ۹۴ھ

عام مفسرین قریب قریب اس بات پر متفق ہیں۔ چنانچہ قرطبی میں ہے۔

"فان تنازعتم فی شیٔ" اے تجادلتم واختلفتم .... " فی شیٔ " ای من امر دینکم " فردوه الی الله والرسول" اے ردوا ذالک الحکم الی کتاب الله او الی الرسول بالسؤال فی حیاته، او بالنظر فی سنته بعد وفاته صلی الله علیه وسلم هذا قول مجاهد، والاعمش وقتادة وهو الصحیح (جزء الخامس ص۲۶۱)

پھر اگر کسی دینی معاملے میں تمہارا اختلاف ہو، تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ یعنی اللہ کی کتاب اور رسول کی طرف جب کہ وہ زندہ ہوں اور اُن کی سنت کی طرف جب کہ وہ رحلت فرما چکے ہوں۔ یہ قول ہے مجاہد، اعمش اور قتادہ کا اور یہی صحیح ہےــــ

خواجہ صاحب نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

حکام دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ۱ــــ حاکم اعلیٰ جس کے آگے آخری اپیل کی جائے اور مقدمہ ختم کر دیا جائے۔ ۲۔ ماتحت حکام۔ رسول کریم کے لیے اپنی زندگی میں ماتحت حکام کے تعاون کے بغیر ایک شہر کے مقدمات کا فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا۔ لہٰذا آپ کے ماتحت کئی اولوالامر تھے جیسا کہ مختلف آیات سے ثابت ہوتا ہے مثلاً۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ... اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (۵/۸)

اس آیت میں عدل کی سخت تاکید ہے اور عدل کے اولیں مکلف اولی الامر ہی ہو سکتے ہیں۔

اگر فریقین یا ایک فریق ان ماتحت حکام کے فیصلے سے مطمئن نہ ہوں تو مقدمے کو ختم کرنے کے لیے آخری عدالت اپیل کی طرف رجوع کیا جائے اور حاکم اعلیٰ (جیسا کہ اس وقت خود رسول اللہ تھے) کے فیصلے کو چون و چرا کے بغیر تسلیم کر لیا جائے۔ وہ خود فیصلہ دے یا منصف مقرر کرے یا مشورے سے مدد دے۔ اس پر مقدمہ ختم ہو جائے گا۔ اعتقادیات میں اللہ کے سوا کوئی حکم نہیں ہو سکتا۔ (ان الحکم الا للہ) لیکن حقوق دلانے کے لیے زندہ اعلیٰ حاکم ہی پر آخری فیصلہ منحصر کیا جائے گاــــ سزاؤں کا فیصلہ بھی عوام کے

سپرد نہیں کیا جا سکتا۔

اس طریق سے مقدمات صحت کے قریب لائے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایسے تمام فیصلے وحی الٰہی نہیں بن جاتے۔ اور اس قسم کے مقدمات آئندہ عدالتوں میں پیش کرنے کی ضرورت و گنجائش سے بالاتر نہیں ہو سکتے۔

نزول قرآن کے وقت رسول کریمؐ اعلیٰ حاکم تھے۔ آپ کی حکومت عرب ہی کے اندر تھی۔ دوسرے ممالک کے لیے حضورؐ اپنی زندگی ہی میں آخری عدالت اپیل نہیں تھے۔ اسی طرح آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء اعلیٰ حاکم تھے ـــ یہی مرتبہ ان تمام حکام کا ہے جن کے آخری فیصلوں کو ماننا اور ان کی سزاؤں کو مقابلہ کئے بغیر برداشت کرنا، ماتحتوں کے لیے لازم ہے ـــ فیصلوں کا یہی طریقہ خیر اور اصلاح و امن پر منتج ہونے کے لحاظ سے بہتر ہے۔ (ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۵۹) تمام ممالک نے اسی کو معمول بنا کر ترقیات حاصل کی ہیں۔

آپ کے عہد مبارک میں ماتحت حکام کی اپیل آپ کی طرف کی جاتی تھی اور اگر آپؐ پہلے کوئی فیصلہ کر چکے ہوتے، تو آپ ہی نظر ثانی بھی کرائی جا سکتی تھی۔

دو اطیعوا

زیر نظر آیت میں دو "اطیعوا" وارد ہوئے ہیں۔ پہلا "اطیعوا" اللہ کے لیے آیا ہے۔ دوسرے کے تحت رسولؐ اور اولی الامر معاً جمع کئے گئے ہیں۔ اول سے مراد قانون الٰہی کی اطاعت اور دوسرے ججوں کی اطاعت مقصود ہے۔ قانون کے نفوذ تعامل کے لیے ججوں کی اطاعت لازم ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ "میں خود ہی سیاسی قانون پر عمل کر لیا کروں گا اور خود ہی سزا دے لیا کروں گا اور خود ہی اپنے حقوق زبردستی سے حاصل کر لیا کروں گا۔ اور تنہا جا کر دشمن کا مقابلہ کروں گا" ـــ ایسا شخص ملکی نظام کو درہم برہم کرنے والا اور سزا کا مستوجب ہے۔

منافقین اور فصل خصومات

سورہ نساء کے رکوع ۹ میں منافقوں کا ذکر چل رہا ہے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے۔ (يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ....) لیکن فصل خصومات میں جائز حاکم اعلیٰ (رسول اللہ) کی بجائے، سرکشوں کی طرف رجوع کرتے تھے (يَتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ) جب قانون (مآ انزل اللہ) اور قانون پر چلانے والے (الرسول) کی طرف انہیں بلایا جاتا ہے تو بُری طرح رُک جاتے ہیں (يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا) پھر جب اپنے ہاتھوں کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں اور بچ نکلنے کا راستہ نظر نہیں آتا، تو آپ کے پاس آ کر سچا بننے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ) ان کے دلوں کے کھوٹ اللہ کو معلوم ہیں (يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ۔ آپؐ ان کی ایسی حرکات سے اعراض کریں (فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ) تاہم مؤثر نصیحت کرتے رہیں (فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا) موثر نصیحت یہ ہے کہ رسولوں کی اطاعت اللہ کے حکم کی مطابقت میں ہوتی ہے (لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ) اگر ان منافقوں نے جائز حاکم کو چھوڑ کر اور ناراض کر کے سرکش لوگوں کی طرف رجوع کیا اور اس طرح اپنے ہی اوپر ظلم کیا تھا تو احساس پیدا ہونے کے ساتھ ہی تیرے پاس چلے آتے، معافی مانگتے خود استغفار کرتے اور رسول سے بھی استغفار کراتے تو اللہ کو اپنے اوپر مہربان پاتے (فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ لَوَجَدُوا

اللہ توّاباً رّحیماً) ایسے لوگوں کا ایمان صرف اسی صورت میں معتبر ہو سکتا ہے۔ کہ جائز حاکم اعلیٰ کے فیصلے کو بلا چون وچرا تسلیم کر لیں۔ (فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ) کوئی حاکم بھی (حتیٰ کہ رسول بھی) غیب دان نہیں ہوتا۔ اس کے فیصلے سے کسی فریق کے دل میں تنگی آسکتی ہے لیکن معاملے کو نمٹانے کے لیے حاکم اعلیٰ کے فیصلے کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ لَا يَجِدُوا فِيْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ـــــ خواجہ صاحب نے آیت (حتّٰی يُحَكِّمُوكَ) کو سیاق وسباق سے مربوط کر کے جو نتیجہ نکالا ہے سلف کی تفسیر میں اس کی تائید ملتی ہے۔ قرطبی میں ہے قال مجاہد وغیرہ: المراد بھذہ الآیۃ من تقدم ذکرہ ممن اراد التحاکم الی الطاغوت وفیھم نزلت۔ (جزء الخامس ص۲۶۶) مجاہد وغیرہ کہتے ہیں کہ اس آیت سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہے۔ جو طاغوت کی طرف رجوع کرنا چاہتے تھے ـــــ انہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

صلوٰۃ

روئے زمین کے مسلمانوں میں نماز کی وضع، اذکار، اوقات وغیرہ میں نمایاں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ جن کی بنا پر عموماً ایک دوسرے کی نماز کو نماز ہی نہیں مانا جاتا۔ یہاں تک کہ مختلف فرقوں کی مسجدیں بھی الگ الگ ہیں فرقہ الف کے پیرو کی نماز فرقہ ب کے میں ہو ہی نہیں سکتی۔ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ مصلیانہ نماز کسی بھی شکل میں ادا کی جائے، درست ہے۔ اگر روحِ نماز (یعنی خالص خدا کا ذکر، تسبیح و دعا) موجود ہے، تو وضع و شکل اور الفاظ و اوقات کے اختلاف کے باوجود اسے صحیح نماز تسلیم کیا جائے گا۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی نمازوں کو صحیح مانتے ہوئے وہ اور آگے بڑھ کر اہل کتاب کی نماز کو بھی مقبول و مؤید قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں۔

"قرآن کریم میں اہل کتاب کی نمازوں کی تعریف موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بعض برائیوں کا ذکر کر کے فرماتے ہیں،

مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ ..... وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ یُّکْفَرُوْهُ (۱۱۳،۱۱۵/۳) اہل کتاب میں[1] ایک ایسی جماعت بھی ہے جو حق پر قائم ہے۔ وہ رات کی گھڑیوں میں آیات الٰہی (صفِ اوّلی) پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں .... جو نیک کام وہ کرتے ہیں۔ ان کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کتاب کی عبادت اور نماز اور مومنین قرآن کی عبادت اور نماز حقیقت کے لحاظ سے ایک ہی ہے۔ صورتوں میں خواہ کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ حقیقت قائم ہے تو صورتوں کے فرق سے صلوٰۃ کو "لاصلوٰۃ" نہیں کہا جا سکتا۔

نزول قرآن کے وقت ایسے عیسائی بھی موجود تھے جو عیسائی رہتے ہوئے بھی قرآن کی حقانیت سے بغایت متاثر ہو جاتے تھے۔

قالوا اِنّا نصاریٰ، اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں؛

اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰٓی اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ۔ قرآن کریم کی حقانیت کو پہچان کر سنتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

قرآن کریم ان کو جنت کا مستحق قرار دیتا ہے۔ بلکہ جنت میں پہنچا بھی دیتا ہے فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِکَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ ۸۳ تا ۸۵ ؍ ۵ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی راست گوئی کے بدلے میں ایسے باغ عطا کئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ بدلہ ہے، نیکو کاروں کا (خواہ وہ کسی جماعت سے

---

[1] مفسرین کہتے ہیں کہ یہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ نہیں رہے تھے، بلکہ مسلمان ہو چکے تھے اور قرآن کی تلاوت کرتے تھے (مرتب)

وابستہ ہوں) ـــــ اور دیکھیے! الرّاسخون فی العلم منھم والمؤمنون .... سنؤتیھم اجرًا عظیمًا ۴/۱۶۲ اہل کتاب میں سے جو لوگ علم میں پختہ ہیں اور مومنین قرآن، قرآن اور سابقہ کتب کو مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اللہ اور روز قیامت پر یقین رکھتے ہیں، ہم ان سب کو اجر عظیم دیں گے (بیان للناس منزل اول، صـ ۴۹۰)

قرآن حکیم کی فراخی ملاحظہ ہو کہ دنیا بھر کے نیکوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اور ہمارے فرقہ پرست آپس ہی میں ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے۔

ہر فرقے کے لوگ اپنی مخصوص حرکات و سکنات اور کلمات ہی کو نماز سمجھتے ہیں دوسروں کی نماز کتنی ہی مخلصانہ و موحدانہ ہو، اس کو نماز نہیں کہتے، بلکہ گناہ و کفر و شرک قرار دیتے ہیں۔

قرآن تمام سابقہ امتوں کی نمازوں کو درست تسلیم کرتا اور جہاں کہیں کسی کی نماز میں کوئی نقص دیکھتا ہے کھول کر بتا دیتا ہے مثلاً ـــ ما کان صلاتھم عند البیت الا مکاءً وتصدیۃً ۸/۳۵ کعبے کے پاس ان کی نماز کیا ہے؟ صرف سیٹیاں بجانا اور تالیاں۔

اذا قاموا الی الصلٰوۃ قاموا کسالٰی یراءون الناس۔ ۴/۱۴۲
نماز کی طرف بے دلی سے آتے ہیں اور دکھاوا کرتے ہیں۔

فویل للمصلین ۝ الذین ھم عن صلاتھم ساھون ۝ الذین ھم یراءون ۝ (۱۰۷/۴-۶)
خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں اور جو دکھاوا کرتے ہیں۔

مندرجہ ذیل باتیں ناقض صلاۃ ہیں: سیٹیاں، بجانا تالیاں، بے دلی، بے خبری، دکھاوا ـــ جن نمازوں میں یہ عیب نہیں، وہ کسی بھی شکل میں خشوع و خضوع اور اخلاص کے ساتھ ادا کی جائیں، قرآن انہیں صحیح تسلیم کرتا ہے۔ وہ ظاہری صورتوں سے کوئی بحث نہیں کرتا، بلکہ جواز کی سند عطا کرتا ہے۔

توریت، انجیل اور قرآن کی فرضیت اور فضائل بیان کر کے فرماتا ہے۔

لکلٍّ جعلنا منکم شرعۃً ومنھاجًا۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ اور کوئی نہ کوئی طریقہ جائز قرار دیا ہے۔

ولو شاء اللہ لجعلکم امۃً واحدۃً ولٰکن لیبلوکم فی ما اٰتٰکم۔
اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم کو ایک ہی جماعت بنا دیتا وہ تمہارا اس میں امتحان لیتا ہے جو تم کو دیا ہے۔

فاستبقوا الخیرات ط
سو تم اصل نیکیوں میں سبقت کرو۔

الی اللہ مرجعکم ۵/۴۸
تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ جانا ہے۔

لکل امۃٍ جعلنا منسکًا ھم ناسکوہ فلا
ہم نے ہر امت کے لیے وہی طریقہ عبادت جائز قرار دیا ہے جس

يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ۲۲/۶۷ ۔ کے مطابق وہ عبادت کرتے ہیں۔ سو یہ لوگ تیرے ساتھ امر مقصود میں جھگڑا نہ کریں۔ بلاشبہ تو سیدھی راہ ہدایت پر ہے۔

جن فروعی اور صوری جھگڑوں میں لوگ الجھے ہوئے تھے، اور الجھے ہوئے ہیں قرآن حکیم ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اگر وہ کوئی ایسی شکل نماز متعین کرنا چاہتا، جس کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی تو اس کے لیے کیا مشکل تھی؟ وہ ایک صفحات میں بیان کر سکتا تھا ص۵۲

مروجہ نماز

خواجہ صاحب مروجہ نماز کو تمام قوموں کی نمازوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

"ہماری مروجہ نماز میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہ تمام نمازوں کا خلاصہ ہے، تاہم اس میں مندرجہ ذیل تین اصلاحات کر لی جائیں تو ہر صلح پسند، خدا پرست ہمارے ساتھ شریک عبادت ہو سکتا ہے۔

۱۔ التحیات میں ایہا النبی کی جگہ علی النبی[1] کہا جائے۔ یہ اصلاح نہایت ضروری ہے۔ نماز میں کسی مخلوق کو مخاطب کرنا یا اس سے بات چیت کرنا صحیح نہیں اور پھر اس مخلوق سے جو سامنے موجود نہ ہو، بلکہ دوسرے عالم میں پہنچ چکی ہو۔

۲۔ اگر درود شریف میں رسول کریم اور آپ کی آل کے ساتھ دوسرے مذاہب حقہ کے صالحین اور مصطفیٰ (برگزیدہ) لوگوں کو ملایا[2] جائے تو اس میں صاف دلی اور رواداری کا ثبوت ملے گا۔ جیسے کہ "آل ابراہیم" کے الفاظ میں یہود و نصاریٰ کے صالحین پر درود و برکات کا مذکور ہے۔

۳۔ جو لوگ عربی نہیں جانتے اور ان کو محض رٹنے کی وجہ سے توجہ الی اللہ نہیں کر پاتے، انہیں اپنی اپنی زبان میں ذکر الٰہی کرنا اور دعائیں مانگنا چاہیئے (بہتر تو یہی ہے کہ ہر نمازی کم از کم اتنی عربی ضرور ہی سیکھ لے کہ نماز کا مطلب سمجھ سکے۔ کیونکہ دینی عربی کا کچھ نہ کچھ حصہ ہماری زندگی میں ہونا ضروری ہے۔ (مؤلف)

قرآن حکیم دوسرے لوگوں کے روزوں کو روزے اور مناسک کو مناسک تسلیم کرتا ہے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ ۲/۱۸۳ ۔ لِّكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ۲۲/۶۷ بالکل اسی طرح ان کی نمازوں کی قدر کرتا ہے (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) اس نے کوئی لایعنی قیود عائد نہیں کیں اور نہ عبادات کی شکلوں اور صورتوں پر زور دیا (فالحمد للہ علی ذالك)

قرآن مجید تمام مذاہب کو ایک بنانا چاہتا ہے۔ وہ نجات کا کوئی نیا راستہ نکال کر دوسروں کو نجات سے محروم نہیں کرتا۔ ایک خاص نماز کو نماز قرار دے کر دینا کی فرقہ بندی دور نہیں ہو سکتی ہے۔ (بلکہ خود قرآن کے ماننے والوں میں یہ مرض پیدا ہو سکتا ہے، بلکہ ہوا اور ہو رہا ہے۔ اعاذنا اللہ منہا۔ مؤلف) ("بیان للناس" منزل اول ص۲۸)

---

[1] اور اگر "علی الانبیاء" کہا جائے تو غالباً اور بھی اچھا ہے۔ مؤلف

[2] "اللھم صل علی محمد وعلی انبیاء ک کاملہ" سے یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ مؤلف۔

مختلف نمازیں

بعض لوگ گھوم کر یا اللہ تعالیٰ پر قربان ہو کر اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ایسے نمازیوں کو[1] "طائفین" کہتے تھے (طواف کرنے والے) بعض بیٹھ کر دھیان لگاتے تھے وہ "عاکفین" کہلاتے تھے۔ کچھ کھڑے ہو کر یا رکوع و سجود کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ وہ "قائمین" اور "رکع السجود" کے نام سے موسوم تھے۔ یہ سب قسم کے لوگ (بشہادت قرآن) حضرت ابراہیم سے پہلے چلے آتے تھے۔ آپ نے بحکم الٰہی مسجد کعبہ کی بنیاد رکھی اور اسے درست کیا تو ارشاد ہوا کہ ان سب قسم کے نمازیوں کے لیے میرے گھر کو پاک و صاف رکھنا۔ یہاں ہر ایک کے لیے آزادی ہے یہاں کا باشندہ ہو یا اجنبی سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۲۲/۲۵ بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۲۲/۲۹ آزاد گھر یا پرانا گھر (مؤلف) قرآن حکیم کی فراخیوں اور مسلمانوں کی تنگ دلیوں کو دیکھیے اور عبرت حاصل کیجیے۔ مؤلف ص۵۵

مصرف مساجد

مساجد سے عام بھلائی کے کام لیے جا سکتے ہیں تعلیم، مشاورت، فصل خصومات، رفاہ عام کے لیے تقاریر و مواعظ وغیرہ ص۵۶

صلوٰۃ وسطیٰ

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۲/۲۳۸ عام طور پر صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد نماز عصر لی جاتی ہے۔ خواجہ صاحب کہتے ہیں:

ذکر الٰہی بندہ کو خدا سے نزدیک کرنے کا وسیلہ و واسطہ ہے۔ اور وسیلہ درمیانی شے ہوتا ہے۔ اسی سبب سے ذکر الٰہی کو "صلوٰۃ وسطیٰ" کہا گیا ہے۔ اس سے مراد مطلق نماز ہے۔ اس سے قبل و بعد جو اصلاحی احکام نازل فرمائے ہیں وہ "صلوات" میں داخل ہیں، یعنی ان نمازوں کی (جن کا ذکر اس آیت سے قبل و بعد پھیلا ہوا ہے) حفاظت کرو اور اس صلوٰۃ وسطیٰ کی بھی جو سب سے اکبر و افضل ہے، وہ ذکر الٰہی جس کا طریقہ آیت کے آخری الفاظ میں سکھایا ہے قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔ اللہ کی طرف مودب ہو کر لگ جاؤ۔ قیام لِشئٍ کے معنی ہیں مراعاۃ لہٗ اس کی نگہداشت۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (۳۴) دو دو ایک ایک خدا کی طرف لگ جاؤ پھر سوچو۔ یعنی اس کی عظمت کا لحاظ کر کے سوچو۔ یہ نہیں کہ کھڑے ہو کر سوچو ——— (بیان للناس منزل ص۵۹)

مفسرین نے صلوٰۃ وسطیٰ کی تعیین میں اختلافات کا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ صرف ایک قرطبی میں یہ مسئلہ ص۲۰۹ سے ص۲۱۳ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں کسی قدر خواجہ صاحب کی تائید بھی مل جاتی ہے۔

والوسطیٰ تانیث الاوسط۔ ووسط الشئ خیرہ واعدلہ ومنہ قولہ تعالیٰ۔ جعلناکم امۃ وسطا ص۲۰۹۔ وسطیٰ اوسط کا مونث ہے۔ کسی چیز کے درمیان اور اس کے بہترین اور اعلیٰ ترین کو کہتے ہیں۔

اِنّھا الصلوات الخمس بجملتہا، قالہ معاذ بن جبل، لان قولہ تعالیٰ حافظوا علی الصلوات یعم الفرض

---

[1] "الطواف صلوٰۃ"، الحدیث (مؤلف)

والنفل۔ ثم خص الفرض بالذکر ص۲۱۲[1] پانچوں نمازیں وسطیٰ ہیں یہ معاذ بن جبل کا قول ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ نمازوں کی حفاظت کرو یعنی فرض و نفل سب کی۔۔۔۔ پھر خاص فرض کا ذکر کیا ہے (الصلوٰۃ الوسطیٰ)

یعنی تمام نمازوں کا وہ افضل واعلیٰ حصہ جو فرض کہلاتا ہے۔ صلوٰۃ وسطیٰ ہے وھذا الاختلاف فی الصلوٰۃ الوسطیٰ یدل علی بطلان من اثبت وھی "صلاۃ العصر" المذکور فی حدیث ابی یونس ص۲۱۳ .... صلوٰۃ وسطیٰ کی تعیین میں اختلاف دلیل ہے اس شخص کے باطل ہونے پر جو صلاۃ العصر ثابت کرتا ہے، ابو یونس کی حدیث میں ...[2]

مشرک ذکر و سجود سے ناواقف نہیں تھے، لیکن وُہ غیر اللہ کا ذکر اور غیر اللہ کے آگے سجدہ کرتے تھے۔ انہیں ہدایت کی کہ جس خلوص اور توجہ سے تم اپنے بڑوں کا ذکر کرتے ہو، اسی خلوص سے اللہ کا ذکر کرو اللہ کے حضور سجدہ کرو فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ﴿۲۰۰﴾ اللہ کا ذکر کرو اپنے باپ دادوں کے ذکر کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر کے لیے کوئی خاص شکل یا الفاظ مقرر نہیں ہیں۔ جیسا کہ ہمارے ہر فرقے نے اپنے لیے بہت سی پابندیاں وضع کر لی ہیں۔

اعتکاف مشرک ذکر و سجود کی طرح اعتکاف کو بھی جانتے تھے۔ لیکن وہ غیر اللہ کے لیے معتکف ہوتے تھے مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ﴿۵۲﴾ ابراہیمؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں یہ مورتیاں کیا ہیں جن کے لیے تم اعتکاف کرتے ہو؟ قرآن نے اس کا رخ اللہ کی طرف موڑ دیا وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ﴿۱۸۷﴾

اعتکاف میں کسی قسم کے تکلفات کی ضرورت نہیں۔ صرف خدا کی طرف دھیان لگانا ایک رات کے لیے، دس راتوں کے لیے یا تیس، چالیس رات کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ مباشرت سے پرہیز لازم ہے۔ باقی قدرتی حاجات کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

دعا دعا سے بھی مشرک واقف تھے۔ کسی وحی کے بغیر اپنے الفاظ میں اپنی بولی میں اپنی ضرورت کے تحت دعائیں کرتے تھے جو کبھی قبول بھی ہو جاتی تھیں۔

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ج لَئِنْ أَنْجَانَا مِنْ هٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۶۳﴾ کہیے! بحر و بر کے اندھیروں سے تم کو کون بچاتا ہے؟ تم اس کو پکارتے ہو۔ گڑگڑا کر اور پوشیدہ کہ اگر ہم کو اس مصیبت (زلزلہ و طوفان وغیرہ) سے بچائے تو ہم ضرور شکر گذار ہوں گے۔۔۔۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی خاص بولی (سنسکرت، عبرانی یا عربی) کے بندھے الفاظ کے سوا بھی ہر بولی کے الفاظ شرف قبولیت حاصل کر سکتے ہیں، اور کسی خاص مذہب و فرقہ کے علاوہ ہر مسلک و مشرب کا آدمی (اگرچہ وہ مشرک بھی ہو) دعا کا کامیاب تجربہ کر سکتا ہے ص۶۲

---

[1] قرطبی۔ متوفی ۶۷۱ھ الجزءالثالث

[2] صلوٰۃ وسطیٰ کا ذکر اس سے پہلے بھی آچکا ہے تاہم یہاں کچھ مزید باتیں بھی آگئی ہیں۔

قرآن نے بہت سی ایسی دعاؤں کی تصدیق کی ہے جو وحی نہیں ہیں اور لوگوں نے اپنے اپنے الفاظ میں مانگی ہیں۔ دیکھئے ذیل کے حوالے ا۔ پ۹ ع ۱۴۔ ۱۔ پ۹ ع ۱۔ پ۱ ع ۹۔ پ۲ ع ۹۔ پ۳ ع ۱۲۔ پ۴ ع ۶۔ پ۵ ع ۱۲۔ پ۱۹ ع ۴۔ پ۱۵ ع ۲۔ ۱۔ پ۳ ع ۹۔ پ۲ ع ۸۔ پ۴ ع ۱۱۔ پ۱۸ ع ۴، وغیرہ۔

اہل کتاب قرآن کو سن کر، سجدوں میں گر کر کہتے تھے۔ سُبْحَانَ رَبِّنَا اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا پ۱۵ ع ۱۲ — انہوں نے دیکھا کہ اللہ کا وعدہ جو انجیل میں موجود ہے، نزول قرآن سے پورا ہوا، تو سربسجدہ ہو کر کہنے لگے، ہمارا رب پاک ہے۔ بے شک اس کا وعدہ پورا ہو کر رہا۔ اس سے ثابت ہوا کہ سجدوں کے دوران اپنے الفاظ میں تسبیح کی جا سکتی ہے —— نماز بھی سجدہ ہی ہے (يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ۔ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ) لہٰذا نماز اپنے الفاظ میں ادا کی جا سکتی ہے ص۶۴

(اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر بولی کو بولی والوں سے بہتر جانتا ہے۔ بلکہ ہماری بے لفظ تمنائیں آہیں اور وسوسے بھی اس تعالیٰ کو معلوم ہیں يَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ۔

حال دلم رابہ دانی از من ناگفتہ دانا انوشتہ خوانا !!

آخر گونگے بھی تو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ وہ اپنی غیر ملفوظ فریاد کہاں لے جائیں؟ لیکن نظم ملی کا تقاضا ہے کہ مسلمانان عالم عربی کو تمام دنیا کی زبانوں پر ترجیح دیں۔ اس کا اپنے ذہنوں اور گھروں سے خارج ہونا گوارا نہ کریں۔ مولف)

اس موقع پر خواجہ صاحب امام رازی کا حوالہ دیتے ہیں —— اہل کتاب کو کہا جا رہا ہے کہ استعینوا بالصبر والصلوٰۃ صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو —— اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

فان قیل کیف یومرون بالصبر والصلوٰۃ مع کونہم منکرین لہما۔ قلنا لا نسلم کونہم منکرین لہما۔ وذالک لان کل احد یعلم ان الصبر علی ما یجب الصبر علیہ حسنٌ۔ وان الصلوٰۃ التی ہی تواضع للخالق والاشتغال بذکر اللہ تعالیٰ یسلی عن محن الدنیا وآفاتہا اگر کہا جائے کہ اہل کتاب تو صبر و صلوٰۃ سے واقف ہی نہیں تھے۔ پھر انہیں ایسا حکم کیوں دیا گیا؟ ہم (رازی) کہتے ہیں کہ ہم ان کا ناواقف ہونا تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے کہ ہر شخص صبر کے موقع و محل کو خوب سمجھتا ہے اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ نماز اللہ کے حضور عجز و دعا کا نام ہے۔ اللہ کا ذکر دنیا کی آفات و تکالیف میں تسلی دیتا ہے (مفہوماً) ص۶۵

خواجہؒ لکھتے ہیں کہ

ہم اس (مروجہ) نماز کو بہت معقول اور عمدہ سمجھتے اور بخوشی ادا کرتے ہیں۔ لیکن دوسروں (اہل کتاب وغیرہ) کی موحدانہ اور معقول نماز کی بھی بے قدری نہیں کرتے اور کسی دردمند دل کے ذکر اللہ کو حقیر نہیں جانتے، ص۶۶

اوقات صلوٰۃ

اوقات صلوٰۃ کے متعلق خواجہ صاحب نے پورے قرآن مجید میں، اول سے آخر تک جہاں جہاں نماز کا ذکر آیا ہے۔ غور کیا ہے۔ ان کو کہیں بھی پانچ کا عدد نمازوں کے ساتھ نہیں ملا۔ حالانکہ روزہ کے

ساتھ ہر مقام پر گنتی واضح کی گئی ہے۔ مثلاً رمضان کے پورے مہینے کے۔ حج قران یا تمتع پہ ہدی میسر نہ ہونے کی صورت میں تین روزے ایام حج میں (ثلاثۃ ایام فی الحج) اور سات لوٹنے پر (وسبعۃ اذا رجعتم) پھر اس کو اور زیادہ مؤکد و واضح کرنے کے لیے ساتھ ہی فرما دیا "یہ دس روزے پورے" (تلک عشرۃ کاملۃ بقرہ-۱۹۶) اسی طرح کفارہ قسم کی آخری صورت تین روزے ہیں (فصیام ثلثۃ ایام مائدہ ۷-۸۹)۔ اور ظہار کے بعد ملاپ کی شرط غلام کو آزاد کرنا۔ یہ نہ ہو سکے تو دو ماہ کے متواتر روزے۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو ساٹھ مساکین کو طعام کھلانا ہے۔ (وغیرہ ذالک)

جس طرح ان مقامات پر اور دیگر کئی جگہ عدد و معدود بالکل واضح فرمائے گئے ہیں۔ نماز کے متعلق ایسی وضاحت سے کون سا امر مانع ہو سکتا تھا؟ جبکہ اس کی اہمیت دوسرے تمام اعمال سے کہیں زیادہ ہے۔ اور ہر شب و روز میں اس سے کئی کئی مرتبہ سابقہ پڑتا ہے۔ خواجہ صاحب اس سکوت کو اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ ترین حکمت و مصلحت کے مطابق سمجھتے ہیں۔

چنانچہ انہوں نے اس موضوع کی تلاش میں ۲۲ آیات فراہم کی ہیں جن میں پانچ ایسی ہیں جو تین وقتوں کا پتا دیتی ہیں۔ اور بصیغہ امر واحد خطاب کرتی ہیں اور ۱۲ آیات بصیغہ جمع دو وقتوں پر دلالت کرتی ہیں۔ سہ وقتی آیات بصیغہ امر واحد میں خواجہ صاحب قرآن حکیم کے مخاطب اول صلعم کو مامور سمجھتے ہیں، جن کے لیے تیسری نماز نافلہ (زائد) قرار دی گئی ہے۔ امت کے خاص افراد کے لیے بھی اس کی بہترین ترغیب تو ہے لیکن فرضیت نہیں۔ جیسا کہ الفاظ آیت سے ظاہر ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ ۔ قائم کر نماز سورج کے ڈھلنے کے بعد رات کی تاریکی تک (یعنی دلوک کے بعد رات کی تاریکی تک نماز کا ایک وقت ہے) وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ط اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا ۔ اور فجر سے قرآن (یعنی پڑھنے) کو قائم کر بلاشبہ فجر کا پڑھنا دل نشین ہوتا ہے۔ وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۔ اور رات سے بھی کچھ وقت نیند سے جاگ کر اس پڑھنے کو ادا کر یہ تیرے لیے ایک نفلی عبادت ہے (یہ بڑی خوبی کی بات ہے اگرچہ فرض نہیں) پ۱۵ ع ۹

آٹھ آیات میں صرف دو نمازوں کا ذکر ہے۔ مثلاً۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا ۙ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا (پ۲۲ ع ۳) اے ایمان والو! اللہ کو بہت یاد کرو (یہ عام نماز ہے) اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو (یہ خاص نماز ہے)

تین آیات میں سابقہ نبیوں کی نماز کا ذکر ہے، ان میں دو ہی اوقات تھے۔ مثلاً حضرت زکریا اپنی قوم سے کہہ رہے ہیں۔ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا پ۱۶ ع ۲۔ صبح و شام خدا کی تسبیح کرو۔ جہاں جہاں جمع کے صیغے کے ساتھ عام لوگوں کو نماز کا حکم دیا گیا ہے، وہاں دو وقت سے زیادہ کا کبھی امر نہیں ہوا۔ دیکھو آیات پ۱۶ ع ۲ و پ۲۲ ع ۳ و پ۲۶ ع ۹ (ص ۲۱ تا ۶۹) منزل اول، فجر و عشاء کے دو وقت (پ۱۸ ع ۱۴) یا اشراق و عشی یعنی پچھلے پہر کے دو وقت (پ۲۳ ع ۱۱) نماز کے لیے یکساں مناسب اور نفع بخش ہو سکتے ہیں ص۷۲

خواجہ صاحب دو وقت کی فرض نماز اور تیسرے وقت کی نفل ثابت کر کے آخر میں لکھتے ہیں۔

نماز ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ اگر دیگر ضروری فرائض ترک کئے بغیر دن میں پانچ بلکہ سات بلکہ آٹھ نو یا زیادہ دفعہ ادا کی جائے تو بھی تھوڑی ہے۔ جو لوگ پانچ پڑھتے ہیں انہیں چاہیئے کہ ممکن ہو تو تہجد و اشراق وضحیٰ بھی پڑھیں۔ لیکن جو لوگ دن بھر میں دو مرتبہ بھی نہیں پڑھتے، ان پر افسوس ہے سہ

زندگی، بے بندگی، شرمندگی

تنہائی کی نماز میں زیادہ یک سوئی سے انسان نماز کے فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ باجماعت نماز سے اجتماعی فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں ہر فرقے کی جماعت میں شریک ہونا، فراخ دلی اور رواداری کا ثبوت دینا اتحاد اسلامی کے لیے ضروری ہے۔ جماعت کی موجودگی میں الگ نماز پڑھنا جائز نہیں۔ کیونکہ حکم یہ ہے وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ۔ جھکنے والوں کے ساتھ جھک جاؤ (پ ۱ ع ۵) ادائے نماز میں "جماعت" سہولت پیدا کرنے کے لیے ہے خود داخل نماز نہیں۔

جمعہ

قرآن مجید میں مشاورت کی تاکید آئی ہے۔ یہاں تک کہ انبیاء و رسل بھی اس سے بے نیاز نہیں۔ ہمارے رسولؐ کو بھی مشورہ کرنے کا حکم تھا۔ مجالس شوریٰ کے لیے ضرور کوئی مقررہ دن ہونا چاہیئے۔ حاکم کو اختیار ہے کہ وہ ہفتہ میں ایک بار دو مرتبہ یا جب مناسب سمجھے شوریٰ کے لیے بلائے۔ ایسے دن کو یوم الجمعہ کہتے ہیں۔ حاکم جس وقت اور جن لوگوں کو بلائے۔ ان کے لیے سب کام چھوڑ کر حاضر ہونا ضروری ہے۔ ایسے "امر جامع" سے غیر حاضر رہنا یا بلا اجازت اٹھ جانا جائز نہیں۔ حاکم کو اجازت دینے یا نہ دینے کا اختیار ہے۔ ایسی مجالس سے نماز مقدم ہے۔ نماز سے پہلے یا پیچھے تقریریں، مقدمات یا دوسرے ضروری کام کئے جاتے ہیں إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ۔ پ ۲۸-ع ۱۲- (ص ۵)۔

إِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلٰى أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتّٰى يَسْتَأْذِنُوهُ پ ۱۸ ع ۱۵

اذان

ان مجالس میں بلانے کے لیے لوگوں کو اطلاع دی جاتی یا منادی کرائی جاتی تھی۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔ اذا نادیتم الی الصلوٰة۔ اذا نودی للصلوٰة۔ یدعون السجود۔

اس "نداء دعوت" میں سب طریقے شامل ہیں، خط، اشتہار، منادی وغیرہ۔ مروجہ طریق اذان بھی اسی کی ایک مستحسن شکل ہے۔ (ص ۵)

طہارت

حفظان صحت کے قوانین پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔ صفائی نہایت عمدہ چیز ہے اللہ تعالیٰ ستھرے لوگوں کو دوست رکھتا اور نجاست سے دور رہنے کا حکم دیتا ہے۔ جسم، لباس، بستر، مکان، سامان، کھانے پینے کی چیزوں اور ہوا کی صفائی صحت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس سے منہ موڑنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے جس سے اللہ نے روک دیا ہے۔ لَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ــــ لیکن اگر کوئی شخص اس سے غفلت کرتا ہے، تو اسے تنہائی کی نماز سے نہیں روکا جا سکتا۔ ذکر الٰہی دلوں کو پاک کرتا ہے۔ یہ کوئی دانش مندی نہیں کہ ظاہری پاکیزگی میں غفلت یا تساہل کے سبب باطنی پاکیزگی سے بھی دست بردار ہو جائے اور ظاہر و باطن دونوں کو پلید کرے۔

حیض و نفاس والی عورت کو تنہائی کی نماز سے روکنا قابلِ افسوس ہے۔ نیز جس کے ہاتھوں اور منہ پر ایسے زخم ہوں جن

کے سبب پانی اور مٹی دونوں کا استعمال مضر ہو، اسے غسل، وضو اور تیمم نہ کر سکنے کے سبب تہائی کی نماز سے روک دینا نہایت ہی حیرت انگیز بات ہے ص٦

اگر ہم اپنا منہ ہزار مشک و گلاب سے دھوئیں، تو بھی خدائے قدوس کے آگے پلید ہی ہوتے ہیں۔ ہم کیا ہیں؛ بلغم، خون، صفرا، سودا وغیرہ (گندی چیزوں) کا مجموعہ! ہم نطفے سے پیدا ہوئے ہم نطفے ہی کے اندر کے ایک حقیر کرم ہیں۔ پھر ہم خدائے پاک کے حضور کس طرح پاک ٹھہر سکتے ہیں؛

اگر کوئی شخص ظاہراً میلا ہو اور فراغت و اطمینان سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور خشوع و خضوع سے نماز ادا کرے تو وہ اس شخص سے ہزار درجہ بہتر ہے جو ظاہری پاکیزگی میں تو خوب مبالغہ کرتا ہے۔ لیکن اس کا دل غافل ہے فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا۔ اَلَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وغیر ذالک من الآیات۔

صفائی اور ستھرائی تہائی کی نماز کے لیے بھی بہت بہتر ہے۔ لیکن وضو، غسل یا پاک خاک[1] سے صفائی حاصل کرنے کا حکم خاص باجماعت نماز ہی سے متعلق ہے عام و خاص ذکر الٰہی تو ابتدائے نزول قرآن ہی کے ساتھ چلا آیا ہے۔ الحمد شریف سب سے پہلے[1] نازل ہوئی ہے، جو بے مثل دعا ہے ـــــ لیکن وضو، غسل اور تیمم کی آیات بہت بعد نازل ہوئیں جب کہ جمعہ و جماعت کا باقاعدہ، انتظام ہوا ص٤٧۔

ہیئت صلوٰۃ

قصر صلوٰۃ کے متعلق خواجہ صاحب کہتے ہیں۔

امن و اطمینان نہ ہو، بلکہ کسی قسم کا خوف ہو تو سوار یا پیادہ، جس طرح بھی ہو سکے خاص نماز ادا کر لینا چاہیئے۔ قیام و سجدہ نماز کی ماہیت میں داخل نہیں، ورنہ ان کے بغیر نماز نہ ہو سکتی۔ پھر اگر اندیشہ ہو کہ مبادا دشمن کسی گھات سے نکل کر حملہ کر دے تو اس وقت اگر خاص نماز کو عام ذکر میں بدل لیں، تو کوئی گناہ نہیں۔ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا پ ٢ ع ١٥۔ منزل ص٨٣

مروجہ قصر خواجہ صاحب کے نزدیک قصر نہیں ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اگر سخت خطرے کے وقت چار رکعت ادا کرنا مہلک ہے، تو دو یا ایک رکعت بھی خطرے سے خالی نہیں۔ دشمن اتنے سے وقت میں بھی حملہ کر دے گا، اس قسم کی قصر صلوٰۃ بالکل بے معنی ہے۔

خدا تعالیٰ نے دشمن کے حملے کے وقت نہیں بلکہ صرف حملے کے خوف کے وقت باجماعت نماز پڑھانے کی اجازت دی ہے۔

---

[1] بعض دوسرے لوگ (وقال الاٰخرون الفاتحہ اول ما نزل ثم سورۃ العلم) "رازی" بھی اسی بات کے قائل ہیں یعنی سب سے پہلے سورۂ فاتحہ اتری اس کے بعد "قلم" یعنی "علق"، ص١٢ تفسیر کبیر فخر رازی الجز ٣٢ مطبوعہ مصر۔

[2] واضح ہو کہ خواجہ صاحب مروجہ تیمم کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ مؤلف

یہ جماعت فرض نہیں ہے۔ محض موقع شناس قائد کی ذمہ داری پر چھوڑی گئی ہے۔ "اِذَا کُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوۃَ"۔ جب تو (یا تیری جگہ کوئی ذمہ دار جنرل) ان (لشکریوں) میں موجود ہو پھر تو ان کو نماز کی اقامت کرائے (یعنی باجماعت نماز پڑھائے) "فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ" چاہیئے کہ ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ قیام کرے "وَلْیَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ" اور چاہیئے کہ (نماز میں بھی) اپنے اوزار لگائے رکھیں "فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ" پھر جب (بعد قیام) سجدہ کر لیں تو چاہیئے کہ "تم" سے (بصیغہ جمع یعنی امام اور باڈی گارڈ) پرے ہو جائیں (اور حفاظت کے کام پر لگ جائیں) "وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰی لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَكَ" ـــــ اور چاہیئے کہ کوئی اور طائفہ آئے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی۔ پھر چاہیئے کہ تیرے ساتھ (اسی طرح) نماز پڑھیں (یعنی قیام وسجدہ کریں) "وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ" اور چاہیئے کہ اپنی خبرداری رکھیں اور اپنے اوزاروں کو سنبھالے رہیں ۵؍۱۶ و ۴؍۶۱

اس مقام پر یہ ترتیب سکھائی گئی ہے کہ پہلے قیام کرو اور پھر سجدہ ـ نماز کا حکم اس آیت کے نزول سے قبل آچکا تھا، لیکن ترتیب کی یہ تعلیم نہیں دی گئی تھی ـــــ ظاہر ہے کہ جنگ کا موقع ہے۔ اس سے پہلے جب کہ جنگ سے روکا جاتا تھا، اس وقت بھی نماز کی تاکید کی جاتی تھی ـــــ "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَیْدِیَكُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ..... الخ" پ۵ ع،
قبل جنگ کی صلوٰۃ بھی صلوٰۃ ہی تھی اگرچہ قیام وسجود کی موجودہ ترتیب کے ساتھ نہیں تھی۔ بلکہ سجدہ پہلے اور قیام بعد میں بھی ہو سکتا تھا یا ہوتا تھا۔ "وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا" (پ۱۹ ع ۴) "اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا" (پ۲۳ ع ۱۵)

خوف کے وقت باجماعت نماز میں قیام وسجدہ کی ترتیب لازمی ہے۔ امن کے وقت اسی ترتیب سے باجماعت نماز میں کم از کم ایک رکعت تو ضروری ہے، زیادہ کی ممانعت نہیں۔ امام کی صواب دید یا جماعت کے شوریٰ سے رکعتوں کی تعداد بڑھائی جا سکتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعداد کی پابندی لازم ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو اس کے بیان کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ جیسا کہ صیام کی تعداد ہر جگہ بیان کی گئی ہے (کما مرّ فی هٰذہ المقالة)

اگر کسی دوسری قوم یا جماعت کی موحدانہ نماز میں شرکت کا موقع ملے، تو ان کی معقول ترتیب و انتظام کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔ جیسا کہ حکم ہے۔ "وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ" ـــــ یہاں پوری نماز کو رکوع سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ آیت ذیل میں۔ "وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ" ۸۶، ۸۷ منزل اول۔

اذکار صلوٰۃ

قرآن مجید میں اذکار صلوٰۃ کی طرف بھی رہنمائی فرمائی گئی ہے مثلاً آیہ "وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى" (پ۳۰ ع ۱۲) (اللہ کے نام کا ذکر، پھر نماز) اس کے تحت پہلے اللہ کہیئے کہ سبحان اللہ یا الحمد للہ یا اِنَّ اللهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا یا لا الٰہ الا اللہ یا اللہ اکبر کہہ کر کھڑے ہو جائیں۔ قیام کے آخر میں سبحان اللہ بحمدہ کہہ کر سجدہ کریں۔ بحکم آیہ "فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ" پ۱۴ ع ۶ اور قیام وسجدہ میں آیات اللہ پڑھیں۔ "یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ"، سجدے کے بعد سبحان اللہ الحمد للہ کہہ کر نماز سے فارغ ہو جائیں (وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ پ۲۶ ع ۱۷)

قرآن مجید نے کافی سے زیادہ دعائیں سکھائی ہیں۔ سب سے پہلے الحمد شریف اسی غرض سے سکھائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی حسب ضرورت دعائیں مانگنے کی اجازت ہے۔ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (پ ع ۱۲)

اسماء حسنیٰ کے ساتھ دعائیں مانگنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (پ۱۵ ع ۱۲) ان آیات میں کئی تعلیمات جمع کر دی گئی ہیں، مثلاً۔

۱۔ دعا کا طریقہ — یا اللہ، یا رحمٰن اور اسماء حسنیٰ میں کسی بھی نام سے دعا مانگی جا سکتی ہے۔ قرآن مجید سے باہر بھی کئی اسماء حسنیٰ قرآن مجید کی رہنمائی کے مطابق ملتے ہیں مثلاً۔ المبدئ، المعید، المغنی، الہادی، الباقی، الجمیل، المعطی، النافع، المحصی وغیرہ۔

۲۔ نماز میں آواز — نماز میں آواز نہ تو چلانے کی طرح بہت بلند ہو اور نہ ہی اتنی پست کہ اونگھ اور غفلت کی سی حالت طاری ہونے لگے۔

۳۔ بالکل معتدل آواز، سکون، عجز اور خشوع و خضوع کا لہجہ اختیار کیا جائے۔

۴۔ نماز میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، توحید، اعلیٰ ترین حاکمیت اور کبریائی کی کیفیت قلب و زبان اور جسم و جان پر طاری ہو جائے[1] پ۱۵ ع ۱۲ (منزل اول ص۸۸)

کئی گروہ خواجہ صاحب مدرس تھے۔ تدریس و تفہیم کے طور پر بعض مطالب بہ تکرار سمجھاتے ہیں۔ پہلے اجمالاً۔ پھر تشریحاً چنانچہ اسی سلسلے میں لکھتے ہیں۔

... فوجوں میں بہت سے طائفے ہوتے ہیں۔ اُحد میں دو گروہ بزدلی دکھانے لگے اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (پ۴ ع ۳) ثابت قدم رہنے والا گروہ ان دونوں سے الگ تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے حضورؐ کی افواج میں دو سے زیادہ طائفے ہوتے تھے۔

کامل نماز لائق اور معاملہ فہم قائد یا امام اپنی ذمہ داری سے باجماعت نماز ادا کرنا مناسب سمجھے تو لازم ہے کہ ایک ایک طائفہ اس کے ساتھ ایک رکعت نماز ادا کر کے اپنے عسکری فرائض کی بجا آوری میں لگ جائیں۔ یہ ایک رکعت بحکم قرآن کامل نماز ہے — سپہ سالار امام کے ذاتی محافظ ہرگز اس سے جدا نہ ہوں پھر دوسرا طائفہ آئے اور امام اور اس کے ذاتی محافظوں

---

[1] خواجہ صاحب عموماً ترجمہ پہ اکتفا کرتے ہیں۔ مؤلف نے آیات کا اضافہ کر دیا ہے تاکہ قارئین کو سہولت رہے اور بعض جگہ ان کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں مرتب کر کے پیش کیا ہے۔

کی کئی رکعتیں ہو جائیں گی ـــــ اس کا مطلب یہ نکلا کہ ایک رکعت نماز کامل ہے اور حسب ضرورت ایک سے زیادہ دو، تین، چار، پانچ وغیرہ رکعات بھی ہو سکتی ہیں۔

خطرے میں بھی نماز خطرے کے اوقات میں مسلمان ایسے اہتمام کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرکے اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ کسی وقت بھی خوف خدا سے بے پروا نہیں ہوتے۔

ایک اور نکتہ وہ نماز جس میں بارش وغیرہ کے سبب اذا اسروں کے اتار رکھنے میں کوئی گناہ نہیں، صرف خوف کے وقت کی نماز ہے وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰ أَن تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ (پ ۵ ع ۱۲) دشمن اس وقت سامنے نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اسی مقام سے واضح ہوتا ہے (لَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ پ۵ ع ۱۲) یعنی دشمن کی تلاش میں سستی نہ کرو۔

قصر من الصلوٰۃ إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ جب تم زمین میں سفر کرو، تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنی نماز سے کم کرو اور اسے عام ذکر الٰہی میں بدل لو (منزل اول ص ۹۴)

یعنی ایسی حالت میں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنی خاص نمازوں میں سے کوئی نماز کم کرو یعنی اسے چھوڑ دو اور اس کی جگہ خاص نماز کی نیت سے عام ذکر کرتے رہو۔ قصر من الصلوٰۃ کے معنی ایک رکعت کو بھی چھوڑ کر عام ذکر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے۔

قرآن پاک میں "قصر، من الصلوٰۃ" کا ذکر ہے "قصر الصلوٰۃ" کا نہیں "مِنْ" کو زائد قرار دینا غلطی ہے۔ اس کی تقدیر اس طرح ہے کہ ـــــ ان تقصروا شیئاً من الصلوٰۃ، یا ان تقصروا صلوٰۃ من صلوٰتکم" ـــــ

اس "قصر من الصلوٰۃ" یعنی خاص نماز کو عام ذکر میں بدل لینا گناہ نہیں۔ اگر تمہیں خوف ہو کہ کفار زبردستی کرکے تمہیں ستائیں گے (إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا پ ۵ ع ۱۲)

قصر کا ذکر ختم ہوا۔ اس کے بعد اقامت صلوٰۃ یا کامل نماز کا ذکر ہے جو سپہ سالار کی صواب دید پر میدان جنگ میں ادا کی جا سکتی ہے۔ منزل اول ص ۹۰ (وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ) اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

مُعلّقہ

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔
دو عورتوں میں عدل و مساوات قائم رکھنا تمہاری طاقت سے باہر ہے۔ اگر تم دوسری عورت کو لے گے تو ان دو کے درمیان عدل نہیں کر سکو گے۔ اگرچہ کتنی ہی حرص کرو ـــــ

اس ارشاد سے خیال ہو سکتا ہے کہ موجودہ بیوی کو چھوڑنے اور نئی لانے سے روکا گیا ہے۔ لہٰذا اس بے چاری کو ادھر میں لٹکائے رکھیں ـــــ اس کا سد باب یوں فرمایا کہ:

"معلقہ" تو وہ ہے جو برائے نام بیوی ہے۔ اور اس کے حقوق زوجیت بالکل ادا نہیں کئے جاتے ـــــ اور "کالمعلقۃ" وہ ہے جس کے ساتھ کچھ ناکافی سا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس انداز سے مترشح ہوتا ہے کہ معلقہ چھوڑنا تو سخت گناہ ہے ہی "کالمعلقۃ" وہ ہے (یعنی معلقہ کی مانند) کر دینا بھی گناہ سے خالی نہیں۔ لہٰذا اس سے بھی روک دیا گیا۔ کتنی احتیاط ہے۔

فرشتے، کتابیں اور رسول

وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (پ ۵ ع ۱۷) ملائکہ، آسمانی کتابیں، رسول اور آخرت پر اعتقاد ـــــ یہ سب نیکی کے محرکات ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ان سے رجوع الی اللہ کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کو خدا کی طرح مانا جائے۔ جیسا کہ بعض لوگ فرشتوں کو اور بعض رسولوں کو "الٰہ" مانتے ہیں (منزل اول صفحہ ۶۴۳)

بے نام مذمت

قرآن مجید کی عام روش یہ ہے کہ وہ کسی بُرے کا نام لے کر اس کی بُرائی کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ وہ سکھاتا ہے کہ مشرکین کے باطل معبودوں کو بھی بُرا نہ کہو، کیوں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمہارے معبودِ برحق کی شان میں گستاخی کی جسارت کر بیٹھیں گے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۔ (پ ۷ ع ۱۹)

(مسلمانو!) ان کو گالی نہ دو جنہیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔ (ایسا نہ ہو کہ) یہ تمہاری عداوت میں، نادانی کے ساتھ اللہ کو گالی دینے لگیں۔

خواجہ صاحب اس موضوع کی طرف خاص توجہ دلاتے ہیں:

• اللہ تعالیٰ عام طور پر مذاہب کے بُرے اعتقادات اور اعمال پیش کرتا ہے، تاکہ لوگ ایسے اعمال سے بچا سکیں ــــ بُرے عقائد والے خود بھی تائب ہو کر نیک بنتے رہے ہیں۔ ــــ اللہ تعالیٰ کسی کا فرو منافق کا نام خواہ مخواہ لینا پسند نہیں کرتا، تاکہ ان کی اور ان کے متعلقین کی ہتک یا دل آزاری نہ ہو ــــ فرعون، ہامان و قارون تو پہلے ہی لوگوں میں بُرے مشہور تھے۔ کوئی بھی انہیں اپنا بزرگ یا تعلق دار نہیں چاہتا تھا ــــ اور ان کی یہی مذمت سے کسی کو اذیت نہیں پہنچ سکتی تھی۔ قرآن حکیم نے ان کی بُرائیاں بیان کرنے میں پہل نہیں کی، بلکہ یہ دکھایا ہے کہ ان کی برائیاں عام طور پر معروف و مشہور ہیں اور سب لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔

ابولہب ابولہب کے معنی ہیں غصیل، غصہ ور ــــ یہ کسی خاص شخص کا نام نہیں ہے مسلمان چاہتے تھے کہ انہیں وحی کے ذریعے چھپے دشمنوں (منافقوں) کے نام بتا دیئے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس مطالبے کو قبول نہیں فرمایا:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۔ (پ ۶ ع ۱)

اللہ تعالیٰ بُرے الفاظ (یا شکایات) کو پکار کر (یا نام لے کر) ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا۔ مگر اس شخص سے جس پر ظلم کیا گیا۔ (مظلوم انصاف چاہنے اور حفاظت حاصل کرنے کے لیے اس قسم کی شکائتیں کر سکتا ہے) اللہ سننے والا جاننے والا ہے (اگر تم مظلوم کی شکایت نہ سنو گے تو آخری اپیل کے لیے خدا موجود ہے) منزل اول ص ۴۳۶ (۶۲)

⁂

سورۃ اللہب کی تفسیر میں لکھتے ہیں ۔

"... ابی لہب صرف ایک ایسے شخص سے کنایہ ہے جو اسلام کا سخت دشمن تھا اور کہتا تھا کہ میں اپنی کوششوں سے اور اپنا مال خرچ کر کے اس توحید کو مٹا دوں گا اور اس کی بیوی اس کے غصہ کی آگ پر تیل ڈالتی اور اس کے غصّے کو بھڑکانے کے لیے ایندھن اٹھا کر لاتی تھی۔ یعنی جھوٹی روایتیں اِدھر اُدھر سے لے کر آتی تھی[1] اور اس کی آتش غضب کو دوبالا کر دیتی تھی ۔ جیسے وہ جھوٹی روایتوں کا سلسلہ پروتی تھی، اسی طرح آج جہنم میں اس کی گردن میں جس میں وہ زیور ڈالتی تھی لوہے وغیرہ کی تاروں سے بٹی ہوئی رسی پڑی ہوئی ہے، جس کے ذریعے سے وہ عذاب میں کھینچی جا رہی ہے ایسے بہت سے غضب ناک دشمن اسلام موجود تھے ۔ لیکن کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ اس میں اس کی ہتک کی گئی ہے ۔ جب نام لے کر کسی کافر کی ہتک کرنا درست نہیں تو کیسے ممکن تھا کہ قرآن خود ہی اس کی خلاف ورزی کرے ۔ (منزل ہفتم ص۲۷۷)

---

[1] میان دو کس جنگ چوں آتش ست ؛ سخن چین بدبخت ہیزم کش است ۔ (سعدی)

وحی کے تین طریقے

۱۔ اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ ..... الخ

۲۔ وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ..... الخ

۳۔ وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا۔

وحی، ایتان اور کلام

ترجمہ آیت: ۱۔ بلاشبہ ہم نے تیری طرف وحی کیا، جس طرح ہم نے نوح اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف وحی کیا (آگے متعدد انبیاء کے نام ہیں)

۲۔ اور (جس طرح) ہم نے داؤد کو زبور دی۔

۳۔ اور (جس طرح) ہم نے موسیٰ سے کلام کیا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید وحی کے تینوں طریقوں سے نازل ہوا ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے اس قدر کلام نہیں ہوا، جس قدر رسول کریمؐ سے ہوا جیسا کہ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ چند آیات کے سوا قرآن کا زیادہ حصہ اسی طرح ملا ہے۔ جس طرح موسیٰؑ سے مکالمہ الٰہی ہوا ـــــ (سورۂ نساء آیت ۱۶۳) منزل اول ص ۶۴۹

سورہ شوریٰ میں مزید تشریح ملتی ہے۔

وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا ـــــ اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ ـــــ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ (آیت ۵۱)

کسی بشر کے لیے لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے مگر تین طریقوں سے۔

۱۔ وحی کے ذریعے اپنا فرمان اس کے دل میں ڈال کر کہ یہ کلام جو دل میں آ رہا ہے اللہ کامل مطلق ہی کی طرف سے ہے۔

۲۔ یا پس پردہ۔ یقین آ جاتا ہے کہ کسی طرف سے دل آواز سن رہا ہے۔ اس کا تعلق بھی دل ہی سے ہے۔

۳۔ یا کوئی رسول، فرشتہ بھیج دے۔ پس وہ اس (خدا) کے حکم سے جو (خدا) چاہے، دل میں ڈال دے (یہ کامل تقسیم ہے، ان کے علاوہ وحی کی کوئی چوتھی قسم (وحی خفی یا غیر متلو، غیر ملفوظ وغیرہ) نہیں ہے۔ یہ لوگوں کے من مانے ڈھکوسلے ہیں جو اور اور طریقے وحی کے اپنی طرف سے بناتے ہیں۔ مذکورہ تینوں طریقوں کو کلام یعنی ملفوظ و متلو ہی کہا ہے (یکلمہ اللہ) خدائے تعالیٰ کی زبان (پارۂ لحم یا گوشت) نہیں ہے۔ مگر کلام بے آواز نہیں ہو سکتا۔ اور کلام رسول کی زبان (بول) میں ہوتا ہے ـــــ

رسول خبر دیتا ہے کہ خدا یوں کہتا ہے ـــــ یا خود نبی کی زبان پر خدا جاری کر دیتا ہے اور یہ نبی کا اختیاری فعل نہیں ہوتا ـ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کوئی وحی بلا واسطہ نہیں ہوتی ـ مثلاً ہوا پہ آواز کی حرکات اثر انداز ہوتی ہیں ـ تو آواز پیدا ہوتی ہے ـ کوئی شخص آواز کی (۱) طرف خیال کرے ـــــ یا ہوا (۲) کی طرف ـــــ یا شخص (۳) متکلم کی طرف ـــــ تینوں کی حقیقت ایک ہی ہے ـــــ یعنی نبی کا قلب وحی الٰہی کو یقینی علم کے ساتھ اخذ کرتا ہے ـ اس حال میں خارجی جذبات (بشری) پر کارکنان قدرت کے پہرے لگا دیے جاتے ہیں کہ وہ وحی میں دخیل نہ ہونے پائیں ـ یہ تینوں طریقے کلام کے ہیں ـ دیدار نہیں ہوتا ـ محدود، لامحدود کا دیدار کیسے کر سکتا ہے؟ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (پ ۲۹ ع ۱۲) وحی غیب کے نازل ہونے کے وقت رسول کے ذاتی خیالات و جذبات پر پوری طرح پہرہ لگا دیا جاتا ہے (مفہوماً)

قبل بعثت کے مومن

قرآن کریم تمام مذاہب کو ایک بنانا چاہتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے ۔۔۔ محمدیت، احمدیت، مسیحیت وغیرہ شخصیات کی بجائے اسلام کی طرف داعی ہے۔ جو تمام زمانوں اور مکانوں کا دین ہے۔ قرآن کلمہ حکمت کو جہاں سے بھی وہ ملے، لینے سے مانع نہیں[1] وہ تمام رسل و انبیاء کا متفقہ دین ہے۔ اس کے سوا کوئی دین عالمگیر اور قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اگر پوری دنیا متفق ہوگی تو اسی پر نہ کہ الگ الگ فرقوں کے محدود شخصی مذاہب اور خود تراشیدہ عقائد و اعمال پر ۔۔۔ سچا مومن کسی بھی سچے مومن سے بیزار نہیں ہو سکتا۔ کوئی نبی اس لیے نہیں آتا کہ پہلے سے جو لوگ موحد اور نیکوکار ہیں اس کے ظہور کی وجہ سے کافر بن جائیں ۔۔۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ اس سچے نبی پر ایمان لا کر دوہرے اجر کے مستحق ہو جائیں، ورنہ ان کا اکہرا اجر ضائع نہیں ہوگا۔

"جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی، وہ اس پر یقین کرتے ہیں۔ جب قرآن کو سنتے ہیں تو اس کے حق ہونے کو مان لیتے ہیں کہ "ہم اس سے پہلے ہی مسلمین (حکم بردار) ہیں" وہ لوگ اپنا اجر دوہرا پائیں گے" يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ (پ ۲۰ ع ۹) دوسری جگہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا ہے يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ (پ ۲۷ ع ۲۰) (اللہ تعالیٰ تم کو اپنی رحمت کے دو حصے دے گا ۔۔۔ رسول اس لیے آتا ہے کہ غافلوں کو جگا کر بچا دے نہ کہ جو پہلے سے مومن و مسلم ہیں انہیں کافر بنا دے (جیسا کہ بعض مدعی یا متنبی کہتے ہیں۔ مؤلف) کیا کوئی حکیم تندرستوں، صحت مندوں کو بیمار بنانے کے لیے آیا کرتا ہے! منزل اول ص ۶۵۱

---

[1] منزل اول ص ۶۵۱-۶۵۲

مسیح کی ماں کی طرف نسبت

"اللہ تعالیٰ نے ابن مریم کہہ کر کئی جگہ مسیحؑ کا ذکر کیا ہے تاکہ سب لوگ سمجھ لیں کہ جننے والی اور جنا ہوا الٰہ نہیں ہو سکتے۔ ورنہ کسی کو بنی فاطمہ کہنے سے وہ بے باپ یا (حضرت علی کی اولاد سے خارج) نہیں ہو جاتا اور یا ابنؤم (ہارونؑ نے موسیٰؑ سے کہا "اے میرے ماں جائے") کہنے سے باپ کا انکار لازم نہیں آتا۔ اس سے ادعوھم لِاٰبآءِھم (بیٹوں کو ان کے باپوں کی طرف نسبت کر کے پکارو) کی مخالفت بھی نہیں ہو سکتی" صفحہ ۶۵۵

سارے قرآن مجید میں موسیٰؑ کے باپ کی طرف کہیں اشارہ بھی نہیں ملتا البتہ وقت ولادت سے لے کر آخر تک صرف ماں کا ذکر بار بار آیا ہے۔ (مؤلف)

تمت منزل اول از تفسیر بیان للناس

یعنی از سورہ فاتحہ تا آخر سورہ النساء۔ بتوفیقہ تعالیٰ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۹ء بدار الخلد الاسحٰق سلمہ اللہ تعالیٰ۔

سُورَةُ المَائِدَة

اہل کتاب کے ساتھ مناکحت

اہل کتاب کے ساتھ مناکحت کے متعلق مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ

"قرآن کریم نے یہ جائز رکھا ہے کہ مسلمان مرد ایک غیر مسلم بی بی سے نکاح کرے۔ لیکن یہ جائز نہیں رکھا کہ ایک مسلم بی بی کا کسی غیر مسلم سے نکاح ہو" (بیان القرآن محمد علی طبع ثانی ص ۴۰۹)

خواجہ صاحب اس سے اتفاق نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں۔

"اہل کتاب کے ساتھ مواکلت و مناکحت کی بھی صریح اجازت ہے" منزل دوم ص ۵ متعلقہ آیت مع ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ط وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ص وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ (المائدہ ۵-۲)

آج تمہارے لیے طیبات حلال کیے گئے ہیں اور ان لوگوں کا کھانا جنہیں کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومنات سے پاک دامن عورتوں اور ان لوگوں کی جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے پاک دامن عورتوں کا بھی (وہی حال ہے جو اس میں کھانوں کا ہے۔ "وَالّٰٓئِیْ لَمْ يَحِضْنَ" سورۂ طلاق میں جو ترکیب بیان کی جاتی ہے وہی یہاں ہے) جب تم (دونوں فریق یعنی مسلمین اور اہل کتاب) ان کو مہر دے دو، قید نکاح میں لاتے ہوئے نہ شہوت رانی کرتے ہوئے، نہ چھپی یاری پکڑتے ہوئے۔

خواجہ صاحب کی بنائے استدلال آیت جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے حسب ذیل ہے۔

وَالّٰٓئِیْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ يَحِضْنَ ط (طلاق-۴)

اور جو تمہاری عورتوں میں سے ناامید ہو چکی ہیں اگر تمہیں شک ہو تو ___ ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض نہیں آتا۔

یہاں ان عورتوں کی عدت جو سن یاس کو پہنچ چکی ہیں۔ واضح لفظوں میں تین مہینے فرمائی اور جنہیں حیض آتا ہی نہیں۔ ان کے عدم حیض کا اشارہ کر کے بات ختم کر دی۔ اب مترجم و مفسر قاری خود سمجھ لے کہ وہی تین ماہ والا حکم اس پر بھی عائد ہوتا ہے جو سن یاس والی عورتوں میں مذکور ہوا۔

اسی طرح آیہ زیر غور میں مسلمانوں اور اہل کتاب کے متعلق دو مرتبہ "حل" کا لفظ وارد ہوا ہے۔ یعنی ان کا کھانا تمہیں حلال ہے اور

تمہارا کھانا انہیں حلال ہے اس کے ساتھ ہی مسلمانوں اور اہلِ کتاب کی پاک دامن عورتوں کا ذکر کر دیا اور اوپر والا "حِلٌّ لَّکُمْ" اور "حِلٌّ لَّهُمْ" ہی کافی سمجھا گیا۔ یعنی جیسے تم دونوں امتوں کا کھانا آپس میں حلال ہے ایسے ہی دونوں امتوں کی عورتیں بھی آپس میں حلال ہیں۔

واضح ہو کہ خواجہ صاحب اس تفسیر میں منفرد ہیں۔ شاید انہوں نے اسلام کی عالمگیری اور مساوات کے خیال سے جمہور کے خلاف یہ مفہوم اختیار کیا ہے۔

آدم کے دو بیٹوں کی خبر

نبأ بنی آدم

سورہ مائدہ آیت ۲۷ تا ۳۱ میں آدم کے دو بیٹوں کی خبر (ایک تاریخی بات) بیان فرمائی ہے کہ

"جب انہوں نے کوئی قربانی پیش کی، تو وہ ان دونوں میں سے ایک کی طرف سے تو قبول ہو گئی اور دوسرے کی غیر مقبول ہوئی۔ اس نے (حسداً) کہا "میں تجھے ضرور قتل کر دوں گا" دوسرے نے جواباً کہا کہ "اللہ صرف اہل تقویٰ کی (قربانی) قبول کرتا ہے"

یہاں ایک بات پیدا ہوتی ہے کہ قبول ہونے اور نامقبول رہنے کا علم کیسے ہوا؟ اس کا جواب مفسر یہ دیتے ہیں کہ

"آتش آسمانی ظاہر ہوئی اور ہابیل کی نیاز (قربانی) کو کھا گئی یہ علامت اس وقت قبول عند اللہ کی تھی" (تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)

بعض اس تفسیر کو قبول نہیں کرتے اور لکھتے ہیں کہ

"کیا قربانی تھی اور کس طرح اس کی قبولیت کا پتا لگا؟ یہ نہیں بتایا۔ اس لیے تفصیلات میں پڑنا درست نہیں (محمد علی لاہوری)

خواجہ صاحب نہایت آسانی سے، قدرتی طریق پر اس مشکل کو حل کرتے ہیں۔ اب دیکھئے آیت اور ان کا تفسیری ترجمہ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ (پ ۶ ع ۹) اور تو ان (لوگوں) پر آدم کے دو بیٹوں کی خبر حق کے ساتھ پڑھ، جب انہوں نے تقرب (الٰہی) حاصل کرنے کے لیے کوئی کام کیا، (ہابیل کا کام صبر و تقویٰ کے موافق تھا اس کا پھل اچھا نکلا۔ قابیل کا کام صبر و تقویٰ کے خلاف تھا، اس کا برا نتیجہ برآمد ہوا۔ جو کام صبر و تقویٰ کے ساتھ ہو سکتا ہے وہ بے صبری اور جلد بازی اور بے اعتباری کے ساتھ بگڑ جاتا ہے، صدق نجات دیتا ہے۔ جھوٹ پھنساتا ہے۔ اتفاق و نفاق کا نتیجہ ایک دوسرے کے بالکل مخالف نکلتا ہے) سو وہ (کام) ان کے ایک (ہابیل) سے قبول کیا گیا اور دوسرے (قابیل) سے قبول نہ کیا گیا۔ وہ (قابیل) بولا "البتہ میں تجھے قتل کر دوں گا"۔ اس (ہابیل) نے کہا سوائے اس کے نہیں کہ اللہ اہل تقویٰ سے (اعمال) قبول کرتا ہے (منزل دوم ص ۳۵)

یہ تشریح بالکل مشہور شعر کے مطابق ہے:

گندم از گندم بروید، جو ز جو از مکافاتِ عمل غافل مشو

قتل ہابیل

قابیل کے دل میں حسد پیدا ہوا۔ وہ دشمنی پر آمادہ ہوگیا۔ اس کے متعلق نیک بخت ہابیل نے کہا۔
اگر تو مجھے قتل کرنے کے درپے ہوگا۔ تو میں تیرے ساتھ ہرگز ایسا معاملہ (مقاتلہ) نہیں کروں گا۔
اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِکَ فَتَکُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ وَذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے:۔

"میں چاہتا ہوں کہ تو حاصل کرے میرا گناہ اور اپنا گناہ۔ پھر ہو جاوے تو دوزخ والوں میں اور یہی ہے سزا ظالموں کی (ترجمہ شیخ الہند)

"یعنی میرے قتل کا گناہ بھی اپنے دوسرے گناہوں کے ساتھ حاصل کرے" (عثمانیؒ بحوالہ ابن جریر)

یعنی تیرے عمر بھر کے گناہ تجھ پر ثابت رہیں اور میرے خون کا گناہ چڑھے اور مظلومیت کی وجہ سے میرے گناہ اتریں (موضح القرآن شاہ عبدالقادر دہلویؒ)

اس تشریح کی رو سے قاتل بھائی کے حق میں متقی ہابیل کی نیت متقیانہ معلوم نہیں ہوتی خواجہ صاحب اس مشکل کو بآسانی حل کر لیتے ہیں۔ سنئے ان کا ترجمہ،

اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِکَ فَتَکُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ــــ "میں (تیرے ساتھ ایسی نرمی کرنا اس لیے) چاہتا ہوں کہ کہیں تو میرے (قتل کے) گناہ اور اپنے (پہلے) گناہ کے ساتھ (ملوث ہوکر خدا کے حضور) نہ لوٹے۔ پھر تو (یوں) جہنمی بنے اور (ظاہر ہے کہ) ظالموں کی یہی سزا ہے (پس تو میرے قتل سے باز آ اور اپنے پہلے گناہوں کے لیے معافی مانگ اور آئندہ تقویٰ کی راہ اختیار کر)

اس آیت میں حرف "اَنْ" قابل غور ہے۔ عربی زبان میں یہ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "کہ" "تاکہ" ــــ "ایسا نہ کہ"۔ عام ترجموں میں پہلا معنی اختیار کیا گیا، لیکن خواجہ صاحب نے آخری معنی کو ترجیح دی ہے ــــ خود قرآن حکیم میں متعدد مواقع پہ ہمارے مترجمین نے یہی معنی اختیار کئے ہیں۔ مثلاً یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (نساء۔۔) "اللہ یہ باتیں تمہیں کھول کر بتاتا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ تم غلطی میں پڑ جاؤ۔

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ عَلٰی فَتْرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ (مائدہ۔۱۹)
ہمارا رسول تمہارے پاس آیا ہے، رسولوں کے بند ہو جانے پر، تاکہ تم نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والا نہیں آیا۔

نعش ہابیل

ہابیل کو دفن کرنے کے متعلق قابیل کو مشکل پیش آئی۔ مفسر لکھتے ہیں چونکہ اس سے پہلے کوئی انسان مرا نہیں تھا اس لیے قتل کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ لاش کو کیا کرے۔ آخر ایک کوّے کو دیکھا کہ زمین کرید رہا ہے۔ یا دوسرے مردہ کوّے کو مٹی ہٹا کر زمین میں چھپا رہا ہے اسے دیکھ کر کچھ عقل آئی کہ میں بھی اپنے بھائی کی لاش کو دفن کر دوں" (عثمانی)

ظاہر ہے کہ مُردوں کو دفن کرنے کا رواج خاص اقوام میں ہے۔ پوری انسانی دنیا اس کی قائل و عامل نہیں، چہ جائے کہ غیر ذوی

العقول حیوان (کوتے) کو اس کام میں انسان کا استاد تسلیم کیا جائے۔ آج بھی دنیا میں کوّے موجود ہیں کسی شخص نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ مردہ کوّے کو زندہ کوّے دفن کرتے ہوں۔ خواجہ صاحب نے اس کا یہ حل پیش کیا ہے۔ آیت اور ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ (پ ۶ ع ۹)

پھر اللہ تعالیٰ نے ایک کوّا بھیجا۔ وہ زمین کریدتا تھا اور دوسرے کوّے کے زخم پر مٹی اڑا کر ڈالتا تھا) تاکہ وہ (خدا اس (قابیل) کو دکھلائے کہ وہ (کوّا) اپنے بھائی کے عیب کو کیونکر چھپاتا ہے (قابیل اپنے بھائی کو جو بے قصور تھا، عیب دار سمجھتا تھا۔ اس لیے اس نے کہا کہ کیا میں اس سے بھی گیا گزرا ہوگیا کہ میں اس کوّے کی مانند ہوتا، سو میں اپنے بھائی کے عیب کو چھپاتا! (جب دوسروں کے عیبوں کو ——— جن میں سیاست کا دخل نہیں۔ چھپانا ضروری ہے تو کیا بے قصور کو ہی قتل کر دینا انسان کے لیے شایان ہے! سو وہ نادم ہوا اور ظاہر ہے کہ ایسے ظلم کے بعد ندامت اس کو سزا سے نہیں بچا سکتی تھی)

یہاں لفظ "سَوْءَةَ" قابلِ غور ہے قرآن حکیم میں اس مقام کے علاوہ متعدد مرتبہ اس کا استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس کے معنی "لاش" کہیں نہیں سمجھے گئے۔ اس کا مادہ سوء (سَاءَ يَسُوْءُ) ہے، یعنی ناگواری، برائی، نا ہمواری، بگاڑ، ابتری۔ سَيِّئَةٌ۔ جمع سَيِّئَاتٌ! ناخوش گواریاں۔ یہ حسنات کی ضد ہے ——— سَوْءَةَ کے معنی ائمہ لغت نے بُری خصلت، معیوب بات یا کام لکھے ہیں، جس سے شرم محسوس ہو۔ اسی وجہ سے مرد و عورت کے مقام ستر کو بھی سَوْءَةَ کہا جاتا ہے جس کی جمع خود قرآن میں سَوْآتُهُمَا آئی ہے عام طور پر آیہ زیرِ غور میں اس کے معنی لاش لے گئے ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب نے وہی معنی لیے ہیں، جو ائمہ لغت نے تسلیم کئے ہیں۔ دیکھئے تاج العروس، محیط المحیط اور مفردات راغب وغیرہ۔

جانوروں کی فطری سمجھ بوجھ سے انسان کی اکتسابی عقل و علم نے کئی سبق سیکھے ہیں۔ مثلاً پانی میں تیرنا، ہوا میں پرواز کرنا وغیرہ کوّے کی اپنے ابنائے جنس سے ہمدردی مشہور ہے۔ پنجابی شاعر نے کہا ہے،

ککڑ کاں، کمبوہ، قبیلہ پالنا جٹ مینہا، سنسار قبیلہ گالنا[۱]

ظہیر الدین بابر (شہنشاہِ ہند) نے انتہائی شکستہ دلی اور مایوسی کے وقت ایک چیونٹی کے عزم و استقلال سے وہ سبق سیکھا کہ مغل خاندان اور پورے ملک ہند کی تقدیر بدل گئی اور صدیوں تک برصغیر کے مسلمانوں نے اس خدا کی بھیجی ہوئی چیونٹی کے دیئے ہوئے سبق سے حکومت و سلطنت، دولت و امارت اور علم و حکمت کے بے انتہا فوائد حاصل کئے۔

---

[۱] یعنی مرغ خانگی، کوّا اور کمبوہ (ایک خاص برادری کا نام ہے) کنبہ پرور ہوتے ہیں۔ اور جاٹ، بھینسا اور گرمچھ اپنے خاندان کے دشمن ہوتے ہیں۔

وسیلہ

ہمارے عوام بلکہ بعض خواص میں بھی لفظ "وسیلہ" کے متعلق کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ براہ راست اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرنا کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں، لہٰذا متوفی بزرگوں کی روحوں اور ان کی قبروں کو وسیلہ بنانا ضروری ہے بعض صوفی حلقوں میں اس خیال کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے، لیکن لغت اور مستند تفاسیر میں اس سے اتفاق نہیں کیا گیا۔ چنانچہ راغب اور لسان العرب وغیرہ میں اس کے معنی توسل الی الشئ برغبتہ، قربۃ، مرتبہ اور درجہ بتائے گئے ہیں۔ تفسیر القرطبی میں ہے۔ الوسیلۃ ھی القربۃ۔ عن ابی وائل والحسن ومجاھد وقتادہ وعطاء والسدی وابن زید وعبد اللہ بن کثیر وھی فعیلۃ من توسلت الیہ ای تقربت صفحہ ۱۵۹ الجزء السادس ۔۔۔ مذکورہ اقتباس تمام بزرگ تابعین اس پر متفق ہیں کہ وسیلہ کے معنی قربت و نزدیکی ہیں۔ خود قرآن مجید میں اس کی تائید ملتی ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۔۔۔ بخاری کی روایت کے مطابق تمام غیر اللہ معبود جن، ملائکہ مسیحؑ و عزیرؑ اس میں شامل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ

"جن ہستیوں کو تم معبود و مستعان سمجھ کر پکارتے ہو، وہ خود اپنے رب کا بیش از بیش قرب تلاش کرتے ہیں ان کی دوڑ دھوپ صرف اس لیے ہے کہ خدا کی نزدیکی حاصل کرنے میں کون آگے نکلتا ہے؟ ان میں جو زیادہ مقرب ہیں، وہی زیادہ قرب الٰہی کے طالب رہتے ہیں"..... الخ (شیخ الاسلام عثمانی)

"اس سے یہ معنی نکالنا کہ ۔۔۔ جو لوگ مر چکے ہیں ان کو ذریعہ بنانا ایک نہایت لغو حرکت ہے ... بزرگان دین کو وسیلے کہہ کر ان کے ذریعے قضائے حاجات چاہنا .... سب مشرکانہ افعال ہیں۔ بزرگوں کا توسل ان کی زندگی میں بذریعہ ان کی دعا کے ہے ... نبی کریمؐ نے خود حضرت عمرؓ سے کہا تھا۔ لا تنسنا یا اخی من دعائك: اے بھائی! اپنی دعاؤں میں ہم کو بھول نہ جائیو!" (بیان القرآن محمد علی طبع ثانی صفحہ ۴۲۲ و ۴۲۳)

خواجہ صاحب نے اس پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا اختصار ملاحظہ فرمایئے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدہ ۶ - ۳۵)	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو (بد عادات سے بچو) اور اس (اللہ) کی طرف قرب ڈھونڈو (یعنی حسنات میں ترقی کرو) اور اس (خدا) کے لئے تم مجاہدہ کرو

(کیونکہ بار بار کوشش کرنے سے نیک عادات اور حسنات روح میں قائم ہو جاتی ہیں) تاکہ تم فلاح پاؤ ۔۔۔۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان اکون من المومنین ﴿پ۱۱﴾ کے مطابق پہلے مومن تھے لہٰذا اس آیت کے حکم میں سب سے پہلے داخل ہیں۔ آپ کو بھی حکم ہے یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ ﴿پ۲۱﴾ (اے نبی اللہ سے ڈر) سورۂ بنی اسرائیل میں ہے "کہ جو لوگ اقرب ہیں وہ بھی خدا کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں"

رسول کریم یقیناً اقرب ہیں (بحکم وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿پ۳۰﴾) لہٰذا وہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے تھے۔ پس جو وسیلہ خدا کی طرف حضور طلب کرتے تھے اس کی طلب ہمارے لیے بھی لازم ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات مبارک "وسیلہ" تھی (جیسا کہ متوفی بزرگوں کو وسیلہ بنانے والے کہتے ہیں) تو کیا آپ اپنے آپ کو ڈھونڈا کرتے تھے؟

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

تورات میں حکم اللہ

ہمارے ہاں عام طور پر صحف اولیٰ کو بالکل منسوخ اور ناقابل اعتماد مانا جاتا ہے اس کے باوجود قرآن حمید پہ غور کرنے والوں میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں۔ جو سابقہ کتب سماوی میں تحریف کے قائل ہونے کے باوجود، ان کو اول سے آخر تک ناکارہ نہیں مانتے۔

سب سے پہلے ہمیں حضرت حضرت علیؓ کا یہ قول ملتا ہے کہ

"اگر میرے لیے حکومت ہو تو اہل توریت کو توریت کے مطابق فتویٰ دوں اور اہل انجیل کو انجیل کے مطابق" (روح المعانی زیر آیہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جناب علیؓ آیہ ذیل کے مطابق توریت میں اللہ کے فیصلوں کو مانتے تھے۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللهِ (مائدہ - ۴۳)

اور (یہود) تجھ کو کیوں کر فیصلہ کرنے والا ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس تورات موجود ہے۔ اس میں اللہ تعالےٰ کا فیصلہ ہے۔

تفسیر قرطبی میں ہے،

هل يدل قوله تعالى "فيها حكم الله" على انه لم ينسخ ؟ کیا آیت کے اس حصہ "فیہا حکم اللہ" سے ثابت ہوتا ہے کہ تورات منسوخ نہیں ہوئی؟ ابو علی نے اس کا جواب دیا ہے۔ نعم لانه لو نسخ لم يطلق عليه بعد النسخ انه حكم الله ہاں اگر وہ منسوخ ہوتی، تو منسوخ ہو جانے کے بعد اس میں حکم اللہ کے موجود ہونے کا اعتراف نہ کیا جاتا (الجزء السادس ص۱۸۸)

انجیل کے متعلق لکھا ہے۔ والنسخ انما يتصور في الفروع لا في الاصول۔ نسخ فروعی باتوں میں ہو سکتا ہے۔ اصول میں ہرگز نہیں ____ یہی مسلک خواجہ صاحب نے اختیار کیا ہے۔ وکیف یحکمونک ..... الخ

"اور وہ تجھے کیوں کر حکم بناتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس تورات ہے، اس میں اللہ کا حکم موجود ہے۔ پھر اس کے بعد بھی منہ موڑتے ہیں اور وہ اپنی کتاب کے بھی مومن نہیں ہیں،

"اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے وقت میں جو لوگ تورات پر فیصلہ کرتے تھے۔ انہیں بحکم خدا اس کی بھی بلا شبہ اجازت تھی۔ ایسے لوگوں کو رسول کریمؐ کے حکم بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ تمام کتابوں کا منشا حق و انصاف کو ہی قائم رکھنے کا تھا.... اسلام تمام لوگوں کو اپنے قواعد پر چلنے کی اجازت دیتا ہے۔ بشرطیکہ ان کے سبب سے کسی پر ظلم نہ کیا جائے اور جو لوگ معقول

پسند ہوں وہ (صحف سماوی کے علاوہ "ناقل") معقول طور پر شوریٰ کے ذریعے قواعد و ضوابط بنا سکتے ہیں۔ اسلام ان سب پر چلنے کی اجازت دیتا ہے۔ وہ کسی قسم کے تحکم کو پسند نہیں کرتا" (منزل دوم صفحہ ۴۴)

اگلے ہی رکوع میں خود قرآن حکیم نے اس پر مہر تصدیق ثبت فرما دی ہے یہ کہہ کر کہ

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ .....
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ
هُمُ الظّٰلِمُونَ (المائدہ ۴۵)

اور ہم (خدا) نے ان پر لکھ دیا اس (تورات) میں کہ جان کے
بدلے جان..... الخ۔ آیت کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوا ہے
اور جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

آج جو تورات ہمارے سامنے ہے اس میں یہ "ما انزل اللہ" موجود ہے۔ دیکھئے استثناء ۱۹: ۲۰-۲۱ اور احبار ۲۴: ۱۷-۲۰ اور خروج ۲۱: ۲۲-۲۴ اسی طرح انجیل کے متعلق فرمایا ہے کہ جو "ما انزل اللہ" کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ فاسق ہے (مائدہ ۴۶) لہٰذا دونوں کتابوں کی موجودہ صورت میں "ما انزل اللہ" موجود ہے اور نزول قرآن کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ قرآن ان کا مصدق اور مہیمن (محافظ) ہے۔ تمام تر کا ناسخ نہیں ہے۔

اس کی مزید تائید میں آیہ ذیل بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ....تا.... أَرْجُلِهِمْ (مائدہ ۶۶) اگر اہل کتاب تورات انجیل اور اپنے دوسرے صحیفوں پر عامل رہتے تو زمین و آسمان سے نعمتیں پاتے۔ (مفہوماً) یہ مضمون اگلی آیات تک پھیلتا چلا گیا ہے۔

شرعۃ و منہاج

ارشاد ہوتا ہے:۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ط (مائدہ آیت ۴۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور طریق مقرر کیا ہے۔

قرطبی میں ہے: ومعنى الآية انه جعل التوراة لاهلها، والانجيل لاهله والقرآن لاهله۔ وهذا في الشرائع والعبادات۔ والاصل التوحيد لا اختلاف فيه (قتادہ) الجزء السادس ص۲۱۱

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے تورات، کو توریت والوں کے لیے مقرر فرمایا، انجیل کو اہل انجیل کے لیے اور قرآن کو اہل قرآن کے لیے ــــ اور یہ بات شریعتوں اور عبادتوں سے متعلق ہے اور اصولی بات توحید ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ــــ خواجہ صاحب آیت کا تفسیر ترجمہ کرتے ہیں۔

"ہم (خدا) نے تم میں سے ہر ایک کے لیے کھلا راستہ اور پگ ڈنڈی (جادّہ) بنائی ہے (اس طرز عمل کے الگ الگ ہونے میں کوئی حرج نہیں) اور[1] اگر اللہ چاہتا تو تمہیں (ظاہری رسم و رواج اور اعمال کی ظاہری صورتوں میں بھی) ایک اُمت بنا دیتا (اور یوں ترقیات و اصلاح کا دروازہ بند ہو جاتا۔ اور رنگا رنگی میں جو رونق اور آسانی ہے جاتی رہتی) ولیکن اللہ کا ارادہ ہے) تاکہ وہ تمہاری اسی (فہم و علم) میں آزمائش کرے جو تمہیں دیا ہے۔ سو تم خیر کے کاموں میں آگے بڑھو۔ تم سب کا رجوع اللہ کی طرف ہی ہے، وہ تمہیں خبردار کرتا ہے کہ تم کن (فضول) باتوں میں اختلاف کر رہے (اور لڑ رہے) ہو (اور اپنے اتحاد و سلوک کو مٹا رہے ہو)

---

[1] لَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (مائدہ ۴۸)

منع کثرت سوال

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔

مسلمانو! ایسی باتیں مت پوچھو کہ اگر تم پر کھول جاویں تو تم کو بری لگیں اور اگر نزول قرآن کے وقت پوچھو گے یہ باتیں تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی اللہ نے ان سے درگزر کی ہے اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک اصولی بات بیان فرمائی ہے کہ جو کچھ قرآن میں آچکا ہے اس پر مطمئن ہو جاؤ اور اپنی طرف سے مزید سوالات کر کے مزید بوجھ اور پابندیاں اپنے اوپر نہ ڈالو۔ جیسا کہ پہلی قومیں کثرت سوال اور انبیاء سے اختلاف کرنے کی بدولت ہلاک ہوئیں " (حدیث صحیح)

قرطبی نے علماء کی اکثریت کا اس پر متفق ہونا بیان کیا ہے۔ حیث قال

قال كثير العلماء المراد بقوله كثرة السوال التكثير من السوال في المسائل الفقهية تنطعًا، وتكلفًا فيما لم ينزل والاغلوطات وتشقيق المولدات وقد كان السلف يكرهون ذالك ويرونه من التكليف (جزء سادس صـ ۳۳۲)

بہت سے علماء کہتے ہیں کہ اس آیت میں کثرت سوال سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ جن فقہی مسائل میں قرآن خاموش ہے، ان میں مبالغہ و تکلف کرتے ہوئے زیادہ کرید نہ کی جائے اور غلط اور نئی نئی باتیں نہ نکالی جائیں۔ سلف کثرت سوال سے کراہت کرتے اور اسے کلفت سمجھتے تھے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ۔ میں نے اصحاب رسولؐ سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی۔ انہوں نے حضورؐ سے صرف تیرہ ۱۳ سوال کئے یہاں تک کہ آپؐ کی رحلت ہوئی۔ اور وہ سب کے سب قرآن حکیم میں آگئے ہیں۔ جیسے کہ يسئلونك عن الشهر الحرام و يسئلونك عن المحيض۔ وغیرہ۔ وہ فضول باتوں کے متعلق سوال ہی نہیں کرتے تھے (قرطبی جزء سادس صـ ۳۳۳)

"عفا الله عنها" کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ العفو بمعنى الترك اي تركها ولم يعرف بحالها حلال وحرام فهو معفو فلا تبحثوا عنه ولعله ان ظهر لكم حكمه ساءكم (ایضاً صـ ۳۳۴) عفو کے معنی ترک ہے یعنی اللہ نے قرآن میں جس کا ذکر ہی نہیں کیا اور اس کی حلت و حرمت کی کوئی تعریف نہیں کی۔ وہ معاف ہے۔ اس کے متعلق کرید نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے سوال کی وجہ سے اس کے متعلق کوئی حکم آجائے جو تمہارے لیے مصیبت بن جائے۔

دارقطنی نے ابو ثعلبہ خشنی سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ان الله فرض فرائض فلا تضيعوها وحرم

حرمات فلا تنتہکوھا وحد حدودًا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنہا عفا اللہ عنہا ان تبد لکم تسؤکم اسے امسک عن ذکرھا فلم یوجب فیہا حکما ایضًا) اللہ تعالیٰ نے کچھ باتیں فرض قرار دی ہیں۔ انہیں ضائع نہ کرو اور کچھ حرام کی ہیں، ان کا ارتکاب نہ کرو۔ اور حدیں مقرر کی ہیں۔ ان سے آگے نہ بڑھو اور کچھ باتوں کے متعلق سکوت فرمایا ہے نسیان کے بغیر، پس ان کو کرید نہ کرو۔ ان سے درگزر کی ہے۔ اگر وہ بھی کہہ دی جاتیں تو تمہارے لیے خواہ مخواہ کی مشقت ہوتی۔ یعنی قرآن میں جن کا کھل کر ذکر نہیں کیا۔ ان کے متعلق کوئی حکم لگانا ناواجب ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں خواجہ صاحب نے مذکورہ صدر تفسیر قرطبی کے مطابق تفصیل سے کلام کیا ہے۔ اس کی تلخیص ملاحظہ فرمایئے۔

" اللہ تعالیٰ بندوں کی ضرورتوں کو ان سے بہتر جانتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ میں نے قرآن کو کامل وکافی کتاب بنایا ہے اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی (کہف ۲) اسی کے ساتھ وعظ کیا کرو (ق ۔ ۴۵)

یہ " تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ " (نحل ۸۹) ہے۔ خدا کے سوا کسی کا حکم نہیں (یوسف ۔ ۴۰) خدا کے سوا کسی حکم نہیں بنایا جاسکتا (انعام ۔ ۱۱۴) خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کو دین میں " شارع " بنانا شرک ہے (شوریٰ ۱۳، ۲۱) اس قرآن میں دوسری کتابوں اور حدیثوں کی طرح باطل نہ آگے سے داخل ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ حکیم وحمید خدا کی طرف سے تمام دنیا کے لیے نازل کیا گیا ہے (حم السجدہ ۔ ۴۲)

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ " جن باتوں کو میں قرآن میں بیان نہیں کرتا میں نے ان کی طرف سے درگزر کیا ہے۔ ان کے لیے تمہارے ہی فہم ودانش کو گذارے کے قابل قرار دے رکھا ہے۔ لہٰذا تم ایسے زائد سوال کرکے مبتلائے مصائب نہ ہو جانا، اور سہل شریعت کو اپنے لیے مشکل نہ بنا لینا پہلے لوگوں نے بھی ایسے سوال کئے تھے۔ پھر تنگی ومشقت سے گھبرا کر آخر کافر بن گئے اور " اصل اعتدال " سے بھی محروم ہو گئے۔ دنیا کی تمام چیزوں میں نفع وضرر کے دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ضروری باتیں (قرآن میں) بیان کر دی ہیں۔ باقی باتیں انسانی فہم پر چھوڑ دی ہیں تاکہ انسان عقل کو کام میں لا کر خود بھی آئندہ کے لیے ترقیات کرسکیں اور اصلاح کرکے مفید پہلوؤں سے کام لے سکیں۔ خواجہ صاحب نے آیۂ زیر غور سے متعدد نکتے اخذ کئے ہیں۔ مثلاً

۱ — سزائی احکام جو خاص اشخاص اور اقوام کے لیے ہی آسکتے ...... ہیں۔ ان کا بھی قرآن حکیم ہی میں مندرج ہونا ضروری تھا۔ لہٰذا وہ عالمگیر احکام جو روزمرہ یا مقررہ ایام واوقات میں اصولاً سب پر فرض ہیں۔ جیسا کہ صلوٰۃ وزکوٰۃ کے احکام، انہیں قرآن سے باہر کیسے چھوڑا جاسکتا تھا؟ (یہود پر یوم سبت اور بعض حلال ماکولات کی حرمت بطور سزا تھی جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ انعام ۱۴۷)

۲ — قرآن کے وحی ہونے کے وقت کسی سوال کا جواب بذریعہ وحی قرآن ہی دیا جاسکتا تھا۔ کوئی غیر قرآنی وحی اس وقت مقصود نہیں تھی۔

۳ — قرآن کے علاوہ کسی اور ذریعے سے (خدا سے یا وحی سے) کوئی بات پوچھنا جو عند اللہ وحی میں نہ ہونی چاہیئے — ناجائز ہے۔

۴ — جن باتوں کو خدائے حکیم وعلیم نے قرآن میں لانا پسند نہیں کیا، وہ سب " عفا اللہ عنہا " میں داخل ہیں۔ یعنی اللہ نے ان

سے درگذر فرمائی ہے۔ پھر ان کو مثلہ معہ، کہنا قرآن حکیم کی ہتک نہیں تو کیا ہے۔؟"

الغرض خواجہ صاحب نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ یہ آیت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ جو بات بھی قرآن مبین و محفوظ سے باہر ہے وہ "عفا اللہ عنھا" میں داخل ہے۔ اس کو رسول یا غیر رسول عُقلاء و حُکماء اپنی اپنی ضروریات زمانہ کے مطابق تجویز کر سکتے ہیں۔ پھر اس کی افادیت کے پیش اس میں مناسب تبدیلیاں بھی کر سکتے ہیں۔ صرف ایک قرآن ہے۔ جو قیامت تک کے لیے غیر مبدل اور اٹل حقائق کا مجموعہ رہے گا یہ بقا و شرف کسی بھی فانی انسان کی تصنیف کو حاصل نہیں۔

مجمع الفوائد کتاب البیوع، ریاض السنۃ صلا۴۳۔ الاحکام لابن حزم ج ۵ ص۵۹ و ۶۰ طبرانی فی الاوسط کنز العمال ج ۱ ص۵ خطبات نبوی لمحمد ج ۵ ص۵۹ ۹۶۸، الرد علی السیر الاوزاعی ص۲۱، کتاب الام للشافعی ج ۷ ص۲۶۴ وغیرہ بہت سی کتابوں میں اس مفہوم کی حدیثیں ملتی ہیں کہ الحلال ما احل اللہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ و ما سکت عنہ فہو عفی عنہ

اس اقتباس کا یہ آخری ٹکڑا کہ جس بات سے اللہ نے سکوت فرمایا وہ معاف ہے، بالکل واضح کر رہا ہے کہ قرآنی اوامر و نواہی و حدود وغیرہ پر اضافے کا حق کسی بشر کو نہیں سونپا گیا۔

---

[1] محمد ابو ریہ نے اپنی "اضواء علی السنۃ النبویۃ او دفاع عن الحدیث" مطبوعہ مصر ص۴۵ میں اس پر سخت تنقید کی ہے "آپ نے اپنی زندگی میں اس "مثلہ معہ" کو کیوں نہ لکھوایا اور حدیث نبی "لا تکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن" کے ساتھ یہ کیوں نہ کہا" وغیرہ ما وتیتہ معہ وھو مثلہ" کیا یہ درست ہے کہ آپ نے نصف وحی کو لوگوں کے حافظے پر چھوڑ دیا کہ کچھ یاد رہے کچھ بھول جائے اور کچھ زیادہ ہو جائے! کیا یہ تبلیغ رسالت اور ادائے امانت میں کوتاہی نہیں! اس وقت یہ حدیث کہاں تھی جب یہ آیت اتری "الیوم اکملت لکم دینکم الخ" اور جب آپ نے فرمایا "انی لم احل الا ما احل القرآن ولم احرم الا ما حرم القرآن" اور جب حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں سے کہا "بیننا بینکم کتاب اللہ فاستحلوا حلالہ وحرموا حرامہ" اور عمرؓ نے آپؐ کی رحلت کے وقت کہا "حسبنا اللہ" اور اس وقت کہاں تھی جب عائشہؓ نے کہا "کان خلقہ القرآن"! اس کے ساتھ "مثلہ معہ" کیوں نہ کہا! نصف وحی کو تدوین کے بغیر چھوڑ دینا کتنا بڑا گناہ ہوتا! ص۴۲ و ۴۳۔

[2] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص۳۴۲

سورہ الانعام

نور وظلمت کے دو خالق نہیں

سورہ انعام کی پہلی آیت ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّھِمْ یَعْدِلُوْنَ ـــــ خواجہ صاحب کا تفسیری ترجمہ اور پھر تفسیر کی تلخیص دیکھئے۔

"سب اصلی خوبیاں اللہ (یعنی ذات کامل) کے لیے ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور نور کو بنایا"

"ظلمات" کے جمع اور "نور" کے واحد ہونے کی وجہ بتاتے ہیں۔

نورِ عقل کا ہمیشہ ایک ہی حکم ہے۔ حق ہمیشہ ایک ہی رہا ہے نور ایک[1] ہی چیز ہے۔ (مثل مشہور ہے۔ "ستو سیانے ایک مت مورکھ آپو آپنی" یعنی دانا کتنے ہی ہوں، ان سب کی ایک رائے ہوگی ـــــ لیکن مورکھوں (احمقوں) نے تفرقے ڈال رکھے ہیں۔ جہالت کے اندھیرے بے شمار ہیں۔ فطرت ایک ہے اور اہواء (خواہشات نفسانی) بہت ہیں ـــــ ظلمات، رات، جہالتیں، بدیاں، غم، دکھ، افلاس اور موت مختلف چیزیں ہیں۔ جو کائنات پر مختلف اثر ڈالتی ہیں۔ یہ سب داخلِ ممکنات ہیں اگر بدی کا امکان نہ ہوتا تو کوئی بد نہ بن سکتا، نیکی اور بدی کے علاوہ ایک اور حالت بھی ہے۔ پتھر کو نیک کہہ سکتے ہیں نہ بد۔ ظلمات اور دکھ ارتقا کے ذریعے ہیں بُرا وہ ہے جو ان سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہی ارتقا ہے۔ اسی میں حکمت ہے۔ جو لوگ دکھ سکھ اور نیکی و بدی کے دو خالق بتاتے ہیں، یقیناً غلطی پر ہیں۔ آگ جلاتی ہے۔ اور زندگی بخش غذا بھی تیار کرتی ہے۔ اس کا خالق ہی حیات و موت دونوں کا خالق ہے۔ اس میں کسی دوسرے خالق کی ضرورت نہیں۔ انسان غلط استعمال سے دکھی ہو جاتا ہے اور قوانین الٰہی کے مطابق بُرا بن جاتا ہے حاصل یہ ہے کہ تمام اشیاء کا خالق اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی نہیں) پھر وہ لوگ جو کافر ہیں اپنے پالنے والے کے ساتھ (دوسروں کو) برابر بناتے ہیں (اور ان کو خدا کے ساتھ کسی نہ کسی بات (صفت) میں "شریک" ٹھہراتے اور خدا تعالیٰ کی طرح قاضی و حاکم بتلاتے ہیں (ایضاً ص۲۴)

---

[1] ایک کمرے میں کئی چراغ جلا کر رکھ دیئے ہیں۔ ان کی روشنیاں الگ الگ نہیں ہوں گی۔ سب مل کر ایک ہو جائیں گی۔

غیر نافع خوارق

عام انسانی فطرت عجائبات و خوارق سے ہمیشہ دل چسپی لیتی رہی ہے خود قرآن مجید میں مخالفین کی طرف سے اس قسم کے مطالبات جا بجا بیان فرمائے گئے ہیں ـــــ مثلاً

..... وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهٗ ..... الخ (بنی اسرائیل ۹۳) یعنی آپ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ کر دکھائیں۔ ہم اسی صورت میں آپ کی بات مانیں گے کہ آپ ہم پر کتاب اتار لائیں جس کو ہم پڑھ لیں۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (میں ایک بشر ہوں، بھیجا ہوا، اس کے سوا میرا کوئی دعویٰ نہیں یعنی عجائب و خوارق کا مدعی نہیں ہوں۔

نیز اس کے جواب میں یہ بھی فرمایا کہ

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (انعام - ۷)

اس کا عام ترجمہ یہ ہے۔

اور اگر اتاریں ہم تجھ پر لکھا ہوا کاغذ میں پھر چھو لیویں وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے البتہ کہیں گے کافر یہ نہیں ہے مگر صریح جادو۔ (ترجمہ شیخ الہند)

خواجہ صاحب اپنے مخصوص میلان و ذوق کے مطابق اس کی طویل شرح کرتے ہیں۔ اس کی تلخیص ملاحظہ فرمائیے:

عقلی دلائل پر مطمئن نہ ہو کر لوگ خلاف فطرت خوارق چاہتے ہیں جس طرح یہود نے جناب پیغمبرؐ سے کہا تھا۔ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَآءِ (النساء ۱۵۳) کہ آپؐ ان پر لکھی ہوئی کتاب آسمان سے اتار لائیں۔ اسی طرح قریش نے بھی کہا کہ ہم پر کتاب اتار لائیں[۱]۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اگر ہم تجھ پر کوئی کتاب کاغذوں میں (لکھی ہوئی) اتار دیتے! پھر وہ اُسے اپنے ہاتھوں سے چھو لیتے۔ تو وہ لوگ جو (فطری و عقلی مشاہدے کی دلائل کو کافی نہ سمجھ کر) کافر ہوئے، کہہ دیتے کہ یہ (خارق) تو صرف دھوکا ہے۔ شبہ پھر بھی قائم رہے گا اور ایمان نصیب نہ ہوگا ـــــ جادو منتر وغیرہ کے قائل آپ کو جادوگر سمجھ لیں گے۔ اور دانش مند خیال کریں گے کہ خارق کا اصل دلیل سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً کوئی شخص کہے کہ "خدا دو ہیں" اور اس کے ثبوت میں وہ آسمان میں پرواز کر کے دکھا دے، تو کیا اس خارق سے دو خدا ثابت ہو جائیں گے! اور اگر بذریعہ خوارق مومن بنایا جائے تو یہ جبری ایمان ہوگا نہ کہ

---

[۱] حوالہ اوپر مذکور ہو چکا۔

عقلی واختیاری۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَلَوْ تَرٰىٓ اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (الانعام-۲۷)

جہنم کو دیکھ لینے کے بعد (کفار) کہیں گے۔ اے کاش ہم (دنیا میں) لوٹا دئے جائیں اور ہم اپنے رب کی آیات کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والے بن جائیں۔

ایسا جبری ایمان ہرگز کوئی نفع نہیں دے گا، جیسا کہ اس سے اگلی آیات سے ظاہر ہے۔

خوارق کے خلافِ حکمت ہونے کے متعلق مثال دے کر سمجھاتے ہیں۔

اگر سیر کا بٹا شام کو دو سیر کا ہو جائے، چھوٹی سی کشتی میں دنیا کے تمام جانور سما جائیں، صرف ہاتھ کو پھیلانے سے پانی منہ میں پہنچ جائے، اونٹ سوئی کے ناکے سے گذر جائے، سونٹا کبھی سانپ اور کبھی پھر سونٹا بن جائے۔ جن کبھی آدمی اور کبھی سانپ بن جائے۔ مٹی کی مورت میں پھونک مارنے سے پرندہ بن کر اڑ جائے، سونٹا دریا میں مارنے سے بارہ خشک راستے پیدا ہو جائیں اور سامری کا بچھڑا جبریل کی گھوڑی کے پاؤں کی مٹی ڈالنے سے گائے کی طرح بولنے لگے (وغیرہ وغیرہ) تو دنیا میں اندھیر مچ جائے۔ کوئی نظم و نسق قائم نہ رہے، کسی بات پر دلیل قائم نہ ہو سکے۔ اثباتِ توحید تو الگ رہا۔ وجودِ باری تعالیٰ بھی گم ہو جائے ـــــ ہر شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ علت و معلول یا سبب اور نتیجہ میں مناسبت ضروری نہیں۔ لہذا کائنات کے لیے مناسب علت یا سبب (خالق تو) کی حاجت نہیں (معاذ اللہ)

ہر کام کے لیے معقول ذرائع و وسائل پیدا کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام بے راہ نہیں ہوتا ـــ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝ (طٰہٰ-۵۲) میرا رب نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔ مناسب قاعدوں سے ہونے والے سب کام فطرت کے مطابق ہیں۔ اللہ نے کائنات کی فطرت میں کوئی کمی اور کجی نہیں رکھی۔ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (السجدہ-۷) ہر شے خوب بنائی۔ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (نمل-۸۸) اللہ نے ہر شے کو (حکمت کے مطابق) درست (اور پختہ) بنایا ہے۔ جو کام خلافِ فطرت ہیں اور جن میں فرض یا سنت اللہ کی تبدیلی لازم آتی ہے، وہ سب بے راہ ہیں اور بے راہی سے مقصود حاصل نہیں ہوتا.... اگر محض ہاتھ پھیلانے سے کوئیں کا پانی منہ میں آجائے، تو بتوں کو پکارنا بھی صحیح ثابت ہو جائے۔ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۭ وَمَا دُعَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (الرعد-۱۴) اللہ کو پکارنا ہی حق ہے۔ جو غیر اللہ کو پکارتے ہیں، وہ نامراد رہتے ہیں، اس شخص کی طرح جو پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے اور امید رکھے کہ پانی آپ سے آپ اس کے منہ میں پہنچ جائے گا کافروں کو پکارنا گمراہی ہے ـــ اگر زوج کے بغیر کسی کے ہاں ولد پیدا ہو سکے، تو اللہ نے اپنے لیے والد نہ ہونے کی جو دلیل دی ہے، باطل ہو جائے۔ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (انعام-۱۰۱) اللہ کے لیے ولد کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ بیوی ہی نہیں۔

(منزل دوم ص ۱۰۲ تا ۱۰۸)

خوارق اور جہل

خوارق کے ذریعے جبری ایمان کی خواہش جاہلوں کا شیوہ ہے۔ اس کا ثبوت آیہ ذیل سے ملتا ہے۔
إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ ۚ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ (الانعام ۳۶) خواجہ صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

(یہ لوگ اس غلبہ اور کام یابی کو جو حق کی متابعت کے سبب پیدا ہوتی ہے، دلیل نہیں سمجھتے بلکہ خوارق کے طلب گار ہیں) اور اگر ان کا منہ موڑنا تجھ پر بھاری گزرتا ہے۔ تو اگر تجھ کو طاقت ہے کہ زمین میں کوئی سُرنگ طلب کرے یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگائے تاکہ تو ان کے پاس کوئی نشان لے آئے (تو لے آ) اور اگر (اللہ ایسا) چاہتا تو انہیں ہدایت پر جمع کر دیتا۔ سو تو جاہلوں سے مت بن (ایضاً صفحہ ۱۲)

اس پر کسی تبصرے یا تشریح کی ضرورت نہیں۔ آیت کریمہ نہ صرف یہ کہ خوارق کا انکار کر رہی ہے۔ بلکہ ایسے مطالبے ہی کو جہالت قرار دے رہی ہے۔ اور جبری ایمان کے متعلق صاف کہہ رہی ہے کہ اگر اللہ کو ایسا ایمان منظور ہوتا، تو خوارق کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کے بغیر ہی اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت پر جمع کر سکتا تھا۔ جیسے کہ انسان کے سوا تمام مخلوق اپنی فطری ہدایت پر بلا اختلاف مجبور و مجبول ہے۔ أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ (طٰہٰ ۵۰) ہر ہر چیز کو اس کی شکل، صورت اور ہیئت عطا کی، پھر اسے اپنی مادی ساخت، اندرونی قویٰ اور خارجی اسباب سے کام لینے کی راہ سُجھائی۔ بقول شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کھانے پینے کا ہوش دیا۔ بچے کو وہ نہ سکھائے تو کوئی نہ سکھا سکے۔" دنیا بھر کے افلاطون و لقمان نہ سکھا سکیں۔ ایسی فطری و جبری ہدایت تمام انسانوں کو سکھانا اس تعالیٰ کے لیے کیا مشکل تھا؟

نفخِ صور

نفخ صور کے متعلق عام تحقیق یہ ہے کہ روزِ قیامت جب پہلا صور پھونکا جائے گا، سب لوگوں کے ہوش وحواس جاتے رہیں گے اور آخر مر کر ڈھیر ہو جائیں گے۔ اتنی فرصت بھی نہیں ملے گی کہ مرنے سے پہلے کسی کو کچھ کہنا چاہیں، تو کہہ گزریں یا جو گھر سے باہر تھے وہ گھر واپس جا سکیں۔[1]

پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا، تو سب زندہ ہو کر اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے اور فرشتے ان کو جلد از جلد دھکیل کر میدانِ حشر میں لے جائیں گے۔

خواجہ صاحب اس سے اختلاف کرتے ہیں ـــــ وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کی قیامت اس کی موت کے ساتھ واقع ہو جاتی ہے[2] اور اس کے لیے صور پھونکا جاتا ہے۔ چنانچہ زیرِ آیۂ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ (انعام۔ ۷۳) لکھتے ہیں:

"جب کہ بگل یا پھونکا جاتا ہے (یعنی تمہارے کوچ کا نقارہ بجتا ہے ـــــ فوجوں کی نقل وحرکت، کوچ اور مقام کے لیے بگل یا نقارہ بجتا ہے، سدِّ ذوالقرنین کی تعمیر کے وقت یاجوج ماجوج کو روکنے کے لیے فوجیں کھڑی تھیں۔ مڈ بھیڑ ہوئی تو نفخ صور ہوا اور بہت سے مفسد جہنم کے سامنے لائے گئے۔ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ (کہف۔ ۹۴) یاجوج ماجوج (یعنی منگول اور منچور) اس زمین میں فساد کرنے والے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ وَتَرَکْنَا بَعْضَهُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًاۙ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ یَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِیْنَ عَرْضَا (ایضاً۔ ۹۹، ۱۰۰) ـــــ (جب دیوار بن رہی تھی تو ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج کی جنگ بھی ہو رہی تھی۔ ذوالقرنین ان مفسدوں کو جو دیوار کی تکمیل میں حارج تھے، تباہ کر رہا تھا جیسا کہ ارشاد ہے) اور ہم نے اس دن ان کے بعض کو اس حال میں چھوڑا تھا کہ وہ دوسرے بعض میں لہریں مار رہے تھے (گتھم گتھا ہو رہے تھے) اور (جنگی) بگل پھونکا گیا اور ان (جنگ آوروں) کو ہم نے اکٹھا کیا (جنگ میں بہت سے مفسد مارے گئے) اور ہم نے اسی دن جہنم کو کافروں کے سامنے بخوبی پیش کر دیا (ترجمہ خواجہ صاحب) یہاں سب صیغے ماضی کے ہیں، جن کو مترجمین نے مستقبل بنایا ہے۔ دیکھئے تَرَکْنَا، نُفِخَ، جَمَعْنٰهُمْ، عَرَضْنَا۔ صرف "یموج" مضارع ہے۔ جس کے کئی شواہد قرآن حکیم میں موجود ہیں۔

---

[1] اگر سب لوگ جو اس وقت روئے زمین پر موجود ہوں گے اچانک ایک دم مر جائیں گے تو ان کے لیے قبریں کون کھودے گا؟ کفن دفن کا اہتمام کون کرے گا؟

[2] دیکھئے زیر عنوان "بلا تاخیر جزا و سزا"

"نفخ صور" کا مفہوم کی طرح ظاہر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً

۱۔ یَوْمَ یُنَادِیْھِمْ (قصص-۶۲) خدا تعالیٰ انہیں پکارتا ہے اور اپنے حضور بلا لیتا ہے۔ (ترجمہ خواجہ)

۲۔ وَاسْتَمِعْ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّکَانٍ قَرِیْبٍ (ق-۴۱) یعنی تو کان رکھ! جس دن پکارنے والا قریب جگہ ہی سے پکار لیتا ہے، جب کہ یہ صیحہ کو حق کے ساتھ سنتے ہیں، یہی خروج کا دن یعنی اس دنیا سے نکلنے کا وقت ہے۔ بلاشبہ ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہماری طرف ہی لوٹنا ہوتا ہے، جب کہ یہ زمین یعنی کثیف مادی حالت ان سے پھٹ کر الگ ہو جاتی ہے۔ اس حال میں کہ یہ دوڑتے چلے آتے ہیں۔ یہ حشر ہم پر آسان ہے (ترجمہ خواجہ سورۂ ق آیہ ۴۱ سے ۴۴ تک) نیز نفخ صور کو بلاوے سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

۳۔ یَوْمَ یَدْعُوْکُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا (بنی اسرائیل-۵۲) یعنی جس دن وہ (خدا) تمہیں پکارتا ہے۔ پھر تم اس کی حمد کے ساتھ اس کے بلاوے کو قبول کرتے ہو اور گمان کرتے ہو کہ تم دنیا میں کم ہی ٹھہرے ہو۔

۴۔ یَوْمَئِذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَهٗ (طٰہٰ-۱۰۸) ــــ (آیہ ما قبل میں زلزلے کا ذکر آیا ہے اس مناسبت سے خواجہ صاحب لکھتے ہیں)

تم کسی بڑے زلزلے کے دن اُس پکارنے والے کا حکم مانتے ہو، جس کے حکم میں کوئی ــــ نہیں ہے اور حکم کیا۔

۵۔ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ یَوْمَ یَدْعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیْءٍ نُّکُرٍ (قمر-۶) یعنی تو ان سے منہ موڑ لے اور اس دن کا انتظار کر جب پکارنے والا ان کو ایک ناگوار چیز کی طرف پکارے (منزل دوم ص ۱۴۳ اور ۱۴۴)

اسی طرح نفخ صور کو کہیں جگہ "صیحہ" کہا گیا ہے۔ مثلاً اِنْ کَانَتْ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ (یٰس-۲۹) ان پر ایک صیحہ (دھماکا) آیا تو وہ یک لخت مر کر بجھ گئے اور تمام تعلق خاک میں مل گئی۔

یہ نفخ صور زمینی و آسمانی لوگوں پر دو دفعہ ہوا کرتے ہے۔ ایک موت کے وقت جب کہ ہر شخص موت کی بے ہوشی اور گھبراہٹ میں پڑا رہتا ہے (شہیدوں، صدیقوں اور نبیوں کے سوا کیوں کہ یہ لوگ فی الفور دوسرے عالم میں داخل کئے جاتے ہیں) پھر مناسب دیر کے بعد دوسری دفعہ صور ان کو کھلے طور پر عذاب و ثواب میں داخل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے بھی بے ہوش لوگوں کی طرح دکھ سکھ میں پڑے ہوتے ہیں۔

اس نفخ صور، صیحہ، ندا یا بلاوے کی آواز اسی طرح ظاہر ہوتی ہے، جس طرح اُسے موت کے وقت فرشتے گرزوں سے مارتے اور ان سے باتیں کرتے ہیں اور نزع کی حالت میں جواب دیتے ہیں اور تیماردار وغیرہ لوگ پاس بیٹھے ہوئے ان گرزوں کو نہیں دیکھتے اور نہ کوئی ایسی آواز سنتے ہیں جو ان جسمانی کانوں سے سُنی جائے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عالم آخرت کی حقیقت اس دنیا سے الگ ہے۔ وہاں صرف اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے، اس لیے کہ وہ (غیب اور شہادت کا یکساں) جاننے والا اور وہی اصل حکمت والا، اصل خبر رکھنے والا ہے۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ (انعام-۷۳) منزل دوم ص ۱۴۴ و ۱۴۵)

حقیقتِ جنّ

عام علماء کے نزدیک "جن" انسان سے الگ ایک غیر مرئی ناری مخلوق ہے۔ خواجہ صاحب اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جن دو قسم کے ہیں۔

۱۔ انسانی جن، جو انسان ہی کی طرح بشر رسولوں کی لائی ہوئی شریعتوں کے مکلف ہیں۔

۲۔ ابلیسی جن، جو ابلیس ہی کی طرح غیر مرئی ہیں۔

چنانچہ وہ آیۂ ذیل کی مفصل تفسیر میں لکھتے ہیں۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

(انعام ۔ ۱۰۰)

انہوں نے اللہ کا شریک جنوں کو بنایا، حالاں کہ اس (خدا) نے ان سب کو پیدا کیا ہے (اور یہ مخلوق ہوتے ہیں سب یکساں ہیں) اور انہوں نے اس (خدا) کے لیے (محض) نادانی سے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لی ہیں وہ ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ پاک اور بلند ہے (ترجمہ خواجہ)

تفسیر ہندوستان میں آریہ آئے تو بہت سے اصلی باشندوں نے جنگلوں اور پہاڑوں میں جا کر پناہ لی۔ جب داؤد نے جالوت کو قتل کیا تو بہت سے اصلی باشندے دشت و جبال میں جا بسے، جب بنی اسماعیل حجاز پر متصرف ہوئے، وہاں کے اکثر باشندے حجاز کی سرحدوں پر جا آباد ہوئے۔

جنّ کے ایک معنی ہیں "اول ہر چیز" اس لیے وہ پہلے باشندے جنّ کہلائے اور مہذب فاتح انس کے نام سے موسوم ہوئے۔ جیسے انسی کے مقابلے میں وحشی آتا ہے۔ اسی طرح انسی کے مقابلے میں جنی لایا جاتا ہے۔ لہٰذا جنّی اور وحشی ایک ہی چیز ہیں۔ ارشاد باری ہے۔ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (توبہ ۹۷) یہ گنوار لوگ کفر و نفاق میں بہت سخت ہیں۔ اور قرآن کے حدود کو سمجھنے کے اہل نہیں اور اللہ تعالیٰ علم و حکمت والا ہے۔

جانّ ــــ جنّ، ماضی سے اسم فاعل ہے۔ یعنی ظلمت پھیلانے والا ــــ جنّ جہالت پسند اور وہم پرست ہوتے ہیں۔ اپنی خود سری و خود رائی کے سبب مطیع بننے کو عار سمجھتے ہیں ــــ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (کہف ۔ ۵۰) ابلیس جنوں یعنی سرکشوں میں سے تھا، اس لیے وہ اپنے رب کے حکم سے نکل گیا ــــ اس سے معلوم ہوا کہ جنّ ایک وصفی نام ہے جو سرکش اور

خودرا سے انسانوں پر بھی بولا جا سکتا ہے۔ عقل کو ڈھانکنے والی بیماری کو بھی جنہ (یا جنون) کہتے ہیں۔
"ناس" کے معنی میں لغت کے لحاظ سے "جن" بھی داخل ہیں؛

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ	جب لوگوں کے پاس ہدایت آتی تھی تو "ناس" (یعنی جن وانس)
الْهُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا	کو یہی بات ایمان سے روکتی تھی کہ وہ کہتے تھے "کیا اللہ نے
رَّسُوْلًا ٥ (بنی اسرائیل - ۹۴)	بشر رسول بنا کر بھیجا ہے۔!"

اس آیہ مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ جنوں کی طرف بھی بشر رسول ہی آیا کرتے تھے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ قوم جن کے لوگ کتاب موسیٰ کی تصدیق کرتے تھے؛ نفراً من الجن ..... قَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا کِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی ..... الخ (احقاف ۲۹ و ۳۰)
کیا یہ درست نہیں کہ جن قرآن پر ایمان لائے تھے؛ (ایضاً) کیا یہ حق نہیں کہ جن قوم کی فوجیں سلیمانؑ کو اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھیں؛ پھر کیا یہ راست نہیں کہ یہ سب رسول بشر ہی تھے؛ حاصل یہ کہ جنوں کی طرف بھی بشر رسول ہی آیا کرتے تھے۔
لیکن ان کا یہ اعتراض تھا کہ "کیا خدا تعالیٰ بشر ہی کو رسول بنا کر بھیجا کرتا ہے (کما مر) اس کا جواب یہ دیا کہ ـــــ قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (ایضاً - ۹۵) کہہ دیجئے کہ اگر اس زمین میں فرشتے بس رہے ہوتے، اس حال میں کہ وہ اس دنیا ہی کی زندگی پر مطمئن ہو جاتے تو ان پر ہم فرشتہ ہی رسول بنا کر آسمان سے اتارتے!
اس آیت سے معلوم ہوا کہ بشروں میں بشر ہی رسول آنا چاہیئے۔ پس جن ضرور بشر ہیں اور ان کی طرف بشر رسول آنا لازم ہے۔
قرآن مجید میں اکثر جگہ آیا ہے کہ "ہم نے "ناس" یعنی جن وانس کے لئے قرآن میں ہر ایک مثال بیان کی ہے ـــــ اس کے ساتھ "ناس" کی تشریح "انسان" کہہ کر دی ہے۔ مثلاً۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا (کہف - ۵۴)
سورہ "الرحمٰن" میں پہلے تعلیم قرآن کا ذکر ہے، پھر انسان کی پیدائش بیان ہوئی ہے، جس کو قرآن کا بیان سکھایا ـــــ اَلرَّحْمٰنُ ٥ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ٥ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ٥ (الرحمٰن۔ ۱تا۴) آگے بڑھ کر اسی انسان کے دو حصے کر دیئے۔ ایک عام انسان دوسرے ان ہی سے خاص جن ـــــ ان دونوں کے لیے زمین کی تمام نعمتیں بھی یکساں فرمائیں۔ سب کے لیے میوے، کھجوریں، اناج اور ریحان یکساں نعمت بتلائے۔ موتیں، مرجان اور کشتیوں کو یکساں نعمت ٹھہرایا۔ دونوں ہی اوپر آسمان اور نیچے زمین کے مرکز کی طرف نہیں جا سکتے۔ اگر جائیں گے تو دونوں پر آگ اور دھواں بھیجا جائے گا۔ عذاب جہنم بھی دونوں کے لیے یکساں ہوگا۔ نعمائے جنت میں بھی ایک کا دوسرے سے کوئی فرق نہیں۔ پھر ان کو انسانوں سے خارج کیسے کیا جا سکتا ہے؛
قرآن حکیم کے حرام کردہ تمام ماکولات جنوں کے لیے بھی حرام ہیں۔ بوقت اضطرار وہ ان کو کھا بھی سکتے ہیں۔ نکاح وطلاق (ستر و پردہ وغیرہ) کے قواعد ان کے لیے بھی یکساں ہیں وہ اپنے مقدمے رسول کریم کی قائم کردہ عدالتوں میں لاتے اور جنگوں میں مدد دیتے ہوں گے پھر ان کی شریعت نوع انسان کی شریعت سے مختلف نہیں تو انہیں نوع انسان سے کس طرح خارج کیا جا

سکتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ الخ (حج - ۵) • اے ناس! (لوگو!) اگر تم آخرت سے شک میں ہو، تو ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ ظاہر ہے کہ جن بھی انس کی طرح بعث سے شک میں تھے۔ وَاَنَّھُمْ ظَنُّوْا کَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ اَحَدًا (سورہ جن - ۷) پس اگر ناس، میں جن وانس دونوں داخل ہیں تو جن بالضرور خاکی ہیں انسان خاک کے علاوہ پانی سے بھی پیدا ہوا ہے۔ وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا (فرقان - ۵۵) وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ (نور - ۴۶) جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (انبیاء - ۳۰) بشر پانی سے اللہ نے بنائے ۔۔۔ ہر چلنے پھرنے والا اللہ نے پانی سے بنایا۔ ہر زندہ چیز ہم نے پانی سے پیدا کی۔ اگر چلنے پھرنے والے اور زندہ چیزیں، تو یقیناً پانی ہی سے پیدا کئے گئے ہیں۔

انسان حرارت سے ٹھیکری کی طرح بنی ہوئی مٹی سے بھی بنا ہے۔ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (حجر ۲۶) انسان جلد بازی سے خلق کیا گیا ہے (خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انبیاء ۳۷)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان پانی سے، مٹی سے، عجلت پسندی سے اور آگ سے مرکب ہے۔ اگر اس میں آگ کا عنصر نہ ہوتا تو ایک دم بھی زندہ نہ رہ سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ رجاہل (کندہ ناتراش) جن کی طبیعت میں غصہ، سرکشی اور اشتعال زیادہ ہوتا ہے اور وہ جلدی بھڑک اٹھتا ہے (یہ تو روزہ مرہ کا مشاہدہ ہے) لہٰذا وہ خاکی ہونے کے ساتھ، "مارج من نار (آتشیں شعلے) سے بھی پیدا کیا گیا ہے۔

اس زمین میں انسان کو خلیفہ (صاحب اختیار) بنایا گیا ہے۔ فرشتوں کو یک طرفہ علم ہے (یعنی صرف تسبیح و تقدیس کا) جن نیکی و بدی دونوں کا اختیار رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ انسان میں داخل ہو کر ہی خلیفہ بن سکتے ہیں۔ اس زمین میں انسان کے سوا کوئی صاحب اختیار مخلوق نہیں۔ کوئی خلیفہ نہیں۔

فرشتے جو خدا تعالیٰ کے فرمان بردار ہیں اور خلاف حکم کر ہی نہیں سکتے، مکلف جن ان میں داخل نہیں ہو سکتے ۔۔۔ ابلیس شیاطین جو یوم الدین تک لعنت کے حامل رہتے ہیں، وہ مومن نہیں بن سکتے ہیں وہ جن جو قرآن کریم پر ایمان لائے، یقیناً انسان میں داخل ہیں۔ فرشتوں اور شیاطین کو انسان کے آگے سجدہ کا حکم ملا ۔۔۔ لیکن صاحب اختیار جن وانس اگر کسی دوسری مخلوق کے آگے سجدہ کریں تو وہ یقیناً مشرک و کافر بن جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مکلف جن ابلیس کی اولاد نہیں بلکہ وہ آدم و حوا کی اولاد ہیں۔

حضرت سلیمان کے دربار میں جن وانس اکٹھے بیٹھتے تھے، اہل علم اصحاب جنوں پر تفوق حاصل کر لیتے تھے، جن تصویریں، دیگیں، پراتیں اور قلعے بنایا کرتے تھے۔ وہ بنّا (معمار) اور غوّاص بھی تھے۔ اور اپنی جنیت یعنی سرکشی کے سبب بیڑیوں میں جکڑے جاتے تھے (ہوائی یا ناری مخلوق کیسے جکڑی جا سکتی ہے؟) جن بحکم قرآن "رجال میں شامل ہیں۔ رِجَالٌ - مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (جن - ۶) رجال، نساء پر قوام ہیں۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (نساء - ۳۴) رجال کا آنکھوں سے دیکھا جانا ضروری ہے

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (انعام - ۹) رجل کا اطلاق نوع انسان کے سوا کسی بھی جان دار نوع کے ذکور پر نہیں ہوتا۔ قرآن، حدیث، لغت اور تمام عربی لٹریچر کو کھنگال کر دیکھ لیجئے ـــــ سورہ احقاف کی آیت ۱۷ اور ۱۸ کا مفہوم یہ ہے کہ

جس شخص نے اپنے والدین سے بیزاری ظاہر کی اور دوبارہ جی اٹھنے کا انکار کیا۔ اس کے والدین نے اُسے ایمان اور حشر و نشر کی تلقین کی۔ اس نے پرانی کہانیاں کہہ کر رد کر دیا تو ایسے لوگوں پر عذاب کا وعدہ ثابت ہو گیا۔ وہ ان جن و انس میں شامل ہوں گے، جو ان سے پہلے واصل جہنم ہو چکے ہیں ـــــ اس بیان کا آغاز "وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ" سے ہوتا ہے۔ اگر جن و انس دونوں لفظ "انسان" میں داخل نہ ہوتے، تو انسان کے عاصی فرزند کا ان سزا پانے والے جن و انس میں شامل ہو کر سزایاب ہونا بے معنی ہوتا۔ قرآن مجید میں غور کرنے سے ایسی بے شمار دلیلیں فراہم کی جا سکتی ہیں ـــــ

آیۂ زیر تفسیر کے جن مکے کے باشندے نہیں تھے۔ باہر سے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے سنا کہ مکے میں ایک رسول ہے تو بلا اطلاع، چھپ چھپا کر آپ کی مجلس میں آ گئے۔ قرآن سن کر خاموشی سے اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے۔ اور قوم کو وعظ کہنے لگے۔ رسول کو وحی سے معلوم ہوا کہ مکے والے جن جنوں کو پوجتے ہیں۔ ان میں سے بعض مومن ہو گئے ہیں ـــــ

اے اہل مکہ! جب تمہارے معبود جن موحد بن گئے ہیں، تو تم کیوں ان کی پناہ پکڑتے ہو؟ (جن - ۶) انہی سرکار نے قریش کو قتل اولاد، خدا کے حلال کردہ کو حرام بنانا سکھایا اور وہم پرستی میں ڈالا (انعام ۱۳۶ تا ۱۳۹) یہ جن بگڑے ہوئے یہود تھے، اور دشمن اسلام تھے۔ قریش فرشتوں، چاند اور سورج کی پوجا بھی کرتے تھے۔ مجوس ابلیسی (غیر مرئی) جنوں کو خدا تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے تھے۔

ہمارے علماء نے سورہ جن میں گڑبڑ ڈال رکھی ہے۔ اَنَّ مفتوحہ کا عطف اِنَّ مکسورہ پر ..... کر کے اُسے جنوں کا قول بنا دیا ہے۔ پھر آگے چل کر اسی اَنَّ کا عطف "اَنَّهُ اسْتَمَعَ" بھی کر دیا ہے۔ حالاں کہ ان سب کا عطف "اِنَّهُ اسْتَمَعَ" پر ہونا لازم ہے

یہ سب باتیں رسول کریم "پر وحی کے ذریعے سے ہی واضح ہوئی تھیں[1] منزل دوم صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۴)

---

[1] عاجز ناقل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت و توفیق حاصل ہوئی تو تفسیر سورہ "جن" کی تلخیص کے وقت اس بیان کی تشریح کی جائے گی ان شاء اللہ اس سے قبل بھی جن کا ذکر آ چکا ہے۔

کیا فرشتے انسان بن سکتے ہیں؟

ضیف ابراہیم ابراہیم ولوط (علیہما السلام) کے ہاں آنے والے ضیف[1] (مہمان) عام طور پر فرشتے بشکل انسان سمجھے جاتے ہیں۔ مریم علیہا السلام کے پاس آنے والا "بشر سویّ"، (تندرست آدمی) بھی فرشتہ جبریل مانا گیا ہے۔ حدیث میں رسول کریمؐ کے پاس جبریلؑ کا بشکل انسان آنا ثابت ہے۔ اسی طرح ہمارے لٹریچر میں فرشتوں کا انسان بن جانا خلاف واقعہ نہیں سمجھا جاتا۔ خواجہ صاحب سرے سے اس کے امکان ہی کے قائل نہیں۔ وہ اس کے ثبوت میں آیات ذیل سے استدلال کرتے ہیں تلخیص ملاحظہ فرمائیے:۔

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ الخ (ذاریات - ۲۴) کیا تیرے پاس ابراہیمؑ کے عزت والے مہمانوں کی بات نہیں آئی؟ ــــــ عہد ابراہیمؑ میں ملک کے بادشاہ کو اللہ کا حکم ملا کہ "لوط کی بستیوں کو سرنگ لگا کر اڑا دو۔ قبل اس کے خاندان لوطؑ کو ان کی بیوی کے سوا کسی محفوظ جگہ بھیج دو اور تاکید کر دو کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں اور راستے میں جاتے ہوئے ابراہیمؑ کو فرزند کی بشارت دیتے جاؤ"۔

کوئی شخص اپنے آپ پر خود وحی نہیں اتار سکتا۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے۔ ایک رسول کو دوسرے رسول کے ذریعے اطلاع دے دیتا ہے۔

مذکورہ بالا معزز مہمان (مکرمین) بادشاہ کے فرستادہ فوجی تھے، جن کی تعداد تین سے زیادہ تھی، بلکہ وہ ایک قوم تھے (قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ، حجر-۶۲، ذاریات ۲۴) ان کے لیے ایک موٹا بچھڑا (عجل سمین) بھون کر، پکا کر لایا گیا۔ روٹیاں اس کے علاوہ تھیں۔ پھر وہ کھانا ان کے آگے چنا گیا۔ ان میں سے کسی نے ابراہیمؑ کو ایسا کرنے سے نہیں روکا۔ ضرور ہے کہ انہوں نے ابراہیمؑ کی خوشنودی کے لیے تھوڑا سا کھایا ہو۔ لیکن چونکہ انہیں قوم لوط کی تباہی کا اہم کام درپیش تھا اس لیے انہوں نے جلدی دکھلائی۔ ابراہیمؑ نے (جیسے کہ مہمانوں کو کہا جاتا ہے) انہیں کہا "کیا نہیں کھاتے؟" (الا تاکلون؟ یعنی اور کھائیے۔ ان کی عجلت سے ابراہیم خائف ہوئے اور سمجھے کہ یہاں کسی کو گرفتار کرنے کے لیے آئے ہیں۔ انہوں نے ابراہیمؑ کو تسلی دی اور کہا "لا تخف" یعنی ہم یہاں کسی کو پکڑنے نہیں آئے۔ اور انہوں نے ابراہیم کو بیٹے کی بشارت دی۔ اس کے بعد ابراہیمؑ نے ان سے پوچھا: "تمہارا وہ اہم کام کیا ہے جس کے لیے عجلت کرتے ہو؟" انہوں نے کہا ہم مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

---

[1] اسرائیلیات، خصوصاً بائیبل میں ان کو فرشتے کہا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تاکہ ہم ان پر کھنگر برسائیں۔ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن طِينٍ (ذاریات۔ ۳۲) یہاں "ہم" جمع متکلم سے مراد ذات باری ہے جس طرح دابۃ الارض کی آیت میں۔ اِنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ (نمل۔ ۸۲) میں "ہماری آیات سے مراد اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں نہ کہ دابۃ الارض کی۔ قرآن مجید میں اس کی کئی مثالیں ہیں (حجر۔ ۴۹) (زمر۔ ۵۱) (عنکبوت۔ ۴۴)

یہ معزز مہمان یقیناً آدمی تھے۔ خود خدا تعالیٰ نہیں ضیف (مہمان) فرماتا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ فرشتے کسی کے ہاں ضیافت کھانے آئیں؟ لوطؑ بھی انہیں ضیف ہی کہتے ہیں کافر بھی انہیں اپنے جیسا انسان سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ یہ دوسری قوم کے لوگ ہیں (اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعَالَمِينَ حجر۔ ۷۰) "انہوں نے لوطؑ سے کہا۔ کیا ہم نے تجھے دوسری قوموں (کے میل ملاپ) سے منع نہیں کر رکھا ہے؟" اگر انہیں فرشتے بصورت مرد ہی تصور کر لیا جائے، تو انہیں فرشتوں کے خواص سے منقلب ہو کر مردوں کے صفات و خواص سے متصف تسلیم کرنا ضروری ہو گا۔ لہٰذا وہ کھانا بھی کھائیں گے، پانی بھی پئیں گے۔ جب وہ عورتوں کو فطری راستے سے حمل کے ساتھ بیٹا دینے آئیں تو ان سے نکاح بھی کریں گے[1] ـــــ لیکن اگر وہ مرد بن کر بھی فرشتوں کے خاصے ظاہر کریں اور ایسے ایسے کام کر دکھائیں جو مرد نہیں کر سکتے۔ تو اللہ تعالیٰ کا یہ قول (معاذ اللہ) بے معنی ہو جائے گا۔ وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ (انعام۔ ۹) یہ جواب ہے کفار کے اس مطالبے کا ـــــ وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ (انعام۔ ۸) اس رسول (محمدؐ) پر کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ اس کے دو جواب دیئے گئے ـــــ اول

وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ (ایضاً) اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو کام کا فیصلہ ہو جاتا (فرشتہ اتارنے کے بعد کسی کو مہلت نہیں دی جاتی ـــــ اس دنیا میں فرشتوں کا آنکھوں سے دیکھا جانا محال ہے۔ الفرقان ۲۱ و ۲۲ میں ہے کہ لقائے الٰہی کے منکر کہتے ہیں کہ "ہم پر فرشتے کیوں نہیں اترے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیتے" یہ ان کا تکبر اور سخت سرکشی ہے۔ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ لَا بُشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِينَ وَيَقُولُونَ حِجْرًا مَّحْجُورًا۔ (موت کے وقت) جب فرشتے دکھائی دینے لگیں گے "تو مجرموں کو کوئی خوشی نہ ہو گی۔ چاہیں گے کہ ان کے اور فرشتوں کے درمیان کوئی سخت روک قائم ہو جائے (تلخیص عثمانی) جب کسی قوم کی سرکشی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو فرشتوں کی فوج اس کو ہلاک کرنے کے لیے بھیجی جاتی ہے پھر اس کو قطعاً مہلت نہیں دی جاتی (عثمانی) مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُّنظَرِينَ (حجر۔ ۸) خواجہ صاحب نے اور بھی کئی آیات کے حوالے دیئے ہیں۔ آخر میں لکھا ہے۔

---

[1] اشارات ہیں آیات ذیل کی طرف فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم ۱۷) ہم نے اس (مریم) کی طرف اپنی ایک سعید روح کو بھیجا سو وہ اس (مریم) کی مانند بن کر اس حال میں آیا کہ وہ ایک تندرست بشر تھا۔ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا (تحریم۔ ۱۲) مریم بنت عمران جس نے (ہیکل کے بے لگام مجاوروں سے) اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی سو ہم نے (ایک بشر رسول کے نکاح کے ذریعے) اس کی شرمگاہ میں اپنی (روحوں میں سے) ایک روح (ربان) کو نفخ کیا (ترجمہ خواجہ)

"اگر فرشتوں کو دیکھ لینے کے بعد ڈھیل مل جائے، تو ایمان، ایمان ہی نہ رہے۔ بلکہ مجبوری کا ایمان رہ جائے جو کسی کام کا نہیں"
کفار کو دوسرا جواب یہ دیا ہے وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ۔ (انعام-۹) اگر ہم
اس (رسول یا رسول کے ساتھ آنے والے) کو فرشتہ بناتے تو اس (فرشتہ کی روح کو مناسب ارتقاء دے کر اور انسان کے گھر
میں پیدا کر کے) آدمی بنا کر ہی لاتے اور ان پر ویسا ہی اشتباہ (والتباس) ڈال دیتے جو کہ وہ (اب) کر رہے ہیں (لہٰذا فرشتوں کے آنے
کی دونوں (مذکورہ) صورتیں ممکن ہیں اور ان دونوں سے انہیں اپنا من بھاتا کوئی بھی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور خلاف فطرت وخوارق
تو ہماری حکمت کے بالکل خلاف ہیں (منزل دوم ص۱۱۷)

اگر کوئی مرد ایک آن میں مخفی ہو جائے تو جب چاہے بھری مجلس میں سب کے سامنے ظاہر ہو جائے۔ چلتے انجن کو ہاتھ
سے روک دے۔ کبھی آسمان پر چڑھ جائے، کبھی زمین کے اندر گھس جائے تو لازماً کافر بھی اسے فرشتہ یا اوتار ہی سمجھیں گے ایسے
مرد کے فرشتہ ہونے میں کسی شک والتباس کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی، لیکن قرآن فرشتے کے مرد بن جانے کے بعد بھی التباس وشبہ
(لَلَبَسْنَا رَجُلًا) کو قائم رکھتا ہے اور فرماتا ہے کہ کوئی انسانی جسد ایسا نہیں ہو سکتا جو کھانا نہ کھائے۔ اگر کوئی شخص اپنے جسم کی
چربی کو صرف کر کے چند روز کے لیے بظاہر کھانا نہ کھائے تو یہ بھی کھانا ہی ہے۔ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ
وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (انبیاء-۸) اور ہم نے ان (رسولوں مردوں) کو ایسے جسد (جسم) نہیں بنایا تھا، جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور
موت سے محفوظ رہتے ہوں (اور کھانے کے تمام تقاضے اشتہاء، اخراج فضلات، صحت ومرض وغیرہ ان میں نہ پائے جاتے ہوں)

سورہ بنی اسرائیل آیت ۹۰ میں کفار کے کئی خارقانہ مطالبات ہیں، جس میں سے ایک یہ ہے۔ اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ
قَبِيْلًا ـــــ ہم تیری پیغمبری کو ہرگز نہیں مانیں گے جب تک تو ..... اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آئے ـــــ اس
کے جواب میں فرمایا ـــــ لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا
اگر زمین میں ایسے فرشتے ہوتے (جو آخرت سے بے خوف ہو کر اس دنیا کی زندگی پر) مطمئن ہو کر چلتے پھرتے (اور ان کے لیے رسول
کی ضرورت ہوتی تو) بالضرور ہم ان پر آسمان سے فرشتہ رسول اتارتے (اطمینان کی دو قسمیں ہیں اول مومنوں کا اطمینان قلب ذکر اللہ
سے ـ دوم ـ کفار کا اطمینان دنیوی زندگی پر) آیۂ زیر تفسیر میں یہی دوسری قسم کا اطمینان مراد ہے۔ جیسا کہ اس آیت سے واضح ہوتا
ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا ..... الخ (یونس) جو لوگ ہماری ملاقات (آخرت)
کی امید نہیں رکھتے (یعنی کفار) اور دنیوی زندگی پر راضی ومطمئن ہو گئے ..... الخ

یعنی اگر بالفرض فرشتے بھی گر کر کفار کی طرح ارضی زندگی پر مطمئن ہو جاتے، تو ان میں سے کوئی طالب حق فرشتہ، آسمانی تعلیم پا کر
آسمان سے نازل ہوتا اور وہ تعلیم فرشتوں ہی کی اصلاح کے مناسب حال ہوتی۔ بشروں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا ـــــ
یہ انسانوں کو تعلیم دینے والا قرآن فرشتوں کے لیے مناسب نہیں ہو سکتا۔ فرشتے ہماری طرح نماز نہیں پڑھتے۔ ہمارے حلال و
حرام سے واسطہ نہیں رکھتے۔ وہ ہمارے لیے اگر کچھ سبق آموز بن سکتے ہیں۔ تو بالکل ایسے ہی جیسے چاند، سورج، درخت اور پرندے

وغیر مجبور مخلوق۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ الخ (ج-۱۸) کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہیں تمام مخلوقات ارض و سما، سورج، چاند، تارے، پہاڑ، درخت اور جانور۔۔۔۔ الخ

اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ (نور-۴۱)
جو کوئی آسمان و زمین میں ہے، اللہ کی تسبیح کرتا ہے اور پرندے پر کھولے ہوئے، سب اپنی اپنی صلوۃ و تسبیح سے واقف ہیں۔ یہ واقفیت یا علم فطری ہے۔ اکتسابی نہیں۔ فرشتے بشر والی اختیاری نماز نہیں پڑھ سکتے جو فحشا و منکر سے روکتی ہے، اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (عنکبوت-۴۵)

جہاد اور جن

جہاد جو قرآن کے مخاطب جن و انس پر یکساں فرض ہے، تو لازم ہے کہ مزعومہ جن بھی جنگوں میں حاضر ہو کر انسانوں کی طرح لڑتے اور کفار کو پچھاڑتے، لیکن ایسا کسی غزوہ میں نہیں ہوا۔ فرشتے ضرور مومنوں کو ثابت قدم اور مطمئن کرنے کے لیے آئے، سو ان کا واضح ذکر قرآن میں موجود ہے۔ جن جو قرآن کے امر و نہی کے مکلف ہیں، اُن کا الگ ذکر کہیں نہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ انسانوں ہی میں شامل ہیں (منزل چہارم ص۳۸)

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْکُمْ مَّلٰٓئِکَۃً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو تمہاری جگہ زمین میں ملائکہ کو خلیفہ بناتے، مگر یہ مجبور ہستیاں اس لائق نہ تھیں اس لیے ان کو اس کام پر لگا دیا، جس کے یہ اہل تھے
اس سے پہلی آیت ۵۸ کے ضمن میں کہتے ہیں۔
"فرشتوں کا درجہ انسان کے مقابلے میں بہت گھٹیا ہے۔ انسان مخلوق میں اشرف اور مسجود ملائکہ[۱] ہے اسی لیے اس کو زمین کی خلافت ملی ہے اور اختیارات عنایت ہوئے ہیں۔ فرشتے ایک ایک مجبور کل (مشین) کی طرح ہیں، انہیں جو حکم ہوتا ہے، بلا چون و چرا کرتے ہیں۔۔۔۔ فرشتوں میں کوئی نبی نہیں۔ نبوت تو الگ رہی، خلافت ارض تک کے بھی اہل نہیں ہیں۔۔۔۔ انسانوں کے لیے ہم جنس ہی نمونہ (اسوہ) ہوا کرتا ہے، نہ کہ کوئی دوسری نوع۔۔۔۔ فرشتے انسانوں کی خدمت پر مامور ہیں۔۔۔ (منزل ششم ص۲۵۸، ۲۵۹)

---

[۱] بقول غالب۔ ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند۔ گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

علمِ غیب

ہمارے ہاں علمِ غیب کا مسئلہ نہایت اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو انبیاء علیہم السلام خصوصاً حضرت خاتم الانبیاءؐ کو ماضی و مستقبل کے تمام غیوب کے متعلق خبیر و علیم مانتے ہیں اور جو ان سے متفق نہ ہو اس کے اسلام کو صحیح نہیں سمجھتے۔ پھر یہ بات اور آگے بڑھتی ہے تو غیر انبیاء بزرگوں کو بھی کسی قدر غیب دانی میں شریک کیا جاتا ہے۔ عوام کی اسی کمزوری کی بنا پر بہت سے لوگ پیشہ ور غیب دان بن کر دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ اور ان کے شکار عمر بھر اس دھوکے کو حقیقت سمجھ کر لٹتے رہتے ہیں، بلکہ مادی خسران کے علاوہ دین و ایمان کی دولت سے بھی محروم ہو جاتے ہیں قرآن حکیم اپنے ماننے والوں کو اس تاریک راستے میں چلنے کے لیے ایسی روشنی مہیا کرتا ہے۔ کہ کہیں بھی ٹھوکر نہ کھا سکیں، الحمد للہ علیٰ احسانہ۔

ہمارے قدیم علماء نے اس پر نہایت بصیرت افروز بحثیں کی ہیں خواجہ صاحب بھی ان کے ہم نوا ہیں، لیکن ان کا اندازِ بیان اپنا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَ الْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۔ (الانعام۔ ۵۰) اس آیہ مبارکہ میں متعدد مسائل آگئے ہیں۔

(۱) نفی خزائن (۲) نفی علمِ غیب (۳) فرشتہ ہونے کی نفی۔ (۴) صرف وحی کی پیروی (۵) بینائی اور نابینائی میں فرق (۶) دعوتِ غور و فکر۔

خواجہ صاحب اس پر روشنی ڈالتے ہیں ـــ نمبروار ملاحظہ فرمائیے!

۱۔ (اے رسولؐ!) تو کہہ میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اللہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ یُنْفِقُ كَیْفَ یَشَآءُ (مائدہ ۵۔ ۶۴) وہی امیر یا غریب بناتا ہے۔ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُطُ بقرہ ۲۔ ۲۴۵ (۲) یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ رعد ۱۳۔ ۲۶۔ اِنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى۔ نجم ۵۳۔ ۴۸۔ امیر خدا کی دی ہوئی دولت سے دوسروں کو بھی کھلا سکتا ہے۔ لیکن بادشاہ بادشاہت سے معزول ہو جائے تو خود بھی بھوکا رہ سکتا ہے۔ رسولؐ اگر حد سے زیادہ خرچ کریں، تو وہ بھی حسرت زدہ بن سکتے ہیں۔ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۔ بنی اسرائیل ۔ ۲۹ ـــ رسولِ خدا ملکی انتظام کے لیے لوگوں سے خرچ کرنے کی درخواست کرتے تھے۔ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ حدید ۔ ۱۰ اگر کبھی آپ کے پاس غریب مجاہدین کے لیے سواری کا انتظام نہیں ہوتا تھا، تو وہ روتے ہوئے آپ سے اپنی معذوری ظاہر کرتے تھے، لیکن آپؐ ان کی مدد نہیں کر

سکتے تھے۔ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ ...... حَرَجٌ .... وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ص تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ (توبہ - ۹۲)

۲ — اللہ تعالی نے اپنے رسول سے یہ بھی کہلوایا — اور نہ میں غیب جانتا ہوں (جو چیز انسان کے ظاہری، باطنی حواس اور عقل کی رسائی سے ماوراء ہو، غیب کہلاتی ہے) کوئی شخص کسی اکتسابی علم سے غیب دان نہیں بن سکتا۔ ہاں اللہ تعالی اپنی وحی کے ذریعے سے کسی بات کی خبر دے دیتا ہے، تو وہ غیب کی خبر ہے۔ خود غیب دانی نہیں تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ (ھود - ۵۰) پھر وہ وحی رسول اپنے پاس بند نہیں رکھتا۔ اس کی عام اشاعت کرتا ہے۔ اس طرح ہر جاننے اور ماننے والا اس غیب سے باخبر (یا غیب دان) بن جاتا ہے۔

۳ — تیسری بات رسول سے یہ کہلوائی میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میں ایک فرشتہ (کی طرح کٹھ پتلی) ہوں — مجھے دوسرے انسانوں کی طرح محدود اختیار دیا گیا ہے، جس کی بنا پر نیکی یا بدی کی نسبت میری طرف بھی کی جا سکتی ہے۔ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ط (نساء ۹) — مجھ سے بھی خدا تعالی کے حضور سوال ہوگا۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ۔ انبیاء ۲۳۔ یعنی اللہ تعالی کے سوا سب کے سب (کسی نہ کسی رنگ میں) زیر سوال ہیں۔

۴۔ بحکم وحی یہ بھی آپ سے اعتراف کرایا گیا کر

(دوسرے مومنوں کی طرح اپنی انسانی وسعت کے مطابق) میں (بھی) اس (قرآن) کا پیرو ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ (اور جو بات وحی میں نہیں ملتی اس میں اجتہاد و شوریٰ سے کام لیتا ہوں جو تمام مومنوں کا دستور العمل ہے، کوئی انسان بے غلط نہیں ہوتا، سب کو ٹھوکر سے بچنے کے لیے آنکھوں سے کام لینا چاہیئے۔

۵ — دیدہ وری کی ترجیح و فضیلت کے متعلق آپ سے یہ اعلان کرنے کو کہا کہ کہہ دیجیے!

کیا بینا اور نابینا یکساں ہوتے ہیں؟

۶ — آخر میں غور و فکر اور قلبی بینائی پہ آیت ختم کی جاتی ہے کیا تم سوچتے نہیں! (تفکر سے ہماری ضروریات میں بہت مدد ملتی ہے) منزل دوم صہ ۱۲۸/۱۲۹

سورہ نمل کی آیت ۶۵ کا ترجمہ و تفسیر ملاحظہ ہو۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ط وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ — مشرک اپنے بزرگوں کی غیب دانی کا دعوی کرتے ہیں۔ یعنی انہیں خدائی منشا پہلے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ لہذا وہ اپنی غیب دانی فیض رسانی میں مختار ہونے کی وجہ سے، خدا ہی کے بنائے ہوئے مثیل خدا ہیں اس کی تردید میں فرمایا کر کوئی شخص اپنی ذات میں غیب دان نہیں ہو سکتا۔ لہذا بزرگان رفتہ و موجودہ اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک و مختار نہیں اور انہیں اتنی خبر نہیں کہ وہ کب، کسی کام پر بھیجے جائیں گے (ایان یبعثون) رسول کریم بحکم خدا فرماتے ہیں۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ

لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَّبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ ۝ (الاعراف - ۱۸۸) اگر میں غیب دان ہوتا تو میں اپنے لیے بہت سی خیر حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی، میں تو صرف ایمان والوں کے لیے نذیر و بشیر ہوں — غیب دانی پر قدرت رکھنا اور بات ہے اور کسی غیب پر مطلع ہو جانا دوسری بات ہے۔ خدا جب چاہتا ہے کسی بات کی اطلاع (جسے چاہے) دے دیتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں کہ وہ شخص غیب دان بن گیا۔ انبیاء اگر اپنی ذات میں غیب دان ہوں تو انہیں وحی کی کیا ضرورت ہے؟ —— ظاہر ہے کہ نبی کی اپنی عام باتیں وحی نہیں ہوتیں۔ جس طرح بعض مصنف یا طبیب اپنی کوئی تحریر یا نسخہ لوگوں سے چھپا کر اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔ نبی ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ وحی کے اعلان و تبلیغ پر مامور ہوتا ہے۔ وحی کا پورا علم جو اُسے ملتا ہے، وہ کمی بیشی کئے بغیر اسی طرح لوگوں کو پہنچا دیتا ہے۔ اسی لئے وہ "امین" کہلاتا ہے —— غیر وحی میں رسول و غیر رسول یکساں سوچ سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ رسولؐ کو خطاب کر کے فرمایا ہے۔ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ تجھے سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا (نساء - ۱۱۳) بالکل اسی طرح دوسرے لوگوں کے لیے ارشاد ہے۔ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (بقرۃ ۱۵۱) تم کو سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے —— یہ تھی تفسیری تمہید۔ اب ترجمہ آیت سنئے تو کہہ دے کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، وہ (سب کے سب) غیب کے جاننے والے نہیں، مگر اللہ ہی (غیب کو جانتا ہے) اور وہ لوگ (یعنی فرشتے یا بزرگان) اتنا بھی نہیں جانتے کہ کب کسی کام پر بھیجے جاتے ہیں۔ منزل پنجم ص ۹۲، ۹۳

سورۂ تکویر کی آیہ ذیل کی تفسیر میں غیب پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (تکویر - ۲۴) اور یہ (تمہارا ہم نشین جو کفار کے ساتھ بھی میل جول رکھتا ہے (صاحبکم) غیب پر بخل کرنے والا نہیں ہے (اس نے تمام بے غلط وحی الٰہی ذرا ذرا تک پہنچا دی ہے۔ کوئی بات اپنے پاس چھپا نہیں رکھی۔ وحی الٰہی جو اس کے پاس ہے وہی تمہارے پاس ہے۔ تم بھی اتنے ہی غیب دان ہو سکتے ہو جتنا یہ غیب دان ہے۔ اس غیب (وحی) میں تم میں اور اس میں کوئی فرق نہیں —— باقی رہے ظنی خواب جو تم کو بھی آتے ہیں، رسول کا خواب بھی وہی صحیح ہوگا جس کی تصدیق قرآن میں آئے گی۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ آمِنِينَ ۙ	اللہ نے سچ دکھایا اپنے رسول کو خواب بالتحقیق کہ تم مسجد حرام میں داخل ہو گے ان شاء اللہ امن سے۔ (الفتح - ۲۷)

وحی کی خصوصیت کے علاوہ باقی ظنیات میں سب انسان یکساں ہیں۔

غیب وہ چیز ہے، جس کے دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ مخلوق کے پاس نہیں خالق تعالیٰ کے نزدیک غیب و شہادت یکساں ہیں بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ قرعہ اندازی، فال، جوتش وغیرہ کے ذریعے غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بعض مجذوبوں سے پوچھتے ہیں اور ان کے الفاظ کے معنی اپنے خیال کے مطابق کچھ نہ کچھ بنا لیتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے اوپر معمول کی حالت وارد کر لیتے ہیں یا اپنے آپ کو نیم خوابی کی حالت میں لے آتے ہیں، اس وقت جو کچھ ان کے سامنے آتا ہے اُسے غیب سمجھ لیتے ہیں بعض لوگ ملائکہ اور شیاطین کی

تسخیر کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کہ وہ جب چاہیں ان کے ذریعے غیب معلوم کر سکتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے "یوگا ابھیاس"[1] اور چلہ کشی کر کے اپنے اندر کا ایسا تزکیہ کر لیا ہے کہ جب متوجہ ہوتے ہیں تو انہیں سب کچھ دل ہی میں نظر آجاتا ہے۔ ایسے لوگ عموماً زیادہ تر پیشہ ور بھکاری ہوتے ہیں اور کوئی کمال حاصل نہیں کر سکتے خستہ و خراب ہی ہو کر مرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی اندھیری جگہ میں تیر مارے۔ اگر نشانے پر لگ گیا تو لوگ اُسے غیب دانی کی سند بنا لیتے ہیں اور نہ لگا تو ان غلط باتوں کی جھوٹی تاویلیں گھڑ لیتے ہیں۔ اور جو دل میں آئے بک دیتے ہیں۔ ایسے تمام دعاوی فضول ہیں۔ کسی مخلوق کو ایسی قوت نہیں دی گئی کہ جب وہ اپنے اندر نگاہ کرے تو غیب بینی کر سکے ۔۔۔۔ الخ (منزل ہفتم صد ۲۱۶)

پیغمبروں کی غیب دانی اس سے معلوم ہو سکتی ہے کہ رسولِ کریم کو حکم ہوا۔ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰهٰ - ۱۱۴) اے رب! میرا علم زیادہ کر۔ غیب دان کر تو سب کچھ پہلے ہی سے از خود معلوم ہونا چاہیے اُسے مزید طلب علم کی کیا ضرورت ؟۔ ابو الانبیا حضرت ابراہیمؑ غیب دان ہوتے، تو اپنے مہمانوں سے کیوں پوچھتے کہ "تم لوگ کس مہم کو سر کرنے جا رہے ہو؟"، مَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (ذاریات - ۳۱) یعقوبؑ کو غیب پہ قدرت ہوتی تو فراقِ فرزند میں سال ہا سال تک غم و اندوہ میں کیوں مبتلا رہتے ؛ بلکہ اسے حاسد بیٹوں کے ساتھ روانہ ہی کیوں کرتے ؛ اِنِّیْ لَيَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ (یوسف ۱۳) اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ (ایضاً ۸۶) قرآن حکیم اس قسم کی تصریحات سے بھرا پڑا ہے۔ سیرت النبیؐ میں بھی ایسے کئی واقعات ہیں۔

---

[1] ہندو جوگیوں، سنیاسیوں یعنی تارک الدنیا گوشہ نشینوں کا طریقہ مراقبہ و مجاہدہ وغیرہ

الرّبا

ربا (سود۔ بیاج) کے حقیقی مفہوم کو متعین کرنے اور قرآن حکیم کا منشا سمجھنے میں علمائے اسلام کے فکر و نظر میں بہت اختلافات پائے ہیں۔ بعض کے نزدیک خاص قسم کی آمدنی ربا میں داخل ہے اور بعض کے نزدیک اس پر قرآنی ربا کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس پر فریقین کی طرف سے اتنی کتابیں اور مقالے شائع ہو چکے ہیں کہ ان کا احاطہ دشوار ہے۔ ضرورت ہے کہ وسیع الخیال اہل علم جو اس موضوع کے تمام لوازمات پر متبحرانہ عبور رکھتے ہوں، سر جوڑ کر بیٹھیں اور دنیائے اسلام کو اسلام کے حقیقی منشا سے آگاہ کریں۔ اگر کبھی ایسا وقت آئے تو خواجہ صاحب کی تحقیق کو بھی سامنے رکھ لیا جائے وہی ہوتا۔

سورہ بقرہ کے رکوع ۳۸ میں "ربا" کے متعلق ہدایات نازل ہوئی ہیں، اس سے پہلے رکوع ۲۶، ۲۷ میں انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات کا کم از کم ۱۴ مرتبہ ذکر فرمایا ہے جو بہترین ترغیب بلیغ ترین حکمت اور اعلیٰ ترین اجر و ثواب پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد رکوع ۲۸ کا آغاز بھی انفاق اور اجر انفاق سے ہوتا ہے

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔

جو لوگ اپنے مال رات اور دن کو پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں، ان کے لیے ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے۔

(البقرہ - ۲۷۴)

اس کے بالکل ہی متصل "ربا" کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے خواجہ صاحب ربط لفظی و معنوی کا فائدہ اٹھاتے ہیں کہ غریبوں کو بطور امداد للہ قرض دینا یا بطور صدقہ ان کی ایسی مدد کرنا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور پھر کسی کے محتاج نہ رہیں، قرآن کا عین منشا ہے اور اس کی ضد ہے غریبوں کو سود پر قرض دینا ـــــ پس یہ ہے قرآنی ربا جس کو نہایت سختی سے روکا گیا ہے اور یہ دونوں کام (غریبوں کی امداد اور نہی ربا) اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہیں۔ اب اس اجمال کی تفصیل خواجہ صاحب کی زبان سے سنئے!

غریبوں کو جو قرض دیا جاتا ہے وہ قرض للہی ہوتا ہے جس طرح صدقات "منّ و اذٰی"[1] سے باطل ہو جاتے ہیں، اسی طرح امدادی قرض کا احسان بیاج سے باطل ہو جاتا ہے۔ اس مناسبت سے صدقات کے ساتھ ربوا کا ذکر نہایت موزوں ہے۔

---

[1] احسان جتانا اور دکھ دینا

مساکین کی ہر طرح مدد کرنا صدقات کہلاتا ہے اور اسے "اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دینا بھی" کہا گیا ہے۔ قرآن میں کئی جگہ زکوٰۃ کے ساتھ "قرض حسن" کا الگ ذکر ہے۔ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (المزمل۔ ۲۰) اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (حدید۔ ۱۸) وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (المائدہ۔ ۱۲)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ مساکین کی مدد صدقات سے کی جائے، اور ان کو للہ قرض دے کر محتاجی سے نکالا اور خود کفیل بنایا جائے۔ ایسے قرض پر سود وصول کرنا ربوا ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۔

اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو اور سود جو باقی رہ گیا ہے۔ اگر تم مومن ہو تو، چھوڑ دو ورنہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے تمہارا اصل مال ہیں اس طرح نہ تم ظالم بنو گے اور نہ مظلوم۔

(البقرہ۔ ۲۷۸، ۲۷۹)

اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو فرماتا ہے وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (مدثر۔ ۶) کسی مسکین پر زیادہ لینے کی نیت سے احسان نہ کر اس آیت میں ایسے ہی سود سے روکا گیا ہے، مساکین کو سود پر قرض دیتے تھے اور جب وہ سود ادا نہیں کر سکتے تھے۔ تو وہ اس کو اصل رقم میں ملا کر قرض میں اضافہ کر لیتے تھے اور پھر مزید سود لیتے تھے۔ مومنوں کو اس سے منع فرمایا ہے۔ لہٰذا اس آیت کا تعلق خاص مساکین کے ساتھ ہے ___ کفار مساکین سے سود لے کر اسی سود کے ایک حصے سے مفلسوں کی مدد کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مساکین کی حالت کو اعلیٰ کر رہے ہیں لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ (روم۔ ۳۹) اس پر فرمایا فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ (ہرگز نہیں۔) اس سے مساکین کو ترقی نہیں ملتی۔ ترقی صدقات و زکوٰۃ ہی سے ہو سکتی ہے وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (ایضاً) جس کے عوض ان سے کوئی چیز نہ لی جائے۔

قرآن حکیم میں جو ربوا کا ذکر ہے، اس سے مراد غربا سے سود لینا ہے، جن کی حالت کو اعلیٰ بنانا اور ترقی دینا مقصود ہے۔ اگر امرا استطاعت کے باوجود ان کی مدد نہ کریں تو یہ غیر انسانی اور غیر اسلامی فعل ہے۔

اس نظام کے لیے حکام کو آگے آنا چاہیئے اور شوریٰ کے تحت حسب حیثیت قرض فراہم کیا جائے اور تناسب کے ساتھ اس کی واپسی ہونی چاہیئے۔ امراء انفرادی طور پر کسی مستحق غریب کو امدادی قرض دیں۔ یا اس کے حالات کے مطابق صدقہ کے طور پر دیں یہ سب کچھ حساب و انتظام کے تحت ہونا چاہیئے۔

روپیہ اور محنت

ایک شخص روپیہ، محنت اور وقت اور صرف کر کے کسی فن یا تجارت میں مہارت حاصل کرتا ہے۔ یا اس کا باپ وغیرہ انہی ذرائع سے کمائی ہوئی دولت یا اسباب اپنے ترکے میں چھوڑ جاتے ہیں ___

روپیہ اور ہنر یا تجربۂ تجارت ایک دوسرے کے حصول کا ذریعہ ہیں اور مساوی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ایک ہنرمند ایک مال دار سے روپیہ لے کر اپنی ہنرمندی سے کمائی کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دونوں باہمی رضامندی سے نفع و نقصان کا حصہ مقرر کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہنرمند مقررہ وقت تک کام کر کے دو حصے لے اور مال دار ایک حصہ پائے تو یہ ناجائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا مال بھی ہنر اور وقت کی طرح قیمت رکھتا ہے ــــ جس طرح کسب و وقت کی قیمت گھٹتی بڑھتی ہے، اسی طرح مال کی قیمت بھی کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ ہنر، تجارت، محنت، وقت اور مال ایک دوسرے کی صورت میں تحویل کئے جا سکتے ہیں۔ اصل مقصود وہ نفع ہے جس کے حصول کی امید کی جاتی ہے ــــ اگر زید، بکر کو تجارت کے لیے دو سو روپیہ ایک ماہ کے لیے دے اور بکر، زید کو سو روپیہ دے تو زید اُسے دو ماہ کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

اگر کوئی تجربہ کار، ہنرمند کسی مالدار کی ملازمت کرے اور باہمی رضامندی سے مناسب تنخواہ طے کر لی جائے یہ بھی جائز ہے۔ اسی طرح کوئی کسی ہنرمند کو اپنے سرمائے سے کارخانہ دار بنا دے۔ اس کا مال بطور ملازم اس کا معاون ہوگا۔ اور وہ باہمی رضامندی سے نفع میں اپنا حصہ مقرر کر لیں گے۔ تو یہ بھی بیع و تجارت ہی میں داخل ہے۔

کفار جو بے حد متکبر اور شیطان کا آلۂ کار تھے۔ محبتِ مال نے انہیں دیوانہ بنا رکھا تھا۔ شیطان انسانی جذبات (حرص و ہوس وغیرہ) کو برانگیختہ کر کے عقلِ سلیم سے بے بہرہ کر دیتا ہے۔ ع

بدوز د طمع دیدۂ ہوش مند،

کافر بیع کو حصولِ نفع کی مانند نہیں کہتے تھے، بلکہ مخبوط الحواس ہو کر بیع کو ربوا کی مانند قرار دیتے تھے ــــ بیع پر نفع حاصل کرنا حلال ہے، لیکن وہ قرض جو مساکین کی حالت کو سدھارنے کے لیے امدادی طور پہ للہ دیا جاتا ہے، وہ احسان جتانے اور ایذا دینے سے باطل ہو جاتا ہے۔ اس پہ نفع لینا، بیع کے نفع کی مانند کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسی بات سچ مچ ان لوگوں کے منہ سے نکل سکتی ہے جو مخبوط الحواس ہوں:

ارشادِ الٰہی ہے کہ

وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ۔ بقرہ ۲۱۹) اگر تم یتیموں کا خرچ اپنے ساتھ ملا لو، تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔

یعنی یتیموں کے ولی ان کا مال اپنے مال سے ملا کر تجارت کر سکتے ہیں۔ اس کے نفع سے ان کی پرورش بھی کی جا سکتی ہے۔ باقی نفع ان کے راس المال میں شامل کر کے مزید نفع کمایا جا سکتا ہے اگر یتیم کا ولی بے سرمایہ ہے۔ لیکن تجارت و صنعت کی اہلیت رکھتا ہے تو وہ گماشتہ بن کر مال یتیم کو ترقی دے کر دستور کے مطابق اپنی محنت کا حق وصول کر سکتا ہے۔ یہ بلاشبہ جائز ہے۔

ولی، قریبی رشتہ داروں اور خیر خواہوں میں سے، جو ہر طرح مناسب ہو، مقرر ہونا چاہیئے۔ یہ تقرر مجلس شوریٰ اور حکام کی ذمہ داری ہے جو مالِ یتیم کی نگرانی بھی فرماتے رہیں گے۔ اگر ایک ولی سے کوئی شکایت پیدا ہو جائے اور مال میں نقصان پایا جائے، تو وہ دوسرا مناسب تر ولی مقرر کر سکتے ہیں۔

بنک اگر یتیموں کا مال کسی سرکاری بنک میں رکھا جائے یا کسی نفع بخش کمپنی کے سپرد کیا جائے تو اس سے بھی ان کے مال کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ وحی الٰہی کے بعد تمام کام دانش و حکمت کے مطابق انجام دینے چاہئیں۔ بحکم الٰہی "حکمت خیر کثیر ہے"۔ یتیم جب تک عاقل و بالغ نہ ہوں، ان کے مال پر زکوٰۃ و صدقات واجب نہیں ہے۔

رہن وہ رہن جو مرتہن کے قبضے میں آجائے، اُسے اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے اگر کوئی زید کے پاس دودھ والی بھینس گرو رکھ دے، تو وہ اُسے چارہ دے گا اور اس سے دودھ کا فائدہ حاصل کرے گا اور اگر کوئی شخص رہن کے بغیر کرائے پر زید کو بھینس دیتا ہے تو وہ چارہ بھی کھلائے گا اور کرایہ بھی ادا کرے گا ــــ لیکن رہن کی صورت میں کرایہ نہیں دیا جاتا۔ پس یہ کرایہ اس روپے کے عوض ہے جو بطور قرض صاحب حیثیت مقروض کو دیا جاتا ہے اور یہ فائدہ تجارت میں داخل ہے جو حرام نہیں ہے۔

بکر پیشگی روپیہ لیے بغیر زید کا کام کرتا ہے۔ زید اس سے تھوڑا فائدہ لینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر بکر پہلے ہی زید سے پچاس یا سو روپیہ لیتا ہے زید اس سے زیادہ کام لیتا اور زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔

عام طور پر رسائل کی پیشگی قیمت کم لی جاتی ہے اور رسال کے بعد دوچند وصول کی جاتی ہے دکاندار نقد قیمت پر ارزاں سودا دیتا ہے اور اُدھار پر زیادہ قیمت لیتا ہے۔ کیا ایسے فوائد بیع و تجارت میں داخل کئے جا سکتے ہیں یا ربوا سمجھے جائیں گے؛ جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اور جس پر سخت وعید وارد ہے؟ (استفہام انکاری ہے۔ ناقل)

تاجر لوگ ایک دوسرے کو اپنی خوشی سے قرض کی رقم سے زیادہ بھی لوٹا سکتے ہیں، لیکن غریب جنہیں للہ قرض دیا گیا ہے، وہ اگر خوشی سے بھی دیں، تو نہیں لیا جائے گا۔

اس تمہید و تفصیل کے بعد خواجہ صاحب اس رکوع (۳۸) کی ایک ایک آیت پر الگ الگ تبصرہ کرتے ہیں۔

۱- اس رکوع کی تمہید میں ایک ایسی آیت لائی گئی ہے۔ جو بلاشبہ مساکین ہی سے متعلق ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ربوا کا تعلق بھی مساکین ہی سے ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (جو لوگ شب و روز، ظاہر و پوشیدہ اپنے مال خرچ کرتے رہتے ہیں، ان کو کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۲- ربوا خواروں کی مخبوط الحواسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو لوگ غریبوں کو للہ قرض نہیں دے سکتے، شیطان انہیں کہتا ہے کہ غریبوں کو دو گے، تو خود غریب ہو جاؤ گے۔ وہ حُبِّ مال میں دیوانے ہو جاتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۔۔۔ الخ

سود خوار اس شخص کی طرح اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جسے شیطان نے اپنے تعلق (مس) سے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ بیع و ربوا کو یکساں سمجھتے ہیں، حالانکہ بیع حلال اور ربوا حرام ہے۔

۳۔ اس واضح نہی کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس جرم عظیم کا مرتکب ہوگا، تو وہ جہنمی ہے ــــ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ۔

۴۔ ربوا و صدقہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ربوا قوم کو برکت سے محروم کر دیتا ہے اور صدقات اس میں اضافہ کرتے ہیں۔ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ــــ سود خوار کو سخت کافر اور گنہگار کہا گیا ہے اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ پھر اللہ کے ناپسندیدہ کا ٹھکانا کہاں ہے ؛

۵ ــــ ایمان، عمل صالح، ادائے نماز کی تاکید کے ساتھ زکوٰۃ کو بھی شامل کر لیا ہے اور زکوٰۃ کا تعلق بھی غریبوں ہی کی فلاح و بہبود سے ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ ..... الخ۔

۶ ــــ تنبیہ و تخویف فرمائی ہے کہ اگر تم مومن ہو تو بقیہ ربوا چھوڑ دو يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

۷ ــــ اللہ اور رسول کی طرف سے سود خواروں کو اعلانِ جنگ ہے کیوں کہ یہ ظلم ہے۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔

۸۔ غریب کو خوشحال ہونے تک مہلت دو۔ صدقہ اس سے بھی بہتر ہے وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

۹۔ آخر میں خدا کے حضور پیشی سے ڈرایا ہے اور یہ کہ ہر شخص کو اس کی کمائی پوری ملے گی۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ منزل اول ص ۲۹۲ تا ۲۹۹ سے ملخص۔

ــــــ ٥ ــــــ

جنّت و جہنّم

سورہ اعراف کی آیہ ذیل کی شرح میں لکھتے ہیں:

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ (الاعراف - ۴۰)

بلا شبہ وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا، ان کے لیے (وقت وفات) سماء (عالم لطیف) کے دروازے نہیں کھولے جاتے اور (تکذیب و استکبار کے زیر اثر) وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ گھس جائے اور ہم اسی طرح مجرموں کو سزا دیتے آرہے ہیں (دنیا و آخرت میں سزا دینے کا، ہمارا یہی قاعدہ چلا آرہا ہے قیامت ایک ایک شخص کی بھی ہوتی ہے اور زلزلوں، وباؤں اور جنگوں سے جماعت جماعت اور امت امت کی بھی ہوتی ہے اسی طرح نوع انسان کا خاتمہ اس دنیا سے ہو جاتا ہے۔ ہر حالت کا بیان اس کی مناسبت سے لایا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے لطیف سے لطیف اور کثیف سے کثیف اشیاء و حالات کو پیدا کیا ہے۔ پھر ان کثافتوں اور لطافتوں کو مناسب ترتیب سے مرتب کیا ہے۔ اول و آخر اور ظاہر و باطن وہی ایک ذات ہے (حدید - ۳) کائنات کا ایک ذرہ بھی اس کے احاطہ سے باہر نہیں (شوریٰ - ۵۴ و طارق - ۲۰) ہر چیز اس کی رحمت کی وسعت میں سمائی ہوئی ہے (اعراف - ۱۵۶) زمین اور آسمانوں کی کنجیاں اس کے پاس ہیں (شوریٰ ۱۲) اس کی رحمت کہیں دور نہیں ہے (اعراف - ۵۶) اس کی گرفت بھی بالکل پاس ہی ہے۔ أُخِذُوا مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ (سبا - ۵۱) جنت زمین اور آسمانوں کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے۔ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ (آل عمران - ۱۳۳) کوئی جگہ جنت سے خالی نہیں۔ جہنم بھی کافروں کو گھیرے ہوئے ہے، جہاں کہیں بھی وہ ہوں وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ (عنکبوت - ۵۴) عالم آخرت کہیں فاصلے پر نہیں ہے۔ بس قلب و نگاہ کی تبدیلی سے پاس ہی دکھائی دینے لگ جاتا ہے يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ (نور - ۳۷) ایک کلاس سے دوسری تیسری یا آخری کلاس تک چڑھنے کے لیے کوئی مکانی یا مقامی تبدیلی نہیں آتی۔ دکھ سے سکھ تک پہنچنے کے لیے بھی کسی سفر کی ضرورت نہیں اسی طرح انسان کثافت و لطافت کے ایک طبقے سے دوسرے طبقے پر ترقی کرتا جاتا ہے لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ (انشقاق - ۱۹) جہنم کثافت کے قریب ہے اور جنات لطیف طبقات میں موجود ہیں۔ دونوں کے درمیان فرق و حجاب ضروری ہے۔

اعراف

لیکن وہ لوگ جو تماشۂ حق میں وفات پا گئے اور انہوں نے دنیا میں کسی شخص کے امن و ناموس میں فرق ڈالنا نہیں چاہا تھا، ایسے لوگوں کو پہلے اعراف پر روکا جاتا ہے۔ پھر جنت میں داخل کیا جاتا ہے

اعراف، عرف کی جمع ہے، جس کے معنی اونچی جگہ ہے۔ جہاں سے دور تک نظر جاتی ہے اور اردگرد کی اشیاء دکھائی دیتی ہیں — یہ لوگ دنیا میں حق کے متلاشی ہوتے ہیں۔ آخرت میں بھی تلاش کے مقام میں ٹھہرائے جاتے ہیں۔ جنت کی حقیقت جنت میں داخل ہو کر ہی منکشف ہوتی ہے۔ جہنم کا دکھ جہنم میں گر کر ہی معلوم ہوتا ہے۔ اعراف والے ان دونوں قسموں کو ان کی علامت ہی سے پہچانتے ہیں۔ جس طرح کام یاب اور ناکام دلوں کا دکھ اور سکھ ان چہروں کی روشنی و بشاشت اور سیاہی و کبیدگی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ المختصر جنت و دوزخ یا عالم لطافت و کثافت میں مدارج کا فرق ہے۔ خواہ مخواہ کا مکانی فاصلہ لازم نہیں جو شخص جہاں بدی کرتا ہے وہیں جہنم یا سزا کی گرفت میں آجاتا ہے منزل دوم ص ۲۱۷-۲۱۸

ناقتہ اللہ یا صالح کی اونٹنی

ہمارے علماء کہتے ہیں کہ

"صالح علیہ السلام کی قوم نے ان سے عہدو اقرار کیا تھا کہ آپ ایک ٹھوس چٹان میں سے حاملہ اونٹنی نکال دیں، تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ خدا نے صالحؑ کی دعا سے ایسا ہی کر دیا"۔ (علامہ عثمانیؒ) قدیم تفاسیر میں اور بھی بہت کچھ مفصل مذکور ہے۔ لیکن خلاصہ یہی ہے کہ وہ اونٹنی بطور معجزہ پیدا ہوئی تھی قرآن حکیم میں اس کا ذکر ۶ سورتوں میں آیا ہے۔ اعراف ۳، تا ۹، وھود ۶۱ تا ۶۷ وشعراء ۱۴۱ تا ۵۸ اور شمس ۱۱ تا ۱۵ واسرائیل ۵۹ وقمر ۲۷ تا ۳۱)۔

خواجہ صاحب نے علماء سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا ترجمہ و تشریح ملاحظہ فرمایئے:

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (اعراف ۔ ۳)

اور (ہم نے) ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو (بھیجا) وہ کہنے لگا "اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو۔ تمہارے لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح بات (توحید الٰہی) آچکی ہے۔ اس میں کسی دانا کے لیے تردد کا موقع نہیں ہے۔ تم اس پر چلو اور اس کے فوائد حاصل کرو لیکن افسوس کہ تم ضد، عناد اور آبائی تقلید کی محبت کے سبب توحید الٰہی کی قدر نہیں کرتے۔ مجھے بھی توحید کا نافرمان بنانا چاہتے ہو اگر میں عصیان کروں تو مجھے عذاب کے وقت سے کون بچائے گا؟ تم خود اس ذلت معذب ہوگے۔ پھر تمہارا عذاب میرے لیے خسارے کے سوا اور کیا بڑھا سکتا ہے۔ ہود ۔ ۶۲ و ۶۳)

قدیم اقوام کو جب عذاب سے ڈرایا جاتا تھا تو وہ عذاب کے لیے کوئی ایسا نشان مانگتی تھیں۔ جس سے ڈر کر بچ جانا، یا ضد پہ قائم رہنا ان کے اختیار میں ہوتا تھا۔ اگر وہ سرکشی اور جبر سے باز آجائیں تو کافر رہنے کے باوجود دنیوی عذاب سے بچ جاتیں۔ اللہ تعالیٰ نے (اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا) کے بعد فرمایا ہے (وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا) (بنی اسرائیل ۵۸۔ ۵۹) یعنی ہم عذاب کو نشانوں کے ساتھ نہیں بھیجا کرتے تھے، مگر ڈرانے کے لیے ——

افسوس ہے کہ لوگ بار بار اسی فتنے میں مبتلا ہوتے رہے۔ قوم ثمود نے بھی اپنے لیے عذاب انگا فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (شعراء ۱۵۴) اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ "اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشان ہے، سو تم اسے چھوڑو کہ اللہ

کی زمین میں چرتے چُگتے اور اسے برائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگانا (اگر ایسا کرو گے) تو تمہیں دردناک عذاب پکڑے گا۔

(یہ ایک معمولی اونٹنی تھی۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس اونٹنی پر ظالمانہ دست درازی کرنے کو قوم ثمود کے لیے عذاب کا نشان ٹھہرایا تھا (اَلنَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا (بنی اسرائیل۔۵۹) اس لیے اُسے "ناقۃ اللہ" کہا گیا۔ قوم ثمود پہاڑیوں کے درمیان ایک وادی میں رہتی تھی۔ وہاں کنواں کھودنا مشکل تھا۔ ان کے گرد چند پہاڑی چشمے تھے۔ جن کو انہوں نے آپس میں بانٹ رکھا تھا۔ وہ لوگ ان چشموں پر اپنے پینے کے اوقات میں حاضر ہوتے تھے۔ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ (القمر۔۲۸) ان کے اوقات میں کوئی فرق نہیں ڈالا گیا۔ بلکہ یہ کہا گیا کہ اُسے بھی پانی کا حصّہ دے لینے دیا کرو اور تمہارے لیے تو مقررہ دن کا حصّہ ہے ہی۔ لَهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (شعراء۔۱۵۵) ان لوگوں نے خدائی تخویف کی کوئی پروانہ کی اور

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (اعراف۔۷۷)

(تکبرانہ انداز میں، ذبح کرنے کے معقول طریقے کے برعکس) انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں (یہ انتہائی شقاوت تھی۔ بلاوجہ جانور کو تڑپایا۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ ہے) اور انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے۔ "اے صالح! اگر تو مرسلین میں سے ہے، تو ہمارے پاس وہ (عذاب) لے آ جس کا تو ہمیں وعید (ڈر) سناتا ہے (یہ اونٹنی ان ظالموں کے لئے فتنہ بن گئی۔ (اِنَّا قَدْ فِتْنَةً لَّهُمْ (القمر۔۲۷)

ایک بڑا بدبخت اپنی قوم کو اپنے ساتھ ملا کر تیار ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں اس اونٹنی کو ستا کر ختم کر دوں گا اور ثابت کر دوں گا کہ عذاب کی دھمکی فضول ہے پھر کیا حال ہوا۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا ..... فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (الشمس۔۱۱ تا ۱۵) انہوں نے اس کے پاؤں کاٹ دیئے (فَعَقَرُوْهَا۔ صالح نے کہا (تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ) تین دن اپنے گھروں میں فائدہ اٹھا لو یہ وعدہ اٹل ہے (ھود۔۶۵)

پھر اس وعدے کے مطابق ان کو زلزلے نے آ پکڑا۔ پس وہ اپنے گھروں میں سینے کے بل (بے حس و حرکت) پڑے رہ گئے۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (الاعراف۔۷۸) منزل دوم صفحہ ۲۲۳)

لوط علیہ السلام

لوطؑ اور قوم لوط کے حالات قرآن مجید کے عام اسلوب کی طرح مختلف سورتوں میں بکھرے اور پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی انداز سے خواجہ صاحب نے بہ تکرار متعلقہ آیات کی تفسیر لکھی۔ اس بحث میں دو باتیں غور طلب ہیں۔

۱۔ لوطؑ کے ہاں آنے والے اجنبی فرشتے تھے یا انسان؟ عام مفسر بائبل کی موافقت میں انہیں فرشتے کہتے ہیں۔ قرآن میں ان کے لیے "ملک" یا "ملائکہ" کا لفظ کہیں نہیں آیا۔ اس لیے خواجہ اس سے اتفاق نہ کرتے ہوئے انہیں انسان ثابت کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل "ضیف ابراہیم" کے عنوان میں گزر چکی ہے۔

۲۔ عذاب جو قوم لوط پر آیا اس کی نوعیت کیا تھی؟ مفسرین آسمان سے سنگ باری پر متفق ہیں۔ خواجہ اس سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مختلف بیانات کی تلخیص حاضر ہے۔

جب اللہ کے حکم سے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے یہ خیال کر کے دل تنگ ہوئے کہ مبادا بستی کے لوگ ان مہمانوں کے ساتھ بدفعلی کا ارادہ کریں۔ انہوں نے دل میں کہا کہ یہ دن تو نہایت دشواری کا دن ہے۔ بستی والوں کو معلوم ہوا تو وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ اور وہ پہلے سے بدکاریوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے حضرت لوط کے داماد[1] دوں کو بات کرنے کے لیے آگے کیا (منزل سوم ص۲۲) انہوں نے کہا۔ ہم نے آپ کو دوسری قوموں سے منع نہیں کر رکھا ہے؟ لوطؑ نے جواب دیا تم نے میری بیٹیوں کو میرے گھر معلقہ بٹھا رکھا ہے یہ تمہارے لیے رجوع کرنے کے لحاظ سے بہت پاک ہیں۔ افسوس تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف آ رہے ہو۔ ـــــ یہ خاص بات اسی قوم کی ایجاد تھی کہ بڑی عمر کے مردوں کو بھی لوٹ کر طعنہ رکھنے کے لیے ان کے ساتھ بدفعلی کرتے تھے۔ اَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ ۙ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ (عنکبوت۔

لوطؑ کے دامادوں نے جواب دیا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے لئے آپ کی بیٹیوں میں کوئی حق نہیں (رہا) اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا ارادہ کیا ہے۔ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ (ھود ۸، ۷۹) اور یہ بھی کہا کہ جس عذاب کی آپ دھمکی دیتے ہیں۔ ہمیں اس کی پروا نہیں قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللَّهِ (عنکبوت۔ ۲۹)

مہمانوں نے کہا، "اے لوط! ہم آپ کے رب کے حکم کے مطابق بھیجے گئے ہیں۔ ہمارے پاس کافی مدد ہے۔ یہ لوگ

---

[1] حضرت لوط کی بیٹیاں تین یا زیادہ تھیں۔ منزل دوم ص۲۲۶

ہرگز بدی کے ارادے سے آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ (اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ۔ خواجہ صاحب کا خیال ہے کہ یہ لوگ۔

فوجی آدمی

جو بھیجے گئے تھے (رُسُلُنَا۔ رُسُلُ رَبِّكَ۔ عنکبوت ۳۱ و ہود ۸۱) وہ فوجی آدمی تھے۔ خدا کی طرف سے ملک صدق کو حکم ہوا تھا کہ بڑھاپے کے وقت ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت دو اور قوم لوط کو تباہ کر ڈالو (کتاب پیدائش باب ۱۸ آیت ۹ تا ۳۳) ان کی فوجی حالت کو دیکھ کر ابراہیم ڈر گئے (اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً۔ ہود۔ ۷۰) انہوں نے خیال کیا کہ یہ فوجی لوگ کسی کو گرفتار کرنے کے لیے آئے ہیں۔ انہوں نے ابراہیمؑ کو تسلی دی ___ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ

ملک صدق

ملک صدق، بادشاہ وقت کو حضرت ابراہیمؑ وہ یکی خراج ادا کرتے تھے۔ وہ خدا تعالیٰ کا نیک اور مقبول بندہ تھا (پیدائش۔ باب ۱۴۔ آیت ۱۸ تا ۲۰)

قوم لوط کی عورتیں بھی اپنے مردوں کی حرکات شنیعہ پہ فخر کرتی تھیں۔ ملک صدق کو خدا کی طرف سے حکم آیا کہ قوم لوط کو تباہ کر دو اور راستے میں جاتے ہوئے ابراہیم کو بشارت دیتے جاؤ۔ منزل پنجم صد ۱۸۶۔

اللہ تعالیٰ نے ان سپاہیوں کو مامور کر کے ان بستیوں کو تہ و بالا کر دیا اور ان پر کھنگر کی قسم کے پتھر برسائے۔ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (حجر۔ ۷۴) یہ علاقہ بحیرہ مردار کی ہولناک صورت میں آج تک موجود ہے۔ اس زمین میں مٹی کے تیل کے چشمے بھڑکنے لگے تو زمین پر وہ حالت طاری ہوئی جو زلزلے کے اوقات میں ہوا کرتی ہے۔ وہ زمین تہ و بالا ہو گئی (منزل سوم صد ۲۱۱)

معلوم ہوتا ہے کہ ان فوجیوں کے پاس اندھا کرنے والی گیسیں بھی تھیں (منزل سوم صد ۸۰) فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ (قمر۔ ۳۷) ہم (اللہ) نے اس نفت والی زمین سے دھواں نکال کر یا آندھی بھیج کر ان کی آنکھوں کو مٹا دیا (منزل ہفتم صد ۳۲) فوجیوں نے اہل لوطؑ کو تنبیہ کی کہ رات رہے یہاں سے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی پچھلی طرف توجہ نہ کرے۔ لوطؑ کی بیوی کے سوا جو خائنہ تھی اور قوم کی بدکاریوں میں شامل تھی ___ بلاشبہ ان لوگوں کے وعدے کا وقت صبح ہے (یعنی نقب لگانے والے سپاہی صبح سے پہلے اپنا کام مکمل کر چکے ہوں گے) کیا صبح قریب نہیں! (اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ہود۔ ۸۱) نقب لگانے سے اس زمین پر زلزلے کی حالت طاری ہو گئی اور وہی نتیجہ پیدا ہوا جو زلزلوں کے اوقات میں ہوا کرتا ہے آج تک وہ زمین بحیرہ مردار (DEAD SEA) کی صورت میں نظر آ رہی ہے۔ منزل سوم صد ۶۸ و ۶۹

خلاصہ

ملک صدق۔ خدا کا برگزیدہ تھا۔ اس کے ذریعے ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت اور قوم لوط کی تباہی وقوع پذیر ہوئی۔ ایک بڑے شخص کے ہوتے، چھوٹے کو اور رسول کے ہوتے غیر رسول کو بھی یا رؤیا کے ذریعے کوئی اطلاع دینا کوئی انوکھی بات نہیں۔ حضرت داؤد کی موجودگی میں ایک اہم مقدمے کا فیصلہ ان کے بیٹے سلیمان کو اللہ تعالیٰ نے سمجھا دیا فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ (انبیاء) اور ہماری مروجہ اذان ایک غیر نبی کو رؤیا میں سکھائی گئی۔ جس کو نبیٔ وقت صلعم نے تسلیم کر کے

رائج کردیا نیز سرکش بستیوں کو تہ و بالا کرنے کے لئے صاحب لشکر بادشاہی کو حکم دینا مناسب تھا جیسے سات سال خوش حالی اور سات سال قحط سالی کی پیشگی اطلاع بدست رسول کے ہوتے ہوئے غیر مسلم بادشاہی کو دینی مناسب تھی۔

قوم لوط کے اندھا ہونے کی وجہ تین وجہوں میں سے کوئی ایک ہو سکتی ہے ۱۔ سرکاری آدمیوں کے پاس کوئی اندھا کرنے والی گیس ہو یا زیر زمین نفت میں آگ لگ جانے سے دھواں پیدا ہوا یا آندھی کی شدت اور گرد و غبار —— قوم لوط کے لوگ اغلام سے آگے بڑھ کر بالغ مردوں کا قصد کرتے اور ڈاکے بھی ڈالتے تھے —— زیر زمین نفت کی اطلاع بھی ملک صدق کو اللہ کی طرف سے حاصل ہوئی —— یہ اسباب ہیں۔ خواجہ صاحب کی تحقیق کے مطابق سدوم و عمورہ کی تباہی کے۔ واللہ اعلم بالصواب و ہو علی کل شی ٍٔ قدیر ——

معجزات موسیٰ علیہ السلام

فرعون جبر و استبداد اور تحکم و تکبّر کا پیکر تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو اپنی رعایا کا الٰہ یا رب اعلیٰ کہتا تھا (مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ۔ قصص ۳۸) اور (اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ـــــ نازعات ۱) ایسا شخص کسی معقول دلیل کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کا تکبر توڑنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کو کسی ذریعے سے مرعوب کر دیا جائے۔ یہ مرعوبیت کسی خارجی منظر یا اثر ہی سے حاصل کی جاسکتی ہے جو اس کی عقل و ہوش کو چکرا دے ـــ اسی مصلحت سے اللہ تعالیٰ نے ایسی دلیل عطا فرمائی جس سے فرعون کی مرعوبیت ظاہر ہوگئی اور رب یا الٰہ ہونے کا دعویٰ یا در ہوا ہوگیا (فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ قصص ۳۲) عصا اور ید بیضا دونوں اللہ کی طرف سے دو دلیلیں ہیں۔

فرعون، موسیٰ ؑ کو کہہ چکا تھا کہ تو میرے ماتحت ہو کر کسی اور کو الٰہ مانے گا تو میں تجھے قید کر دوں گا لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (الشعراء ۲۹) لیکن ہوا یہ کہ متحرک عصا اور ید بیضا کو دیکھ کر اس پر ہیبت طاری ہوگئی اس کا ثبوت یہ ہے کہ اتنے لاؤ لشکر اور قوت و جبروت کے باوجود اُسے موسیٰ ؑ کو قید کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اس کے بعد اس کی عظمت و اقتدار کو دوسرا زبردست دھکا اس وقت لگا جب جادوگروں نے بھرے دربار میں اپنی شکست تسلیم کر لی اور موسیٰ ؑ پر ایمان لے آئے۔ اس کے ساتھ پے درپے مصائب (قحط، طوفان، ٹڈی، چچڑی وغیرہ) (اعراف ۱۳۰ و ۱۳۲) کے نزول سے بھی اس کی مرعوبیت میں اضافہ ہوتا گیا۔

پہلی دفعہ رات کے وقت موسیٰ ؑ خود بھی اپنے عصا کو متحرک دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تسلی دی لَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ (قصص ۳۱) مت ڈر تجھ کو کوئی خطرہ نہیں لَا تَخَفْ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ (نمل ۱۰) مت ڈر میرے پاس رسول نہیں ڈرتے ـــــ موسیٰ ؑ کو دربار فرعون میں جا کر تبلیغ کا حکم دیا تو انہوں نے کہا، مجھ سے غلطی سے ایک خون ہوگیا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے (قصص ۳۳)

ارشاد ہوا کہ میں دل، آنکھ اور کان کا مالک ہوں۔ میں ان کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا۔ وہ تمہیں معمولی ایذا رسانی کے علاوہ کوئی بڑا ضرر نہیں پہنچا سکیں گے۔ آخر کار میری آیات کے ساتھ تم ہی غالب ہوگے۔ اور فرعون کا دعوائے الوہیت نقش بر آب ہو جائے گا۔ میں چاہوں تو ناچیز کیڑوں سے بڑی جماعتوں کو خاک کے گھاٹ اتار سکتا ہوں۔ (مختلف سورتوں میں اس مفہوم کی آیات پھیلی ہوئی ہیں)

موسیٰ ؑ علیہ السلام کے جواب میں فرعون نے کہا:-

اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِآيَةٍ فَأْتِ بِهَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ (اعراف - ۱۰۶) اگر تو کوئی ایسی دلیل لایا ہے تو اُسے پیش کر۔ اگر تو راستی پر ہے۔ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُبِينٌ (۱۰۷) موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا تو وہ (عصا اس طرح حرکت کرتا تھا گویا کہ وہ سونٹا) ایک ظاہر اسانپ تھا۔

تفسیر اس عصا میں اس بجلی کے سبب سے جو موسیٰؑ کے جسم میں محفوظ رکھی گئی تھی۔ تین دفعہ تھوڑی دیر کے لیے حرکت پیدا ہوئی۔ لیکن وہ عصا اپنی ذات کو چھوڑ کر سانپ کی ذات میں ہرگز ہرگز منقلب نہیں ہوا تھا۔

اس جگہ خواجہ صاحب نے جسم میں بجلی کا دعویٰ کیا ہے۔ سورہ طٰہٰ ۱۲ میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

اِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (اے موسیٰ!) بلاشبہ میں تیرا (رب) تربیت کرنے والا ہوں۔ سو تو اپنی جوتیاں اتار دے! بلاشبہ تو اس پاک کردہ وادی میں ہے جس کا نام طویٰ ہے۔

کوہ طور اس وقت ایک آتش فشاں پہاڑ تھا۔ اس میں بالعموم زلزلے آتے رہتے تھے۔ خاص اوقات میں سخت زلزلوں کا بھی دور ہوتا تھا۔ ان صدمات کے سبب طور کی داہنی وادی میں بجلی کی لہریں پیدا ہوتی تھیں۔ اس بجلی کے سبب اس وادی کی ہوا بھی صاف تھی اور امراض کے جراثیم سے پاک تھی (المقدس) اعصابی مریض وہاں آتے اور اس زمین میں چل پھر (طے کر کے) کر بفضل خدا شفا پاتے تھے۔ اسی لیے اس وادی کو "طویٰ" کہتے تھے (طوی البلاد طیاً کے معنی ہیں، اس نے شہروں کی مسافت کو قطع کیا۔ تاج العروس)

اس وادی کو قرآن حکیم نے "مقدس" کہا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس کی "تقدیس" کی دو وجہ سمجھی ہیں۔ روحانی اور جسمانی۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ جیسے آج کل لوگ بعض خاص پہاڑی علاقہ میں بغرض حصول صحت جاتے ہیں۔ وہاں بھی جاتے اور صحت پاتے تھے۔ دوسری روحانی وجہ تھی کہ وہاں امن سے تنہائی میں عبادت کا موقع ملتا تھا۔ یہ تھی روحانی تقدیس چنانچہ وہ آیہ ذیل شرح و ترجمہ میں لکھتے ہیں۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ (القصص - ۴۴) تو اسے رسول ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو طور میں جا کر اعتکاف بیٹھا کرتے تھے تو قبل از نبوت موسیٰؑ کی طرح مدین میں آیات الٰہی کی تلاوت بھی نہیں کرتا تھا (وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا۔ قصص - ۴۵) تجھ پر غربی وادی میں بجلی کے اثرات وارد نہیں ہوئے تھے تجھے کوئی امید نہیں تھی کہ تجھ پر کتاب اترے گی ..... "شاہدین" حاضرین کے معنی خواجہ صاحب نے "معتکفین" کیے ہیں "شاہد" یا "شہید" کا تعلق عبادت سے اہل علم نے تسلیم کیا ہے۔ "مصباح اللغات" میں "صلاۃ الشاہد" کے معنی نماز مغرب لکھا ہے اور "قاموس قرآنی" مولف حسن محمد موسیٰ (مطبوعہ اسکندریہ۔ مصر) میں شہداء کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ولفظ الشہداء ..... الذین آمنوا باللہ ورسلہ والتزموا لطاعتہ ھم الصادقون الذین تشہد اعمالھم بصدق ایمانھم وتظھر للناس حلاوۃ الدین ص ۲۲۴

شہداء (یعنی شہید یا شاہد) وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور پوری طرح طاعت کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہی راست باز ہیں جن کے اعمال اور راست بازی کی شہادت دیتے ہیں اور لوگوں کو دین کی حلاوت سے آشنا کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ سونٹا (عصا) حقیقتاً سانپ نہیں بن گیا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

۱ سورۂ نمل - ۱۰ - اور سورۂ قصص - ۳۱ - میں اللہ تعالیٰ موسیٰؑ کو فرماتا ہے تو اس عصا کو ڈال دے۔ پھر جب موسیٰؑ نے اس کو ہلتے ہوئے دیکھا کہ گویا وہ ایک سفید سانپ ہے تو اس نے پیٹھ پھیر کے منہ موڑ لیا اور پیچھے کو نہ مڑا اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس میں حرکت آ گئی تھی، سانپ ہرگز نہیں بنا تھا۔ اَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۤنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ (نمل) بالکل یہی الفاظ قصص میں ہیں)

«جان» سفید سانپ کو کہتے ہیں، «حیہ» بھی سانپ ہی ہے اور «ثعبان» بھی مطلق سانپ پر بولا جاتا ہے۔ سانپ اور ثعبان ہندی اور عربی میں ملتے جلتے الفاظ ہیں (ہندی کا س عربی کے ث سے، الف، عین سے اور پ، ب سے بدل گیا ہے اور نون کا اضافہ ہوا ہے۔ ناقل) بعض لوگ کہتے ہیں کہ سونٹا بڑا سانپ بنا تھا، لیکن چھوٹے سانپ کی طرح تیزی سے حرکت کرتا تھا۔ یہ درست نہیں۔ اس وجہ سے کہ لفظ «جان» کے معنی چھوٹا سانپ نہیں ہیں اور «تَهْتَزُّ» (اہتزاز) میں تیز حرکت نہیں پائی جاتی۔ دیکھئے قرآنی دلیل فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ۔ (ج - ۵ وحم سجدہ - ۳۹) یعنی جب ہم خشک اور دبی ہوئی مٹی پر پانی برساتے ہیں، تو زمین ہلتی ہے اور پھولتی ہے ___ اگنے کے وقت زمین کی حرکت کا تیز ہونا تو درکنار ظاہری نظر کو اس کا ہلنا دکھائی بھی نہیں دیتا۔ ایسی غیر محسوس حرکت کو «اہتزاز» سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فرعون کے دربار میں بھی سونٹا حقیقتاً سانپ نہیں بن گیا تھا۔ صرف اس کی دھیمی حرکت کو بطور «برہان» پیش کیا گیا تھا۔ یہ ہے خدائی تفسیر، اس کے مقابلے میں روایتی اور افسانوی تفاسیر کی کوئی وقعت نہیں۔

۲۔ دربار فرعون میں ساحروں نے مسمریزم یا ہپناٹزم کے ذریعے لوگوں کی آنکھوں کو مسحور کیا تھا اور انہیں ڈرایا تھا۔ وہ صرف ایک دکھاوا تھا۔ بالکل بے حقیقت۔ نظر کا دھوکا۔ ساحر (کہ) بلند آواز سے لوگوں کو متاثر کرنے لگے کہ «یہ لو! دیکھو! ہمارے سونٹے اور رسیاں چل پڑے ہیں» ہشیار بولنے والے اپنی چھتے دار تقریر سے سماں باندھ دیتے ہیں۔ لوگوں کے خیال کو جدھر چاہیں موڑ دیتے ہیں۔ بلکہ (خیالی) آوازیں بھی لوگ سننے لگتے ہیں۔ سونٹوں اور رسیوں میں حقیقتاً کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی ___ دربار فرعون کے اس منظر کا راوی اللہ تعالیٰ سے بہتر کون مفسر یا مورخ ہو سکتا ہے! اللہ تعالیٰ کا چشم دید بیان! سبحان اللہ کتنی پکی روایت اور شہادت ہے۔

۳۔ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ (طٰہٰ - ۶۷) جادوگروں کی رسیاں اور سونٹے ان کے جادو (فریب) کے اثر سے موسیٰؑ کے خیال میں دوڑتے ہوئے معلوم ہونے تھے۔

لہ من السحر ما هو تخييل للنظر وخداع للعقل ترى معه الاشياء غير حقيقتها (قاموس قرآنی صد ۳۸۲) سحر کیا ہے؟ نظر کی خیال آرائی اور عقل کا دھوکا۔ جس سے وہ کچھ نظر آتا ہے۔ جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔

موسیٰ اپنے جی میں ڈر گئے تو اللہ تعالیٰ نے کہا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (طٰہٰ ۶۸) مت ڈرو، اس قسم کے وسوسے مت لاؤ یقیناً تمہیں غالب ہو گے۔

· اَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ط اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ط (۶۹) جو تمہارے ہاتھ میں ہے (سونٹا) اس کو پھینک دو۔ تاکہ وہ سونٹا ساحروں کی کارستانیوں کو ہڑپ کر لے اور ان کے مکروں کو کھا جائے۔ یہاں "ما صنعوا" آیا ہے دوسری جگہ "مایافکون" (اعراف ۱۱۷) وارد ہوا ہے جس کا مادہ "افک" ہے۔ اس کے معنی ہیں جھوٹ، سانگ[1] یعنی شعبدہ، نقل اداکاری۔

از روئے قرآن سونٹے میں حرکت کی سیرت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور سیرت کے معنی ہیں چال، حال، طریقہ روش (تاج العروس، محیط المحیط، مفردات راغب) سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰى (طٰہٰ ۲۱)

ظاہر ہے کہ جب خیالی (غیر حقیقی) حرکت مقابلے میں اصلی حرکت سامنے آ جائے تو اس کی قلعی کھل جائے گی۔ خیالی حرکت والی چیز اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر نہیں سرکتی اور اصلی حرکت، متحرک کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ اس کے لیے تبدیل مکان لازم ہے۔ لہٰذا بہ اصل اُس نقل کو کھا گئی اردو میں بھی کھانا اور کھا جانا کے معنی ہیں۔ تباہ کر دینا سیتا ناس کر دینا وغیرہ (فیروز اللغات)

عصائے موسیٰ ان کی مکاری و فریب (افک و کید) کو کھا جاتا تھا۔ رسیوں اور سونٹوں کو ہرگز نہیں نگل جاتا تھا۔ جب اُسے پکڑ لیتے تو پھر وہی سونٹا ہوتا تھا پہلے جیسا۔ اس کے ساتھ دوسرے سونٹے رسیاں شامل نہیں ہو جاتے تھے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ط وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰى (طٰہٰ ۶۹) بس "ما صنعوا" کید ساحر ختم ہو کر رہ گیا۔

۴۔ جب موسیٰؑ نے رات کو وادی ایمن میں عصا کو متحرک ہوتے دیکھا۔ گویا کہ وہ سفید سانپ ہے تو خائف ہوئے۔ ارشاد ہوا۔ اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ (قصص ۳۱) آگے آ اور مت ڈر، تجھے کچھ خطرہ نہیں۔ دوسرے مقام پہ ہے۔ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰى (طٰہٰ ۲۱) اس عصا کو اپنے ہاتھ سے پکڑ لے، ہم اسے اس کی پہلی (غیر متحرک) حالت میں لے آئیں گے —— خواجہ صاحب کا خیال ہے کہ ہاتھ لگانے سے اس کی بجلی ہاتھ میں چلی جاتی تھی اور یوں پکڑنے سے اس کی حرکت رُک سکتی تھی۔ اگر وہ سچ مچ سانپ بن گیا ہوتا تو اپنی اصلیت (سانپ ہونا) گم نہ کر دیتا۔ بلکہ اپنی ارتقائی حالت کو صاف دکھلاتا! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَیْدِیْهِمْ لَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (انعام ۷) اگر ہم تجھ پہ کاغذوں میں لکھی ہوئی کتاب اتارتے۔ پھر یہ لوگ اسے اپنے ہاتھ سے چھو لیتے، تو بھی یہ کافر یہی کہتے کہ یہ کھلا جادو ہے۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ ہاتھ کے ساتھ ٹٹولنے سے شے کی اصلیت کھل جاتی ہے۔ بس اگر عصا واقعی ارتقا پا کر سانپ بن گیا ہوتا تو ہاتھ لگانے سے سانپ ہی رہتا! لیکن وہ تو بار بار سونٹا ہی نظر آتا ہے —— حرکت کے وقت بھی فی الحقیقت سونٹا ہی تھا۔

۵ —— جادوگر جانتے تھے کہ جادو کے ذریعے خیالی حرکت تو دکھائی جا سکتی ہے، لیکن اصلی حرکت پیدا کرنا ان کے بس میں نہیں۔

---

[1] ترجمہ شیخ الہند [2] معجزات کی دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔

جب انہوں نے اصلی حرکت دیکھ لی تو فرعون کی الوہیت کا انکار کر دیا اور رب العالمین پر ایمان لے آئے۔ ایسے امتحان و مقابلہ کے موقع پر فریقین ایک دوسرے کے افعال و حرکات پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں کہ کہیں کوئی جعل و فریب تو نہیں!

اگر جادوگروں نے دیکھا ہوتا کہ عصائے موسیٰؑ سچ مچ سانپ بن گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ دوسری چیزوں کو نگل جاتا ہے، تو موسیٰؑ کو کہتے کہ اس سے ظالم دشمنوں کو نگل جانے کا کام لیں۔ انہیں فرعون کو یہ نہ کہنا پڑتا کہ اِنَّمَا تَقۡضِیۡ هٰذِهِ الۡحَیٰوةَ الدُّنۡیَا (طٰہٰ۔ ۷۲) (فرعون نے انہیں پھانسی کی دھمکی دی تو بولے) تو اس دنیا میں ہمیں سزا کا حکم دے سکتا ہے۔

اگر فرعون اور اس کی قوم عصا کو سانپ بنا ہوا دیکھتے، تو انہیں اپنی جانوں کا فکر پڑ جاتا اور غرق ہونے کے وقت تک جو شرارتیں وہ کرتے رہے، ہرگز نہ کر سکتے۔

اگر موسیٰؑ کے پاس فرعونیوں کو مرعوب کرنے کے لیے اژدہے کی قوت تھی، تو بلا حیل و حجت بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کرا لیتے — دشمن کو اپنی ممکنہ قوت سے ڈراتے — اور ڈرانے کی حتی الوسع تیاری کرنا خدا کا حکم بھی ہے۔

وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ (الانفال۔ ۶۰)	اپنے اور خدا کے دشمنوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے ممکن حد تک تیاری کرو۔ قوت سے اور خوب پلے ہوئے گھوڑوں وغیرہ جنگی سامان سے۔

۶۔ جب وادی طویٰ میں موسیٰؑ سے کہا گیا کہ اپنے دائیں ہاتھ کے عصا کو پھینک دے تو انہوں نے اسے پھینک دیا۔

فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسۡعٰی (طٰہٰ۔ ۲۰) پس وہ ایک سانپ تھا کہ حرکت کرتا تھا اگر روایتی تفسیریں صحیح ہیں تو اس جگہ "تسعیٰ" کی جگہ "تحییٰ" زیادہ موزوں تھا، جو حیات سے مشتق ہے۔

۷۔ بیج سے درخت اور نطفہ سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ عناصر مختلف اور مناسب منزلوں سے گزر کر بیج اور نطفے کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ منزلوں سے گزرے بغیر ایک سونٹا، سانپ کا نطفہ یا انڈا یا سانپ بن جائے — مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع وغیرہ بے شمار قسم کی منظم شکلیں پائی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے بعض شکلیں ترکیب پا کر کوئی خاص شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اور بعض دوسری شکلیں مرکب ہو کر اس خاص شکل میں نہیں لائی جا سکتیں۔ بعض حروف سے ایک کلمہ بنتا ہے اور دوسرے حروف سے دوسرا کلمہ بنایا جا سکتا۔ یہی حال عناصر کا ہے، ایک قسم کے عناصر سے بنی ہوئی چیز دوسری قسم کے عناصر سے تیار شدہ چیز میں تبدیل نہیں ہو سکتی — اگر اس طرح قلب ماہیت ہونے لگے تو تمام علوم و حقائق غیر یقینی اور بیاد ہوا ہو جائیں۔ یہ بات حکمت الٰہی کے سراسر خلاف ہے[1]۔

---

[1] شاہ ولی اللہ رہ اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ جن واقعات کو بالعموم خارق عادت سمجھا جاتا ہے وہ فی الواقع خلاف عادت نہیں ہوتے۔۔۔ کوئی بات بھی خارق نہیں۔ ہر چیز جو معرض وجود میں آتی ہے اس کے ظہور کی کوئی موجبہ علت ہوتی ہے۔ (باقی حاشیہ آگے)

کوئی دانشمند اللہ تعالیٰ سے ایسی دعا نہیں مانگ سکتا — "کہ اے خدا تو میرے اس خشتی گھر کو سونے کا گھر بنا دے یا اس پتھر کو روٹی میں منقلب کر دے۔ ایسی دعائیں کرنا "معتدین" کا شیوہ ہے۔

اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (الاعراف - ۵۵) — اپنے رب کو پکارو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

اگر یہ بات منصوص و مسلّم ہے تو کیا حضرات موسیٰؑ، سلیمان و عیسیٰ علیہم السلام کو ایسے اختیارات دیئے جا سکتے ہیں، جن کے متعلق خدا تعالیٰ سے بھی دعا کرنا حد سے نکل جانے کے جرم کا ارتکاب ہے؟ اس طرح تو انبیاء کو ایسی باتوں میں پکارنا جائز ہو جائے گا جن کا عمل میں لانا خود اللہ تعالیٰ کی حکمت کے بھی خلاف ہے۔

بہرحال امور میں ایک عورت اپنے شوہر سے توقع رکھ سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اذن و آئین کے مطابق اُسے اولاد دے سکے، لیکن وہ کسی ایسے شخص کو تلاش نہیں کر سکتی جو مٹی کی مورت میں پھونک مار کر اس کے لیے بیٹا بنا دے۔ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو وہ چیز عطا کرتا ہے، جو بلا فرق و امتیاز دوسرے بندوں کو بھی دی جا سکے۔ لیکن جو بات خاصۂ خداوندی ہے، اس کے لیے اللہ ہی سے دعا کی جا سکتی ہے۔ اور جس کام کا عمل میں لانا خود اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے، وہ کسی انسان (مسیحؑ وغیرہ) کو کیسے سونپا جا سکتا ہے!

استعارے کی زبان

اللہ تعالیٰ ہمارے رسولؐ کو چراغ روشن (سراجاً منیراً) (احزاب ۴۶) فرماتا ہے — اگر یہ بات حکمت الٰہی کے مطابق ہو کہ ایک بشر رسول منقلب ہو کر ایسا روشن دیا بن جائے جس میں تیل اور بتی ڈالی جا سکے تو رسول کا چراغ بن جانا تسلیم — اور اگر حکمت الٰہی کا تقاضا یہ نہیں ہے تو لازماً چراغ کو استعارہ ہی سمجھا جائے گا — اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ

"اے رسول تو روشن چراغ کی طرح لوگوں کی رہنمائی کا ایک واسطہ ہے"۔ ایک عورت کا بیٹا میلا کچیلا تھا۔ اس نے اُسے نہلا دُھلا کر ستھرے کپڑے پہنائے اور کہنے لگی "اب تو چاند بن گیا ہے"، اس کا مطلب کوئی شخص یہ نہیں سمجھے گا۔ وہ بچہ منقلب ہو کر چاند بن گیا۔ یہ تو محض ایک استعارہ ہے کہ اب وہ بچہ چاند کی طرح صاف، پاک اور خوبصورت بن گیا ہے — نادان آدمی کو گدھا کہنا اور جاہلت

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ سمجھنا غلط ہے کہ خارق عادت کے ذریعہ کُلّی نظام کے قوانین توڑ دیے گئے۔ البتہ کسی چیز کو عادت کے خلاف اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ اس کا وقوع پذیر ہونا عام معمول کے خلاف ہے۔" المعارف، لاہور جلد ۳، شمارہ ۷، صفحہ ۴۲۔ رومی فرماتے ہیں لے اس کی تفسیر میں مولانا عثمانیؒ فرماتے ہیں: "در رتہ اسباب ہا اسباب ہاست — اندریں ابواب ہا ابواب ہاست" بحوالہ الخیر الکثیر وغیرہ "دعا میں حد ادب سے نہ بڑھے۔ مثلاً جو چیزیں عادتاً یا شرعاً محال ہیں، وہ مانگنے لگے یا معاصی اور لغو چیزوں کو طلب کرے یا ایسا سوال کرے جو اس کی شان و حیثیت کے مناسب نہیں یہ سب "اعتداء فی الدعا" میں شامل ہے۔

سے نکل کر مہذب و شائستہ ہو جانے والے کو، گدھے سے انسان بن جانے کا مصداق قرار دینا روزمرہ کے استعارے ہیں۔ بالکل اسی طرح قرآن حکیم میں شرارت پیشہ اہلِ کتاب کے بندر اور سور بن جانے کا ذکر ہے۔ سورۂ یٰسین آیت ۸ و ۹ کو دیکھیے۔ کفار کی گردنوں میں ایسے طوق ہیں۔ جن سے ان کی گردنیں اوپر کو اٹھی رہتی ہیں اور ان کے پیچھے دیواریں ہیں اور وہ اوپر سے بھی ڈھانک دیئے گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا (فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ) سب مفسر[1] و مترجم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب استعارے ہیں۔ حقیقتاً نہ کوئی دیوار تھی اور نہ طوق۔

حضرت موسیٰ کے پاس جو لاٹھی تھی، وہاں کے بیان کے مطابق ایسا عصا تھی جو بکریاں رکھنے والوں کے پاس ہوا کرتی ہے (طٰہٰ۔ ۸) جس سے وہ اپنی بکریوں کے لیے درختوں سے پتے اور شاخیں کاٹ کر اتارا کرتے تھے۔ مدین میں ۸۔ ۱۰ سال تک بکریاں چرانے کی خدمت بجا لاتے رہے۔ اس وقت آپ اس علاقے سے اپنے اہل و عیال اور اسباب و سامان کے ساتھ گزر رہے تھے۔ وہی عصا پاس تھا۔ جیسا کہ آپ اقرار کرتے ہیں، یہ سونٹا صرف تین مرتبہ حرکت میں آیا۔ اس کو حرکت میں لانے کا قدرتی سبب (کچھ اوپر بیان ہوا اور کچھ) حسب ذیل ہے:

موسیٰؑ کے وقت طور ایک آتش خیز پہاڑ تھا۔ جو آج کل بجھا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر ماہرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ کبھی آتش فشاں تھا۔ ایسے پہاڑوں میں زلزلے بکثرت آیا ہی کرتے ہیں۔ سخت زلزلوں کے مواقیت بھی ہوتے ہیں۔ تین سخت زلزلوں کا ذکر سورہ اعراف میں آیا ہے ایک زلزلہ پہلے میقات پر آیا۔ پہاڑ کے ٹکڑے اڑ گئے اور موسیٰؑ بے ہوش کر گر پڑے۔

جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا ... جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا (اعراف۔ ۱۴۳) دوسرا زلزلہ میقات ثانی پہ آیا جب آپ قوم کے ستر آدمیوں کو پہاڑ پہ لے گئے۔ حضرت موسیٰؑ کو اس کی کچھ خبر نہ تھی ـــــ اچانک رجفہ (زلزلہ) آیا اور سب بے ہوش ہو گئے وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ ... (اعراف ۱۵۵) تیسرا زلزلہ بنی اسرائیل سے عہد لینے کے وقت جب پہاڑ سائبان کی طرح ان پر جھکتا تھا اور گمان ہوتا تھا کہ ابھی گرا کہ گرا۔ آتشیں دھکوں سے طور اپنی جڑوں سے اونچا بھی ہو گیا تھا۔ اس سے جو آگ نکلتی تھی۔ رات کے وقت دور دور تک نظر آتی تھی۔ وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ (اعراف۔ ۱۷۱) اس کے دہانے کا رخ جنوب کی طرف تھا طور کے دائیں طرف ایک وادی تھی جسے وادی ایمن کہتے تھے یہ طور کے غربی جانب تھی، جس طرف ملک مصر واقع ہے۔ بجانب الغربی (قصص[2]) پہاڑ میں آتشیں صدمات سے بجلی پیدا ہوتی رہتی تھی۔ اس کی روئیں[3] وادی ایمن میں موج زن رہتی تھیں۔ وادی میں ایک درخت تھا۔ سبز درخت بجلی کا بڑا جاذب ہوتا ہے۔ اس لیے رات کے وقت ایسا

---

[1] مولانا عثمانی رو لکھتے ہیں؛ ـــ "یہ طوق، عادات و رسوم، حب جاہ و مال اور تقلیداً باد واجداد تھے، جنہوں نے اس کے گلے سختی سے دبا رکھے تھے۔ اور نخوت و تکبر کی وجہ سے ان کے سر نیچے نہیں جھکتے تھے ـــــ نبیؐ کی عداوت نے ان کے اور قبولِ ہدایت کے درمیان دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ جاہلانہ رسوم و اطوار اور اہواء و آرائے فاسدہ کی اندھیریوں میں اس طرح بند تھے کہ آگا پیچھا اور نشیب و فراز کچھ نظر نہ آتا تھا۔"

[3] لہریں۔

معلوم ہوتا کہ وہ درخت ید بیضا کی طرح چمکارے مار رہا ہے، لیکن جل نہیں جاتا۔ بجلی ہوا کو صاف کرتی ہے۔ اس میں خوف و طمع دونوں ہوتے ہیں۔ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا ..... (رعد-۱۲) " وادی ایمن " بجلی کی روؤں کے سبب پاکیزہ تھی۔ اسے طوی بھی کہتے تھے۔ جسے دہرایا جائے باطنے کیا جائے۔ بار بار آنے جانے چلنے پھرنے کی جگہ ــــ ضرور ہے کہ وہاں اعصابی مریض بجلی کا اثر لینے کے لیے آتے جاتے چلتے پھرتے ہوں گے۔

مدین سے واپسی پہ موسیٰؑ راستہ بھول گئے، رات ہو گئی اور سردی کا زور ہوا تو آپ نے طور کی جانب آگ دیکھی، اپنے اہل کو کسی محفوظ جگہ بٹھا دیا۔ خود اس طرف گئے کہ آگ لے آئیں اور راستہ بھی دریافت کریں۔ وادی ایمن میں پہنچے اور اس چمکتے ہوئے درخت کو دیکھ کر اس جگہ ٹھہر گئے، جہاں ان بجلی سے بھرپور درخت سے برکت پہنچتی تھی۔ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ (قصص-۳۰) اس وقت موسیٰؑ خود بھی چمکتے تھے لیکن جل نہیں جاتے تھے۔ وہ اس وقت اس (بظاہر) آگ میں تھے جو بجلی کی صورت میں جلوہ گر تھی نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (نمل-۸) یعنی وہ شخص جو آگ کے اندر ہے۔ اور وہ جو اس کے ارد گرد ہیں، یعنی دوسرے شاہدینؑ جو طوی میں آیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی کوئی نہ کوئی ان میں سے وادی کے کسی کونے میں موجود ہوگا۔ ہمارے رسول کریم اس وقت شاہدینؑ میں سے نہ تھے ــــ آیہ بالا (بورک من فی النار) کا آخری جزو ہے، سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس کا مطلب اور ربط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی سے برکت حاصل کرنے اور آگ اور بجلی کی شکل اختیار کرنے سے پاک ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ رب العالمین ہے وہ کسی کے زیر اثر اور کسی جگہ میں محدود نہیں۔

جب موسیٰؑ وادی ایمن میں پہنچے تو ان کے پاؤں میں جوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ خشک چمڑا بجلی کا جاذب نہیں ہوتا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ان کی تربیت کے لیے سامان کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے فرمایا اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ (طٰہٰ-۱۲) میں بلاشبہ تیری تربیت کرنے والا ہوں اس لیے تو اپنی جوتیاں اتار دے۔ جوتیوں کے اتار دینے سے ان کے جسم میں بجلی کی مناسب مقدار محفوظ کی گئی۔ جس طرح ایک برقی بیٹری میں بجلی کام کرتی تھی، جس کا ذکر سائنٹفک ڈکشنری میں واضح کر کے لکھا گیا ہے۔ بعض خراطین اور بعض مچھلیوں میں بھی ان کی حفاظت کے لیے برق محفوظ رکھی جاتی ہے۔ قدرتی اشیا سے معقول اور مناسب طور پر ہی کام لیا جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کفار کو غیر معقول طور پر ڈرانا ہوتا، تو ایک زلزلے سے سارے ملک کو فوراً تباہ کیا جا سکتا تھا۔ قوانین فطرت جو حکمت الٰہی کے مطابق کام کرتے ہیں، کبھی توڑے نہیں جا سکتے۔

سورۂ قصص، نمل اور طٰہٰ میں بجلی کے ذکر کے ساتھ ہی عصا کو پھینکنے اور اس کے متحرک ہونے کا بیان ہے اور " اَلْقِ عَصَاكَ "

لے ۔ سے مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِیْنَ (قصص ۴۴) اس کا بیان اوپر آ چکا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ وہ لوگ اس حقیقت سے واقف بھی ہوں۔ بعض چشموں کے پانی سے مریض صحت یاب ہوتے ہیں۔ لیکن اس پانی کے صحت بخش اجزا کو تو ماہرین ہی جان سکتے ہیں۔

کے بالکل منتقل ید بیضا کا ذکر آگیا ہے۔ اس کا ظہور صرف دو مرتبہ ہوا ہے۔ رات کے وقت پہاڑ پر اور فرعون کے دربار کے بند مکانوں میں ـــــ ضحیٰ کے وقت جادوگروں کے مقابلے میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ ید بیضا کو تین مرحلوں سے گزرنا پڑتا تھا: ہاتھ کو گریبان میں داخل کرنا، بازو کے ساتھ اُسے ضم کرنا اور کھینچ کر باہر نکالنا ـــــ (۱) اُسْلُكْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ (القصص ۳۲) (۲) وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ (ایضاً) (۳) نَزَعَ يَدَهُ (الاعراف-۱۰۸)

اس طرح رگڑ کے ذریعے وہ بجلی ہاتھ میں منتقل ہو جاتی تھی۔ اگر ان مراحل کا بجلی سے کوئی تعلق نہیں۔ تو کوئی صاحب ان الفاظ کا فائدہ بیان فرمائیں۔ کلام خدا میں کوئی لفظ بے فائدہ نہیں (منزل دوم ص ۲۴۴ تا ص ۲۵۳ اس کے علاوہ دوسرے متعلقہ مقامات کے حوالے بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔)

———— • ————

موسیٰ و عبورِ بحر

موسیٰ علیہ السلام، بنی اسرائیل کو لے کر نکلے تو بحرِ قلزم کو عبور کیا۔ اس کا ذکر متعدد مقامات پہ وارد ہوا ہے۔ مترجمین و مفسرین کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔ فَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ (شعراء - ۶۳) پھر ہم نے حکم بھیجا موسیٰ ؑ کو کہ مار اپنے عصا سے دریا کو۔ پھر دریا پھٹ گیا، تو ہو گئی ہر پھانک جیسے بڑا پہاڑ (شیخ الہند)

پانی بہت گہرا تھا بارہ جگہ سے پھٹ کر خشک راستے بن گئے بارہ قبیلے بنی اسرائیل کے الگ الگ ان میں سے گزرے اور بیچ میں پانی کے پہاڑ کھڑے ہو گئے (موضح القرآن) ـــــ خواجہ صاحب کی تحقیق ملاحظہ ہو۔

بنی اسرائیل آگے آگے جا رہے ہیں اور فرعونی ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ (شعراء - ۶۱) جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا، بلاشبہ ہم تو پکڑے گئے قَالَ کَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (۶۲) (موسیٰ نے) کہا، ہرگز نہیں بلاشبہ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ ابھی مجھے صحیح راستے کا پتا بتائے گا۔[1] (وہاں ایک وسیع پتھریلا راستہ تھا جو اکثر اوقات خشک پڑا رہتا تھا۔ یہ بات موسیٰ ؑ کو بذریعہ وحی بتا دی گئی تھی۔ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَکًا وَّلَا تَخْشٰی (طٰہٰ ۷۷) تو میرے بندوں کو رات کے وقت لے چل ـــــ فرعونی لوگ نیل کی سرسبز وادی میں رہتے تھے اور بنی اسرائیل کو وادی کے کنارے پہ الگ جگہ ملی ہوئی تھی۔ وہاں موسیٰ نے بحکمِ الٰہی ان کے لیے گھر بنائے تھے۔ وادیوں میں اکثر طوفانوں کے آنے سے نباتات گل سڑ جایا کرتی ہیں اور بہت سے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسرائیلی گھرانے ایسی جگہ بسائے گئے جو امراض سے محفوظ تھے وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَةً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ یونس (۸۷) دونوں بھائیوں، موسیٰ و ہارون کو بذریعہ وحی تعمیرِ مکانات کا حکم دیا اور یہ بھی کہ گھروں ہی کو قبلہ (مساجد) بناؤ (ص ۳۶ - منزل سوم) اس علیحدگی کے سبب بنی اسرائیل ان عذابوں سے بچ رہے جو فرعونیوں کے محلوں میں آئے تھے۔ جب موسیٰ ؑ مجمع البحرین تک پہنچے تو خشک راستے پہ بحیرہ روم کا پانی پھیل کر جھیل منسل کے ساتھ مل گیا تھا۔ فرعون پوری تیاری کے ساتھ پیچھے چلا آتا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ ؑ کو فرمایا تو اس سمندر میں اپنا عصا مار کر اس راستے کا جو بعض اوقات خشک پڑا رہتا ہے پتا لگا تجھے (فرعون سے) پکڑے جانے کا خوف نہیں ہوگا اور نہ راستہ بھولنے سے ڈرے گا (منزل چہارم ص ۱۹۲ ملخصاً)

---

[1] سبحان اللہ! یہ ہے یقین وحیِ الٰہی پہ

حضرت موسیٰ جب مدین کی طرف گئے تو اسی راستے سے گئے اور جب مصر کو واپس آئے تو اسی راستے سے آئے جب شمال کی طرف سے تیز ہوائیں چلتی تھیں، تو بحیرہ روم کا پانی اس راستے کو ڈھانک لیتا تھا۔ جھیل منسل کے ساتھ وہ راستہ بھی سمندر کا ایک حصہ بن جاتا تھا۔ جب بنی اسرائیل پانی کو چیرتے ہوئے اس راستے سے گزرے، تو طغیانی کی ابتدا تھی۔ اس راستے پر ریت کے تودے بڑے بڑے پہاڑوں کی طرح نکلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ (شعراء-٦٣) موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ سمندر میں اپنا عصا مار کر اس راستے کا پتا لگاؤ۔ وہ ریگ کے تودے بھی راستے کا پتا لگانے میں ممد تھے ارشاد ہوا — تو" سمندر کو اس کی تھمی ہوئی حالت میں چیر کر نکل جا۔ ابھی طوفان میں ترقی ہونے والی ہے۔ یہ فرعونی مزید غرق ہو کر رہیں گے۔ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا إِنَّهُمْ جُندٌ مُّغْرَقُونَ (دخان-٢٤) جب بنی اسرائیل سمندر کو چیر کر پار ہو گئے تو دوسری طرف جا کر دیکھتے ہیں کہ اب فرعونیوں کے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے گا۔ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ (بقرہ ٥٠) جب فرعون سمندر پہ پہنچا تو سیلاب کا زور بڑھ گیا۔ فرعون نے اپنی قوم کو بے راہ ڈال دیا اور صحیح رہنمائی نہ کر سکا۔ وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ (طٰہٰ-٧٩) وہ اپنے لشکروں سمیت جھیل منسل کے کنارے پر نیل کی دوسری شاخ میں غرق ہو گیا۔ موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے ہر ایک حصے کو ترتیب وار پانی سے پار کیا۔ بنی اسرائیل کا ہر حصہ (قبیلہ) سمندر کو اس طرح چیرتا جاتا تھا، گویا وہ ایک بڑا پہاڑ ہے۔ ارشاد ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کے چلنے کے وقت سمندر کو پھاڑ دیا۔ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ (بقرہ ٥٠) جس طرح کشتیاں سمندر کو چیر کر چلا کرتی ہیں۔ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ (نحل-١٤) (فاطر-١٢) ایک مچھلی بھی سمندر کو چیرتی ہوئی اور اس میں سرنگ لگاتی ہوئی اپنا راستہ لیتی ہے نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا (کہف-٦١) موسیٰ اور اس کا جوان ساتھی اپنی مچھلی کو بھول گئے پھر اس مچھلی نے اپنی راہ کر لی دریا میں سرنگ بنا کر "فرق" کے مفہوم میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ بنی اسرائیل کا ہر حصہ بڑے پہاڑ کی طرح سمندر کو چیرتا جاتا تھا۔ دوسرا یہ کہ ہر پشتہ یا ریگ تو وہ بڑے پہاڑ کی طرح نمودار ہو رہا تھا۔ (منزل پنجم صہ)

تکملہ

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ (الاعراف-١٣٣) سو ہم نے ان پر طوفان اور نباتات کے گلنے اور متعفن ہونے کے سبب) ٹڈی اور جھڑیاں (یا جوئیں یا پسو یا دیمک وغیرہ ستانے والے کیڑے) اور مینڈک اور خون (کے امراض) بھیجے جو (خدا تعالیٰ کی قدرت کے) الگ الگ نشان تھے۔

فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ (اعراف ١٣٦) پھر ہم نے فرعونیوں سے (مظلوموں کے ستانے کا) بدلہ لیا۔ سو ہم نے ان کو (اسی دریا کی دوسری شاخ میں جو غالباً جھیل منسل میں گرتی تھی اور جس پر حکومت کرنے کا فرعون مدعی تھا اس وجہ سے غرق کر دیا کہ وہ ہماری آیات (و دلائل) کو جھٹلاتے تھے اور ان کی طرف سے بے پروا تھے۔

جس جگہ اب سویز کنال ہے پہلے وہاں خاکنائے سویز تھی۔ اس خاکنا میں کئی جھیلیں تھیں ان جھیلوں کے درمیانی خشک حصے کو کاٹ کر اور جھیلوں کو ساتھ ملا کر بحیرہ قلزم و بحیرہ روم کے درمیان جہازوں کی آمد و رفت کے لیے بحری رستہ بنا دیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ جب مناسب دیکھتا ہے بندوں کو ایسی رہنمائی کرتا ہے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک تک جانے کے قریبی راستے پیدا کر دیتا ہے۔

جبل القمر کے شمالی پہاڑوں میں دو بڑی جھیلیں ہیں۔ ان میں سے دریا، نیل ازرق اور نیل ابیض نکلتے ہیں اور خرطوم شہر کے پاس آ ملتے ہیں اور بہت بڑا دریا بن کر شمال کا راستہ لیتے ہیں۔ مصر کی حدود کے قریب ماضی میں یہ دریا پھر دو حصوں میں بٹ جاتا تھا۔ بڑی شاخ شمال کی طرف چلی جاتی تھی وہ آج تک بحیرۂ روم میں اسکندریہ کے پاس سے گزر رہی ہے اور دوسری شاخ شمال مشرق کا رستہ لے کر جھیل منسل میں جا ملتی تھی۔ جب دریا نے مغربی ساحل کو توڑ کر نشیب کا رستہ لیا تو دریا کی وہ مشرقی شاخ گم ہو گئی۔ لیکن موسیٰؑ کے وقت میں وہ مشرقی شاخ موجود تھی فرعون کو وہ ماتحت شاخ ہی اس کے لشکروں سمیت ہڑپ کر گئی (هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ زخرف ۵۲) "الیم" سے دریائے نیل کی وہی شاخ مراد ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے فَغَشِیَهُمْ مِّنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَهُمْ۔ طٰہٰ ۷۸) فرعون نے اپنی قوم کو غلط راستے پر ڈال دیا۔ سیدھی راہ پر نہ چلایا اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰی۔ (طٰہٰ-۷۹)

ربّ ارنی

موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے دیدار کے لیے التجا کی۔ اس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا،
(تم پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو ہم اپنے جمال مبارک کی ایک ذرا سی جھلک اس پر ڈالتے ہیں اگر پہاڑ جیسی سخت اور مضبوط چیز اس کو برداشت کر سکی تو ممکن ہے، تم سے بھی اس کا تحمل کرا دیا جائے ورنہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کا تحمل پہاڑ سے نہ ہو سکے انسان کی مادی ترکیب اور جسمانی آنکھیں اُسے کیسے برداشت کر سکتی ہیں؟ (شیخ الاسلام عثمانیؒ) یہ تفسیر ہے اس آیت کی ـــــ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ج (اعراف ۱۴۳)

اس تفسیر میں جمال مبارک کے کچھ حصے (ایک کرن ہی سہی) کے ظہور کا اعتراف کیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب التجائے موسیٰ ہی کو طلب محال کہتے ہیں اب ان کا ترجمہ و شرح دیکھئے۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ج فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ج فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (اعراف ۱۴۳)

اور جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر آیا اور اس سے اس کے رب نے کلام کیا تو کہنے لگا کہ اے میرے پروردگار! مجھے ایسی بینائی دے کہ میں تیری طرف نظر کروں (خدا نے) فرمایا تو مجھے ہرگز نہیں دیکھے گا۔ لیکن تو اس پہاڑ کی طرف نظر کر، سو اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو ہو سکتا ہے کہ تو مجھے دیکھ لے وہ وقت کسی سخت زلزلے کے آنے کا تھا، اس سے یہ سکھانا مقصود تھا کہ جب پہاڑ اپنے سے بڑی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو انسان محال کی طلب میں کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کامل مطلق ہے۔ اس کائنات میں اپنے ارادہ، علم حکمت، خالقیت، رازقیت، قدرت، رحمانیت رحیمیت اور کلام و وحی کی صفات کا ظہور فرماتا رہتا ہے لیکن اس کی اصل ذات کو جس سے اس کی صفات و افعال کا ظہور ہوتا ہے کوئی نہیں دیکھ سکتا زیادہ سے زیادہ اس کے متعلق یہی سمجھا اور کہا جا سکتا ہے۔

دور بینان بارگاہ الست   بیش ازیں پے نہ بردہ اند کہ "ہست"

(ذات بحت کے متعلق "ہست" کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس پر کچھ اضافہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ناقل)

بعض لوگ خدائی صفات کا خیال کر کے اپنے دل میں خدا تعالیٰ کی ایک مثال یا تصور قائم کر لیتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا خیال ہی ہوتا ہے۔ اہل ریاضت (صوفیہ جوگیہ وغیرہ) ایسے نقوش کا مشاہدہ کرتے ہیں (حقیقت یہ ہے کہ)

آنچہ نزد تو پیش ازاں وہ نیست سرحدِ فکر تست اللہ نیست ۔ ناقل)

خدا تعالیٰ بے مثل ہے۔ وہ مکان و زمان اور دیگر اوضاع سے وراء الورا ہے۔ لہٰذا اس قسم کا سوال صرف بشری کم زوری[1] ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کی تردید کر دی کہ لن ترانی ـــــ

رحاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اس کائنات میں اپنی قدرتوں ہی کے ساتھ ظہور فرمایا کرتا ہے) سو جب اس (موسیٰ) کے رب نے پہاڑ کے لیے (اپنی ایک قدرت کے ساتھ) ظہور فرمایا تو اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑا[2] (مطلب یہ کہ جب پہاڑ جیسی مضبوط شے اللہ تعالیٰ کی زلزلہ افگن قدرت کے سامنے تاب ثبات نہیں رکھتی تو ذات کا دیکھنا جو مخلوقات کی تاب[3] نظارہ سے بالاتر ہے، کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ جو چیز میرے فہم میں سما ہی نہیں سکتی۔ اگر میں اس کو احاطہ فہم میں لانے کے لیے بہت بڑھ چڑھ کر زور لگاؤں تو فہم پھیلتا ہوا ٹوٹ پھوٹ جائے گا اور وہ پھر بھی اس کے قابو میں نہیں آئے گی)۔ پھر جب وہ (موسیٰ) ہوش میں آیا تو کہنے لگا کہ تو (مخلوق کی گرفت میں آنے سے پاک ہے سبحانک) میں تیری طرف تائب ہوا اور میں پہلا مومن ہوں۔

---

[1] حضرت موسیٰؑ کے لفظ "تُبتُ" کی تفسیر میں حضرت عثمانیؒ لکھتے ہیں "میں توبہ کرتا ہوں کہ فرطِ اشتیاق میں بدون اجازت کے ایک نازیبا درخواست کر گزرا"

[2] طور مست و خرّ موسیٰ صعقا۔ رومیؒ [3] انسانی نظر تو مخلوقی تابش کو بھی ایک حد تک ہی دیکھ سکتی ہے۔ سورج اور نگاہ کا فاصلہ ذرا کم کر دیجیے۔ پھر نگاہ کو کہیے کہ ایک لمحہ ابھر اس کرۂ درخشاں کو دیکھ! خانۂ چشم ہی میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو کر رہ جائے گی۔ ہر حس کی قدرتِ احساس محدود دائرے کے اندر ہی کام کر سکتی ہے۔ شامہ، لامسہ، سامعہ وغیرہ (ناقل)

[4] یعنی پاگل ہو جاؤں گا۔ جیسا کہ بہت زیادہ سوچنے اور مغز پاشی کرنے والے ہو جایا کرتے ہیں۔ نطشہ جرمنی ساز آزاد دہلوی وغیرہ (ناقل)

الواحِ موسیٰؑ

حضرت موسیٰؑ کو طُور پر جو الواح (تختیاں) ملی تھیں، اُن کے متعلق ہمارے مفسّر عجیب وغریب تشریحیں لکھتے ہیں۔ مثلاً تفسیر کبیر میں ہے کہ

موسیٰؑ عرفہ کے دن بے ہوش ہوئے اور تورات قربانی کے دن ملی اور تختیاں دس تھیں یا سات۔ ان کا طول وجوہر کتنا تھا؛ وہ زمرد کی تختیاں تھیں یا سرخ یاقوت کی یا سبز زبرجد کی یا لکڑی کی جو آسمان سے نازل ہوئی تھی یا سخت پتھر کی جس کو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کے لیے نرم کر دیا تھا۔

یہ تو ہوئی تختیوں کی وضع قطع پر طبع آزمائی اب کتابت کے بارے میں سنئے:۔

فقال ابن جریج کتبھا جبریل بالقلم	ابن جریج کہتے ہیں کہ تختیوں پر جبریل نے لکھا تھا اس قلم سے
الّذی کتب بہ الذکر واستمد من نھر النور۔	جس کے ساتھ ذکر کو لکھا اور روشنائی نہرِ نور سے لی۔

امام رازی کا ان تشریحات پر یہ تبصرہ ہے۔

واعلم انہ لیس فی لفظ الآیۃ ما یدل علیٰ کیفیۃ تلک الالواح وعلیٰ کیفیۃ تلک الکتابۃ فان ثبت ذالک التفصیل بدلیل منفصل قوی وجب القول بہ والّا وجب السکوت عنہ

یعنی آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو ان تختیوں کی کیفیت پر روشنی ڈالتا ہو اور ان کی کتابت کے متعلق وضاحت کرتا ہو۔ اگر اس قسم کی تفصیل کسی قوی دلیل سے ثابت ہو جائے تو اس کے بارے میں کچھ کہنا ضروری ہے۔ ورنہ سکوت ہی واجب ہے[1] (یعنی جو مختلف اقوال اوپر آئے ہیں، سب بے کار ہیں۔)

خواجہ صاحب کا ترجمہ وتفسیر ملاحظہ فرمایئے۔ وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ (اعراف ۱۴۵)

(حضرت موسیٰؑ طور میں اعتکاف کے لیے بیٹھے تھے۔ چالیس رات کے بعد خدا تعالیٰ کے رسالات (پیغامات) نازل ہوئے اسی پہاڑ سے پتھر کی لوحیں لے کر موسیٰؑ نے ان کو، ان پر لکھ لیا ظاہری کتابت[2] موسیٰؑ کا کام تھا۔ ان احکام کا موسیٰؑ کیلئے لکھ دینا یعنی فرض ٹھہرا دینا خدا تعالیٰ کا کام[3] تھا۔) اور ہم نے اس (موسیٰؑ کو سکھانے) کے لیے ہر شے کی نصیحت اور ہر بات کی تفصیل ان تختیوں میں لکھ دی تھی۔ (منزل دوم صفحہ ۲۹۶)

---

[1] جز ثالث عشر التفسیر الکبیر للرازی ص ۲۳۶ مطبوعہ مصر ۱۳۵۷ھ۔

[2] یہ بھی ظاہر ہے موسیٰؑ نے شاہی ماحول میں تربیت پائی اور بہترین علم وفضل حاصل کیا۔

[3] قرآن مجید میں کئی جگہ کتب کے معنی فرض آیا ہے مثلاً کتب علیکم القتال کتب علیکم الصیام وغیرہ

بچھڑا اور سامری

سورہ اعراف رکوع ۱۸ اور سورہ طٰہٰ رکوع ۴ ۱ میں سامری اور بچھڑے کا ذکر آیا ہے مفسرین کہتے ہیں کہ

وہ زیور جسے گلا کر اور ڈھال کر بچھڑا بنایا اصل میں فرعون کی قوم قبطیوں کا تھا۔ ان کے پاس سے بنی اسرائیل کے قبضے میں آیا — قوم فرعون کے یہ زیورات کس طرح بنی اسرائیل کے ہاتھ آئے تھے؟ یا ان سے مستعار لیے تھے یا مال غنیمت کے طور پر ملے یا اور کوئی صورت ہوئی؟ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ کوئی صورت بھی ہو بنی اسرائیل ان کا استعمال اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن غضب ہے کہ ان کا بت بنا کر پوجنا جائز سمجھا...... موسیٰؑ نے سامری کو ڈانٹ بتلائی اور فرمایا...... یہ حرکت تو نے کس وجہ سے کی؟ اور کیا اسباب پیش آئے کہ بنی اسرائیل تیری طرف جھک پڑے"؟ سامری نے کہا۔ مجھ کو ایک ایسی چیز نظر پڑی (بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا۔ طٰہٰ) جو اوروں نے نہیں دیکھی تھی۔ یعنی خدا کے بھیجے ہوئے فرشتہ (جبریل) کو گھوڑے پر سوار دیکھا۔ شاید یہ اس وقت ہوا جب بنی اسرائیل دریا میں گھسے اور پیچھے پیچھے فرعون کا لشکر گھسا۔ اس حالت میں جبریل دونوں جماعتوں کے درمیان کھڑے ہو گئے، تاکہ ایک کو دوسرے سے ملنے نہ دیں۔ بہرحال سامری نے کسی محسوس دلیل سے یا وجدان یا کسی قسم کے تعارف سابق کی بنا پر سمجھ لیا کہ یہ جبریل ہیں۔ ان کے پاؤں یا ان کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر مٹی اٹھالی۔ وہی اب سونے کے بچھڑے میں ڈال دی۔ کیوں کہ اس کے جی میں یہ بات آئی کہ روح القدس کی خاک پا میں یقیناً کوئی تاثیر ہوگی فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا (ایضاً۔ ۹۶) دنیا میں اس کو یہ سزا ملی کہ لشکر بنی اسرائیل سے باہر الگ رہتا۔ اگر وہ کسی سے ملتا یا کوئی اس سے تو دونوں کو تپ چڑھتی۔ اسی لیے لوگوں کو دور دور کرتا (لَا مِسَاسَ۔ ایضاً۔ ۹۷)

حضرت موسیٰؑ سامری سے مخاطب ہیں :

تیری تو یہ سزا (مذکورہ بالا) ہوئی اب تیرے جھوٹے معبود کی قلعی بھی کھولے دیتا ہوں۔ جس بچھڑے کو تو نے خدا بنایا اور دن بھر وہاں دل جمائے بیٹھا رہتا تھا (ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ایضاً) ابھی تیری آنکھوں کے سامنے توڑ پھوڑ کر اور جلا کر راکھ کر دوں گا۔ پھر راکھ کو دریا میں بہا دوں گا" یہ تفسیر صحابہ، تابعین اور مفسرین علماء کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ اور جو لوگ اس کو تسلیم نہ کریں انہیں زائغین کا خطاب والقاب دیا گیا ہے۔ (علامہ عثمانیؒ)

اس میں بعض باتیں غور طلب ہیں ،

۱۔ فرعونیوں کے زیورات اسرائیلیوں کے قبضے میں کیسے آگئے؟ جب کہ قرآن حکیم میں اسکی کوئی صراحت نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس نص یہ ہے کہ زیورات بنی اسرائیل کے تھے جیسا کہ حُلِيِّهِمْ (اعراف۔ ۱۴۸) سے ظاہر ہے۔

۲- سونے چاندی کو راکھ بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ ایسی پکی دھات کو تولہ یا ماشہ بھر کشتہ بنانے کے لیے اطبا اور دید صاحبان سخت مشقت اٹھاتے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ کشتہ بنتا اور کبھی کچا بھی رہ جاتا ہے، اس کے علاوہ کشتہ ہونے کے بعد پھر اسے اصلی حالت میں بھی لایا جا سکتا ہے۔

۳- ایک عالی شان پیغمبر کا یہ فعل نہیں ہو سکتا کہ سونا چاندی جس سے کئی مفید کام لئے جا سکتے ہیں، اُن کو یونہی ضائع کر دے۔ یہ تو نعمائے الٰہی کا ضیاع ہوگا۔

۴- سامری جو منافق بلکہ مشرک قسم کا آدمی تھا، اس کو جبریل نظر آ گئے، لیکن کسی مخلص و متقی اسرائیلی حتیٰ کہ ہارون رسولؑ کو بھی جبریل اسپ سوار نظر نہ آئے۔

۵- جبریل ایسی ہستی سے بالمشافہ متعارف ہونے کے باوجود سامری ایمان نہ لایا اور منافقت ہی پہ جا رہا۔ یاللعجب!

ان مشکلات کے کچھ حل بعض لوگوں نے پیش کئے ہیں۔ جن کو ہمارے بزرگ علامہ عثمانی ''زائغین'' کے لقب سے نواز رہے ہیں۔ سردست خواجہ صاحب کی تحقیق دیکھئے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِن بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ (اعراف-۱۴۸)

ترجمہ اور بنی اسرائیل کو موسیٰؑ اور ہارون علیہما السلام کا اصحاب ہونا کچھ کام نہ آیا جب کہ وہ گوسالہ پرستی میں پڑ گئے (موسیٰ کی قوم نے اس کے (پہاڑ پر جانے کے) بعد اپنے زیوروں (کو گلا کر ان) سے ایک بچھڑا (بنا کر اسے معبود) پکڑا۔ وہ ایک ڈھانچ تھا جس کی آواز بیل کی سی تھی، کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ نہ وہ ان سے باتیں کرتا ہے اور نہ وہ انہیں کسی راستہ کی ہدایت دیتا ہے (وہ انسان جیسی تعظیم کے بھی لائق نہیں ہے۔ پھر وہ معبود کیسے ہو سکتا ہے!) وہ اُسے (معبود) پکڑ کر ظالم بن گئے۔

تفسیر اس کی اندرونی ساخت ایسی بنائی گئی تھی کہ جب اس کے اندر ہوا داخل ہوتی تھی تو اس سے ''بھاں بھاں'' کی آواز نکلتی تھی۔ بنی اسرائیل جن کو موسیٰؑ نے فرعون کی غلامی سے چھڑایا تھا اور سمندر سے ان کے ساتھ پار اتارا تھا۔ ان پہ سامری کی اس شعبدہ بازی کا وہ اثر ہوا جو موسیٰؑ کے عصا اور ید بیضا کا بھی نہ ہوا تھا۔

زیورات کی ماہیت یہ زیور خود بنی اسرائیل ہی کے تھے اور قلعی وغیرہ۔ کچی دھات کے بنے ہوئے تھے جو تیز آگ میں ایسی خاکستر سے بنائے جا سکتے ہیں جو پھر زندہ نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ لَنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا (طٰہٰ-۹۷) سے صراحتاً ثابت ہے۔ اسی طرح وَلَٰكِنَّا حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِّن زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا (طٰہٰ-۸۷) سے صاف پتا لگتا ہے کہ وہ زیورات خود اسی قوم یعنی بنی اسرائیل کے تھے۔ فرعونی لوگوں سے دھوکے کے ساتھ عاریتاً نہیں حاصل کئے گئے تھے (منزل دوم صفحہ ۳۶۳) اب آئیے دوسرے مقام سورۂ طٰہٰ کی طرف!

موسیٰ علیہ السلام طور سے لوٹے اور قوم کو گمراہی میں مبتلا دیکھ کر غضب ناک ہو گئے اور کہا کہ تم غضب الٰہی کو دعوت دے رہے ہو اور تم نے میرے وعدے کا خلاف کیا۔ انہوں نے جواب دیا ہم نے کوئی خلاف عہد بات نہیں کی۔ لیکن۔

حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۝ طٰہٰ - ۸۷

ہم سے اس قوم کے بوجھوں کو ہلکا اٹھوایا گیا۔ سو ہم نے ان (زیوروں) کو لا پھینکا اور اسی طرح سے سامری نے اسے آگ میں ڈالا۔

بنی اسرائیل کے زیور کچی دھات کے تھے وہ تھوڑی سی آگ میں پگھل گئے اگر انہیں زیادہ آگ دی جاتی تو جل جاتے اور راکھ بن جاتے ..... سونا چاندی کا اگر کشتہ بھی کیا جائے پھر بھی وہ اپنی اصلی شکل میں آجاتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے۔

شہد، سہاگہ، گھی، موئی دھات کے تینوں جی

لیکن کچی دھاتیں (سکہ، قلعی، جست) جل کر دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتیں۔ ان کی راکھ اڑائے جانے کے قابل ہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس بچھڑے کو جلا کر کیا گیا تھا۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ (ایضاً) پھر اس (سامری) نے (ڈھال کر) ایک ایسا بچھڑا ان کے لیے نکالا کہ وہ ایک (بے جان) ڈھانچ تھا جس کے لیے گائے کی آواز تھی (اس کے اندر جب ہوا جاتی تھی تو "بھاں بھاں" کی آواز نکلتی تھی) بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کی لائی ہوئی آیات کی کچھ بھی قدر نہیں کی لیکن سامری کے بچھڑے کو معبود بنا لیا) سو کہنے لگے یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا بھی معبود ہے۔ پس وہ (موسیٰ) بھول گیا (اور اسے پہاڑوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہے) (منزل چہارم ۱۹۶ و ص ۱۹۷)

اسی سلسلے میں ایک مقام آتا ہے۔ جہاں موسیٰؑ غضب ناک ہو کر عجل پرستوں کو سزا دینے پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (بقرہ - ۵۵) یعنی تم اپنے آپ کو قتل کر ڈالو۔ یہاں ہمارے مفسرین کہتے ہیں۔

"جنہوں نے بچھڑے کو سجدہ نہ کیا تھا، وہ سجدہ کرنے والوں کو قتل کریں" اور بعض کا قول ہے کہ بنی اسرائیل تین گروہ تھے۔ ایک وہ جنہوں نے گوسالہ پرستی نہ کی ـــ اور دوسروں کو بھی روکا دوسرے وہ جنہوں نے گوسالہ کو سجدہ کیا، تیسرے وہ جنہوں نے خود تو سجدہ نہ کیا، مگر دوسروں کو منع بھی نہ کیا ـــ فریق دوم کو حکم ہوا کہ "مقتول ہو جاؤ"، تیسرے فریق کو حکم ہوا کہ "ان کو قتل کر دو" تاکہ ان کے سکوت کرنے کی توبہ ہو جائے۔ اور فریق اول توبہ میں شریک نہیں ہوئے۔ کیوں کہ ان کو توبہ کی حاجت نہ تھی" (حضرت عثمانیؒ تفسیر آیہ ۵۴ ۔ بقرہ)

یہ بقرہ کے چھٹے رکوع کی آیت ہے۔ رکوع کا آغاز اللہ کے احسانات کی یاد دہانی سے شروع ہوا ہے۔ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ (آیت ۴۷) اے بنی اسرائیل میری نعمتوں کو یاد کرو ..... الخ اس ضمن میں پہلا انعام تھا فرعون سے نجات۔

۲۔ سمندر پار کرا دینا بالکل صحیح و سلامت۔

۳۔ قوم کی ہدایت کے لیے موسیٰؑ سے چالیس رات کا وعدہ

۴۔ قوم کی ہدایت کے لیے موسیٰ کو کتاب و فرقان (تمیز) عطا فرمانا۔
۵۔ پانچواں انعام آیہ زیرِ غور میں بیان ہوا ہے۔ ظاہر ہے قتل کرا دینا کوئی انعام نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ تو انتہائی سزا ہے۔ جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا خواجہ صاحب کا ترجمہ و تفسیر ملاحظہ ہو۔
وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (بقرہ۔ ۵۴) (اور اس انعام الٰہی کو یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا "اے میری قوم! بلاشبہ تم نے بچھڑے کو (معبود) پکڑ کے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ سو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو۔ پھر اپنی جانوں کو قتل کرو۔ یہ تمہارے لیے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے" تو تمہارے پیدا کرنے والے نے موسیٰ کے اس جبری حکم سے تمہیں بچا لیا اور بلا قتل) تم پر مہربانی کے ساتھ رجوع کیا۔ بلاشبہ وہ بار بار رجوع کرنے والا مہربان ہے منزل اول ص۱۹۷، ۱۹۸ سورۂ طٰہٰ میں زیر آیہ ۹۳ لکھتے ہیں۔ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ الخ یعنی تم اپنے کو قتل کر ڈالو یہ تمہارے لیے تمہارے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے موسیٰ نے یہ حکم غضب ناکی کی حالت میں دیا تھا، لیکن خدا تعالیٰ نے قوم کی توبہ قبول فرمائی بلاشبہ خدا تواب و رحیم ہے (بقرہ۔ ۵۴) حاصل یہ کہ خدا نے موسیٰ کی تجویز کردہ سزا سے گوسالہ پرستوں کو بچا لیا (منزل چہارم۔ ۵۸)
اب سامری کا باقی قصہ سنئے!
قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ (طٰہٰ۔ ۹۵) (موسیٰ پوچھ رہے ہیں) اے سامری! پھر تیرا کیا معاملہ ہے؟ وہ جواب دیتا ہے۔
بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي (ایضاً)
میں نے (تمہارا وہ کمال) دیکھا جو انہوں نے نہیں دیکھا۔ پھر میں نے اس رسول (رہارون) کے نشان قدم سے (مٹی کی) مٹھی بھر لی پھر اُسے مبارک جان کر اس کو بچھڑے میں) ڈال دیا اور میرے نفس نے مجھے ایسا ہی اچھا کر دکھایا یا یہ بچھڑا تمہارے پاؤں کی مٹی کی برکت ہی سے آوازیں نکالتا ہے۔ میں نے یہ کام تمہارے ہی کمال کو دکھلانے کے لیے کیا ہے۔ ان آیات میں جبریل کی گھوڑی کا کوئی اشارہ تک نہیں ہے)
بعض لوگ رسولوں کی عزت ایسی باتوں میں سمجھتے ہیں، جن کے ساتھ ان رسولوں کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ خوشامدی لوگ کہا کرتے ہیں کہ تم مٹی کو ایک نگاہ سے کیمیا[ل] بنا دیتے ہو۔ اور لوگ ایسی خوشامدانہ باتوں کو نبیوں کی عزت سمجھتے ہیں۔ یہ طریقہ سامری کا ہے۔ یہ

ل آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند — سگ را ولی کنند و مگس را ہما کنند — آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند۔ ایک مرید نے لکھا ہے کہ وہ یا شاید اس کے گھر کا کوئی فرد سخت بیمار ہوا دیسی، ولایتی کسی قسم کے علاج سے فائدہ نہ ہوا مایوس ہو کر (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

طریقہ ایمانداروں کا نہیں۔ ایمانداروں کے نزدیک کسی کو اس کی حیثیت سے بڑھا کر دکھلانا، اس کی تحقیر اور بے عزتی کرنا ہے)

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ (ایضاً، ۹) حضرت موسیٰ سمجھ گئے کہ یہ سامری لوگوں کو جھوٹے توہمات میں پھنسا رہا ہے اور چھوت چھات کا قائل ہے۔ جو شخص اس بات کو مانتا ہے کہ فلاں شخص کے پاؤں کی مٹی مبارک ہے اور فلاں شخص کے سائے اور گرد و غبار سے بچنا چاہیے کیا ایسا شخص چھوت چھات میں مبتلا ہونے کے قریب نہیں ہے!! اس لیے موسیٰ نے) کہا: "تو (یہاں سے) چلا جا! اس لیے کہ تیرے لیے اس دنیا میں یہ بات ہے کہ تو لوگوں سے کہے گا کہ "چھونا نہیں" (یعنی میرے ساتھ مت لگنا۔ کہیں تمہارا برا سایہ مجھ پہ نہ پڑ جائے اور میں ہلاک نہ ہو جاؤں۔ وہی لوگ ایسی مصیبتوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ یہ کچھ کم سزا نہیں) اور تیرے (تباہ ہونے) کے لیے ایک وعدہ ہے، جس سے تو نہیں بچے گا، اور تو اپنے معبود کی طرف دیکھ جس پہ اعتکاف بیٹھا تھا (اور اس کی عبادت میں لگا ہوا تھا، ہم اس کو جلا کر خاکستر بنا دیں گے پھر اسے دریا میں بکھیر دیں گے (کیا ایسی عاجز و مجبور چیز الٰہ ہو سکتی ہے؟) وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا۔ (طٰہٰ۔ ۹۷) منزل چہارم صفحہ ۲۰۰-۱۹۹)

(بقیہ حاشیہ) میاں صاحب شرقپوری کی قبر سے مٹی لے آیا۔ اس کی پڑیاں استعمال کیں، تو شفائے کلی حاصل ہو گئی۔
مولانا احمد علی مرحوم (مسجد شیرانوالہ۔ لاہور) کی قبر کی مٹی کے متعلق بھی عجیب غریب باتیں شائع ہوتی رہی ہیں۔

سبت

سبت کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ

حق تعالیٰ نے یہود پر ہفتہ کے دن شکار کرنا حرام کیا تھا۔ باشندگان ایلہ کو عدول حکمی اور نافرمانی کی عادت تھی۔ [1]
خدا تعالیٰ کی طرف سے سخت آزمائش ہونے لگی کہ ہفتہ کے دن دریا میں مچھلیوں کی بے حد کثرت ہوتی تھی۔ باقی دنوں میں غائب رہتیں۔ [2]
ان لوگوں سے صبر نہ ہو سکا صریح حکم الٰہی کے خلاف حیلے کرنے لگے۔ دریا کا پانی کاٹ لائے۔ جب ہفتہ کے دن مچھلیاں ان کے بنائے ہوئے حوض میں آجاتیں تو نکلنے کا راستہ بند کر دیتے اور اگلے دن اتوار کو جا کر پکڑ لاتے" تاکہ ہفتہ کے دن شکار کرنا صادق نہ آئے (علامہ عثمانی) آخر اس جرم کی سزا میں وہ بندر بنا دیئے گئے۔ (حاشیہ اعراف ۱۶۳

خواجہ صاحب کا ترجمہ و تفسیر:

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (الاعراف ۱۶۳)

(رکوع سابق میں قوم موسیٰ نے الٰہی احکام کی مخالفتیں کی۔ اس رکوع میں ان کے سبت توڑنے کا ذکر ہے۔ جسے انہوں نے خود اپنے ذمے لیا تھا۔ وہ اپنی ہی پسند کردہ رسم کو بھی نہیں نباہ سکے جیسا کہ ارشاد ہے:

اور تو ان سے اس بستی (کے رہنے والوں) کی بابت سوال کر، جو سمندر کے کنارے پر واقع تھی۔ جب وہ لوگ ہفتہ میں تعدی کرتے تھے (اور کس حال میں تعدی کرتے تھے؟) وہ تعدی کرتے تھے جب کہ ان کے پاس ان کی مچھلیاں ان کے ہفتے کے دن سامنے آتی تھیں اور اس دن بھی جب کہ وہ ہفتہ نہیں کرتے تھے (یعنی ان کی مچھلیاں ہر روز یکساں طور پہ ان کے سامنے لائی جاتی تھیں۔ پس ان کے لیے ایک دن کے واسطے صبر کرنا بالکل آسان تھا۔)

اسی طرح (ہفتہ اور غیر ہفتہ کے دن کبھی کبھی) نہیں بھی آیا کرتی تھیں یہ (ہفتہ کی) آزمائش ہم ان کی نافرمانی کے سبب کرتے تھے (یہ آزمائش انہوں نے خود اپنے آپ پر لی تھی۔ جب وہ نہ ٹلے تو ہم نے بھی یہ آزمائش ان پر ڈال دی اور انہیں کہہ دیا۔ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ (النساء - ۱۵۴) سبت ان پر ڈالا گیا جنہوں نے ملت ابراہیم میں اختلاف کیا تھا۔ إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ

---

[1] گویا خدا تعالیٰ کو آزمائش و سزا دہی کا شوق تھا۔ معاذ اللہ۔ [2] انہیں کہا گیا تھا کہ دروازہ شہر میں داخل ہوتے وقت حِطّۃ (طلب بخشش) کہو۔ انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی (اعراف ۱۶۱ و ۱۶۲)

اِخْتَلَفُوْا فِیْهِ — ای فی ملتہ ابراھیم (النحل ۱۲۴)

اس آیت (زیر تفسیر) میں تمام مفسر "یوم لا یسبتون" کو "لا تاتیھم" کا ظرف بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مچھلیاں ہفتہ کے دن تو سامنے آتی تھی جب کہ وہ اپنے عہد کے مطابق انہیں نہیں پکڑ سکتے تھے۔ لیکن دوسرے دنوں میں جب کہ ان کے لیے مچھلیوں کا پکڑنا جائز تھا، گم رہتی تھیں — وہ لوگ بحیرہ روم کے ساحل پر آباد تھے۔ ان کا گذارہ مچھلیوں پر ہی تھا۔ اگر خدا تعالیٰ نے غیر سبت ایام میں بھی ان کو مچھلیوں سے محروم کر کے ان کی بسر اوقات کو مشکل میں مبتلا کر دیا تھا، تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی ان کو بد عہدی پر مجبور کر رہا تھا؟ کیا ایسی مجبوری کو تعدی اور زیادتی کہا جا سکتا ہے؟ (اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ) کیا اس کو عتو اور سرکشی کا نام دیا جا سکتا ہے؟ (فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ۔ اعراف ۱۶۶) کیا مجبوروں کو وعظ کہنا اور بھوکے رہنے کی تلقین کرنا درست ہو سکتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ "لا یسبتون" پر آیت ختم ہو جاتی ہے۔ اگلی آیت میں کذالک کا تعلق "لا تاتیھم" کے ساتھ ہے۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَاۨ ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (اعراف ۱۶۴)

("اذ قالت" کا عطف "اذ یعدون" پر ہے۔ "یعدون" حال ماضی یا ماضی استمراری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ کافی عرصہ تک ہفتے کے دن شکار کرتے رہے اگر ان کے شکار کرنے کے سبب غیر ہفتہ ایام میں مچھلیاں گم رہتی تھیں، تو اس طویل مدت میں جب تک کہ وہ سبت شکنی کے مرتکب رہے کیوں گم نہ ہو گئیں؟ (یعنی سبت کے دن کیوں گم ہوئیں؟))

ان بستی والوں میں سے ایک فریق اس عہد شکنی سے بیزار تھا ان کا خیال تھا کہ ہفتہ بھر میں صرف ایک دن شکار کا ناغہ کرنا کوئی دشواری[1] نہیں۔

دوسرے لوگ وہ تھے جن کا پیشہ ہی بحری شکار تھا — تیسری قسم کے لوگ وہ تھے، جو شکاریوں کے اس کاروبار پر راضی تھے۔ ان سے بخوشی مچھلیاں خریدتے تھے۔ جو عہد شکنی کر کے لائی جاتی تھیں۔ یہی لوگ تھے جو وعظ کہنے والوں کو روکتے تھے۔ وہ جواب دیتے تھے۔ امر بالمعروف اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ہم اللہ کے حضور اپنی معذرت کے لیے وعظ و نصیحت کرتے ہیں تا کہ ہم پر مداہنت یا سکوت عن الحق کا الزام نہ آئے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ نافرمان لوگ نافرمانی سے باز آ جائیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ ہلاک ہوں یا عذاب شدید میں گرفتار ہوں)

ترجمہ اور جب ان میں سے ایک جماعت نے (وعظ کہنے والوں سے کہا) کہ تم اس قوم کو وعظ کیوں کرتے ہو، جنہیں (تمہارے خیال میں) اللہ ہلاک کرنے یا سخت عذاب دینے والا ہے"! وہ بولے — "تمہارے

---

[1] جبکہ آج کل پاکستان میں ہفتہ میں دو دن گوشت کا ناغہ ہوتا ہے۔

رب کے حضور معذرت کے بلے (ہمارے لیے ایسا کرنا ضروری ہے) اور ممکن ہے کہ وہ (تائب ہوکر) متقی بن جائیں (ان کا ہلاک ہوجانا یا معذّب ہونا کوئی ضروری تو نہیں) جب انہوں نے تذکیر کو فراموش کردیا تو برائی سے روکنے والوں کو نجات ملی اور عہد شکن اپنے فسق کے سبب گرفتار عذاب ہوئے۔

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـٕیْنَ (الاعراف - ۱۶۶) پھر جب وہ (عذاب کے باوجود) جس کام سے روکے گئے تھے اس میں زیادہ سرکش ہوگئے (یہاں تک کہ انسانیت سے نکل گئے) تو ہم نے انہیں کہا (جاؤ) بنو ملعون بندر اور ہمیشہ ذلیل و خوار ہو جیسا کہ دائمی قانون چلا آرہا ہے) کما قال اللہ تعالیٰ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (النساء - ۴۷) اے لوگو! جن کو کتاب دی گئی ہے ایمان لاؤ ہمارے نازل کردہ (قرآن) پر جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اس سے پہلے کہ ہم تمہاری قوم کے (بڑوں (سرداروں) کو مٹا دیں پھر انہیں ان کی پیٹھوں (سابقہ ذلیل حالت) پر موڑ دیں وجوہ سے مراد وجوہ والے لوگ ہیں مثلاً - وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ (طٰہٰ ۱۱۱) وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍ نَّاضِرَةٌ (قیامۃ ۲۲) وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍ نَّاعِمَةٌ (غاشیہ - ۸) آیہ زیر تفسیر میں بقول راغب وجوھا سے مراد باوجاہت یا وجیہ و رئیس لوگ ہیں۔ یہاں وجوہ کے اعتبار سے ضمیر "ھا" لائی گئی ہے ان ہی اشخاص کے لحاظ سے "ھم" آگیا ہے۔ اسی رکوع کی آیات بالا میں ایسی تذکیر و تانیث کی متعدد مثالیں موجود ہیں) یا ہم ان پر (ویسی ہی) لعنت کریں۔ جیسی ہم نے ہفتہ والوں پر لعنت کی تھی۔ (اس آیت سے ثابت ہے کہ اصحاب سبت پر جو لعنت ہوئی تھی وہ ایک قدرتی فعل تھا، جو اب بھی اپنے موقع پر ہو سکتا ہے) خدا کا کام ہمیشہ اپنے موقع پر کیا جاتا رہا ہے (یعنی انسانی پیکر میں حیوانی خواص و عادات، بندر پن، سور پن وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں)

الست وبلیٰ

الست وبلیٰ کے متعلق عام عقیدہ یہ چلا آرہا ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا۔ پھر پشت میں داخل کیا۔ (شاہ عبدالقادرؒ زیر آیت الست بربکم) اس کا مطلب یہ ہے کہ آیت کا تعلق قدیم ترین عہد ماضی سے ہے اور یہ واقعہ بس ایک مرتبہ ہو چکا ــــ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ ماضی ایسا ہی ہے جیسے وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ ... وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ط (ق ۱۰ تا ۱۱) ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اتارا پھر اس سے باغ اگائے ..... اور مردہ شہر کو زندگی بخشی۔ یہ پانی ہمیشہ اترا رہتا ہے۔ مردہ زمینوں کو زندگی ملتی رہتی ہے ــــ قرآن میں ماضی کے ایسے حاوی بر مستقبل ہونے کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اسی طرح یہ بات ہے کہ اولاد آدم پیدا ہوتی رہتی ہے اور ان سے ربوبیت کا فطری اقرار بھی لیا جاتا ہے۔ اور لیا جاتا رہے گا۔ چنانچہ خواجہ صاحب لکھتے ہیں۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ج اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ط قَالُوْا بَلٰى ج شَهِدْنَا ج اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۔ (اعراف ۔ ۱۷۲) بلاشبہ انسانی فطرت ہی میں خدا کا ایمان موجود ہے۔ کسی بھی دوسری شخصیت کا ایمان ہرگز داخل فطرت نہیں۔ اس کے علاوہ اس پر بے شمار عقلی دلائل بھی موجود ہیں۔ خود انسان کی اپنی ہستی اس حقیقت کبریٰ کے لیے برہان قاطع ہے۔

فراموشت نہ کرد ایزد دراں حال   کہ بودی نطفۂ مدفون و مدہوش
روانت داد و عقل و فہم و ادراک   جمال و حسن و رائے و فکرت و ہوش
دہ انگشتت مرتب ساخت بر کف   دو بازویت مرتب کرد بر دوش
کنوں پنداری اے ناچیز ہمت!   کہ خواہد کردنت روزی فراموش!

حاصل یہ ہے کہ انسان اپنے حالات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ میرا پالنے والا میرا رب تعالیٰ خدائے واحد ہی ہے ــــ

اب ترجمہ آیت ملاحظہ فرمائیں۔

اور جب تیرے رب نے بنی آدم سے (یعنی) ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو اپنے آپ پر گواہ بنایا (ان

کی نظران کی اپنی ہستی پرڈال کر دکھلایا کہ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟ (میں نے آج تک تم سب کی پرورش نہیں کی ؟) تو انہوں نے (ہر دفعہ یہی) کہا کہ کیوں نہیں ؟ (تو ہی ہمارا رب ہے، یہ ہم زبان ہی سے نہیں کہتے بلکہ) ہم نے مشاہدہ کر لیا ہے (ہم اس کے شاہد ہیں۔ یہ دلیل خدا نے فطری طور پر تم میں رکھ دی ہے) تاکہ تم پیشی کے دن نہ کہو کہ ہم اس سے غافل تھے۔

مسیح اور الست

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسل آدمؑ کی بقا کا قانون یہی ہے کہ ہمیشہ مردوں (ذکور) ہی کی پیٹھ سے ان کی اولاد نکال جاتی ہے۔ کیا مسیحؑ اس فطری قانون سے خارج تھے اور "الست بربکم" کے مخاطبین میں داخل نہیں تھے۔؟

غزوات میں فرشتوں کی مدد

بعض غزوات میں فرشتوں کی مدد کا ذکر آیا ہے۔ اس کے متعلق ہمارے مفسرین کرام کہتے ہیں کہ (بشارت دی گئی کہ) ......

"فرشتے بھیج دیئے جائیں گے جن کی خاص علامتیں ہوں گی اور ان کے گھوڑوں[1] پر بھی خاص نشان ہوں گے۔" (تفسیر آیت ۱۲۴۔ آل عمران عثمانیؒ)

"...... بدر میں ملائکہ کو لوگ آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان کے مارے ہوئے کفار کو آدمیوں کے قتل کئے ہوئے کفار سے الگ شناخت کرتے تھے۔"

حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی کمک پر شاہی فوج کے دستے جبریل و میکائیل کی کمانڈ میں یہ کہہ کر بھیجے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں.... تم مسلمانوں کے ساتھ ہو کر ان ظالموں کی گردنیں مارو اور پور پور کاٹ ڈالو۔" (تفسیر آیت ۱۲ تا ۱۴۔ انفال۔ عثمانیؒ)

اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے گھوڑوں پر سوار باقاعدہ انسانی سپاہ کی طرح دشمن کو قتل کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ خواجہ صاحب فرشتوں کے دکھائی دینے سے انکار کرتے ہیں۔ آیات کے الفاظ میں گھوڑوں کا کوئی ذکر نہیں نہ ہی فرشتوں کا مرئی ہونا واضح ہوتا ہے۔ اوپر آپ "ضیفِ ابراہیم" کے ذکر میں مطالعہ کر چکے ہیں ۔۔ اب متعلقہ آیات کا ترجمہ و تفسیر دیکھئے۔

تمہید

".... عاجزی کے وقتوں میں مظلوم خدا پرستوں کی اندرونی قوتیں جوش میں آجایا کرتی ہیں۔ جس قدر ان میں (تعداد کی) کمی ہوتی ہے اتنا ہی زور ان میں پیدا کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر وہ بے سرو سامان مظلوم صرف تین سو ہوتے ہیں اور باسامان حملہ آور تیرہ سو[۳] ہوں تو ایک ہزار کی کمی اس طرح پوری کی جاتی ہے کہ ملائکہ بحکم خدا ان کی باطنی قوتوں کو حرکت میں لاتے ہیں فتح کی بشارتوں سے ان کے دلوں میں اطمینان پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ صبر و تقویٰ اور نظم و ضبط سے مدافعت کرتے اور اللہ کی مدد سے فتح یاب ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ہزار فرشتوں کی مدد کہلاتی ہے۔

رنگا رنگ بشارتوں اور طرح طرح کی باطنی قوتوں کو کام میں لانے کے لیے ان کی مناسبت سے ملائکہ میں بھی تعدد کی ضرورت ہے۔ اگر مومن سات سو ہوں اور ظلم پیشہ حملہ آور سینتیس[۳] سو سے زیادہ تو اسی قاعدے کے مطابق کمزوران کو خدا تعالیٰ کے فضل کی امید

---

[1] مُسَوِّمٖ بکسر واو مُسَوَّمَہ سے فاعل ہے۔ نشان لگانے والا۔ لیکن ہمارے مترجمین نے اس کو مفعول بنا لیا ہے اور اس میں گھوڑا اپنی طرف سے داخل کر کے مُسَوَّمِین (بصیغہ جمع) معنی کئے ہیں۔ نشان دار یا نشان زدہ گھوڑے۔ جہاں جہاں یہ لفظ مفعول آیا ہے وہاں بفتح واو آیا ہے مثلاً (الخیل المُسَوَّمَۃِ (آل عمران ۔۱۴) مُسَوَّمَۃً عِندَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ (۳۴)

دلا سکتا ہے کہ "صبر و تقویٰ اور نظم و اتحاد سے بنیان مرصوص کی طرح پیش قدمی کرو! کیا خدا تعالیٰ تمہارے لیے کافی نہیں کہ تین ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرے! اگر حملہ آوروں میں مختلف اقوام کی مدد سے اضافہ ہوتا رہے۔ اور تم صبر و تقویٰ پر قائم رہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں پانچ ہزار فرشتوں کی مدد دے گا۔ اور تمہاری کمی کی بخوبی تلافی کر دے گا۔

فرشتوں کی یہ مدد اس لیے نہیں آتی کہ فرشتے خود آکر آدمیوں کی طرح جنگ کریں اور تلوار چلائیں ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کے نزول کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مظلوموں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے بشارتیں دیتے اور ان کے دلوں میں اطمینان بھر دیتے ہیں۔ دراصل مدد تو صرف اللہ عزیز و حکیم ہی کی طرف سے آتی ہے۔ ملائکہ کا اس میں اپنا کچھ دخل و اختیار نہیں ہوتا ——

لیکن اگر کسی وقت مظلوم لوگ اجتماعی نظام کی پابندی سے غافل ہو جائیں تو وہ رسول کی موجودگی میں بھی بہت زیادہ مصائب کا شکار ہو جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اختیار مطلق خدائے واحد کے سوا کسی بزرگ ہستی کو بھی حاصل نہیں اخلاق، روحانی یا مادی قوانین و اسباب کی خلاف ورزی کا نتیجہ وہی ہوتا ہے۔ جو اللہ نے ہمیشہ سے مقرر کر رکھا ہے۔ اس میں کسی کی رو رعایت نہیں (منزل اول ۴۰۰ و ۴۰۱)۔ إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنزَلِينَ ۝ بَلَىٰ ۚ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم بِهِ ۗ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ (آل عمران - ۱۲۴ تا ۱۲۶)

(اے پیغمبر!) جب تو (مومنوں کو مورچوں پر قائم کر کے، اللہ تعالیٰ کے فضل کا امیدوار بنانے کے لیے) کہتا تھا کہ "کیا تمہارا پروردگار کافی نہیں ہے کہ تمہاری تین ہزار فرشتوں سے مدد کرے (جو حاجزوں کی کمی کو پورا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے) اتارے جاتے ہیں؟

کیوں نہیں، اگر تم ٹکے رہو گے اور (خدا سے) ڈرو گے اور (یہ) دشمن تم پر ایسے ہی جوش سے چڑھتے آئیں گے، تو تمہارا پروردگار تمہاری پانچ ہزار فرشتوں سے مدد کرے گا، جو نشان لگانے والے (یعنی ثابت قدموں کو بزدلوں سے الگ کرنے والے) ہوں گے۔

اور خدا نے اس (فرشتوں کی مدد) کو صرف اس لیے بنایا ہے کہ تمہیں بشارتیں ملیں اور تمہارے دل ان سے آرام پائیں اور مدد تو صرف اللہ عزیز و حکیم کے حضور سے آتی ہے ...... لغات منزل اول ص ۱۱۵ و ۱۱۲

دوسرے مقام پہ ملائکہ کی امداد کا ذکر ——

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (الانفال - ۹ تا ۱۰) (مسلمان حملہ آور کفار کے ساز و سامان دیکھ کر گھبرا اٹھے اور فریادی ہوئے جیسا کہ ارشاد ہے) جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے۔ سو اس نے

---

[1] یہ غزوہ احد کا واقعہ ہے۔ دیکھو آل عمران رکوع ۱۴۔

تمہاری (فریاد) قبول کی کہ میں پے در پے آنے والے ہزار فرشتوں (کارکنان قدرت) کے ساتھ تمہاری مدد کرنے والا ہوں (یہ وعدہ مسلمانوں کے ساتھ ہوا تھا۔ ان کے اچھے کاموں کی قرآن میں تصدیق کی گئی ہے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ یہ الہامی وعدہ بھی قرآن میں محفوظ کر لیا جائے۔ بلاشبہ قرآن دمی کے لحاظ سے مکمل ہے — فرشتے ہمیشہ نیکوکاروں کو خوش خبری دینے اور غم دور کرنے کے لیے نازل ہوتے رہتے ہیں؛

تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا.... نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔

ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ مت ڈرو اور نہ غم کھاؤ.... ہم تمہارے رفیق ہیں دنیا اور آخرت میں۔ (حم السجدہ ۳۰)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں بھی مومنوں کے مددگار بنتے ہیں۔ لیکن مدد ایسی نہیں کہ ہتھیار اٹھائیں اور دشمنوں کی گردنیں کاٹیں۔ ان کا کام خوش خبری دینا اور مومنوں کے دلوں کو مطمئن رکھنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

اللہ نے (فرشتوں کی) اس امداد کو صرف خوش خبری دینے کے لیے بنایا ہے اور اس لیے کہ اس سے تمہارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو اور مدد اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ بلاشبہ اللہ غالب حکمت والا ہے —

فرشتوں کی طرف وحی

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (الانفال-۱۲)

(آیات بالا میں مذکورہ واقعات اس وقت ہوئے) جب تیرا رب فرشتوں (کارکنانِ قدرت) کو وحی کرتا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ ہوں۔ تم ایمانداروں کو ثابت قدم رکھو (اے مومنو!) میں ابھی کافروں کے دلوں میں رعب ڈالتا ہوں۔ پس تم ان کی گردنوں پر مارو (جب ان کا زور توڑ چکو تو) ان کی انگلیوں کے ہر پور پہ مارو (تاکہ ان کے ہاتھ کام کرنے سے رہ جائیں) منزل دوم صفحہ ۲۱۲، ۲۱۳)

عام طور پہ یہی سمجھا گیا ہے کہ ضرب (مارنے) کا حکم فرشتوں کی طرف وحی میں داخل ہے۔ خواجہ صاحب نے اس کو الگ کر کے مومنوں کو اس کا مخاطب بنایا ہے۔ اس موقع پر مولوی محمد علی لکھتے ہیں۔ "ملائکہ کو حکم تھا کہ مسلمانوں کو ثابت قدم رکھیں۔ اور ملائکہ کا تعلق چونکہ قلوب سے ہوتا ہے اس لیے ان کا ثابت قدم رکھنا اسی طرح پر تھا۔ جیسا کہ زجاج نے بھی لکھا ہے کہ "ان کے دلوں میں القا کریں جس سے ان کا عزم پختہ ہو اور ان کی کوشش مضبوط ہو — "سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ" والا فقرہ الگ ہے جس میں مسلمانوں کو خطاب ہے کہ تم کفار کو مارو۔ یہ ملائکہ کی وحی میں داخل نہیں ...... الخ (ص ۵۵۰)۔

("بیان القرآن"، جلد اوّل طبع ثانی ۱۹۶۹ء)

امام رازی بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں (فاضربوا فوق الاعناق) فیہ وجهان: الاول: انه امر للملائكة متصل بقوله تعالى (فثبتوا) وقيل: بل امر للمومنين وهذا هو الاصح لما بيّنا انه تعالى ما انزل الملائكة

لاجل المقاتلہ والمحاربہ واعلم انہ تعالیٰ لما بین انہ حصل فی حق المسلمین جمیع موجبات النصر والظفر فعند ھذا امرھم بمحاربتھم۔۔۔۔ (التفسیر الکبیر الجزء الخامس عشر۔ طبع بالمطبعۃ البھیۃ المصریہ ۱۳۵۷ھ)

اس آیت (فاضربوا) کے مخاطب دو سمجھے گئے ہیں۔ اول فرشتے۔ دوم مومن اور یہی صحیح ترین ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو قتل و حرب کے لیے نازل نہیں فرمایا پہلے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ مسلمانوں کے لیے فتح و نصرت کے اسباب مہیا کر دیئے گئے پھر ان کو جنگ کا حکم دیا۔

وما رمیت

غالب نے ایک بہت بڑی حقیقت کو ایک شعر میں سمیٹ لیا ہے۔

نقش پئے رفتگاں جادہ بود درہ جہاں　　　ہر کہ وِدو بایدش پاسِ قدم داشتن

رہروؤں کے نقشِ قدم دنیا میں پگڈنڈی بن جاتے ہیں۔ اس لیے ہر رہرو کو اپنے قدم کا پاس رکھنا چاہیئے۔ کیوں کہ اس کی غلط روی بعد والے تمام قافلوں کی گمراہی کا سبب بن سکتی ہے ——— بقول اقبال انسانوں میں حسینؑ اور کتابوں میں قرآن مجید سب سے زیادہ مظلوم ہیں۔ اس کتاب پاک کے ساتھ غیروں سے زیادہ اپنوں نے دانستہ اور نادانستہ وہ ظلم کئے ہیں کہ قرطاس وقلم ان کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ انہی بے شمار مظالم میں سے ایک ظلم عظیم ان الفاظ (وما رمیت) کے ساتھ ہوا ہے اور ہمارے بڑے بڑے محقق کسی غیر معلوم ظالم اوّل کی ہاں میں ہاں ملاتے چلے آرہے ہیں۔ اس سے ثابت کیا جارہا ہے کہ رسولِ خدا (معاذ اللہ) خود ہی جامہ بشری میں خدا تھے جو میدانِ جنگ میں کفار سے برسرِ پیکار تھے۔ آہستہ آہستہ اس بیج سے ایک تناور درخت بنا۔ یعنی جب ایک بشر کو خدا مان لیا گیا۔ تو اس کو وسعت دے کر "ہمہ اوست" کی عمارت کھڑی کر دی گئی۔ اور کلمہ طیبہ کی "اصلاح" یوں کی گئی کہ "لا الٰہ الا اللہ" کا حقیقی مطلب "لا موجود الا اللہ" ہے ——— اصل واقعہ یہ ہے۔

جنگِ بدر کا ذکر چل رہا ہے۔ مسلمان تھوڑے اور بے سامان ہیں۔ کفار بہت زیادہ اور بہت باسامان ——— مسلمان مقابلے سے کتراتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ذریعے ان کے حوصلے بلند کئے اور فتح مند کیا ——— اس ضمن میں فرمایا۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (الانفال ۱۷) خواجہ صاحب اس کا ترجمہ وتفسیر لکھتے ہیں:

(مسلمانو! تم اپنی طرف سے بھاگنے پر آمادہ تھے) سو تم نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا۔ لیکن اللہ نے انہیں قتل کیا (ظالم کفار ڈرنے والے مومنوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ مومنوں میں یہ قوت نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا اللہ کی مدد سے ہوا۔ تو حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا خوف زدہ مومنوں کے ہاتھ کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہے تھے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ مومن خدا بن گئے وہ لوگ عجیب ہیں جو ایسی آیتوں سے "ہمہ اوست" کے باطل مسئلے کو ثابت کرتے ہیں۔ کبھی تو مخلوقات کو "ممکن" بلکہ "عدم محض" قرار دیتے ہیں۔ پھر اسی عدم محض کو واجب الوجود اور عین ذات بنا دیتے ہیں۔ افسوس ——— آگے فرمایا) جب تو نے تیر پھینکے تو تُو نے نہیں پھینکے، لیکن اللہ نے پھینکے (جنگ میں تیز ہوا چلنے لگی جو مومنوں کو پیچھے سے آتی تھی اور ظالموں کی آنکھوں پر حملہ کرتی تھی۔ ظالم ٹھیک طرح نشانہ نہیں لگا سکتے تھے۔ لیکن تیز ہوا رسول کریم کے تیروں یا کنکروں کو ٹھیک ہدف پر لے جاتی تھی۔ اس الٰہی مدد سے کیا عاجز رسولؐ خود خدا

بن گئے (حیف! صد حیف!!) اور یہ مدد اللہ کی طرف سے ہوئی تاکہ وہ مومنوں کو اپنی طرف سے اچھا انعام دے (اور عمدہ آزمائش میں ڈالے۔ لوگ اللہ تعالیٰ کی ایسی امداد کا خیال نہیں کرتے اور توکل سے دور نکل جاتے ہیں۔ ایسا کرنا ہرگز مناسب نہیں) بلاشبہ سننے والا جاننے والا ہے (وہ مدد کرنے کے وقتوں اور طریقوں کو خوب جانتا ہے) منزل دوم۔ صفحہ ۲۱۵

صاحب کشاف نے (فلم تقتلوھم) کے متعلق کہا ہے "جواب شرط محذوف تقدیرہٗ، ان افتخر تم بقتلھم فانتم لم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم"۔ یہ شرط محذوف کا جواب ہے۔ اگر تم قتل کفار پر فخر کرتے ہو تو سنو تم نے قتل نہیں کیا۔ لیکن اللہ نے ان کو قتل کیا (وما رمیت ..... الخ) مٹھی بھر کنکریاں جو تو نے پھینکی تھیں ما رمیتھا فی الحقیقۃ اصل میں تو نے نہیں پھینکیں ..... ولکن اللہ رمی حیث نفذ اجزاء ذالک التراب واوصلھا الی عیونھم۔ لیکن اللہ نے پھینکی تھیں اس لیے کہ کفار کی آنکھوں تک ان کو اللہ نے پہنچایا تھا۔ فصورۃ الرمیۃ صدرت من الرسول ؐ واثرھا انما صدر من اللہ۔ بظاہر رسول ؐ کا فعل تھا پھینکنا۔ اور اس کا اثر اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر ہوا، فلھذا بمعنی صحیح فیہ النفی والاثبات اس معنی میں نفی واثبات دونوں صحیح ثابت ہوئیں۔ التفسیر الکبیر۔ الجزء الخامس عشر ص ۱۳۹۔

قدرتی ماہ و سال

مختلف اقوامِ عالم میں قمری اور شمسی سنہ مروج چلے آ رہے ہیں، مسلمانوں میں قمری حساب مروج ہے، لیکن اسلامی مہینوں کے ناموں پر غور کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا آغاز بھی موسموں کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا تھا اور یہ بات دلیل ہے اس کی کہ یہ شمسی سال کے مہینے تھے۔ مثلاً ربیع الاول، ربیع الآخر لازماً موسم بہار میں آتے ہوں گے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ کبھی سرما میں اور کبھی گرما میں اور کبھی واقعی فصلِ بہار میں۔ اسی طرح جمادی الاول اور جمادی الآخر یقیناً انجماد یعنی سخت سردی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اب انہیں سخت گرمی میں آنے سے کوئی روک نہیں سکتا وقس علیٰ ہذا۔ یہ موضوع تحقیق طلب ہے کہ ایسا الٹ پھیر کیوں ہوا اور کب ہوا؟ بعض لوگوں نے اپنے مختصر کتابچوں میں اس پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اہلِ علم و تحقیق کو سنجیدگی سے اس موضوع پر غور و فکر کرنا چاہیے۔ اس مسئلے کے طے ہو جانے سے ہماری بہت سی مشکلات جو موسمیاتی تذبذب و تلوّن کی وجہ سے پیدا ہوتی رہتی ہیں، حل ہو جائیں گی۔ خواجہ صاحب اپنے خطبات میں اس پر تفصیلی اور ماہرانہ گفتگو فرمایا کرتے تھے، لیکن تفسیر میں اشارت سے آگے نہیں بڑھے۔ چنانچہ متعلقہ آیت کا تشریحی ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (توبہ-۳۶) جس دن اس (خدا) نے (زمین سے متعلقہ) سماوات کو اور خود زمین کو پیدا کیا ہے (تب سے) اللہ کی کتاب (صحیفہ فطرت) میں مہینوں کی گنتی بلاشبہ بارہ رہی ہے (دوازدہ بروج اس سے پہلے موجود تھے۔ زمین منطقۃ البروج میں سفر کرتی چلی آئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مہینے فصلی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی جن سالوں[1] کا ذکر کیا تھا وہ بھی فصلی تھے۔ قمری مہینہ تو قدرتی ہو سکتا ہے۔ لیکن قمری سال قدرتی نہیں۔ آگے فرمایا) ان (بارہ مہینوں) میں سے چار حرمت والے مہینے (مسلسل) ہیں۔ یہ حساب پکا ہے پس ان میں (جائز لڑائی کی ابتدا کر کے بھی) اپنی جانوں پر ظلم مت کرو اور (اگر یہ مشرک ان مہینوں میں تم پر حملہ آور ہوں تو) ان مشرکوں سے ہر حال میں لڑو جس طرح یہ تم سے ہر حال میں لڑتے ہیں ..... الخ

خواجہ صاحب نے "الدین القیم" کے معنی کیے ہیں "حساب پکا"، اس کی تائید تفسیر کبیر رازی سے ہوتی ہے، ان الدین

---

[1] بادشاہ کے خواب کی تعبیر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا (یوسف-۴۷) تم سات برس جم کر کھیتی کرو گے ـــــ یہ سات برس یقیناً موسموں فصلوں اور کھیتی باڑی کے مقررہ اوقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو شمسی ہی ہو سکتے ہیں۔

قد یراد به الحساب۔ یقال ایکس من دان نفسه ای حاسبها۔ والقیم معناه المستقیم۔ فتفسیر الآیة علی هذا التقدیر۔ ذالك الحساب المستقیم الصحیح والعدل المستوفی ..لا یغیر ولا یبدل ......الدائم الذی لا یزول۔ دین سے کبھی حساب مراد لی جاتی ہے۔ " دان نفسه "، کے معنی ہیں، اپنے نفس کا حساب کیا۔ قیم کے معنی ہیں پکا، ٹھیک درست۔ آیت کے معنی ہوئے " پکا حساب " اور " کامل عدل " جس میں کوئی تبدیلی نہیں۔ جو ہمیشہ اٹل رہے جو لوگ یہاں دین کے معنی عبادت کرتے ہیں، رازی نے ان سے اختلاف کیا ہے فلم یکن حمل هذا اللفظ علی التعبد اولیٰ من حمله علی الحساب۔ یہاں حساب کو چھوڑ کر عبادت کہنا درست نہیں (الجزء سادس عشر ص ۵۳)

دائمی عذاب

کفار و مشرکین کے متعلق عام عقیدہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ عذاب دوزخ میں گرفتار رہیں گے ـــــ علامہ عثمانی رح فرماتے ہیں۔
"...... وہ (خدا) چاہ چکا ہے کہ کفار و مشرکین کا عذاب اور اہل جنت کا ثواب کبھی موقوف نہ ہوگا۔ چنانچہ فرمادیا۔ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (البقرہ رکوع ۲۰) يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا (مائدہ رکوع ۶) اور لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (بقرہ رکوع ۱۹) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (نساء رکوع ۱۸) یعنی وہ آگ سے نکلنا چاہیں گے لیکن نہیں نکلیں گے۔ ان کا عذاب کم نہیں ہوگا۔ مشرک کے لیے بخشش نہیں ہے۔ اسی پہ تمام اہل اسلام کا اجماع رہا ہے" جو لوگ اس "اجماع" کے خلاف ہیں ان کو حضرت عثمانی نے "کوتاہ نظر و بدفہم" قرار دیا ہے۔ خواجہ صاحب ان کے بقول اسی زمرے میں شامل ہیں ــــ امام رازی نے اس پہ قدرے مفصل کلام کیا ہے۔ اور دائمی و غیر دائمی والوں کے دلائل نقل کر دیئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کے دائمی ہونے پر اجماع کا دعوی محل نظر ہے۔ قدیم زمانے ہی سے اس کے مخالف بھی چلے آئے ہیں۔ جیسا کہ امام صاحب لکھتے ہیں۔ قال قوم ان عذاب الكفار منقطع وَلَهَا نهاية ص۶۳ الجزالثامن عشر ایک جماعت کا قول ہے کہ کفار کا عذاب ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہے گا۔ ا۔ ان معصية الكافر متناهية ومقابلة الجرم المتناهى بعقاب لانهاية له ظلم وانه لا يجوز۔ کافر کی نافرمانی کی ایک حد ہے۔ اور محدود جرم کی سزا غیر محدود ظلم ہے جو کسی طرح جائز نہیں ـــــ ذلك العقاب ضرر خال عن النفع فيكون قبيحا ...... دائمی عذاب تو ایک ضرر ہی ضرر ہے۔ جس میں کوئی نفع نہیں۔ اور یہ محض برائی ہی برائی ہے (ایضاً)

تفسیر خواجہ

جن آیات سے دائمی عذاب ثابت کیا جاتا ہے۔ خواجہ ان کا ترجمہ حسب ذیل کرتے ہیں۔ مَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (بقرہ ۱۶۷) وہ بغیر پورا عذاب پانے کے نجات نہیں حاصل کریں گے۔ (منزل اول ص۳۰۱)
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (نساء ۱۱۶) بلاشبہ اللہ اس بات کو پوری سزا کے بغیر نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے (منزل اول ص۶۲۲) خَالِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (بقرہ ۱۶۳) وہ اس (لعنت) میں رہ پڑنے والے ہیں ان سے ان کا عذاب (جو ان کے لیے مقرر ہے) کم نہیں کیا جاتا اور نہ ہی انہیں ڈھیل دی جاتی ہے (منزل اول ۲۹۸) ــــ اس کے علاوہ بہت سی مثبت آیات بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً: جو لوگ لقائے الٰہی کی امید نہیں رکھتے، دنیا کی زندگی پر رجھ بیٹھے ہیں، آیات الٰہی سے غافل ہیں اُولٰئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (یونس - ۸) ان کی جائے پناہ آگ ہے۔ اس سبب سے جو کسب کرتے تھے (جائے پناہ سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہنم ایک ہسپتال ہے، حقیقت میں

وہ بھی رحمت ہی کا ایک نشان ہے۔ نیکوں اور بدوں کو عطائے الٰہی ہی سے مدد ملتی ہے۔ عطائے الٰہی کبھی منقطع نہیں ہوتی) (منزل سوم ص۵) قوسین کے آخری الفاظ آیۂ ذیل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (بنی اسرائیل ۲۰) دوزخیوں اور بہشتیوں کا ذکر چلا آرہا ہے) ان (جنتیوں) میں سے اور ان (جہنمیوں) میں سے ہر ایک کی ہم اپنی عطا کے ساتھ مدد کرتے ہیں اور تیرے رب کی عطا کبھی نہیں رکی جاتی (اس سے معلوم ہوا کہ جہنمیوں کی بھی عذاب کے ذریعہ سے اصلاح ہی ہوتی ہے اور یہ بھی خدا کی عطا ہی ہے۔ (منزل چہارم ۲۷) ـــــ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (اعراف ۱۵۶) میرا عذاب میں جسے مناسب دیکھتا ہوں پہنچاتا ہوں۔ اور میری رحمت نے تمام چیزوں کو سما لیا ہے (منزل دوم ص۲۴۲) (شیطان بھی اس سے باہر نہیں رہ سکتا۔

اگر در دہد یک صلاے کرم ‍ ‍ ‍ ‍ عزازیل گوید نصیبے برم

دوزخ بھی تو ایک شے ہے۔ وہ رحمت سے باہر کیونکر ہو سکتی ہے؟

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ (قارعہ ص۹/۸) ولیکن جس کے تول ہلکے ہوئے (اس نے بے وزن اور بے دلیل، مقلدانہ عمل کئے اسلئے دلیل باتیں ہی بے وزن ہوتی ہیں) تو اس کی ماں ھاویہ ہے (جہنم ایک ہسپتال ہے جو ماں کی طرح علاج کرنے والا ہے (منزل ہفتم۔ ص۲۹۷)

مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِیَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ (حدید ۱۰) (کفار مخاطب ہیں) تمہاری جائے پناہ آگ ہے، وہی (آگ) تمہاری مددگار ہے، اور بری جگہ (اس سے معلوم ہوا کہ جہنمیوں کو اگر کوئی اور پناہ ملے گی تو آگ کے ذریعہ ہی سے ملے گی) منزل ہفتم ۴، سورہ الرحمٰن کی وہ آیات جن میں عذاب کا ذکر آیا ہے۔ ان کی تمہید میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں۔

"جہنم میں لوگ کسی کینہ کشی کے لئے داخل نہیں کئے جاتے۔ جہنم ایک ہسپتال ہے، وہاں مجرموں کا علاج ہوتا ہے۔ پس جہنم بھی رحمت الٰہی کا ایک نقشہ ہے۔ اسی لیے جہنم کے عذابوں کے ساتھ بھی فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ سات دفعہ اسی طرح آیا ہے جس طرح جنت کی نعمتوں کے ساتھ لایا گیا ہے ...... مصیبت تو محض اصلاح کے لیے لائی جاتی ہے، ورنہ اصل رحمت ہی رحمت ہے۔ منزل ہفتم ص۳۹"

پیر مہر علی شاہ جو صاحب تصانیف اور اپنے دور کے جلیل القدر علماء میں تھے، مؤلف نے ان کی کسی تصنیف (غالباً ملفوظات) میں دیکھا ہے کہ وہ آیۂ ذیل سے استدلال کرتے ہیں: فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (الشراح ۵ و ۶) تحقیق مشکل کے ساتھ آسانی ہے، تحقیق مشکل کے ساتھ آسانی ہے ـــــ دوزخ بھی ایک مشکل ہے اس قانون کے مطابق اس کے ساتھ بھی آسانی بلکہ ایک مشکل کے ساتھ دو آسانیاں آنی چاہئیں جیسا کہ حدیث میں ہے "لن یغلب عسر یسرین" العسر معرف باللام ہے اور یسر نکرہ ہے، یعنی عسر تو ایک ہی ہے اور اس کے ساتھ یسر دو آتے ہیں۔ بہر حال بقول رومیؒ

"ہیچ ہرگز گریہ آخر خندہ ایست"

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ...الخ

سورۂ نور کی آیت ۲۶ کا عام ترجمہ یہ کیا گیا ہے:۔

گندی عورتیں ہیں گندے مردوں کے لیے اور گندے مرد ہیں گندی عورتوں کے لیے۔ اور ستھری عورتیں ہیں ستھرے مردوں کے لیے اور ستھرے مرد ہیں ستھری عورتوں کے لیے (شیخ الہند) یعنی بدکار اور گندی عورتیں گندے اور بدکار مردوں کے لائق ہیں ..... الخ (حضرت عثمانیؒ)

اس میں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اکثر دیکھا جاتا ہے۔ نیک بیویوں کے شوہر بد ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض نبیوں تک (نوحؑ و لوطؑ) کی بیویوں کے خائنہ اور جہنمی ہونے کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے اور اس کے ساتھ ہی فرعون جیسے اشقی کی نیک بیوی کی تعریف بھی کی گئی ہے۔ اس کا حل خواجہ صاحب پیش کرتے ہیں ـــــ

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ج وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ج اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (النور۔ ۲۶) خبیث عورتیں (یعنی زانیہ و مشرکہ) خبیث مردوں کے لیے ہی سجتی ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے ہی لائق ہیں (کبھی کبھی نبیوں تک کے پلّے میں بھی خائنہ عورتیں پڑ جاتی تھیں۔ لیکن یہ بات شایاں نہ تھی) اور طیب (یعنی عفت و صلاحیت والی) عورتیں طیب مردوں کے لیے مناسب ہیں اور طیب مرد طیب عورتوں کے لیے شایاں ہیں۔ یہ (لوگ یعنی طیبات و طیبین) اس سے بری ہیں جو لوگ (ان کے متعلق) بکتے ہیں۔ ان کے لیے بخشش اور عزت کی روزی ہے۔ (ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان دار مرد اور عورت کے لیے لائق ہے کہ رشتے ناطے ایسے لوگوں سے کریں، جو با اخلاق اور قابل اعتبار ہوں اور معاملے کے ٹھیک ہوں۔ قوموں کی بہتری کی بنیاد نیکی اور راستی پر ہی ہے) منزل چہارم صفحہ ۲۲۵۔

نوح علیہ السلام کے ذکر میں ضمناً اس آیت پر بھی کچھ گفتگو کی گئی ہے۔ وہ بھی دیکھ لیجیے۔ جب آپ اپنے بیٹے کے متعلق "وعدالحق" کا ذکر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملتا ہے۔ "اے نوح وہ (بیٹا) تیرے اہل سے نہیں ہے۔ وہ ایک ناجائز کارروائی ہے (عمل غیر صالح) پس تو مجھ سے وہ بات مت پوچھ جس کا جاننا تیرے لیے مناسب نہیں ہے۔ بلاشبہ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں سے نہ بن (اس بات کی جب کہ موقع گزر جائے، تفتیش کرنا کہ یہ بدفعل کس طرح پیدا ہوا! نادانی کا کام ہے) نوح نے کہا اے میرے پروردگار! بلاشبہ میں اس بات سے تیری پناہ میں آتا ہوں کہ میں تجھ سے اس بات کا سوال کروں، جس کا علم میرے لیے مناسب نہیں اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے، تو میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤں گا (ہود۔ ۴۶ و ۴۷)

سوال اسی چیز کا کیا جاتا ہے، جس کا علم نہ ہو۔ لیکن یہ معاملہ ایسا تھا، جس کا جاننا نامناسب اور بے موقع تھا۔ جب حضرت نوحؑ کو معلوم ہوا کہ یہ لڑکا ایک ناجائز کارروائی ہے، تو قطعاً ایسا خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کی تفصیل معلوم کی جائے اور پتا لگایا جائے کہ یہ کام کب اور کس طرح ہوا..... ظاہر ہے کہ اس وقت ایسا سوال کرنا یقیناً نامناسب تھا۔ حضرت نوحؑ کی بیوی خائنہ تھی۔ (تحریم-۱۰) خیانت امانات وحقوق میں کی جاتی ہے۔ یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (انفال-۲۷) مسلمانو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور آپس کی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو جان بوجھ کر۔

حضرت نوحؑ کی بیوی صرف کافرہ ہی نہ تھی بلکہ خائنہ بھی تھی۔ اگر رسول کی بیوی سے "فاحشہ مبینہ" کا سرزد ہونا محال ہے، تو اللہ تعالیٰ کیوں فرماتا ہے۔

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ یُّضٰعَفْ لَھَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ ط وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرًا (احزاب-۳) اے نبی کی عورتو! جو کوئی کرلائے تم میں کام بے حیائی کا صریح دونا ہو اس کو عذاب دوہرا، اور ہے یہ اللہ پر آسان (شیخ الہند) بڑے کی غلطی بھی بڑی ہوتی ہے اگر بالفرض تم میں سے کسی سے کوئی بداخلاقی کا کام ہو جائے تو جو سزا اور دوں کو اس کام پر ملتی ہے اس سے دگنی ملے گی۔ اور اللہ پر آسان ہے یعنی تمہاری وجاہت اور نسبت زوجیت سزا دینے سے اللہ کو روک نہیں سکتی۔ (حضرت عثمانیؒ)

الخبیثات للخبیثین (نور-۲۶) کے معنی یہ ہیں کہ خبیث باتیں خبیث شخصوں کے لائق ہیں اور خبیث لوگ خبیث باتوں کے شایان۔ اگر خبیثات اور طیبات سے مراد عورتیں ہیں تو بھی اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لائق ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے سزاوار ہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ طیب لوگ سوچ سمجھ کر طیبات سے نکاح کریں۔ اور طیبہ عورتوں کے لیے مناسب ہے کہ طیب مردوں کو نکاح کے لیے پسند کریں۔ اس سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی کہ طیب مردوں کے گھر میں خبیث عورتیں نہیں ہو سکتیں۔ کیا ہر طیبہ عورت کا خاوند ضرور ہی زنا سے باز رہے گا۔ کیا اس آیت میں خبیثات اور طیبات سے مراد عام عورتیں نہیں ہیں! یا کیا طیبات سے وہی عورتیں مراد ہیں جنہیں نبیہ سمجھنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کی بیوی کی اس خیانت کو لوگوں سے چھپائے رکھا۔ اگر اس معاملے کی کوئی شہرت ہوتی تو یہ بات طوفان آنے کے بعد تک نوحؑ پر پوشیدہ نہ رہتی۔ منزل سوم صفحہ ۶۸/۶۷۔

کِدنا لیوسف

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاۗءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَاۗءِ اَخِيْهِ ۭ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۭ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ .... مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (یوسف-۷۶)

سو اس (یوسف) نے اپنے حقیقی بھائی کی بوری سے پہلے ان (دوسرے بھائیوں) کی بوریوں کو دیکھنا شروع کیا، پھر اس نے اپنے عینی بھائی کی بوری سے (گم شدہ شاہی پیالہ) نکالا۔ اس طرح ہم (خدا) نے یوسف کے لیے اس تجویز[1] کو چلنے دیا (کِدْنَا)۔ (اگر وہ بھائی یہ کہہ دیتے کہ "تم اپنے ملک مصر کے مطابق سزا دینا" تو یوسف کی یہ تجویز بے نتیجہ ہو جاتی۔ شاہی قانون میں چور کی سزا مار پیٹ یا جرمانہ ہوگی۔ لہٰذا یوسف کے لیے) ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی کو بادشاہِ مصر کے قانون کے مطابق گرفتار کر لے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا (اور صبر کیا جاتا اور اس پر بھروسہ قائم رکھا جاتا تو ایسا ہو سکتا تھا) ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہوتا ہے (اس آیت سے سورج کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ وحی الٰہی کے علاوہ غیر وحی امور میں غیر نبی بھی نبی سے زیادہ عالم ہو سکتا ہے[2])

---

[1] کِدْنَا "کید" سے ہے۔ اس کے متعلق ائمہ لغت کی تصریح ہے کہ اس کا استعمال اچھائی اور برائی دونوں پر ہوتا ہے۔ قد یکون مذموماً و ممدوحاً۔ راغب اصفہانی اس کے لیے مثالیں بھی دی ہیں مثلاً اِنَّ کیدی متین۔ یہاں کید کے معنی ہیں الاملاء والامھال المؤدی الی العقاب۔ کید سے مراد ڈھیل دینا ہے۔ پھر اس کے بعد عذاب۔ انما لایھدی کید الخائنین۔ فخص الخائنین تنبیھاً انہ قد یھدی کید من لم یقصد بکیدہ خیانۃ ککید یوسف وقولہ لاکیدنّ اصنامکم ای لاریدنّ بھا سوءً (راغب) اللہ خیانت کاروں کے داؤ کو چلنے نہیں دیتا۔ اس سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جس کی نیت میں خیانت ہو، اس کے داؤ کو چلنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ جیسے یوسفؑ کا داؤ اور جیسے حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول کہ "میں تمہارے بت پرستوں کے بتوں کے ساتھ داؤ کروں گا یعنی میرا ارادہ ان کو نقصان پہنچانے کا ہے ــــــ ان دونوں (ابراہیم و یوسف) کی نیت نیک تھی اس لیے اپنے کید، داؤ یا تجویز میں اللہ تعالیٰ کی تائید و اعانت حاصل ہوئی۔

[2] جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہے۔ انتم اعلم بامور دنیاکم۔ تم لوگ اپنے دنیوی امور میں زیادہ علم رکھتے ہو ــــــ یہ بھی ظاہر ہے کہ ملکی اور فوجی معاملات میں آپؐ صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے اور بعض اوقات اپنی رائے پر ان کے مشورے کو ترجیح بھی دیتے تھے۔

معراج

قرآن حکیم کے بعد جو دینی کتابیں مختلف زمانوں میں تصنیف ہوئیں۔ان کے اجمالی مطالعے سے یہ حقیقت مجسم بن کر سامنے آجاتی ہے کہ ہمارا کوئی دینی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق اختلاف کے انبار نہ پائے جاتے ہوں۔ یہاں تک کہ توحید جو تمام انبیاء و رسل کی متحدہ و متفقہ اساس ہے۔اس کو بھی بے شمار اختلافات کے گورکھ دھندوں میں الجھا کر رکھ دیا گیا ہے۔

بقول اقبال،

دہی توحید جو اک زندہ حقیقت تھی کبھی رہ گیا اب فقط اک مسئلۂ علم کلام

لیکن آپ یہ سن کر حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ سب سے زیادہ جو مسئلہ اختلاف کا ہدف بنا، وہ "معراج" ہے۔ معراج ایک طویل داستان کا نام ہے۔اس داستان کا ہر جزو دسیوں، بیسیوں، اختلافات کا آماجگاہ ہے۔ مثلاً

۱۔ معراج کب ہوئی قبل نبوت یا بعد نبوت؟ اس کے متعلق عینی شرح بخاری میں ۱۲ مختلف اقوال۔

۲۔ اسراء اور معراج دو الگ الگ واقعات ہیں یا ایک۔ پھر ان کا وقوع الگ الگ زمانوں میں ہوا یا ایک ہی رات میں؟ معراج ایک بار ہوئی یا کئی بار ہوئی؟

۳۔ معراج کے آغاز میں آپ کہاں تھے؟ اس میں بھی اختلاف ہے۔

۴۔ جبریل تنہا آئے یا ان کے ساتھ اور بھی دو یا تین فرشتے تھے؟

۵۔ اس وقت آپ سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے؟

۶۔ شق صدر کے متعلق اختلافات۔

۷۔ بعض حدیثوں میں براق کا ذکر ہے، بعض میں نہیں۔

۸۔ بیت المقدس میں براق باندھنے پر اختلاف۔

۹۔ بیت المقدس پہنچنے سے پہلے آپ کہاں کہاں گئے؟

۱۰۔ اختلاف مقام انبیاء جن سے آسمانوں پر ملاقات ہوئی۔

۱۱۔ سدرۃ المنتہیٰ اور بیت المعمور کے متعلق اختلاف۔

۱۲۔ سدرہ کی نہریں، اس کے رنگ۔

۱۳۔ بیت المقدس سے نکلنے پر دو پیالے (دودھ اور شراب) پیش کیے گئے یا تین (شہد)؟

۱۴۔ سدرہ کے بعد جنت میں گئے یا نہیں گئے؟

۱۵۔ آسمان اول پر ایک نہر دیکھی جس کا نام کوثر ہے۔ بعض روایات میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

۱۶۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ ایک مقام پر آپ نے قلموں کے چلنے کی آواز سنی۔ اس کے علاوہ کسی حدیث میں یہ ذکر نہیں۔

۱۷۔ سیڑھی کے ذریعے آسمان پر گئے یا براق کے ذریعے۔

۱۸۔ معراج مع الجسد ہوئی یا صرف روحانی؟ ــــ وغیرہ ــــ وغیرہ

کتب احادیث میں ان تفصیلات کو پڑھنے کے بعد ایک سوچنے والا فیصلہ کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے کہ کس بات کو مانے اور کس کا انکار کرے ہر بات کا راوی محدثین کے نزدیک ثقہ ہے۔

موطا مالک

ہمارے پاس روایات کا قدیم ترین اور معتبر ترین ماخذ موطا مالک ہے اس میں معراج کا قطعاً ذکر ہی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت مدینہ منورہ یا حجاز میں اس کے متعلق کوئی روایت تیار نہیں ہوئی تھی۔ یہ تمام روایات امام موصوف کے بعد کی پیداوار ہیں۔ موطا کی تالیف سنہ ۱۳۰ ہجری کے بعد ہوئی۔ حال ہی میں ایک اور چیز دستیاب ہوئی ہے۔ جو اس سے بھی مقدم تسلیم کی گئی ہے۔ وہ ہے صحیفہ ہمام ابن منبہ۔ جو ۵۸ھ سے قبل لکھا جا چکا تھا۔ اس میں بھی معراج کے متعلق کوئی اشارہ تک نہیں۔

تفاسیر میں وقوع معراج پر (مندرجہ بالا اختلافات کثیرہ کے باوجود) اتفاق پایا جاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس سے انکار کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ تفسیر رازی میں ایسے لوگوں کے دلائل نقل کئے گئے ہیں۔ مثلاً

۱۔ ان صعود الجرم الثقیل الی السموات غیر معقول ــــ جسم ثقیل کا آسمان کی طرف چڑھنا غیر معقول ہے۔

۲۔ اس کے لیے آسمانوں کو پھاڑنا لازم آئے گا، جو محال ہے، انخراق الافلاک محال

۳۔ ان ھذا المعنی لو صح لکان اعظم من سائر المعجزات وکان یجب ان یظھر ذالک عند اجتماع الناس حتی یستدلوا بہ علی صدقہ فی ادعاء النبوۃ۔ فاما ان یحصل ذالک فی وقت لا یراہ احد ولا یشاھدہ، فانہ یکون ذالک عبثا و ذالک لا یلیق بالحکیم۔

اگر واقعۃً معراج ہوئی ہے، تو یہ تمام معجزات سے بڑا معجزہ ہے۔ اس کا لوگوں کے ایک بڑے مجمع کے سامنے ہونا چاہیئے تھا۔ تاکہ وہ دعویٰ نبوت کی صداقت پر اس کو دلیل بنا سکتے۔ لیکن اس کا وقوع ایسے وقت میں ہونا کہ کوئی ایک شخص بھی اس کا عینی گواہ نہیں۔ یہ تو ایک فعل عبث ہے جو خدائے حکیم کی شان کے لائق نہیں۔

۴۔ یہ لوگ جو جسدی معراج کے منکر ہیں۔ آیت ذیل سے تمسک کرتے ہیں وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (اسرائیل-۶۱) اور ہم نے تجھے جو خواب دکھایا وہ لوگوں کے لیے ایک فتنہ تھا۔

اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بعض نے اس کی تصدیق کی اور بعض نے انکار کیا لہٰذا حدیث معراج لوگوں کے لیے فتنہ کا سبب

بن گئی۔ فثبت ان ذالک رؤیارٰہ فی المنام پس ثابت ہوا کہ یہ ایک خواب تھا جو آپؐ نے سوتے میں دیکھا۔

۵۔ ایک اور دلیل ان لوگوں نے یہ پیش کی ہے کہ حدیث معراج میں بعض ایسی باتیں آگئی ہیں جو ناقابل قبول ہیں۔ مثلاً حضورؐ کا سینہ شق کیا اور آب زمزم سے دھویا اور یہ امر بعید ہے۔ اس لیے کہ پانی سے مادی نجاستوں کو دھویا جاتا ہے۔ اور دل کو باطل عقائد اور مذموم اخلاق سے پاک کرنا پانی کے بس کی بات نہیں ـــــ اس کے علاوہ اس دنیا سے عالم افلاک کی طرف براق کو ذریعہ بنانا بھی ناقابل فہم ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو سیر افلاک کرانا چاہی تو اس کے لیے براق کی احتیاج کیا معنی رکھتی ہے؟ معراج ہی کے دوران میں پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔ جو گھٹتے گھٹتے پانچ تک پہنچ گئیں۔ اس کے متعلق قال القاضی وھذا یقتضی نسخ الحکم قبل حضورہ وانہ یوجب البداء وذالک علی اللہ تعالیٰ محال، فثبت ان ذالک الحدیث مشتمل علی مالا یجوز قبولہ فکان مردوداً۔ قاضی نے کہا ہے۔ یہ تو کسی حکم کو قبل نفاذ ہی منسوخ کرنا ہوا۔ جس سے بداء[1] لازم آتا ہے جو اللہ کی شان کے خلاف ہے پس ثابت ہوا کہ اس حدیث کے مشمولات ناقابل قبول ہیں۔ لہٰذا یہ مردود ہے۔

امام رازی نے تمام شبہات واعتراضات کے مفصل جواب دیئے ہیں۔ جن کا خلاصہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے۔ "ان الخالق العالم قادر علی کل الممکنات" خالق عالم تمام ممکنات پر قدرت رکھنے والا ہے (الجزء العشرون صفحہ ۱۵ تا ۱۵۲)

عائشہ صدیقہؓ معاویہؓ اور حسنؓ معراج کو خواب کہتے ہیں۔ ابن اسحق کا یہ قول ابن کثیر نے نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم ای ذالک کان قد جاء وعاین من اللہ ماعاین علی ای حالاتہ کان نائما او یقظانا۔ معراج کے شاہدات کے متعلق اللہ ہی کو علم ہے کہ سوتے میں ہوئے۔ یا جاگتے ہیں۔ کل ذالک حق وصدق۔ یہ سب حق وصدق ہے۔

علامہ اقبال نے معراج کو "نبی کی واردات" سے تعبیر کیا ہے۔ پانچویں خطبے کی ابتدائی سطور دیکھئے ـــــ مشہور صوفی بزرگ شیخ عبدالقدوس کہتے ہیں کہ

"محمد عربی بر فلک الافلاک رفت باز آمد   واللہ اگر من رفتمے ہرگز باز نیامدے

محمد عربی فلک الافلاک پر گئے، اور لوٹ آئے۔ خدا کی قسم میں جاتا تو ہرگز نہ لوٹتا علامہ اس کی شرح کرتے ہیں!

صوفی نہیں چاہتا کہ واردات اتحاد میں اسے جو لذت اور سکون حاصل ہوتا ہے، اسے چھوڑ کر واپس آئے۔ لیکن اگر آئے بھی، جیسا کہ اس کا آنا ضروری ہے، تو اس سے نوع انسانی کے لیے کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے، نبیؐ کی بازآمد تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ ان "واردات[2]" سے واپس آتا ہے، تو اس لیے کہ زمانے کی رَو میں داخل ہو جائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ وتصرف سے جو عالم تاریخ کی صورت گر ہیں، مقاصد کی ایک نئی دنیا پیدا کرے۔" (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجمہ سید نذیر نیازی ص ۱۸۸)

---

[1] بات کہہ کر بدل جانا

[2] مترجم نے اس پر حاشیہ لکھا ہے "جن میں اس کا اتصال ایک حقیقت سرمدی سے ہوتا ہے"

اس اقتباس میں لفظ "واردات" غور طلب ہے۔ اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے نزدیک معراج کی حقیقت کیا تھی۔ [1]

مولانا ابوالکلام نے واقعہ اسریٰ کی نوعیت کے متعلق ترجمان القرآن میں ایک مختصر نوٹ لکھا ہے، جس کی آخری سطور حسب ذیل ہیں۔

"خود صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "میں اس وقت ایک ایسے عالم میں تھا کہ نہ تو سوتا تھا، نہ جاگتا تھا۔ بین النائم والیقظان۔" اس سے معلوم ہوگیا کہ اس معاملہ کو نہ تو ایسا قرار دے سکتے ہیں جیسا ہمیں جاگتے میں پیش آیا کرتا ہے اور نہ ایسا جیسا سونے میں دیکھا کرتے تھے۔ وہ ان دونوں حالتوں سے ایک مختلف قسم کی حالت تھی اور ہماری تعبیرات میں اس کے لیے کوئی تعبیر نہیں" یہ آخر میں توقع دلاتے ہیں کہ —— اس مقام کی تشریح "البیان" میں ملے گی۔ "البیان" مولانا کی متوقع تفسیر تھی جو وجود میں نہ آسکی۔ لیکن اگر ان کو ایسی عظیم تصنیف کا موقع مل جاتا تو وہ معراج و اسریٰ کے متعلق کیا لکھتے! —— اس کا کچھ اندازہ اسی سورہ (بنی اسرائیل) کے ایک نوٹ سے لگایا جا سکتا ہے جو آیات ذیل پر آپ نے ارقام فرمایا ہے۔

وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ..... الی ..... بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل ۸۹ تا ۹۳) منکروں نے کہا کہ ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ تو زمین سے ایک چشمہ ہمارے لیے جاری نہ کر دے یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور تو اس میں نہریں جاری کر کے دکھا دے۔ یا تو اپنے خیال کے مطابق آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے یا اللہ اور اس کے فرشتے ہمارے سامنے لا کر کھڑے کر دے۔ یا تیرے پاس سونے کا ایک محل ہو یا تو آسمان میں چڑھتا ہوا نظر آئے اور ہم تیرے اس چڑھنے کو بھی جب ہی مانیں گے کہ تو ہم پر ایک کتاب اتار لائے، جسے ہم خود پڑھ لیں۔ (ان سب باتوں کے جواب میں) تو کہہ دے! سبحان اللہ! میں نے کچھ خدائی کا دعویٰ تو نہیں کیا! میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ایک آدمی ہوں، پیغام حق پہنچانے والا۔

---

[1] ایک صحبت میں مؤلف نے علامہ سے معراج کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے ایک مختصر تقریر میں اظہار خیال فرمایا۔ یہ تقریر "ملفوظات" مرتبہ محمود نظامی مرحوم میں شائع ہو چکی ہے۔ راقم نے کہا آپ کا مطلب سرمد کے ایک شعر میں ملتا ہے وھو ھذا۔

ملا گوید احمدؐ بفلک بر شد سرمد گوید فلک با حمدؐ در شد

علامہ نے کہا "یہ خیال رومیؒ نے بہت پہلے منظوم کیا ہے" پھر رومیؒ کی وہ حکایت سنائی جس میں حلیمہ سے آنحضرتؐ کا طفلی میں گم ہو جانا اور اس کا پریشان ہونا مذکور ہے پھر اسے غیبی آواز آئی۔

مصطفیٰ با وہ نخواہد شد زتو بلکہ گردد عالمے با وہ درو

یعنی بچہ گم نہیں ہوگا۔ بلکہ ایک دنیا اس بچے (محمدؐ) میں گم ہو جائے گی۔

اس پر مولانا ایک تشریحی نوٹ لکھتے ہیں۔ اس کی تلخیص ملاحظہ فرمایئے:
"قرآن میں جابجا منکرین حق کے عقائد وا قوال نقل کر کے دو خاص گم راہیوں پر توجہ دلائی ہے۔
ایک یہ کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ روحانی ہدایت کے لیے انسان سے کوئی بالاتر ہستی ہونی چاہیئے۔ اسی خیال سے دیوتاؤں اور عجائب آفرینیوں کا خیال پیدا ہوا چنانچہ ہر پیغمبر کو یہی کہا گیا مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا۔ تو ہمارے ہی جیسا ایک بشر ہے۔ مشرکین مکہ نے بھی کہا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ۔ کہ یہ کیسا رسول ہے کہ ہماری ہی طرح کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔
دوسری گمراہی یہ کہ سچائی کو خود سچائی میں نہیں ڈھونڈتے۔ اس کے ساتھ عجیب عجیب طرح کے کرشمے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مثلاً ریگستان حجاز میں اچانک ایک نہر پھوٹ نکلے، آسمان ٹکڑے ہو کر گر پڑیں، اللہ اور فرشتے سامنے آ جائیں وغیرہ ذالک ـــــ ان سب باتوں کا ایک جواب ہے کہ
میری حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک آدمی ہوں خدا کا بھیجا ہوا ـــــ میں نے خدائی دعویٰ نہیں کیا کہ آسمان کو زمین اور زمین کو آسمان بنا دینے والا ہوں۔ اور دنیا کی ساری قوتیں میرے اختیار میں ہیں پھر تم مجھ سے یہ فرمائشیں کیوں کرتے ہو؟
ہم کسی مدعی سے اس کے دعویٰ کے مطابق ہی دلیل طلب کر سکتے ہیں۔ لوہار ہونے کے مدعی سے یہی چاہیں گے کہ وہ لوہے کا سامان بنا سکتا ہے یا نہیں؟۔ طبیب سے علاج میں مہارت کی توقع کریں گے۔ ایسا تو نہیں کریں گے کہ طبیب سے کہیں کہ لوہے کے شہتیر بنا کر دکھا دے۔ یہ تو صریح بے عقلی ہو گی۔
ایک اچھا انسان رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر خدا نے سچائی کی راہ کھول دی ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر سچائی ملتی ہے یا نہیں۔ ہم اسے یہ تو نہیں کہیں گے پہاڑ کو سونا بنا دے یا آسمان پر اڑ کر دکھا دے۔
ٹھیک یہی مطلب ہے "هل كنت الا بشرا رسولا" کا کہ میں نے کب کہا ہے کہ میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دوں گا۔ بس اگر تم طالب ہو تو میرا پیام پرکھ لو میں صرف "پیام بر آدمی ہوں۔ نہ فرشتہ ہوں اور نہ ماورائے انسانیت مخلوق"۔ (ترجمان القرآن" آزاد ص۳۷۱-۳۷۲ جلد دوم مطبوعہ مکتبہ مصطفائی کشمیری بازار۔ لاہور)
اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے اچانک چشمہ جاری کر دینا۔ سونے کے محل کا مالک ہونا۔ یا آسمان میں چڑھنا پیغمبری میں داخل نہیں ہے۔ پیغامبری کا تعلق صرف پیغام الٰہی سے ہے۔ عجائبات سے ہرگز نہیں۔ اگر آپ آسمانوں میں گئے تھے، تو جواب یہ نہ ہوتا کہ "میں تو صرف بشر رسول ہوں" بلکہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ میں فلاں آسمان پر پہنچا۔ وہاں یہ یہ چیزیں دیکھیں وغیرہ وغیرہ یہی سورت جس میں دیگر عجائبات کے انکار کے ساتھ آسمان پر چڑھنے کا انکار شامل ہے۔ اسی کی پہلی آیت سے فلک رسی کی ایک پوری داستان سازی ہر بات میں الگ بولی بولتے ہیں۔ ع
" شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا "

آیئے اب خواجہ صاحب سے دریافت کریں کہ وہ مسئلہ معراج کے متعلق کیا سمجھ پائے ہیں؛ ان کی تحقیق کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

قرآن مجید میں بعض سورتوں کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی ایسی صفات آئی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبوح و قدوس ہے، ہر عیب سے پاک ہے۔ کفار اس ذات پاک کی شان کے خلاف کوئی بات کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے اپنی بریت ثابت کرتا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل ان سورتوں میں سے ایک ہے۔ جس کی ابتدا لفظ ”سبحان“ سے ہوتی ہے — پھر اس سورت کے گیارھویں رکوع میں کفار ہمارے رسول کریم سے بعض خوارق طلب کرتے ہیں۔ ان کے جواب میں بھی سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا فرمایا جاتا ہے — اس سے معلوم ہوتا ہے، ”سُبْحَان“ کا تعلق ایسے خوارق (خلاف سنۃ اللہ) کی تردید کے ساتھ ہے۔

کفار کا ایک مطالبہ یہ تھا — ”آپ آسمان پر چڑھ کر دکھائیں“ — لہٰذا اگر حضور اس وقت تک سیر افلاک کر آئے ہوتے، تو ضرور فرماتے کہ میں شب معراج آسمان سے ہو آیا ہوں۔ لیکن آپ نے اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔

حضور کفار سے بچتے ہوئے غار میں چھپ کر بڑی مشکل کے ساتھ مدینے پہنچے۔ اس اشد ضرورت کے وقت آپ کے لیے کوئی بُراق نہیں آیا، لیکن بیت المقدس تک جو مدینے سے چار گنا زیادہ دُور ہے۔ رات کے قلیل ترین حصے میں بآسانی پہنچ گئے — اس غلطی کو رفع کرنے کے لیے ”سبحان“ سے سورۃ کا آغاز ہوا ہے۔ اس کے برعکس احادیث سیدھی بات کو دیو پری کی کہانی بنا دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے قوانین اور سُنن کبھی نہیں بدلتے اور نہ ہی غلطی کرتے ہیں ہر کام حکمت اور معینہ قوانین کے تحت انجام پا رہا ہے۔ اگر قانون شکنی ہوتی رہے تو تمام علوم و تجربات رکھے رہ جائیں گے۔ اگر ایک برتن میں صبح کو ایک سیر اور دوپہر کو بیس سیر پھر شام کو پانچ سیر ایک ہی چیز کی سمائی ہو جائے، تو تمام علوم ضائع ہو جائیں دنیا کا نظام و قیام ختم ہو کر رہ جائے۔

ایک دس گز طول و عرض اور اونچائی والے کمرے میں۔ ٹھوس لکڑی کے ایک گز طول و عرض اور دبازت والے ٹکڑے ایک ہزار سے زیادہ نہیں سما سکیں گے۔

سیڑھی پر چڑھنے کے لیے تمام زینوں کو بتدریج عبور کرنا لازم ہے جو شخص ۹۹ مرتبہ غلطی کر چکا ہے اسے ۱۰۰ ویں مرتبہ ہی غلطی کرنے کا موقع آئے گا — ہر معلول کے لیے مناسب علت درکار ہے — اگر یہ سلسلہ منقطع ہو جائے خدا (جو علۃ العلل ہے اس) کے ثبوت کا بھی کوئی ذریعہ باقی نہ رہے گا۔ ولد کے بغیر والد اور مملوک کے بغیر مالک کا تصور ہی محال ہے۔

اسی طرح ولد، والد کے بغیر اور مملوک مالک کے بغیر نہیں ہو سکتا — ہاں ابتدائی انسان جوڑا بننے کے لیے بغیر باپ ہی کے پیدا ہو سکتا ہے، کیوں اس وقت تقاضائے حکمت یہی ہے۔ لہٰذا آدم پر لفظ ولد کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ لفظ ولد میں نسب کا مفہوم مضمر ہے۔ جو دونوں نسبتوں (والد و والدہ) کا متقاضی ہے۔ اگر ایک نسبت کی نفی ہو جائے گی، تو دوسری کی بھی ساتھ ہی جاتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اندازہ و حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ (رعد ۲)

جبری ایمان پر لفظ ایمان کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ جہنم کو دیکھ کر ہر شخص اس کے وجود کا یقین کر لیتا ہے، لیکن اُسے ایمان لانا نہیں

ہیئے، کیوں کہ اس مشاہدے سے اس کو کوئی عملی فائدہ نہیں پہنچ سکتا — سچا اور نفع بخش ایمان وہ ہے، جو باختیار خود، شبہات و مشکلات کا مقابلہ کر کے محبت و اخلاص اور غور و فکر کے نتیجے میں پیدا ہو — خوارق سے جو ایمان حاصل ہوتا ہے، وہ جبری ہے (مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق، اگر اللہ تعالیٰ کو معجزاتی ایمان منظور ہوتا، تو انسان کو اختیار عطا نہ کرتا۔ اور تمام انسانوں کو ہدایت یافتہ ہی پیدا کرتا۔ جبری ایمان جہلا کی پسندیدہ چیز ہے۔ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (انعام - ۳۵)

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۹۰[1] تا ۹۳ میں مشرکین جن خوارق کا مطالبہ کرتے ہیں، انہیں دیکھ کر واقعی جبری ایمان حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کے متعلق ارشاد ہے کہ یہ بشر رسول کے امکان میں نہیں، نہ ہی وہ دعا کے ذریعے ان کو وجود میں لا سکتا ہے — کیوں کہ ایسا کرنا حکمت الٰہیہ کے خلاف ہے، میرا رب اس سے پاک ہے کہ اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین پر سے اعتماد و وثوق کو ختم کر دے (سبحان ربی) نوع بشری ہی رسول بن کر آ سکتا ہے اور اپنی بشریت کا نمونہ دکھا کر ہر فرد بشر کو اس کے اتباع کی دعوت دے سکتا ہے (هل كنت الا بشرا رسولا) قرآن جو وحی محفوظ ہے، بالواسطہ ہر دور اور خطۂ ارض کے انسانوں تک پہنچ سکتا ہے، لیکن خوارق ہر عہد میں ہر ہر شخص کو نہیں دکھائے جا سکتے۔

قرآن نے پوری شدت کے ساتھ معجزہ نمائی سے مدلل انکار کر دیا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (الانعام - ۱۰۹، ۱۱۰)

"(خوارق کے خواہش مندوں سے کہہ دے کہ) نشان تو خدا کے پاس ہیں اور (مسلمانو!) تمہیں کیا خبر ہے کہ وہ (نشان یا معجزات) جب (ظہور میں) آ جائیں تو یہ لوگ (پھر بھی) نہیں مانیں گے۔ اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو پھیر دیں گے جس طرح وہ اس (تعلیم قرآنی) پر پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور انہیں ان کی سرکشی میں اندھا دھند حالت میں چھوڑ رکھیں گے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں"

اس تمہید کے بعد آیت کا ترجمہ و تفسیر ملاحظہ فرمائیے:

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (بنی اسرائیل - ۱)

(المسجد الاقصیٰ کے معنی ہیں کسی قصبے کی[2] دور کی مسجد یعنی وہ مسجد جو اس قصبے کی حدود میں سے دور کی حد پر واقع ہو قرآن مجید میں ہے۔ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى (یٰس - ۲۰) وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى (القصص ۲۰)

"یہاں "اقصی المدینہ" کے معنی ہیں شہر کی دور کی جانب جو ان لوگوں سے زیادہ دور ہو، جن کا آیات میں ذکر ہے۔ کسی شہر کی دور کی

---

[1] یہ آیات مولانا ابوالکلام کے اقتباسات بالا میں دیکھیے۔

[2] "المسجد الاقصیٰ" یہ نام نہ یہود میں مروج تھا، نہ نصاریٰ میں اور نہ عرب جاہلیہ میں۔ لہٰذا اس کے لغوی معنی لیے گئے ہیں۔

مسجد سے کل دنیا کی دور کی مسجد مراد لینا درست نہیں کرۂ زمین پر کوئی مسجد اقصیٰ نہیں ہو سکتی ـــــ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو اصحاب کہف کی مسجد اور زمین ... کی اس سے بھی دور کی مسجدیں کیوں اقصیٰ نہیں کہی جا سکتیں؟ بیت المقدس کو عام مفسر مسجد اقصیٰ کہتے ہیں حالانکہ رسولِ کریم کے زمانے میں اس مسجد کا وجود ہی نہیں[1] رہا تھا۔ اسی سورہ کی ساتویں آیت میں بیت المقدس کی مکمل تباہی کا ذکر موجود ہے۔ اس کے بعد اس کی آبادی کا کہیں مذکور نہیں۔ چھٹی آیت میں اسی مسجد کا ذکر لفظ "دیار" میں آیا ہے۔ اس کے ساتھ (قرآنی) مسجد اقصیٰ کا کوئی تعلق نہیں۔

مکے کے باہر عرفات تک حج کا جلسہ ہوتا تھا۔ لہٰذا مکے کی دور کی مسجد "مشعر الحرام" ہے۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ (البقرہ - ۱۹۸) جو مقام اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ مختص ہو، وہی مسجد ہے ـــ یہ مسجد حدود مکہ کی ایک انتہائی بیری کے پاس تھی اور اس کے پاس مسافروں کے آنے جانے کے لیے باغ تھا۔ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ٥ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (نجم ۱۴، ۱۵) اس لیے اس کے اردگرد باطنی برکات کا ظہور بھی ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ ایک رات اپنے بندے (رسول) کو اس مسجد کی طرف لے گیا۔ اس سیر سے مقصود یہ تھا کہ حضور کو قدرتی آیات کا مشاہدہ کرایا جائے۔ حضرت موسیٰ پر بھی (وادی طور میں) ایسی آیات کے ملاحظے کے دوران وحی کی حالت طاری کی گئی تھی۔ اسی طرح جب ہمارے رسول کریم نے ایسی آیات کا مشاہدہ کیا تو آپ پر بھی وحی نازل ہوئی فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى (نجم - ۱۰)

اس وقت آسمان سے ایک گرنے والا ستارہ جسے "طارق" کہتے ہیں، گرتا اور قریب آتا ہوا دکھائی دیا۔ گرنے کے بعد بھی آپ نے مگر اس کا ملاحظہ کیا اس کی جلتی ہوئی راکھ اس انتہائی بیری پر پڑی۔ اللہ تعالیٰ نے باغ (الجنۃ الماویٰ) اور مکے کو اس کی مضرت سے بچا لیا۔ کفار نے جو سجدہ[2] سورہ نجم کی آخری آیت کے مطابق کیا تھا، وہ اسی ہولناک نظارے کو دیکھ کر کیا تھا۔ کفار بھی ایسے نظاروں کو دیکھ دیکھ کر سہم جاتے تھے۔ اس آیت میں ایسے ہی نشانوں کا ذکر ہے جیسا کہ ارشاد ہے) وہ اللہ (اپنے احسن و اتقن قواعد کو توڑنے سے) پاک ہے جس نے ایک (ہی) رات میں اپنے بندے کو حرمت والی مسجد سے جو مکے کے وسط میں ہے۔ مکے کے حدود کی (دور) کی مسجد تک سیر کرائی جس مسجد کے اردگرد کو ہم نے (ظاہری و باطنی) برکت دی تھی (اس سیر کا مقصود یہ تھا) تاکہ ہم (خدا) اس کو اپنی (قدرتی) نشانیاں دکھلائیں بلاشبہ وہ (خدا) اصل سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

---

[1] ہیکل سلیمانی کے متعلق تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے ۷۰ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرت عمر کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا تو اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہ تھا بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے ... الخ (اقتباس از مقالہ "سانحہ مسجد اقصیٰ"، مولانا مودودی "ترجمان القرآن جلد ۲، عدد ۱ صفحہ ۶)

[2] شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ اس وقت سب کو ایک غاشیۂ الٰہیہ نے گھیر لیا تھا، گویا ایک غیبی اور قہری تصرف سے طوعاً و قہراً سب کو سر بسجود ہونا پڑا (بحوالہ عثمانی زیر آیت ۶۲ - نجم)

وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰہُ هُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا (اور اس طرح نشان دکھا کر) ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور ہم نے اس (کتاب) کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا یہ کہتے ہوئے) کہ میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ۔

اس سلسلے میں ایک نظر سورۂ "والنجم" پر بھی ڈال لیں۔ (اگرچہ اوپر قوسین میں اس کے متعلق اشارات آچکے ہیں) خواجہ تمہید کے طور پر لکھتے ہیں:

"کفار ستاروں کو پوجتے تھے اور فرشتوں کو ان پر با اختیار موکل سمجھتے تھے اور انہیں خالق تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ انہوں نے ان کی خیالی تصاویر بنائی ہوئی تھیں۔ جن کے نام لات، عزیٰ، منات وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ ان خوب صورت دیویوں کے آگے برہنہ طواف کیا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اللہ نے ہمیں ایسی بے حیائیوں کا حکم دے رکھا ہے۔ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۔۔۔۔۔ الخ (الاعراف - ۲۸)

ان کا خیال تھا کہ آسمان اور اجرام سماوی کون و فساد سے مبرا ہیں۔ نہ سماء کی ترکیب میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ ہی ستارے ٹوٹ پھوٹ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں میں بھی زمین ہی کی طرح شکست و ریخت ہوتی رہتی ہے۔ شہاب ثاقب زمین پر گر کر اس کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ چاند زمین کے گرد پھرتا ہے یہ زمین سے بہت قریب ہے اس میں آتش خیز پہاڑ موجود ہیں یہ کئی مرتبہ پھٹ چکا ہے۔ یہی حال دوسرے سیاروں اور ستاروں کا بھی ہے۔ نہ ستارے اپنی حفاظت کے قابل ہیں اور نہ فرشتے ان پر کوئی اختیار رکھتے ہیں بچا حافظ صرف ایک ہے اور بس۔ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ (طارق - ۴) ہر نفس پر ایک (بلند مرتبہ) نگہبان ہے (یعنی اللہ تعالیٰ)

سابقہ سورت کے آخر میں آسمان سے ایک ٹکڑے کے گرنے کے امکان کا ذکر فرمایا ہے۔ وَاِنْ یَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا یَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ (الطور ۴۴) اس سورہ میں شہاب ثاقب کے فی الواقع گرنے کا بیان ہے (وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی (النجم - ۱) اس نے زمین پر گر کر زبانِ حال سے عذاب خداوندی کے وقوع پر شہادت دی۔ یعنی اللہ تعالیٰ جب چاہے کسی بڑے شہاب ثاقب کو گرا کر بستیوں کو تباہ و برباد کر دے وہ عظیم و شدید قوتوں کا مالک ہے شَدِیْدُ الْقُوٰی (نجم - ۵) لیکن اس کے ساتھ ہی وہ رحیم، حلیم صاحب حوصلہ ہے ذُوْ مِرَّةٍ (نجم - ۶) اس لیے ڈھیل بھی دیتا رہتا ہے۔

قرآن مجید کے اندر قسمیں دلیل و شہادت کا فائدہ دیتی ہیں۔ سورۂ نجم میں تین رکوع ہیں۔ رکوع اوّل میں اللہ تعالیٰ کے حافظ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ گرنے والے ستارے کو زمین پر گرا کر اور تھمے کے ساتھ جنۃ الماویٰ کو سجا کر قوت اور حوصلے کا عظیم نشان دکھایا ہے۔ اور لات و عزیٰ کی الوہیت کی بیخ میزی واضح فرمائی ہے ــــ قریش فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے اور ان کی مورتیں بنا کر پوجتے تھے۔ ان کو باطل قرار دیا ہے۔ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰی (نجم - ۲۱) اور فرمایا ہے کہ انسان میں یہ قدرت نہیں ہے کہ اپنی تمنا کی تکمیل کر سکے: اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی (نجم - ۲۴) دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ مختار مطلق ہے: فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰی (نجم - ۲۵)

اب آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی : ستارے کی قسم (یا گواہی) اس وقت (جب کہ وہ گرا۔[1]

مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی : (وحی کے معاملے میں) تمہارا ہم نشین (رسول) نہ راہ سے بے راہ ہوا اور نہ اس نے غلطی کھائی۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی : (وحی میں) وہ اپنی خواہش نفسانی سے نہیں بولتا۔[2]

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی : نہیں یہ (قرآن) مگر ایسی وحی جو (بحفاظت) وحی کی جاتی ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی : اس کو مضبوط قوتوں والے (خدا) نے سکھایا ہے۔

ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰی : جو صاحب حوصلہ ہے (رسول کو سابقہ سورت میں اطلاع مل چکی تھی) پس وہ (رسول گرنے والے ستارے کو دیکھ کر اس کی طرف) متوجہ ہوا۔

وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی : اور وہ (ستارہ) بہت اونچے افق پر تھا۔

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی : پھر وہ (ستارہ رسول کی طرف) نزدیک آیا۔ پس وہ (زمین پر) گر پڑا۔

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی : سو وہ (محیط میں) دو کمانوں کی مقدار تھا۔ یا اس سے الگ جگہ (اللہ تعالیٰ) ایک رات رسول کریم کو مکے سے باہر لے گیا۔ وہاں آپ نے اس نظارہ کو دیکھا):

فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی : پس اس خدا نے اپنے بندے کی طرف وحی کی، جو وحی کی (یہ سورہ نجم اسی حال میں نازل ہوئی تھی)

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی : دل نے جھوٹ نہیں بولا جو دیکھا (جیسی وحی نازل ہوئی وہی تمہارے آگے رکھ دی)

اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی : کیا تم اس وحی کا انکار کرتے ہو؟ پھر کیا تم اس کے ساتھ اس بات پر جھگڑا کرتے ہو جو وہ دیکھتا ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی : (پہلے اس نے دور سے اس ستارے کو زمین پر گرتے دیکھا۔ پھر جہاں وہ گرا تھا وہاں بھی گیا) اور بلاشبہ اس (رسول) نے اس (ستارے) کو ایک دفعہ اور دیکھا۔

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی : (وہ ستارہ کہاں گرا تھا) انتہائی بیری کے پاس (وہ بیری حدود مکہ پر تھی۔ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے اہل مکہ کو بچالیا۔ بلکہ اس باغ کو بھی جہاں مسافر آرام پاتے تھے جیسا کہ فرمایا)

عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی : اس کے پاس پناہ (لینے) کا باغ ہے (خدا نے اسے بھی بچالیا)

اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی : (بیری پر صرف اتنا اثر ہوا کہ ستارے کی چمکتی راکھ اس پر آگری) جب بیری کو وہ چیز ڈھانکتی تھی جو ڈھانکتی تھی (جس سے ممکن ہے کہ بیری خشک ہو گئی ہو)

---

[1] من یحلل علیه غضبی فقد هوٰی (طٰہٰ-۸۱) جس پر میرا غضب اترا وہ ٹپک پڑا۔ هوٰی کے یہی معنی آیہ "والنجم اذا هوٰی" میں لیے گئے ہیں [2] وحی کے علاوہ انبیاء سے صدور هوٰی غیر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت کو فرمایا۔ لا تتبع الهوٰی (ص-۲۶) (اے داؤد!) اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کر

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی: (اس معائنے میں رسول کی نگاہ نے کجی نہیں کی کہ کسی اور چیز کو ستارہ قرار دے لیا ہو اور نہ وہ نگاہ حد سے نکلی کہ اس گرنے والے ستارے کے کئی ٹکڑے سمجھ لیے ہوں)

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی: بالتحقیق اس نے اپنے رب کے بعض بڑے بڑے نشانوں کو دیکھا جس سے خدا تعالی کا شدید القوی اور ذو مرۃ ہونا ثابت ہوا۔ اس حادثے کو دیکھ کر ضرور سہمگیں ہو گئے تھے اور ممکن ہے کہ انہوں نے اس سورہ کو سن کر خدا کے حضور سجدہ کیا ہو اور جلال الٰہی سے کانپ اٹھے ہوں ـــ منزل ہفتم ص ۲۹ تا ۳۴

ماہنامہ "بلاغ" امرتسر جولائی ۱۹۲۴ء میں خواجہ صاحب نے ایک مضمون بعنوان "رسول خدا کی رات کی سیر" لکھا تھا۔ اس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں۔

۱۔ "گرنے والا ستارہ اپنی پھیلی ہوئی ناری حالت میں دو کمان کی مقدار تھا یا اس کے لگ بھگ۔"

۲۔ اس معائنے میں رسول مقبول کی نگاہ نے کجی نہیں کی کہ کسی اور چیز کو وہ ستارہ قرار دے لیا ہو۔ اور نہ نگاہ حد سے نکلی کہ ایک ستارے کو کئی ستارے سمجھ لیے ہوں۔

۳۔ آیات میں جبریل فرشتہ کا یقیناً کوئی اشارہ تک نہیں۔ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ شَدِیْدُ الْقُوٰی اور ذو مرۃ خدا تعالی ہی ہے۔ رسول خدا جبریل کے بندے نہیں ہیں۔

۴۔ رویت باری تعالی کا بھی ان آیات میں کوئی ذکر نہیں۔ اگر آپ نے خدا کو دوبارہ دیکھا ہوتا تو یہ نہ فرمایا جاتا۔ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی ـــ سورہ بنی اسرائیل میں بھی سیر شبانہ کا یہی مقصد بتایا ہے۔ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا۔ دونوں جگہ نظارہ آیات کا ذکر ہے۔ جمال الٰہی کا کہیں اشارہ بھی نہیں۔

۵۔ مسجد سلیمان یروشلم میں حضرت سلیمان نے بنائی۔ وہ اس مسجد کو مسجد اقصی ہرگز نہیں کہہ سکتے تھے جو انہوں نے کہا۔ ہاں اگر شہر میں اور مسجدیں ہوتیں اور وہ اپنی مسجد شہر کے کسی کنارے پر بناتے تو بلاشبہ اس کا نام مسجد اقصی رکھ سکتے تھے۔ یہود و نصاری نے اس کے بعد بہت سی مسجدیں بنائیں۔ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَیْهِمْ مَسْجِدًا۔ الکہف (۲۱) وہ مکے کی جانب سے بیت المقدس کی نسبت زیادہ دور بھی تھیں۔

۶۔ قرآن کی بیان کردہ مسجد اقصی کے حول میں مسجد حرام ہی واقع تھی۔ جس کے متعلق ارشاد ہے مُبٰرَکًا وَّهُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ (آل عمران ۹۶) پس اس مسجد اقصی سے بیت المقدس مراد لی جائے تو کیا وجہ ہے کہ اس کے اندر برکت کا ذکر نہ کیا اور بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ فرمایا گیا مسجد کے حول میں مسجد سے زیادہ برکت ہوتی ہے۔

۷۔ رسول خدا کے وقت بیت المقدس کی مسجد اس حالت میں تھی ہی نہیں کہ کوئی وہاں جا کر نماز ادا کرے۔

۸۔ اللہ تعالی کو علم تھا کہ لوگ مسجد اقصی کو بیت المقدس سمجھ لیں گے۔ اس لیے اگلی آیات میں ظاہر کر دیا۔ وہ یہود کی مسجد رسول خدا ﷺ سے پہلے ہم نے یہود کی سزا میں کفار کے ہاتھوں تباہ کرا دی تھی۔ یہود پر دو بار بڑی تباہی آئی۔ پہلی تباہی کے بعد ان کو دشمنوں پر غلبہ دیا گیا تھا لیکن دوسری تباہی کے بعد غلبہ نہیں ملا۔ یروشلم کے لوگ عیسائی ہو گئے۔ انہوں نے مسیح ؑ کی اس پیش گوئی کی حمایت میں کہ ہیکل کی

اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی، ہیکل کو دوبارہ تعمیر نہیں ہونے دیا اب وہاں مسجد عمرہ موجود ہے۔

۹۔ اگر المسجد الاقصیٰ اور ہیود کی (تباہ شدہ) المسجد ـــ ایک ہی جگہ کے دو نام ہیں۔ تو اس کا کیا مطلب ہوا ...... کہ پہلے یہ فرمایا جائے کہ ہم اس رسول کو مسجد اقصیٰ تک لے گئے ـــ پھر ساتھ ہی یہ بتلایا جائے کہ مسجد اقصیٰ رسول خدا سے پہلے تباہ ہو چکی تھی ـــ لیکن اس کے دوبارہ آباد ہونے کا ذکر تک نہ کیا جائے؟

۱۰۔ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى معلوم ہوتا ہے بعض ستارے گرنے والے ہوتے ہیں۔ رسولؐ کے وقت میں کئی چھوٹے ستارے شعلوں کی شکل میں کاہنوں پر پڑے تھے۔ ایک بڑا ستارہ زمین پر گر کر سرد بھی ہو گیا تھا۔ چونکہ وہ رات کو زمین پر اترا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام طارق رکھا اور چونکہ وہ کرۂ ہوا کو چیرتا ہوا، اور رگڑ سے جلتا ہوا زمین پر آیا تھا، اس لیے ساتھ ہی اس کی تفسیر میں فرمایا: النَّجْمُ الثَّاقِب۔ آسمان ایسے ستاروں سے معمور ہے۔ خدا تعالیٰ نے رات کے وقت ایک ستارہ زمین پر گرا کر متنبہ کیا کہ اگر میری حفاظت نہ ہو، تو یہ ستارے تمہاری دنیا کو ختم کر دیں۔

۱۱۔ طارق کے متعلق میری خاص حفاظت کو ملاحظہ کرو کہ میں نے اسے تمہارے شہر کی انتہائی حد پر گرایا اور تمہیں اس کے شر سے بچا لیا۔ یہ میرے شدید القویٰ اور ذو مرّہ یعنی قادر و حافظ ہونے کی صریح دلیل ہے۔ اس لیے ایسے بھر لپور آسمان اور رات کو اس طرح بے خبری کے عالم میں آنے والے ستارے کو دلیل میں پیش کر کے آگے فرمایا: اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ـــ اللہ کی حفاظت آڑے نہ آئے تو انسان کی کیا حقیقت ہے؟ ایک بے قرار اچھلتا ہوا قطرہ جو اپنے آپ کو ضائع کرنے پر آمادہ رہتا ہے (مَاءٍ دَافِقٍ) خدا ہی ہے جو اس کو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان (دشوار گذار راستوں سے نکال کر اس کے مخزن تک پہنچاتا ہے) سورۂ طارق۔

۱۲۔ گرنے والے ستارے بڑے بڑے ستاروں کے ٹکڑے ہوتے ہیں جو ان کی آتشیں حالت میں ان سے جدا ہو کر آسمان میں چکر لگاتے ہیں اور دُم دار ستاروں کے ٹوٹ پھوٹ جانے سے بھی حاصل ہوتے ہیں ـــ یہ ستارے دور نکل جانے کے سبب دوسرے ستاروں میں بھی جا گرتے ہیں۔ بلکہ اس نظام شمسی کے باہر سے بھی اس میں نووارد ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ایک ذرہ گم نہیں ہوتا۔ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ (سبا-۲)

۱۳۔ ہر صدی میں کہیں نہ کہیں تین دفعہ اس قدر ستارے ٹوٹتے ہیں کہ ان کی بارش ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ـــ پھر کیا ہر صدی میں تین دفعہ مقررہ اوقات پر فرشتوں اور شیاطین میں لگاتار جنگ ہوا کرتی ہے؟ قرآن مجید نے ان خیالات کی تردید کی ہے۔ مگر لوگوں نے وہی باتیں قرآن حکیم کے ذمے لگا دی ہیں۔

۱۴۔ مَا يَنْطِقُ میں رسولؐ کا منطوق صرف قرآن مجید ہے۔ لہٰذا۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى میں ھُوَ کی ضمیر کا مرجع قرآن ہی ہے۔ کبھی مرجع کا اظہار ضروری نہیں ہوتا۔ مثلاً۔ انا انزلناہ فی لیلۃ القدر۔ یہاں بالاتفاق ضمیر کا مرجع قرآن مجید ہی ہے جو مذکور نہیں ہے۔

اصحاب کہف

اصحاب کہف کی معجزانہ نیند اور بیداری کے متعلق مفسرین جو کچھ لکھتے اور ہمارے عوام مانتے چلے آ رہے ہیں، سب کو معلوم ہے۔ اس کے خلاف معقول پسندوں نے متعلقہ آیات کا مفہوم اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں خواجہ صاحب کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔

اصحاب کہف اور رسولؐ کی ہجرت میں مماثلت

ہمارے رسول کریم کفار سے بچ کر غار میں جا چھپے تھے۔ جہاں سے نکلنے کے بعد آپ کا اقبال شروع ہوا۔ اصحاب کہف بھی غار سے نکلے، تو عیسائی مذہب برسرِ عروج آ چکا تھا۔ ان کی قوم مومن بن گئی۔ جیسے قریش قرآن پر ایمان لے آئے۔ اصحاب کہف کی ہجرت ہمارے رسول کریم کی ہجرت سے مماثلت رکھتی ہے۔

تاریخی پس منظر

ملک شام میں انجیل کی تعلیم جاری تھی۔ کئی رومی توحید، مساوات اور حریت انسانی کو تسلیم کر چکے تھے۔ لیکن اس وقت ایک رومی قیصر توحید کے خلاف تھا اور لوگوں کو جبراً اعلان حق سے روکتا تھا۔ اس کی قوم کے کچھ نوجوان موحد ہو گئے۔ بادشاہ نے انہیں حاضر دربار ہونے کا حکم دیا۔ تو انہوں نے خدا کی وحدانیت کا صاف اقرار کیا۔ بادشاہ نے انہیں گرفتار کرنا چاہا، تو وہ بھاگ کر غار میں جا چھپے۔

غار کی وضع

گہرے اور ڈھلوان پہاڑی سوراخ کو غار کہتے ہیں۔ اور کہف پہاڑ کے اندرونی راستے کا نام ہے۔ جس غار میں عیسائی نوجوان چھپے تھے، اس کا منہ شمال کی جانب تھا اور وُہ خط سرطان سے بہت اونچا واقع ہوا تھا۔ جس طرح ہمارے ملک میں جاڑے کے موسم میں شمال رُخ مکانوں میں صبح اور شام کو بھی روشنی نہیں آتی۔ اسی طرح سورج غار کے عین مشرق سے جنوب کی طرف ہٹ کر نکلتا تھا۔ اور مغرب سے بھی اسی طرح کترا کر پیچھے رہ جاتا تھا (وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت ...... الخ) حاصل یہ کہ غار میں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی تھی۔ اس کا دہانہ تنگ تھا۔ لیکن آگے جا کر ایک کھلی جگہ آتی تھی۔ نور و حرارتِ آفتاب کی رسائی نہ ہونے کی وجہ سے وہاں کوئی زہریلی گیس جمع تھی، جس کا اثر دروازے تک بھی پہنچتا تھا۔ ان کا کتا اندر جانے کی جراٴت نہ کر سکا۔ فطرت نے اُسے دہلیز ہی پر روک رکھا تھا۔ وہ چوکس اور ہشیار ہونے کی بجائے دہلیز پر اگلے پاؤں پھیلائے پڑا تھا۔ یہ زہریلی گیس کا اثر تھا۔ لیکن اصحاب کہف خوف زدہ ہونے کی وجہ سے غار کے اندر کشادہ جگہ میں جا پہنچے (وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ)

وہ اس وقت سخت مجبوری کے عالم میں خدا سے دعا مانگ کر غار میں داخل ہوئے (رَبَّنَا آتِنَا ... الخ) وہ کئی نوجوان تھے۔ (إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ) اندرونی گیس ان سب پر تقسیم ہو گئی، جس سے وہ بے ہوش ہو گئے۔ لیکن موت سے بچ گئے۔ اُن کی آنکھیں کھلی رہ

گئیں اور وہ بے کلی سے کروٹ پر کروٹ بدل رہے تھے ـــــ (تَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُودٌ وَّنُقَلِّبُهُمْ ....الخ)

رسول کریم ایسا بہادر انسان بھی ان کو اس حالت میں دیکھ لیتا تو خوف سے بھر کر بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا (لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا)

ان کے تنفس اور جسموں کی گرمی سے گیس میں حرکت پیدا ہوئی اور باہر کی تازہ ہوا اندر آنے لگی۔ اس وجہ سے وہ تین، چار یا زیادہ دنوں تک بے آب و خورش پڑے رہے۔ اور پھر اپنی تکان کا خیال کر کے کہنے لگے کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ ہم کتنی دیر پڑے رہے۔ ان کو خود بھی اس مدت کا علم نہ تھا (قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ۔)

ہوش میں آئے تو ایک ساتھی کو کہنے لگے چھپ کر جاؤ اور نرم کلامی کرنا تاکہ تم پہ کوئی واقف نہ ہونے پائے اور ستھرا کھانا لے آؤ۔

کھانے کے بغیر کوئی پیغمبر بھی زندہ نہیں رہ سکتا (یَأْكُلُونَ الطَّعَامَ۔ انبیاء ۸۔ رسول کھانا کھایا کرتے تھے) اصحاب کہف جو رسول بھی نہیں تھے، کس طرح صدیوں تک بے کھائے پیئے زندہ رہ سکتے تھے؛

بادشاہ وقت کے قریبی رشتہ داروں میں خفیہ موحد موجود تھے۔ ان میں کسی نے موقع پا کر ظالم شاہ کو ٹھکانے لگا دیا اور عنانِ حکومت موحد حاکم کے ہاتھ میں آ گئی۔ اکثر دیکھا گیا ہے۔ ایک شخص صبح کو بادشاہ ہوتا ہے اور شام کو پابہ زنجیر یا مصلوب ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر

شہے کہ تاج مرصع صباح بر سر داشت غماز شام ورا خشت زیر سر دیدم

اس وقت ملک شام کے سمجھ دار لوگوں میں توحید کا چرچا ہو رہا تھا کئی لوگ بدعت پسند بھی تھے۔ آخر یہ بدعات تثلیث کی شکل اختیار کر گئیں عیسائی یہود کے سخت دشمن تھے۔ انہوں نے پھر وہاں کے یہود کے پاؤں جمنے نہیں دیئے۔

جب کہف والوں کا آدمی کھانا لینے آیا تو اس نے وہاں آ کر عجیب صورت حال دیکھی۔ عیسائیوں کا غلبہ ہو رہا ہے۔ اور وہ خیال کر رہے ہیں کہ غار والے، زہریلے غار میں جا چھپے ہیں۔ وہیں مر کھپ گئے ہوں گے۔

انہوں نے آپس میں کمیٹی کی ـــــ بعض نے کہا کہ ہم غار پہ یادگار عمارت بنائیں گے۔ لیکن اکثریت مسجد بنانے کے حق میں تھی۔ ایسے وقت میں ان کو اصحاب کہف کے زندہ بچ رہنے کی خبر مل گئی تاکہ خود اصحاب کہف اور دوسرے مومن ان تمام واقعات کے نتیجے میں سمجھ لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ وہ نیکوں کی اس دنیا میں بھی مدد کرتا ہے (جیسا کہ ان موحدین کی مدد ہوئی) لہٰذا قیامت کے متعلق بھی اس کے وعدے سچے ہیں (أَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا) غالباً لوگوں نے وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے غار کی بدلی ہوئی حالت کا معائنہ بھی کیا۔

طویل مدت گزرنے کے بعد لوگوں نے حسب عادت قصۂ اصحاب کہف پہ معجزے کا رنگ چڑھا دیا۔

اصحاب کہف دعا کے قائل تھے۔ دعا مانگ کر غار میں داخل ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ ان کی حفاظت کی اور ان کے مشن کو کامیاب کیا۔

بعد والوں میں ان کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا۔ کوئی کہتا کہ وہ تین سو سال سوئے رہے۔ کوئی ۳۰۹ سال بتاتا ـــ یہ دونوں مذہبی سرتاپا غلط ہیں۔ اس مدت کا صحیح علم اللہ ہی کو ہے۔ (اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا) بحکم قرآن لازم ہے کہ وہ اتنی ہی مدت رہے ہوں۔ جتنی دیر تک انسان کھائے پئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے ـــ لوگوں نے یادگار کے طور پر یہ قصہ ایک تختی پر لکھ کر غار پر لگا دیا ہوگا۔ رسول کریم اس قصے کو سن کر تعجب کرتے تھے۔ حضور نے آخر یہ گمان کیا کہ شاید جو کہانی مشہور ہے واقعۃً ایسا ہی ہوا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس افواہ کی تردید کر دی اور فرمایا کہ ـــ ہم ان کا صحیح واقعہ تمہیں بتاتے ہیں (نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ط .... تا .... مَسْجِدًا) اس سے پہلے کا بیان فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا غیر صحیح شہرت ہے ـــ بعد میں پھر لوگوں کے ان اختلافات کا ذکر ہے جو افراد کہف کی تعداد اور مدتِ قیام سے متعلق ہے اور دونوں باتوں کے متعلق الٰہی فیصلہ یہ صادر ہوا ہے کہ

اکثر لوگ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اصحاب کہف واقعی کوئی موجود فی الخارج ہستیاں تھے یا نہیں ـــ ان کی مدت قیام کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ـــ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا۔

سورۂ کہف میں تین قصے ہیں۔ تینوں میں تمہید سورۃ کے مطابق شخصیت پرستی سے ڈرانا مقصود ہے۔ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (کہف ۔۴)

۱۔ کوئی نیک انسان (مثلاً اصحاب کہف) نیکی کی وجہ سے خدا کا بیٹا نہیں بن سکتا۔

۲۔ کوئی شخص علم لدنی پا کر خدا کا بیٹا نہیں ہو سکتا (مثلاً موسیٰ کو ملنے والا شخص[1] بندہ ہی تھا۔ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا کہف ۶۵)

۳۔ کوئی شخص دنیوی اقتدار پا کر یا مہاراجہ بن کر خدازادہ نہیں ہو سکتا۔ (مثلاً ذوالقرنین) اپنے اپنے موقع پر ان سب کی عبودیت و بشریت کا ذکر واضح فرمایا گیا ہے۔

ایک مشکل کا حل

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا (کہف ۔۲۵) عام طور پر اس آیت کو مقولہ الٰہی سمجھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سابقہ آیات ۲۳ و ۲۴ واضح طور پر مقولہ الٰہی ہیں۔ چوں کہ ساتھ ہی بغیر کسی فرق و امتیاز کے یہ آیت آگئی ہے اس لیے اس کو ان کے ساتھ ملا کر ایک ہی متکلم تعالیٰ کا کلام سمجھ لیا گیا ـــ لیکن خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ اس کا تعلق آیت ۲۲ "سیقولون" سے ہے۔ یعنی جو لوگ اصحاب کہف کی تعداد میں اختلاف کر رہے تھے۔ وہی کہتے تھے کہ وہ تین سو نو سال اپنے غار میں رہے۔" چنانچہ ان کے اس خیال کی تردید اور خواجہ صاحب کی تصدیق آیت ۲۶ سے ثابت ہوتی ہے۔ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا (کہہ دے کہ اللہ ہی کو علم ہے کہ وہ کتنی مدت تک غار میں رہے" اب رہا یہ سوال کہ آیت ۲۳ و ۲۴ درمیان کیوں آگئیں۔ اس کا جواب خواجہ صاحب یہ دیتے ہیں کہ قرآن مجید کا یا اسلوب دیگر آیات میں بھی ملتا ہے، کہ ایک متکلم کا کلام جاری ہے۔ درمیان میں دوسری بات آگئی۔ پھر اسی سابق متکلم کی طرف رجوع ہو گیا۔ اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

---

[1] جس کو عرف عام میں خضر کہتے ہیں۔

حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہے ہیں۔ درمیان میں اللہ تعالیٰ ماں باپ کے حقوق و احترام کا حکم اولاد کو دینے لگتا ہے۔ دو طویل آیتوں کے بعد پھر بیٹے کو لقمان کی نصیحت شروع ہو جاتی ہے اور کوئی ایسا لفظ نہیں لایا جاتا کہ یہاں تک اللہ کا حکم ختم ہوا اور پھر لقمان کی ناتمام بات کی تکمیل کی جاتی ہے۔ دیکھیے سورہ لقمان آیت ۱۲ سے ۱۹ تک۔

اسی طرح سورۃ مریم میں "یَوْمَ اُبْعَثُ" تک حضرت عیسیٰ کا بیان ہے۔ آگے جملہ معترضہ کے طور پر حضرت عیسیٰ کا عجز بشری دکھانے کے لیے دو آیتیں مقولۂ الٰہی آگئی ہیں۔ اس کے بعد پھر قول مسیح کا تتمہ ان الفاظ میں وارد ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ۔ دیکھیے سورۂ مریم آیات ۳۰ سے ۳۶ تک اور دیکھیے۔ سورۂ یوسف آیت ۵۲۔ ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْہُ بِالْغَیْبِ ... تا ... خَائِنِیْنَ یہ یوسفؑ کے قول کا تتمہ ہے۔ درمیان میں قول ملک آگیا تھا۔ اس کے بعد اچانک اس کو رکھ دیا گیا۔ اور کہیں بھی وضاحت کے لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ قال الملک۔ اور۔ قال یوسف۔ یہ بات قارئین پر چھوڑ دی گئی کہ اپنی سمجھ سے سمجھ لیں کہ کون سی بات کس کے لیے مناسب ہو سکتی ہے۔

بالکل اسی طرح اس سورہ (کہف) میں آیت ۲۲ لوگوں کا قول ہے اور ۲۳ و ۲۴ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور پھر ۲۵ انہی لوگوں کی بات آگئی۔ اس کے بعد ساتھ ہی اللہ نے اس تین صدی مدت خواب کی یہ کہہ کر تردید کر دی کہ قُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا۔

(منزل چہارم ۶۴ تا ۸۰ ملخصاً)

حضرت موسیٰ کا سفر مدین

حضرت موسیٰ ؑ کے سفر مدین کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ آپ نے ایک سوال کے جواب میں اپنے آپ کو "اعلم الناس" کہا۔ اس پر وحی ہوئی کہ فلاں جگہ ایک شخص تم سے بھی زیادہ عالم ہے۔ اس سے ملو۔ ایک مچھلی تل کر ساتھ رکھ لو۔ جہاں وہ گم ہو جائے، وہیں وہ شخص ملے گا۔ چنانچہ ایک جگہ وہ بھنی ہوئی مچھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی۔ بہر حال وہاں حضرت خضرؑ سے ملاقات ہوئی۔ وہ اسرار کونیہ کے بہت عالم تھے۔ موسیٰ ؑ ان کے ساتھ ہوئے دوران سفر ایک کشتی پر سوار ہوئے تو خضر ؑ نے کشتی کو عیب دار کر دیا۔ موسیٰ ؑ نے اس حرکت پر اعتراض کیا۔ انہوں نے پہلے اعتراض نہ کرنے کا وعدہ لے رکھا تھا۔ جو اس وقت یاد دلایا۔ موسیٰ ؑ نے معذرت کر دی۔ آگے بڑھے تو خضر نے ایک خوب رو لڑکے کو مار ڈالا۔ موسیٰ ؑ کو پھر اعتراض پیدا ہوا، وہ بول اٹھے۔ خضر نے پھر وعدہ یاد دلایا۔ موسیٰ ؑ نے کہا "اگر اب کے مجھ سے خلاف ورزی ہوئی، تو آپ مجھے اپنے سے الگ کر دینے میں حق بجانب ہوں گے۔ وہاں سے آگے بڑھے، تو ایک بستی والوں سے کھانا مانگا انہوں نے انکار کر دیا۔ وہاں ایک گرتی ہوتی دیوار کو خضر نے درست کر دیا۔ موسیٰ نے پھر اعتراض کیا تو خضر نے کہا کہ اب ہم تم اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ اس کے بعد تینوں واقعات کی تاویل بیان کی جو خضر کے غیب دان اور پیش بین ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ (تلخیص عثمانیؒ) صوفیہ کرام اپنے مخصوص رنگ میں اس سے عجیب وغریب باطنی نتائج نکالتے ہیں۔ پیری مریدی کی اہمیت اور ظاہر پہ باطن کی اور شریعت پر طریقت کی فضیلت ثابت کرتے ہیں وغیرہ ذالک۔

ان تفسیرات میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جن کا قرآنِ حکیم کے ظاہری الفاظ سے کوئی واضح تعلق دکھائی نہیں دیتا۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ

یہ واقعہ قبل نبوت کا ہے۔ جب موسیٰ ؑ فرعون سے بھاگ کر مدین کو چلے گئے۔ نبوت کے بعد قوم کی نگرانی انہیں اتنے طویل سفر کی مہلت کیسے دے سکتی تھی؟ جب کہ صرف ۴۰ دن کی غیر حاضری میں سامری نے بچھڑے کو خدا منوا کر قوم سے اس کی پوجا کرائی۔ ایسے تجربے کے بعد پیغمبرانہ فرائض کا اقتضا یہی تھا کہ ان کے ساتھ ساتھ رہیں۔

حضرت موسیٰ ؑ فرعون کے گھر میں پلے تھے۔ جب ان سے نادانستہ ایک قبطی قتل ہو گیا، تو فرعونی جماعت ان کو قتل کرنے کا مشورہ کرنے لگی۔ ایک وفادار خادم نے فوراً موسیٰ ؑ کو اس کی اطلاع دے دی اور کہا کہ "اس ملک سے نکل جائیے۔ اگر ان کو قتل خطا کی سزا (فدیہ، خون بہا) دی جاتی تو وہ اسی انصاف کو خوشی سے منظور کر لیتے، لیکن قتل تو خلاف عدل تھا۔ اس لیے انہیں فرعون کے زیر تسلط علاقے سے نکلنا پڑا۔ خادم ان کو کسی امن کی جگہ پہنچا دینا چاہتا تھا۔ موسیٰ ؑ نے کہا کہ میں مجمع البحرین سے ورے کہیں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا، کیونکہ وہ مقام فرعون کی حکومت سے باہر تھا۔ یہ بھی کہا کہ "یا میں مدتوں آگے کا سفر کئے جاؤں جب تک کہ

کوئی امن کی جگہ نہ ملے۔

جب دونوں مجمع البحرین پہنچے، تو کھانا تیار کرنے کے لیے انہوں نے ایک مچھلی پکڑی اور خادم سے کہا کہ اسے کھانے کے لیے تیار کرنا۔ پتھر پر آرام سے لیٹ گئے ...... خادم نے مچھلی کو بے جان سمجھ کر بے پروائی کی اور خیال کیا کہ اسے صبح کے قریب تیار کر لوں گا۔ لیکن مچھلی رات کی نمی پا کر پانی کو چیرتی ہوئی سمندر میں گم ہو گئی۔ حضرت موسیٰ اس وقت سو رہے تھے۔ صبح کو خادم انہیں یہ بات یاد دلانا بھول گیا۔

جب ریگستان میں چلتے چلتے تھک گئے۔ موسیٰؑ نے بھوک اور نقصان دور کرنے کے لیے کھانا مانگا تو خادم نے کہا۔ مچھلی کے سمندر میں چلے جانے کا ذکر آپ سے کرنا مجھے یاد نہیں رہا۔ شیطان نے غافل کر دیا۔ اب ہمیں واپس جانا پڑے گا۔

حضرت موسیٰؑ نے کہا۔ ہمیں مجمع البحرین تک پہنچنا ضروری تھا۔ اب ہم فرعون کی گرفت سے تو نکل آئے ہیں۔ پھر وہ دونوں انہی قدموں پر لوٹ آئے تاکہ خوراک حاصل کریں۔ انہوں نے وہاں تصرف الٰہی سے ایک بندے کو پایا۔ جس کو خدا نے اپنے حضور سے علم عطا فرمایا تھا۔ وہ علاقہ اس کی حکومت میں تھا۔ خادم انہیں اس بندے کے سپرد کر کے واپس چلا گیا۔ موسیٰؑ کو حصول علم کا اشتیاق تھا۔ انہوں نے اس بندے سے کہا۔

کیا میں آپ کے ساتھ چلوں، بشرطیکہ آپ مجھے وہ ہدایت سکھائیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے!

اس نے کہا: "تو میرے ساتھ صبر نہیں کر سکے گا اور تو کیسے صبر کر سکتا ہے جب کہ تجھ پر حقیقت منکشف نہ ہو۔"

وہ پختہ کار بندہ نوجوان اور گرم جوش موسیٰؑ کو صبر کی تعلیم دینا چاہتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے وعدہ کیا کہ میں مناسب وقت تک صبر کروں گا۔

اس نے کہا کہ میں اپنے کاموں کی حقیقت آخر کار تجھے بتا دیا کروں گا۔ لیکن جب تک میں خود نہ بتاؤں، تم مجھ سے کچھ نہ پوچھنا یہ وعدہ کر کے دونوں چل پڑے — اس نے تین کام کیے، جن پر موسیٰ ہر بار اعتراض کرتے رہے — اس نے موسیٰؑ کو اس طریقے سے یہ سکھایا کہ — تیرے جیسا اعلیٰ قابلیت کا آدمی بھی اس بات پر صبر نہیں کر سکتا جس کی حقیقت اسے معلوم نہ ہو۔ پھر عام لوگوں سے اس کی توقع کیسے رکھی جا سکتی ہے، تمہیں چاہیے کہ لوگوں کو پہلے حقیقت حال سے آگاہ کرو۔ کسی کے متعلق فتویٰ لگانے میں جلد بازی سے کام نہ لو۔ جب بندوں کے کاموں کی حکمتیں سمجھائے بغیر سمجھ میں نہیں آتیں، تو خدائے علیم و حکیم کی حکمتوں کو سمجھنے کے لیے انتظار کی بہت ضرورت ہے۔

مجمع البحرین وہ جگہ ہے جہاں اب نہر سویز ہے موسیٰؑ کے وقت یہ خاک نائے تھی اس کے جنوب کی طرف بحر قلزم اور شمال کی طرف بحر روم واقع تھا۔ اس خاک نائے میں بہت سی جھیلیں تھیں ان جھیلوں کو اٹھا کر کے اور پہاڑی راستے کو کاٹ کر جہازوں کی آمد و رفت کے لیے اب راستہ بنایا گیا ہے۔ ان میں سے بڑی جھیل کا نام منسل تھا نیل کی ایک شاخ جو اب خشک ہو گئی ہے، اس جھیل میں گرتی تھی۔ جھیل منسل اور بحر روم کے درمیان ایک وسیع پہاڑی راستہ تھا، جو بالعموم خشک پڑا رہتا تھا۔ حضرت موسیٰ اس راستے سے مدین پہنچے تھے اور بحکم الٰہی اسی راستے سے دوبارہ فرعون کے پاس تشریف لائے تھے سندھ کے اوقات میں جب کہ شمال کی طرف سے تیز ہوائیں چلتی تھیں،

بحر روم کا پانی اس پہاڑی راستے پر پھیل کر جھیل منسل کے ساتھ مل جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اس راستے کو مجمع البحرین کہتے تھے۔ موسیٰؑ بنی اسرائیل کو رات کے وقت لے کر چل کھڑے ہوئے۔ جب وہ تیسرے، چوتھے دن وہاں پہنچے، تو راستہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ فرعون کو جب خبر ہوئی کہ بنی اسرائیل رات کو بھاگ گئے ہیں، تو اس نے اپنے نقیب بھیج کر دوسرے علاقوں سے فوج منگوائی اور ساز و سامان کے ساتھ ڈبل مارچ کرتا ہوا، اُن کے پیچھے چلا اور دیکھا کہ وہ مجمع البحرین تک پہنچ چکے ہیں۔

بنی اسرائیل نے دیکھا کہ آگے پانی ہے پیچھے فرعون تو گھبرا کر کہنے لگے "ہم پکڑے گئے"۔ موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ تھا۔ انہوں نے کہا —— "ہرگز نہیں۔ میرا رب میری رہنمائی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کی کہ سونٹا مار کر اس خشک پہاڑی راستے کا پتہ لگاؤ —— بنی اسرائیل اسی راستے پانی کو چیرتے ہوئے نکل گئے، (جو اس وقت دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پانی کے پھیلاؤ کی وجہ سے سمندر بن چکا تھا (یا سمندر میں شامل ہو چکا تھا) اس لیے فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فرمایا۔ سمندر اس وقت تھما ہوا تھا۔ ہواؤں کے سبب اس میں سیلاب آنے ہی والا تھا جس نے بعد میں فرعونیوں کو غرق کر دیا۔

موسیٰؑ اور ان کا خادم اسی راستے سے گزر رہے تھے۔ وہ کسی خاص بندے کو ملنے کا ارادہ کر کے گھر سے نہیں نکلے تھے، اگر ایسا ہوتا، تو قرآن مجید میں "فوجدا عبداً من عبادنا" بطور نکرہ نہ آتا۔ بلکہ الف لام تعریفی کے ساتھ "فوجدا العبد" لایا جاتا۔ جس کے معنی یہ ہوتے کہ انہوں نے اس بندے کو پا لیا، جس کی طرف انہیں بھیجا گیا تھا۔

اس ساری داستان میں ایک نکتے پر زور دیا گیا ہے اور وہ ہے صبر۔ اس بندۂ خاص نے موسیٰؑ کو ہر بار یہی تعلیم دی کہ انسان کو جس بات کی خبر نہیں ہوتی، اس پر مشکل سے صبر کر سکتا ہے۔ واعظین کو چاہیئے کہ اپنی طرف سے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہیں۔ موسیٰؑ پر وعظ و تلقین کا عظیم بوجھ پڑنے والا تھا، اس لیے انہیں صبر و ضبط سیکھنا ضروری تھا۔ اس کے باوجود دیکھا جاتا ہے کہ وہ کبھی کبھی بے قابو ہو جاتے تھے اور بعد میں اس کو محسوس بھی کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ہارون کے سر اور داڑھی کو پکڑنے اور کھینچنے کے وقت ہوا۔

اب ان تینوں واقعات کی تاویل سنئے جو مفسرین کے نزدیک معجزات کی قسم سے ہیں۔ خواجہ صاحب خضرؑ کو اس علاقے کا صاحب اختیار شخص سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ابتدائی تعارف سے معلوم ہوتا ہے۔ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ وہ خاص رحمت اور خاص علم سے نوازا گیا تھا (کہف ۶۵) اس میں حکومت و سیاست وغیرہ شامل ہے۔

وَاَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ ..... الخ (کہف ۷۹) اب وہ بندہ ان باتوں کی حقیقت کھولتا ہے۔ وہ تقلیداً اپنی بات منوانا نہیں چاہتا تھا۔ مطلب یہ کہ خضرؑ ایسے خواص کی تقلید بھی درست نہیں۔

کیا فرض ہے کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے۔ (غالب)

ترجمہ —— لیکن وہ کشتی مسکینوں کی ملکیت تھی، جو سمندر میں کام کرتے تھے (مسکین محنت کیا کرتا ہے اور اپنا گذارا بخوبی چلا سکتا ہے۔ اور فقیر وہ ہے جو مرض یا بے کاری کی وجہ سے بالکل نادار ہو) سو میں (خضر) نے ارادہ کیا کہ اس (کشتی) کو عیب دار بنا دوں

اور ان کے آگے ایک بادشاہ ہے ہر ایک (سالم) کشتی کو غصب کر لیتا ہے (کشتی والوں نے کشتی شکنی سے اس بندے پر کوئی اعتراض نہیں کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو با اختیار شخص جانتے تھے انہوں نے موسیٰؑ و خضرؑ دونوں سے اجرت بھی نہیں مانگی)

وَاَمَّا الْغُلٰمُ ..... الخ (۸۰) ولیکن جو نوجوان لڑکا تھا، اس کے والدین صاحب ایمان تھے۔ پس ہم (خضر) ڈرے کہ یہ ان کو بھی اپنی سرکشی اور کفر سے نہ ڈھانک لے (وہ نوجوان جرائم پیشہ تھا۔ والدین مامتا کے سبب اسے پناہ دیتے تھے۔ خضر کو اندیشہ ہوا کہیں غلام لڑکا اپنی بداعمالیوں کا اثر والدین پر بھی نہ ڈال دے اور انہیں بھی کافر بنا دے۔ اولاد کے لیے ماں باپ کیا کچھ نہیں کر گزرتے۔ خضر اس کی تلاش ہی میں تھا۔ آج جب وہ اس سفر میں ملا تو اسے اپنے اختیارات سے کام لے کر قتل کر دیا) ——

اس کے بعد خضر کا قول ہے کہ

فَاَرَدْنَآ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ ..... الخ (۸۱) ہم نے چاہا کہ ان (مومن والدین) کے لیے ان کا رب (ایسی اولاد) بدل دے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر اور صلہ رحمی میں قریب تر ہو (اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکا نوجوان[1] تھا بچہ نہیں تھا۔ اگر کسی کا فسادی بیٹا مر جائے اور وہ اس پر صبر کرے تو امید ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ اسے نعم البدل عطا فرمائے۔ وَاَمَّا الْجِدَارُ ..... الخ (۸۲)

ولیکن جو دیوار تھی وہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو (گاؤں سے پرے) شہر میں رہتے ہیں۔ اور اس دیوار کے نیچے ان کا ایک خزانہ ہے اور ان کا باپ نیک تھا (اس نے میرے آگے اس خزانے کا ذکر کیا تھا اور کہا کہ آپ اس دیوار کا خیال رکھیں۔

گاؤں والوں نے مدت کے بعد دیکھنے کے سبب انہیں نہیں پہچانا۔ غالباً اسی وجہ سے انہوں نے کھانا دینے سے انکار کیا ہوگا۔ اور انہوں نے اپنا اختیار جتا کر کھانا نہیں مانگا —— اب خضر کہتے ہیں) سو تیرے رب نے ارادہ کیا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تیرے رب کی طرف سے رحمت ہے اور میں نے یہ بات اپنے حکم سے نہیں کی (خدا کے فرمان کے مطابق کیا ہے) یہ ان باتوں کی حقیقت ہے، جن پر تو صبر نہیں کر سکا منزل چہارم۔ ص۹۱ تا ۱۰۰

---

[1] الغلام: الولد الذی طر شاربه۔ غلام کے معنی وہ لڑکا ہے جس کی مونچھیں اُگ آئی ہوں (ص ۲۶۸ "قاموس الالفاظ والاعلام القرآنیہ" محمد اسمٰعیل ابراہیم۔ المطبعۃ العربیہ)

ذوالقرنین و یاجوج ماجوج

سورۂ کہف میں اصحاب کہف اور خضر؏ موسیٰ؏ کے بیان کے بعد تیسرا بیان ذوالقرنین کے واقعات پر مشتمل ہے۔ قدیم مفسرین یقینی طور پر متعین نہیں کر سکے کہ اس نام کی شخصیت کون تھی، کس زمانے میں اور کس ملک میں تھی؟ خواجہ صاحب بھی اس تحقیق میں الجھے بغیر سرسری تعین کر کے آیات کی تشریح کرتے ہیں اور مزعومہ خوارق کو اپنے اسلوب کے مطابق عقلی طور پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے ان کی تمہید اور پھر آیات پر نظر ڈالئے۔ لکھتے ہیں:

گذشتہ آیات میں ایک علم و حکمت والے حاکم (خضر) کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس پر لوگوں نے ذوالقرنین کا حال پوچھا (یَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ) قصہ گو لوگوں نے ان کو مجموعہ خوارق بنا رکھا تھا۔ خوارق کی تشہیر سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ غیر خدا کی پوجا کرائی جائے اور یوں اس کے بیٹے، بیٹیاں بنائی جائیں۔ مفسرین کے ہاں زیادہ ذخیرہ انہی قصہ گو لوگوں سے لیا گیا ہے (جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ اور بعض دیگر محققین نے اعتراف کیا ہے "مرتب")[1]

ذوالقرنین کے معنی ہیں دو زمانوں والا ـــــ نیک اور خیر خواہِ رعیّت اپنے عہد حکومت کے دو حصے کرتا ہے۔ ۱۔ داخلی استحکام۔ ۲۔ حدود کی حفاظت۔ ذوالقرنین امر اول سے فارغ ہو کر امر ثانی کی تکمیل کے لیے دورے پر نکلا۔

عظیم دیوار چین دنیا کے عجائبات میں شمار ہوئی تھی ـــــ لوگوں نے اسی دیوار کے سبب حضورؐ سے ذوالقرنین کا حال پوچھا ہو گا ـــــ یہ چین کا بادشاہ تھا۔ اس کا نام "چوانگٹی" تھا۔ اس کی حکومت چین اور جزیرہ نمائے سند چینی پر تھی۔ اس علاقے کی مغربی حد پر خلیج بنگال واقع ہے اس کی تہ میں سیاہ مٹی ہونے کے سبب اس کو آج تک کالا پانی، کہتے ہیں اس کے کنارے پر پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ پہاڑوں کے مساموں سے پانی رس رس کر دوسری طرف آ کر دلدلی چشمہ بناتا تھا۔ جو بہت وسیع تھا۔ ذوالقرنین نے اس حد کو کافی مضبوط پایا اور اپنے وقت کے لحاظ سے سمجھا کہ اس طرف سے کوئی بڑا لشکر میرے ملک پر حملہ آور نہیں ہو سکتا۔

ایک شخص جس کی آنکھیں زمین سے چھ فٹ اونچی ہوں کسی روشن چراغ کو تین میل سے آگے نہیں دیکھ سکتا۔ اس فاصلے میں وہ چراغ زمین کے حدب یا گولائی میں چھپ جاتا ہے۔ اس ذریعے سے زمین کا قطر اور محیط اور اس کی تمام وسعت و ضخامت وغیرہ کا پتا لگ سکتا ہے۔ اگر چراغ کی جگہ سورج ہو تو وہ زیادہ فاصلے پر غروب ہوتا معلوم ہو گا اور اگر آدمی گھوڑے ہاتھی وغیرہ پر سوار ہو تو وہ چیز زمین

---

[1] ثلاثۃ کتب لیس لہا اصول المغازی والملاحم والتفسیر۔ تین قسم کی کتابوں کی کوئی اصل نہیں، مغازی، ملاحم اور تفسیر۔ سیرۃ النبی حصہ اول علامہ شبلی، طبع سوم، مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ ص ۱۶

کے حدب میں چھپنے کے لیے زیادہ فاصلہ چاہیے گی۔ یہ تو خشکی کا حال ہوا۔ سمندر میں غائب ہو جانے والی چیزوں کا عکس اونچا آ جاتا ہے اس لیے وہ چیز خشکی کی بہ نسبت دیر کے بعد غروب ہوتی نظر آتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد اگر کوئی شخص کشتی میں بیٹھے اور دریا شرقاً غرباً واقع ہو اور دور تک سیدھا چلا جائے تو سورج پھر اس میں نظر آنے لگے گا۔ پانی کی گہرائی اگر دو گز ہو تو ظاہری نگاہ سے دیکھنے والے کو چھ گز کے قریب معلوم ہوتی ہے۔ سمندر کے صاف پانی میں سورج کا عکس صاف نظر آتا ہے لیکن دلدل میں اس کا عکس مدہم ہو جاتا ہے اور پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ ذوالقرنین کو معلوم ہوا کہ یہ دلدل ہی بہت لمبا چوڑا ہے۔ اس وجہ سے تیروں کے حملے سے محفوظ ہے۔
پھر وہ اپنے مسلک کی مشرقی حد پر گیا، جس سے آگے جاپان ہے۔ جاپان کے معنی ہیں "مطلع الشمس" یعنی سورج کے نکلنے کی جگہ۔ اس حد پر بحرالکاہل موجود ہے۔ سمندر میں خشکی کی نسبت سورج پہلے طلوع ہوتا ہے۔ پھر اس نے واقف کاروں سے بھی اس سمندر کی وسعت کا پتا دریافت کیا۔ یہ سمندر دنیا کے تمام سمندروں سے بہت بڑا ہے۔ ذوالقرنین اس قوم تک جا پہنچا جو اس سمندر کے کنارے رہتی تھی۔ طلوع کے وقت سورج اور اس قوم کے درمیان کوئی بستی یا پہاڑ حائل نہ تھا۔ اس حد کو بھی مضبوط پاکر وہ شمال مغربی حد کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں اس نے اسی دنیا کی ایک قوم دیکھی ـــــ جس نے التجا کی کہ یاجوج ماجوج زمین میں بہت فساد کرتے ہیں اور ہمیں ستاتے ہیں۔ ہم آپ کو چندہ فراہم کر دیتے ہیں۔ آپ ان دونوں پشتوں کے درمیان مضبوط دیوار بنا دیں اور برجوں پر پہرے بٹھا دیں۔ تاکہ وہ اس پر چڑھ نہ سکیں اور نہ حملہ کر سکیں۔ ممکن ہے کہ چیوانگ ٹی نے یاجوج ماجوج کو روکنے کے لیے تھوڑی سی دیوار بنائی ہو۔ قدیم ترین بادشاہ بھی اس کی تعمیر و تیاری اپنے اپنے دور میں کرتے رہے تھے اور ممکن ہے کہ اس کی تکمیل بعد والوں نے کی ہو۔ یاجوج ماجوج وہی لوگ ہیں۔ جن کو اب منگول اور منچور کہا جاتا ہے وہ منگولیا اور منچوریا کے رہنے والے تھے۔ ان تاتاریوں نے دنیا کو تہ و بالا کر دیا۔ اس سے محفوظ رہنے کے لیے کوہ یورال، کوہ الطائی اور دوسرے پہاڑی دروں میں دیواریں بنائی گئی تھیں۔ لیکن دنیا کی مشہور دیوار یہی (سد ذوالقرنین) تھی۔

ذوالقرنین دنیا کا کوئی بادشاہ ہو۔ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ نیک بادشاہ اپنے ملک و قوم کی حفاظت کس طرح کرتے ہیں اور وہ ہمیں سیاسیات کے اصول کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ جب تک رسول کریم کو ظالموں کی طرف سے ایذائیں پہنچتی رہیں۔ اور آپ کے ہاتھ میں عنان حکومت نہیں آگئی۔ اس وقت تک قرآن مجید میں "اطیعوا الرسول" کا حکم کہیں نہیں آیا ـــ لیکن جب حکومت ملی، آپ نے عدالتیں قائم کیں، نکاح و طلاق، سود وغیرہ کے فیصلوں اور دیگر سزاؤں کے جاری کرنے کے موقع آئے تو "اطیعوا الرسول" کا حکم نازل ہوا۔

اب متعلقہ آیات اور ترجمہ و تفسیر دیکھیے۔

اِنَّا مَکَّنَّا لَہٗ .... سَبَبًا (کہف ۸۴، ۸۵) ہم (خدا) نے اس (ذوالقرنین) کو قوت دی تھی اور اسے (اس کے عہد حکومت کے پہلے حصے میں) ہر شے کے اسباب (سامان) دے دیئے تھے۔ پس وہ ایک سامان کے پیچھے چلا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ ... حُسْنًا (۸۶) یہاں تک کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ (جہاں سورج زمین کی اوٹ میں آجاتا ہے) پہنچا (یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ آسمان پر چڑھ گیا اور وہاں اس نے زمین کی قومیں دیکھیں) تو اس نے معلوم کیا، سورج کیچڑ کے چشمے (کالے پانی کی خلیج) میں ڈوبتا ہوا یعنی زمین کی اوٹ میں آجاتا ہے (یا غروب ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کیچڑ میں غرق ہو جاتا ہے، بلکہ زمین کی اوٹ میں آجاتا ہے) اور اس (جائے غروب) کے پاس ایک قوم پائی — ہم نے کہا اے ذوالقرنین یا تو انہیں عذاب دے گا یا ان کے درمیان بھلائی اختیار کرے گا۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ ... نُّكْرًا (۸۷) اس نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ جو شخص ظلم (سرکشی) کرے گا، تو قریب ہے کہ ہم اُسے عذاب دیں گے۔ پھر اپنے رب کی طرف لوٹ جائے گا، تو وہ بھی اُسے سخت عذاب میں مبتلا کرے گا (جب مفسد لوگ باز نہ آئیں اور تائب نہ ہوں تو دوسرے عالم میں بھی سزا پاتے ہیں)

وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ... يُسْرًا (۸۸) (ذوالقرنین نے مزید عرض کی) اور جو امن پسند (یا مومن) ہو اور صلاحیت کے کام کرے، تو اس کے لیے خدا تعالیٰ کے ہاں نیک بدلہ ہے۔ اور ہم بھی اپنے معاملے میں اسے سہل بات کہیں گے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا (۸۹) پھر وہ ایک اور راہ پر چلا[1] حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ ... سِتْرًا (۹۰) یہاں تک کہ وہ اس جگہ پہنچا جہاں سورج نکلتا معلوم ہوتا تھا کہ ایسی قوم پر نکلتا ہے کہ ہم (خدا) نے ان کے لیے سورج کے ورے کوئی پردہ نہیں بنایا تھا اور روک نہیں ڈالی تھی۔

كَذٰلِكَ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا (۹۱) بات یونہی ہے اور اس نے وہاں جو کچھ خبریں پائیں ہم (خدا) نے انہیں گھیرا ہوا ہے (خدا کو ان کا پورا علم ہے۔ قصہ گو لوگوں کا بیان غلط ہے) ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا (۹۲) پھر وہ ایک اور راہ پر چلا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ ... قَوْلًا (۹۳) یہاں تک کہ جب وہ (بادشاہ) دو دیواروں کے درمیان پہنچا، تو ان دو دیواروں سے ورے اس نے ایک قوم کو پایا۔ وہ لوگ قریب نہیں تھے کہ بات کو سمجھیں۔ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ ... سَدًّا (۹۴) انہوں نے (ترجمان کے ذریعے سے) کہا اے ذوالقرنین بلاشبہ یاجوج ماجوج (منگول اور منچور) اس زمین میں فساد کرنے والے ہیں۔ کیا ہم تیرے لیے خرچ اکٹھا کر دیں اس شرط پر کہ تو ان کے اور ہمارے درمیان ایک دیوار بنا دے؟ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ ... رَدْمًا (۹۵) ذوالقرنین نے کہا جو کچھ میرے رب نے مجھے (مالی قوت) دی ہے، بہتر ہے۔ پس تم قوت (جسمانی) کے ساتھ میری مدد کرو۔ میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک (سنگین) دیوار تعمیر کر دوں۔

اٰتُوْنِيْ زُبَرَ ... قِطْرًا (۹۶) میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لاؤ (تاکہ میں پتھر کی سلوں کو جو دیوار میں لگائی گئی ہیں، ان کے

---

[1] والسبب الطریق (فاتبع سببا) اے سلک طریقاً، سبب کے معنی ہیں راستہ یعنی ایک راستے پر چل پڑا صفحہ ۲۰۲ قاموس قرآنی (حسن محمد موسیٰ۔ مطبع خلیل ابراہیم بالاسکندریہ ۱۹۶۶ء)۔

ذریعے سے جوڑ دوں) یہاں تک کہ جب وہ (دیوار) دو پشتوں کے درمیان برابر ہو گئی تو ذوالقرنین نے کہا کہ تم اس لوہے کو دھونک کر گرم کرو۔ یہاں تک کہ جب اُس (لوہے) کو آگ کی طرح کر دیا لوہا نرم ہو گیا تو اوزاروں سے اس کے سروں کو موڑ کر پتھر کے سوراخوں میں داخل کیا گیا اور تراشے ہوئے پتھروں میں اس لوہے کو چسپاں کر دیا گیا تاکہ وہ لوہا دیوار کے ساتھ ہموار ہو جائے۔ اور پگھلا ہوا تانبا ڈالا گیا تاکہ سرد ہو کر سوراخوں میں مضبوطی سے قائم ہو جائے۔ اور ممکن ہے کہیں کہیں مضبوط دروازہ بنانے یا کہیں شگاف بھرنے کے لیے بھی لوہے اور تانبے کا استعمال کیا گیا ہو۔ پتھر کی دیوار میں جہاں کہیں لوہے کا استعمال کیا گیا تھا، اس کے لیے ذوالقرنین نے کہا میرے پاس لاؤ تاکہ میں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دوں (تمام دیواریں جو یاجوج ماجوج کو روکنے کے لیے بنائی گئی تھی پتھر ہی کی تھیں پتھروں کو مضبوط کرنے کے لیے لوہے اور تانبے کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ دیواریں بہت چوڑی تھیں اور ان پر برج بھی بنائے گئے تھے دیوارِ چین اتنی فراخ تھی کہ اس پر چھ سوار پہلو بہ پہلو گھوڑے دوڑا سکتے تھے۔ اب بھی اس کا معائنہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ دیوار ایک پہاڑ کا منظر دکھا رہی ہے۔

فَمَا اسْطَاعُوْٓا ..... نَقْبًا (۹۷) پس وہ (یاجوج ماجوج) اس (دیوار) پر چڑھنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور (لوہے، تانبے کی مضبوطی کے سبب) اس میں نقب بھی نہیں لگا سکتے تھے۔

قَالَ هٰذَا ..... حَقًّا (۹۸) دیوار تیار ہو چکی تو ذوالقرنین نے) کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے۔ پس جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ (جیسا کہ اس وقت ان دیواروں کا حال ہو چکا ہے ــــ لوگوں کا خیال ہے کہ یاجوج ماجوج کسی آئندہ قیامت کے وقت آئیں گے۔ قرآن مجید اس کی تردید کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے۔ وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (انبیاء ۔ ۹۵-۹۶-۹۷) جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ اس کے لیے یہ بات حرام ہے کہ وہ یاجوج ماجوج کے کھلنے اور ہر بلندی سے دوڑتے آنے تک خدا کے حضور پیش نہ ہو (ہر بستی کا یاجوج و ماجوج کے ساتھ کیا تعلق ہے)۔ اور خدا کا سچا وعدہ قریب ہے۔ وہ اسی وقت آتا ہے جب کافروں کی آنکھیں (حیرت و دہشت سے) کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔

اس آیت سے یاجوج و ماجوج کی سکونت کا پتا بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ وسط ایشیا ایک طویل و عریض سطح مرتفع ہے۔ اسی میں پامیر بھی شامل ہے۔ جسے بام دنیا کہتے ہیں۔ یاجوج ماجوج کے ہر بلندی (حدب) سے بھاگنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسی سطح مرتفع کے باشندے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کی آبادی کا آغاز یہیں سے ہوا ــــ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ زمین کی ہر شے فنا ہونے والی ہے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن ۔ ۲۶) اس سورۂ کہف کے آغاز میں بھی فرمایا ہے وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا (۸) اور ہم ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں مٹا کر خالی میدان بنانے والے ہیں ــــ دیوار خواہ کتنی ہی مضبوط ہو وہ بھی کبھی بقول ذوالقرنین ٹوٹ پھوٹ جائے گی) اور میرے رب کا وعدہ سچ ہے۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ ..... جَمْعًا (۹۹) (جب دیوار بن رہی تھی، تو ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج میں جنگ بھی ہو رہی تھی ۔

ذوالقرنین ان مفسدوں کو جو دیوار کی تکمیل میں حارج تھے تباہ کو رہا تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہے) اور ہم نے اس دن ان کو اس حال میں چھوڑا تھا کہ ایک دوسرے (لشکر آپس) میں گھس رہے تھے اور (جنگی) بگل پھونکا گیا اور اُن (جنگ آوروں) کو ہم نے اکٹھا کیا۔

وَعَرَضْنَا .... عَرْضًا (۱۰۰)۔ (جنگ میں بہت سے مفسد مارے گئے اور واصل جہنم ہوئے، جیسا کہ ارشاد ہے اور ہم نے اسی دن جہنم کو کافروں کے سامنے بخوبی پیش کر دیا۔

ﹶالَّذِيْنَ كَانَتْ .... سَمْعًا (۱۰۱) ـــــ (وہ کافرون ہیں جو وہ ایسے لوگ ہیں) جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھیں (آنکھوں سے عجائبات الٰہی نظر آتے ہیں اور ذکر میں مدد ملتی ہے) اور وہ دوسروں سے سن کر بھی (ذکر الٰہی) نہیں کر سکتے تھے۔ (منزل چہارم ص۱۰۱ تا ۱۰۶ تلخیص)

ابراہیمؑ اور آگ

کفار جب ابراہیم علیہ السلام سے بحث و مناظرہ میں عاجز آگئے تو انہوں نے آخری تدبیر یہ سوچی کہ جس طرح اس نوجوان (ابراہیمؑ) نے ہمارے معبود (بُت) توڑ کر ہمارے دل جلائے ہیں، اس کو آگ میں جلا ڈالیں۔ آخر ظالموں نے جمع ہو کر نہایت اہتمام اور بے رحمی سے حضرت ابراہیم کو سخت بھڑکتی آگ کے نذر کر دیا۔ جیسا کہ بحر المحیط میں ہے " انہ علیہ السلام القی فی النار فجعلھا اللہ علیہ برداً وسلاماً۔ تکویناً آگ کو حکم ہوا کہ ابراہیم پر ٹھنڈی ہو جا..... آگ کا ابراہیم پر ٹھنڈا ہو جانا ان کا معجزہ تھا۔ (تلخیص عثمانیؒ)

خواجہ صاحب اپنے ذوق و تحقیق کے مطابق اس مقام پر لکھتے ہیں، قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ (انبیاء۔ ۶۸) جب مخالفین مقابلے میں ہار گئے تو لڑائی پر اتر آئے۔

چو حجت نماند جفا جوئے را　　بہ پرخاش درہم کشد روئے را

آپس میں کہنے لگے (کہ ہمارے بزرگوں یعنی بتوں نے اس ابراہیمؑ کو گستاخی و بت شکنی کی کوئی سزا نہیں دی تم (خود ہی) اس کو جلا ڈالو اور اپنے (کمزور) معبودوں کی خود ہی مدد کرو اگر تم (کچھ) کرنے والے ہو) ابراہیم کی بحث ہستی باری تعالیٰ پر ملک کے بادشاہ سے ہو چکی تھی۔ وہ ظالم لاجواب ہو گیا تھا۔ اگرچہ لوگ ابراہیم سے سخت ناراض تھے لیکن ملکی قانون کے سبب کھلم کھلا شرارت نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے ایک داؤ کیا۔ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا۔ صافات۔ ۹۸ اور کہا کہ ان کو جلانے کے لیے شہر سے باہر ایک عمارت بناؤ اور وہاں آتش پرستی کے لیے ایک بھٹی تیار کرو اور ابراہیم کو وعظ کے بہانے سے لاؤ اور آگ میں ڈال دو اور راکھ بنا دو۔ اس طرح ہمارے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس تجویز کے مطابق شہر سے فاصلے پر ایک عمارت بنائی اور بھٹی کو خوب تپایا، قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ (صافات ۹۷) اور ابراہیمؑ کو وعظ کے بہانے بلا بھیجا۔ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا (ایضاً) ـــــ اللہ تعالیٰ پر سچا بھروسا ہو تو کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ـــــ ان کا ارادہ تھا کہ ابراہیم کو آگ میں تڑپائیں گے اور اس کے جسم کو ریزہ ریزہ کر دیں گے۔ حکمت الٰہیہ سے اس بھٹی کی آگ اس مکان کو لگ گئی اور وہ خود ہی زرغے میں آگئے۔ چھتیں ان پر گر پڑیں اور وہ نیچے دب گئے فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ (صافات۔ ۹۸) (خدا نے انہی کو کر دیا نیچے دبے ہوئے ـــــ اور سخت گھاٹے والے بن گئے (اخسرین) جب ابراہیمؑ وہاں پہنچے تو آگ ٹھنڈی (بردا) اور بے ضرر (سلاما) ہو چکی تھی۔ آگ کے مالک ہی نے اس کو ایسا حکم دیا تھا کہ "تیری گرمی ابراہیم کو نہ پہنچے۔

جیسا کہ ارشاد ہے)

قُلْنَا یَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (انبیاء-۶۹) —— (لوگ چاہتے تھے کہ ابراہیم کو آگ میں جلائیں اور راکھ بنادیں۔ لیکن خدا فرماتا ہے) ہم نے کہا اے آگ تو ابراہیم (کے تن) پہ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جانا! (تیرا ضرر ابراہیم کو ہرگز نہ پہنچے)

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ (اس آگ کا ضرر دغا بازوں ہی کو پہنچا۔ جیسا کہ فرمایا) اور انہوں نے اُس (ابراہیم) کے ساتھ داؤ کا ارادہ کیا۔ سو ہم نے انہیں ہی سخت گھاٹے والے بنا دیا۔

ابراہیم علیہ السلام آگ میں ہرگز نہیں ڈالے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تجویز کردہ آگ سے ان کو بچالیا۔ فَاَنْجٰهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (عنکبوت-۲۴) جس طرح لوطؑ کو اس سزا سے بچایا تھا جو ان کی قوم کے لیے تجویز کی گئی تھی۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۔ (قمر ۳۴) ہم (خدا) نے قوم لوطؑ پر پتھر برسائے سوائے لوط کے لوگوں کے۔ انہیں ہم نے صبح کے وقت بچالیا۔ (منزل چہارم ۲۴۱ و ۲۴۲)

حضرت ابراہیم پر اتہام

قرآن حکیم نے وضاحت فرمائی ہے کہ ابراہیم سچے نبی تھے۔ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (مریم ۔۴۱) "صدیق" کے معنی ہیں بہت زیادہ سچ کہنے والا، جو اپنی بات کو عمل سے سچا کر دکھائے۔ یا وہ راست باز، پاک طینت جس کے قلب میں سچائی کو قبول کرنے کی نہایت اعلیٰ واکمل استعداد موجود ہو۔ جو بات خدا کی طرف سے پہنچے اس کے دل میں اُتر جائے۔ شک و تردد کی گنجائش نہ رہے۔ ابراہیم ہر ایک معنی میں صدیق تھے اور چوں کہ صدیقیت کے لیے نبوت لازم نہیں، اس لیے آگے "صدیقاً" کے ساتھ "نبیاً" فرما کر نبوت کی تشریح کر دی (عثمانی ؒ)

اس کے برعکس بخاری و مسلم متفق ہیں کہ

لم یکذب ابراھیم فی شئ قط الا ثلاث ۔ ابراہیم نے صرف تین مرتبہ کذب بولا۔ ہمارے بعض مفسرین اس کو "توریہ"[1] کا لباس پہنا کر مباح قرار دیتے ہیں، یعنی مصلحت شرعی کے وقت اس قسم کی مغالطہ دہی مباح ہے۔ لیکن حدیث نے اس کو "ذنب" بھی قرار دیا ہے جس کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ یہ "حسنات الابرار سیئات المقربین" میں داخل ہے (تلخیص عثمانی زیر آیہ اِنِّی سَقِیْم ۔ صافات ۸۹)

امام ابوحنیفہ، امام رازی، علامہ فراہی اور مولانا ابوالکلام[2] نے اس حدیث (لم یکذب) کی صحت سے انکار کیا ہے۔ خواجہ صاحب بھی اس کو تسلیم نہیں کرتے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ ..... عٰكِفُوْنَ (انبیاء ۔۵۲) جب کہ ابراہیم نے اپنے باپ اور قوم سے کہا "یہ مورتیں کیا ہیں، جن کے لیے تم اعتکاف میں بیٹھتے ہو (اپنے نفع و ضرر کے لیے ان کی طرف دھیان لگاتے ہو، ان کا تصور باندھتے ہو)

قَالُوْا وَجَدْنَآ ..... عٰبِدِيْنَ (۵۳) انہوں نے کہا "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پوجا کرنے والے پایا ہے" یعنی محض تقلید آباء ہے ـــــ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی قبر یا مورت سے کسی نفع کی امید پر معتکف ہونا، اس کو معبود بنانے کے مترادف ہے)

قالوا اجئتنا ..... لعٰبین (۵۴) (ابراہیم نے) کہا بلا شبہ تم اور تمہارے باپ دادا کھلی گمراہی میں چلے آرہے ہو۔ انہوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس حق لے کر آیا ہے یا کھیل کرنے

---

(۱) یعنی اصل بات چھپا کر دوسری بات کرنا (مصباح اللغات)

(۲) ان بزرگوں کی تحقیق اپنے موقع پر آئے گی۔ ان شاء اللہ

والوں سے ہے؟ (یعنی بے حقیقت باتیں بنا رہا ہے۔ اگر تو ان دیوتاؤں کی ہتک کرے گا، تو یہ تجھے تباہ کر دیں گے۔ حضرت ابراہیم نے کہا، اگر تمہیں امتحان منظور ہے تو میں ان کے ساتھ جنگ بھی کروں گا تو یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے)

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ ...... شَاهِدِيْنَ (۵۶) ابراہیم نے کہا (یہ تمہارے رب نہیں ہیں) بلکہ تمہارا رب وہ ہے، جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، جس نے انہیں (تمام مخلوقات) کو پیدا کیا ہے اور میں اس بات پر (بھی) گواہی دینے والوں سے ہوں (سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بُت خانہ ایسا تھا، جہاں سے ابراہیم ایسے موحد دشمن اصنام کو نکالا نہیں جا سکتا تھا وہ بتوں کے سامنے موجود ہیں اور ان کی مخالفت کر رہے ہیں ـــــ ان کا باپ صاحب حیثیت آدمی تھا اور حکومت میں بھی دخیل تھا۔ اس نے توحید دشمنی کی بنا پر ابراہیم کو نہ صرف گھر سے بلکہ ملک سے نکال دیا تھا ـــــ یہ بت خانہ اس نے اپنے گھر میں بنا رکھا تھا اس کا منتظم اور کفیل وہ خود یا اس سے میل ملاپ رکھنے والے چند افراد تھے۔ وہ خاص اوقات میں دوسرے لوگوں کے لیے بھی کھولا جاتا تھا۔ ابراہیمؑ کا مقابلہ و مباحثہ اور بعد میں قسم کھا کر بت شکنی کا عہد انہی خاص لوگوں کے ساتھ ہوا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ ابراہیم اس مقابلے میں بُزدل ثابت ہوگا اور اپنے باپ سے مرعوب ہو کر رُک جائے گا۔ لیکن ابراہیم عہد کے پکے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے ڈرنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنا بت شکنی کا کام کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ "تم مشرکوں کے جھوٹے معبودوں کو بھی گالی مت دو، اگر تم نے ایسا کیا تو وہ دشمنی اور ضد میں آ کر تمہارے خدا کو گالیاں دینے لگ جائیں گے (انعام ۱۰۹) دلیل کی قوت سے کسی کی کمزوری ثابت ہو تو درست ہے لیکن خواہ مخواہ ستانا، بدامنی پھیلانے کے مترادف ہے۔

اگر بادشاہ جبر مذہبی کا حامی ہو تو وہ صرف ایک ہی قوم پر بُری بھلی حکومت کر سکتا ہے لیکن نیک اور معقول پسند بادشاہ تمام اہل مذاہب کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ان کو تعلیمی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے تاکہ وہ علمی بصیرت حاصل کر کے خود ہی حق و صداقت کو کذب و باطل پر ترجیح دے سکیں۔ وہ مسجدوں اور معبدوں کی طرح بت کدوں اور آتش کدوں کی بھی حفاظت کرتا ہے وہ کسی مذہبی فرد کو اجازت نہیں دیتا کہ بُت کدے میں گھس کر بت شکنی کرے ـــــ لیکن اگر کوئی قوم خود ہی ایسا امتحان پیش کرے ـــــ "آؤ ہمارے معبودوں (بُتوں) پر حملہ کر کے دکھاؤ"، تو ایسا امتحان فریقین کے ذمہ دار لوگوں کی منظوری سے جائز ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی واقعہ حضرت ابراہیم کو پیش آیا تھا)

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ ...... مُدْبِرِيْنَ (۵۷)۔ (نیکی پسند ابراہیمؑ نے بہر حال احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کھلے الفاظ میں بت شکنی کا اعلان کرنے کے باوجود بت پرستوں کے سامنے بت نہیں توڑے)۔ انہوں نے کہا۔ اور خدا کی قسم میں تمہارے بتوں کے ساتھ ضرور داؤ کروں گا۔ جب کہ تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے (اور ثابت کر دوں گا کہ تمہارے معبود نہ میرا کچھ بگاڑ سکے اور نہ اپنا دفاع کر سکے۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا ...... يَرْجِعُوْنَ (۵۸) پس (ان کے جانے کے بعد) اُس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

نگران کے بڑے بت کو چھوڑ دیا تا کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں وہ لوگ رب العالمین کو مانتے تھے۔ لیکن اس کی کائنات میں دوسرے معبودوں کو بھی مختار قرار دیتے تھے۔ بڑا بت ان کے نزدیک رب العالمین کی تمثال تھا۔ اس کی بڑائی کا تقاضا ہے کہ وہ لاشریک ہو۔ اس لیے وہ خود ہی چھوٹے شریکوں کو ختم کرنے یا توڑنے کا باعث بنتا ہے۔

سورۂ شعراء میں آیت ۷۰ سے ۸۹ تک حضرت ابراہیم کا مقولہ ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ

(اے لوگو! تم اور تمہارے آباء جن کی پوجا کرتے چلے آرہے ہو یہ سب میرے دشمن ہیں، سوائے رب العالمین کے جو میری تمام روحانی و جسمانی ضروریات کا کفیل ہے اور دوسری زندگی میں بھی اس سے فلاح و نجات کی توقع رکھتا ہوں..... الخ پس اس کی وحدانیت مقتضی ہے کہ اس کے جعلی شریک مٹا دیئے جائیں۔ جب قوم کے ذمہ دار لوگوں نے اس مقابلے کو منظور کر لیا تو یہ کام خدا کے حکم سے انجام پایا۔ حضرت ابراہیم نے بالمشافہ قسم کھا کر کہا کہ میں تمہارے بتوں کے ساتھ داؤ کروں گا۔ اگر مخالفین نے امتحان کا عہد نہ کر لیا ہوتا تو وہ اس اطلاع کے بعد بت خانے کی حفاظت کرتے۔ اور حضرت ابراہیم کو وہاں تک پہنچنے میں رکاوٹ ڈال دیتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا)

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ ...... الظّٰلِمِیْنَ (۵۹)۔ (جب مشرک دوسرے موقع پر مندر میں آئے تو کہنے لگے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کام کس نے کیا ہے۔ بلاشبہ وہ ضرور ظالموں سے ہے (ان کو اس معاہدے کا علم نہ تھا جو ان کے ذمہ داروں نے ابراہیمؑ سے کیا تھا)

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى یَّذْكُرُهُمْ یُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِیْمُ (۶۰) ــــ (معاہدے کی منظوری دینے والوں نے) کہا۔ ہم نے ایک نوجوان کو سنا ہے کہ وہ ان (بتوں کی کمزوری) کا ذکر کرتا تھا۔ اس کا نام ابراہیم ہے۔

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْیُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَشْهَدُوْنَ (۶۱) انہوں نے کہا۔ اسے لوگوں کے سامنے لاؤ۔ تاکہ وہ دیکھیں (کہ اس ارتکاب کے بعد وہ کس حال میں ہے)

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰٓاِبْرٰهِیْمُ (۶۲) ــــ (جب ابراہیم ان کے سامنے آئے تو) انہوں نے کہا۔ اے ابراہیم کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کام کیا ہے؟

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا یَنْطِقُوْنَ (۶۳)۔ (ابراہیم نے کہا (میں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا) بلکہ ان کے اس بڑے نے (جس کو تم رب العالمین کی تمثال قرار دیتے ہو) یہ کام کیا ہے (اگر یہ کچھ اختیار رکھتے ہیں تو) ان سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہیں۔

اس مکالمے کے اخیر میں وہ اپنی شکست تسلیم کر لیتے ہیں اور حضرت ابراہیم بتوں کی ناکارگی اور بت پرستوں کی نالائقی پر سخت ملامت کرتے ہیں۔ انجام کار آتش افروزی کا واقعہ پیش آتا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے منزل چہارم ص ۲۲۶ تا ۲۳۰

عجیب واقعہ | خواجہ صاحب کی پیرانہ سالی کے خیال سے، پہلی منزل کی تکمیل کے بعد دوستوں میں مشورہ ہوا کہ آخری منزل

ہفتم کی تفسیر پہلے کرائی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہاں تک پہنچنے سے پہلے مفسرِ علام کی زندگی کے دن پورے ہو جائیں اور قرآن مجید کی آخری منزل کی سورتیں جو بہت سے عمیق و مشکل مسائل پر مشتمل ہیں، غیر مفسرہ رہ جائیں۔ خواجہ صاحب نے اس مشورہ کو قبول فرمایا ـــــ اس کی تکمیل کے بعد پھر سے دوسری منزل کی طرف توجہ فرمائی اور پانچویں منزل کی سورۂ قصص کی سترویں آیت تک پہنچ کر زندگی کے آخری مرض میں مبتلا ہو کر راہیِ آخرت ہو گئے۔ آخری آیت جس کی تفسیر ان کے اپنے الفاظ میں ہے۔ یہ ہے۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (قصص ۷۰)

اس کے بعد منزل پنجم کی بقیہ سورتیں اور منزل ششم کی پوری کی پوری تفسیر خواجہ صاحب کے خطبات جمعہ سے جو مطالب جمع کئے گئے تھے، ان پر مبنی ہے ان کی ترتیب کی ذمہ داری خواجہ صاحب کے ایک عقیدت مند عبداللہ پہلوان نے قبول کی۔ اس لیے کہ جب خواجہ صاحب خطبہ دیا کرتے تھے تو وہ پنسل کاغذ ہاتھ میں لے کر بیٹھا کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ نوٹ لیتے جاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے منزل ششم کے آغاز میں "عرض مرتب" کے عنوان سے سطور لکھی ہیں۔ ان میں اعتراف کرتے ہیں کہ

"حضرت خواجہ احمد الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی میں تفسیر "بیان للناس" کی چار پہلی منزلیں اور ایک آخری ساتویں منزل مکمل فرمائیں اور پانچویں منزل سورۂ قصص کی آیت ۷۰ تک بھی حضرت مرحوم ہی کے قلم مبارک سے مرقوم ہوئی۔ اس کے بعد قصص کے باقی حصے سے سورۂ یٰسین تک اور زیر نظر منزل ششم تمام تر حضرت خواجہ صاحب مرحوم کے فرمودہ خطبات جمعہ کی یادداشتوں سے مرتب کی گئی ہے۔ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ حضرت مرحوم کے معانی و مطالب کو اپنے الفاظ میں پیش کر دوں۔ امید ہے کہ میری یہ ناچیز محنت دوستوں کے بڑھتے ہوئے شوق کے لیے کسی قدر تسکین کا موجب ثابت ہوگی۔ عبداللہ پہلوان"

اب ہم زیر تفسیر آیات متعلقہ حضرت ابراہیم کی تشریح کے لیے اس منزل ششم کی طرف رجوع کرتے ہیں ـــــ سورہ صافات پیش نظر ہے۔ آیت ۸۳ سے ۱۱۳ تک حضرت ابراہیم اور ان کے ضمن میں حضرت اسحٰق کا ذکر چل رہا ہے۔ اس ذکر کی تمہید میں سورۂ انبیاء کی آیات مذکورہ بالا کی طرف اشارات کئے گئے ہیں ـــــ ابراہیم علیہ السلام قوم کی صنم پرستی پر نہایت سخت تنقید کر رہے ہیں۔ قوم کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ ہمارے بزرگوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ نوجوان ابراہیم بزرگانِ قوم کے سامنے ان کے سلف کو گمراہ کہنے سے بھی نہیں جھجکتے۔ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (الانبیاء ۵۴) وہ لوگ ایسے "گستاخانہ" الفاظ سننے کو تیار نہیں تھے۔ یہ ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ کوئی شخص ان کے معبودوں کی توہین کر کے زندہ رہ سکتا ہے ـــــ ابراہیم تن کر کہتے تھے ـــــ کہ تمہارے مسلک کی عمارت باطل پر کھڑی ہے اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ (صافات ۸۶) یہ تمہارا نہ کچھ سنوار سکتے ہیں اور نہ ہی بگاڑ سکتے ہیں۔ لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ (انبیاء ۶۶) میں تجربہ کر کے دکھلا دوں گا کہ ان میں کوئی قوت و اختیار نہیں۔ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ (انبیاء ۵۷) ـــــ ابراہیمؑ کا خیال تھا کہ وہ لوگ اپنے خداؤں کے ریزے ریزے دیکھ کر بڑے بت سے (جسے رب العالمین سمجھتے تھے) دریافت کریں گے کہ تمہارے ہوتے یہ کیسا حشر ہوا؛ پھر جب انہیں کوئی جواب نہیں ملے گا اور اس "خدا" کی بے بسی عملاً ان پر کھل جائے گی تو ممکن ہے کہ وہ اس گمراہی سے باز آ جائیں ـــــ

لیکن ان کی یہ امید نہ بر آئی۔ واقعات کا تسلسل اس طرح ہے کہ

۱۔ ابراہیم علانیہ قوم کی گمراہی ثابت کرتے ہیں اور قوم انہیں اپنا دشمن سمجھ لیتی ہے۔

۲۔ وہ آگاہ کر دیتے ہیں کہ تمہارے بتوں کی ہتک و توہین میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

۳۔ وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔

آپ کی ہر ہر بات صاف گوئی کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ پھر آپ کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟
بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوهُمْ اِنْ كَانُوا يَنْطِقُونَ (انبیاء۔ ۶۳) سے واضح ہوتا ہے کہ آپ منطق و فلسفہ سے ہٹ کر عملی اور تجرباتی دلیل سے ان کو لاجواب کر رہے ہیں کہ تمہارے خدا بالکل بے بس ہیں — اب وہ لوگ پشیماں اور خاموش ہیں۔ ان کے دل ابراہیم کی صداقت کے معترف ہو چکے ہیں۔

اسی طرح اس آیت "اِنِّی سَقِیْمٌ" کے پیچھے بھی روایت نے حضرت ابراہیم پر جھوٹ کا الزام لگایا ہے — اس کا صحیح مفہوم قرآن کے اپنے الفاظ میں یہی ہے کہ "میں (تمہارے مشرکانہ اعمال کو دیکھ دیکھ کر) بیمار (ہو گیا) ہوں" — واقعتہً آپ قوم کی گمراہیوں سے دل برداشتہ اور کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ معلوم نہیں اس سیدھی بات کو جھوٹ قرار دینے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی۔

تیسرا جھوٹ جو خدا کے سچے نبی ابراہیم علیہ السلام پر لگایا گیا ہے۔ قرآن اس کا ذمہ دار نہیں۔ وہ ایک روایت کی بنا پر گھڑا گیا ہے۔ اس لیے تفسیر قرآن میں اس کے دفاع کی ضرورت نہیں۔

داؤد و سلیمان علیہما السلام

حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے اکثر واقعات ہمارے مفسرین کے نزدیک معجزات پر مبنی ہیں۔ یہاں ان کو درج کیا جائے تو بہت بڑا دفتر بن جائے۔ اور اس لیے بھی ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ وہ اکثر ہمارے واعظوں کی زبان پر رہتے ہیں اور عوام کی اکثریت کو معلوم ہی ہیں۔ لہٰذا جن آیات سے معجزات نکالے جاتے ہیں۔ ان کی عقلی تفسیر "بیان الناس" سے ملخصاً درج کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ سورۂ انبیاء اور بعض دوسری سورتوں سے یہ حالات ماخوذ ہیں۔

ایک مقدمے کا فیصلہ

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ (انبیاء ۷۸) اور (ذکر کر) داؤد اور سلیمان جب کہ وہ ایک کھیتی کے متعلق فیصلہ کرتے تھے۔ جب اس (کھیتی) میں رات کے وقت (چرواہوں کی غفلت سے) ایک قوم کی بکریاں چر گئیں اور ہم (خدا تعالیٰ) ان کے فیصلے کو دیکھنے والے تھے۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ (۷۹) سو ہم نے سلیمان کو اس (مقدمے) کا خوب فہم دیا اور ہم نے ہر ایک (داؤد، سلیمان اور ارکان شوریٰ) کو حکمت (قوت فیصلہ) اور علم دیا۔

وہ بکریاں کسی ایک شخص کی نہ تھیں بلکہ ایک قوم کی ملکیت تھیں۔ جن کی حفاظت کے لیے چرواہے ملازم رکھے ہوئے تھے۔ ان کی غفلت سے باڑے کا دروازہ کھلا رہ گیا اور بکریاں کھیتی کو چر گئیں۔ حضرت داؤد نے اس کے فیصلے کے لیے مجلس شوریٰ بلائی جیسا کہ "لحکمھم" بصیغۂ جمع سے ظاہر ہے۔ اس میں داؤد و سلیمان بھی شامل تھے جیسا کہ "یَحْکُمٰنِ" بصیغہ تثنیہ سے واضح ہے۔ داؤد کا فیصلہ صحیح نہیں تھا۔ وہ غالباً اس نقصان کا بوجھ قوم پر ڈالتے ہوں گے۔ قوم بے قصور تھی۔ اس کا باعث چرواہوں کی غفلت تھی۔ اس لیے انہیں فہمائش کی جا سکتی تھی لیکن کھیت والے کا نقصان تو اس طرح ہوا۔ جیسے کسی کے مکان کو آگ لگ جائے۔ یا کوئی قدرتی مصیبت آ جائے۔ اس میں کھیت کے رکھوالوں کی غفلت کا تعلق بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید ایسے نقصان رسیدوں کو "غارمین"[1] کہتا ہے۔ اور نقصان کی تلافی بیت المال (سرکاری خزانے) کی ذمہ داری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان نے یہی فیصلہ دیا ہوگا اور یہی صحیح ہے۔

---

[1] غارمین (توبہ - ۶۰) جن پر کوئی حادثہ پڑا اور مقروض ہو گئے یا کسی کی ضمانت وغیرہ کے بار میں دب گئے۔ اس کے لفظی معنی ہیں "تاوان بھرنے والے" (شیخ الہند عثمانی رحمہما اللہ تعالیٰ)

یہ آیت کہہ رہی ہے کہ رسل وانبیاء بھی اجتہادی فیصلوں میں غلطی کر سکتے ہیں۔ ان کے اجتہادی فیصلے وحی نہیں ہوتے ـــــ آیت کے اگلے حصّے کا ترجمہ حسب ذیل ہے) اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں (یعنی اہل جبال) کو کام میں لگا دیا جو (صبح وشام) نماز نمازیں پڑھتے تھے۔ اور نیز رفتار رہ گاروں اور جاسوسوں کو بھی (کام میں لگا دیا) اور ہم ہی (توفیق عطا) کرنے والے تھے (ان کی اپنی طاقت نہ تھی کہ ایسا عروج حاصل کر سکیں۔)

مفسرین کہتے ہیں کہ پہاڑ اور پرند جانور بھی ان (داؤد) کے ساتھ تسبیح پڑھنے لگتے تھے۔ (عثمانی) ـــــ خواجہ صاحب قرآن مجید سے استدلال کرتے ہیں کہ پہاڑ سے مراد پہاڑ والے اسی طرح ہے جس طرح قریہ سے اہل قریہ۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا (طلاق - ۸)

بہت سی بستیاں تھیں جو اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے نکل گئیں۔ پھر ہم نے ان (بستیوں) کا سخت حساب لیا۔ سو ان بستیوں نے اپنے کام کا وبال چکھا۔ اور ان بستیوں کے کام کا انجام گھاٹا ہوا۔

اس آیت میں سات مؤنث ضمیریں بستیوں ہی کی طرف لائی گئی ہیں۔ لیکن سب مانتے ہیں کہ یہاں بستیوں والے مراد ہیں۔ اسی طرح جبال سے اہل جبال مراد ہو سکتے ہیں یہ قوم عمالقہ کے لوگ تھے جنہیں بنی اسرائیل "جبابرین"[1] کہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ پہاڑی جن تھے۔ داؤد علیہ السلام نے ان پر فتح پائی اور قابو میں لے آئے۔ وہ دن بھر داؤدؑ کے ساتھ کام کرتے تھے۔ پچھلے پہر اور دن چڑھے داؤد کے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے ـــــ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ۔ (ص - ۱۸) دوسری جگہ فرمایا ہے۔

يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ (سبا - ۱۰) ہم نے پہاڑوں (یعنی پہاڑی لوگوں) کو کہا کہ تم داؤد کے ساتھ سارا دن چلو پھرو اور قوم طیر کو بھی ان کے ساتھ کام میں لگا دیا ـــــ یعنی پہاڑ داؤد کے ساتھ چلا پھرا کرتے تھے "تاویب"[2] کے معنی ہیں۔ ہمہ روز کشتن۔ یہ کام پہاڑوں کا نہیں پہاڑ والوں ہی کا ہو سکتا ہے۔

شام میں ایک شہر ہے جسے "طیر" (TYRE) کہتے ہیں، وہاں قوم طیر آباد تھی۔ منتخب اللغات وغیرہ عربی لغت والے اس بستی کا نام "طیرہ" بتاتے ہیں حضرت سلیمانؑ اپنے جاسوسوں کو طائر کہتے تھے (الواعظ ہے) طائر، فاعل ہے۔ اس کا مصدر طیر و طیران ہے۔ اس کے معنی ہیں "سرعت سیر" لہٰذا طائر کے معنی "سریع السیر" ہوئے۔ کتب لغت میں اس کا اطلاق انسانوں پر بھی ہوا ہے۔ طرفی حاجتی اور طار طالبہ اور یطیرون علی متون الخیل (گھوڑوں کی پیٹھوں پہ تیزی سے اڑے جا رہے ہیں) طائر

---

[1] سخت جبر و تشدد کرنے والے۔

[2] ـــــ اس کا مادہ "اوب" ہے۔ "آوَب۔ مُؤاوَبَۃ کے معنی ہیں سارا دن چلنا رات کو قیام کرنا (مصباح اللغات)

دو قسم ہیں۔ اول وہ جو اپنے بازوؤں پر اڑتے ہیں۔ دوم وہ جو بازوؤں پر اڑتے تو نہیں لیکن سریع السیر ہونے کی وجہ سے طائر کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید میں تصریح ملتی ہے یَطِیْرُ بِجَنَاحَیْہِ یعنی وہ طائر جو اپنے بازوؤں کے ساتھ اڑتا ہے۔ یہاں بازوؤں کی قید بتائی ہے۔

سورۂ نمل میں حضرت سلیمان کے ایک سفر کا حال بیان ہوا ہے کہ آپ وادی نمل میں پہنچے نمل قوم کا نام ہے۔ منتہی الارب میں اس کے متعلق لکھا ہے "واذ اعلام است" یعنی یہ علم (معرفہ) کے طور پر بھی آتا ہے۔ پھر اس وادی سے آگے گئے اور سبا کے قریب پہنچ کر طیر کی حاضری لی۔ ان کا افسر ہدہد تھا۔ وہ غیر حاضر تھا۔ انہوں نے اس کی غیر حاضری پر حاکمانہ لہجے میں کہا۔ "میں اسے سخت عذاب کروں گا یا اُسے بُری طرح ذبح کر ڈالوں گا۔ ذبح کا اطلاق انسانوں پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا کہ فرعون تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتا تھا اور حضرت ابراہیم اپنے بیٹے کو کہتے ہیں۔ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ۔ میں خواب دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔

نیز حضرت سلیمان نے کہا کہ "بادہ (ہدہد) اپنی غیر حاضری کے متعلق روشن دلیل پیش کرے ـــــ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ روشن دلیل کے ذریعے سلیمان کے عتاب و سزا سے بچ سکتا تھا۔ اور یہ انسان ہی کا کام ہو سکتا ہے ـــــ ہدہد تھوڑی دیر کے بعد آ گیا اور اس نے اپنی غیر حاضری کی معقول وجہ بتائی کہ "میں سبا سے آپ کے پاس ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں" ـــــ اس سے معلوم ہوا کہ یقینی اطلاعات فراہم کرنا اس کا منصب تھا ـــــ اب وہ سزا سے محفوظ ہو گیا۔ جاسوسی اس کا کام تھا، اور وہ جن "طیروں" کا افسر تھا وہ بھی اس کے ماتحت یہی خدمت انجام دیتے تھے ـــــ اس خبر رسانی کا ماحصل یہ تھا کہ ـــــ

۱۔ سبا پہ ایک عورت حکمرانی کرتی ہے۔

۲۔ اس کا تخت بہت بڑا ہے۔

۳۔ وہ تمام شاہانہ اسباب ثروت رکھتی ہے۔

۴۔ وہ اور اس کی قوم سورج کی پرستش کرتے ہیں۔

ہدہد صاحب کا اپنا تبصرہ یہ ہے کہ

شیطان نے ان کے مشرکانہ اعمال کو ان کی نگاہ میں مزین کر دکھایا ہے۔ اس نے ان کو سیدھی راہ سے گمراہ کر دیا ہے۔ وہ ہدایت سے محروم ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیوں نہیں کرتے؟ جو زمین و آسمان سے پوشیدہ چیزوں کو نکالتا ہے اور وہ جانتا ہے جو اے لوگو! تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔ وہ اللہ ہے۔ جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ بڑے تخت (حکومت) کا مالک ہے (دیکھئے سورہ نمل رکوع ۲)

ان آیات سے واضح ہے کہ ہدہد موحد آدمی تھا ـــــ سورج پرستی سے بیزار تھا ـــــ شیطان کو فتنہ پرداز اور گمراہی کا باعث سمجھتا تھا ـــــ اہل سبا کو شرک کے باعث قابل ملامت جانتا تھا ـــــ اگر بقول مفسرین یہ سارا کاروبار اعجازاتی تھا،

تو معجزے میں کذب و فریب کی سمائی نہیں ہوسکتی ہے۔ وہ تو اول سے آخر تک ربانی چیز ہوتا ہے۔ اس میں دھوکے کا کیا کام۔ لیکن یہاں ہم سلیمانؑ کی زبان سے سنتے ہیں کہ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ (نمل۔ ۲۷) (اے ہدہد! ہم تیرے بیان کا سچ جھوٹ ابھی جانچ لیں گے ——— اس کا مطلب یہ تھا ان کو شبہ ہوا کہ شاید ہدہد دل سے بنا کر باتیں کر رہا ہے یا سچ مچ سبا سے ہو کر آیا ہے؛ اس مقصد کے لیے انہوں نے اس کو حکم دیا کہ میرا یہ خط لے جا۔ بلقیس نے اپنے دربار کے باہر صندوق لٹکائے ہوئے تھے۔ فریادی لوگ ان میں عرضیاں ڈالتے تھے ان کو پڑھ کر انہیں بلایا جاتا اور فریاد رسی کی جاتی تھی۔ حضرت سلیمان نے ہدہد سے کہا۔ "تم یہ خط اسی صندوق میں ڈال دینا پھر اوٹ میں ہو کر انتظار کرنا کیا جواب دیتے ہیں" ——— ہدہد اس خط کا جواب لاتا ہے۔ (دیکھئے نمل رکوع ۲،۳)

قرآن حکیم کی ایسی حکیمانہ تصریحات کے باوجود جو لوگ ہدہد کو حیوان لایعقل منوانے پر اصرار کرتے ہیں، ان کے علم و فضل کے متعلق کیا عرض کیا جائے؟ ہدہد یقیناً انسان تھا اور دوسرے طیر جن پر وہ افسر تھا۔ یقیناً جاسوس تھے۔ قرآن حکیم نے اس جاسوسی سے منع فرمایا ہے۔ جو دوسروں پر عیب لگانے کے لیے کی جائے۔ اپنی حفاظت و دفاع کے لیے جاسوسی کرنا منع نہیں ہے۔ حضرت داؤد کو علم دیا گیا تھا وہ جاسوسوں کی بولیاں، اشارات اور اصطلاحات سمجھتے تھے۔ ان کے پاس جن و انس اور جاسوسوں کی فوجیں تھیں۔ جو مختلف شہروں سے فراہم کی گئی تھیں۔ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً (ص۔ ۱۹) سلیمان علیہ السلام بھی اپنے باپ سے ان افواج کے وارث ہوئے وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوُدَ (۱۶)

صنعت داؤد

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ (انبیاء ۸۰)
(اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام پر ایک اور انعام کیا، جس سے ان کی فوجوں کی حفاظت ہوتی تھی۔ جیسا کہ ارشاد ہے) اور ہم نے اس کو تمہارے لیے ایک لباس (زرہ) کی صنعت کی تعلیم دی۔ تاکہ وہ (زرہ) تم کو تمہاری لڑائی سے بچائے۔ پھر کیا تم شکر کرنے والے ہو؟ (قبل ازیں لوہے کی تختیوں کو موڑ کر زرہیں بنائی جاتی تھیں اور کنڈیوں سے جوڑی جاتی تھیں۔ بائبل میں مذکور جالوت کی زرہ ایسی ہی تھی ——— لیکن اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو لوہا پگھلانے کا علم دیا، انہوں نے کڑیوں والی زرہ ایجاد کی۔ یہ کوئی معجزہ نہیں تھا۔ قرآن مجید میں صنعت اور تعلیم (علمناہ صنعۃ) فرما کر اس کی حقیقت واضح کر دی ہے۔

ہوا اور سلیمان

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ (۸۱) (اسی داؤد پر جو انعام کئے گئے ان کا ذکر فرمایا ہے) اور ہم نے سلیمان کے لیے ایک خاص ہوا کو کام میں لگا دیا) اس حال میں کہ وہ تیز چلتی تھی (جب کہ وہ اپنے باربرداری کے جہازوں کو شام کی طرف واپس لے جاتے تھے) وہ (ہوا) اس کے کام کے مطابق اس زمین (شام) کی طرف چلتی تھی۔ جس میں ہم نے برکت رکھی تھی (اللہ تعالیٰ نے ساری زمین کو بابرکت بنایا ہے (خلق الارض... و بارک فیھا۔ حٰم سجدہ ۹ و ۱۰) خدا کے رسول تمام اقوام میں آئے ہیں، لیکن شام میں بکثرت رسولوں کی وحی شائع ہوئی ہے۔ جس زمین میں خیر و برکت کا ظہور ہو، وہ خاص طور پر مبارک ہو جاتی ہے علم کی اشاعت بلاشبہ موجب برکات ہے۔ لیکن جب قومیں بگڑ جائیں تو مبارک مسجدیں بھی تباہ کر دی جاتی ہیں۔ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا۔

(بنی اسرائیل ۱۷/۴) اللہ تعالیٰ نے یہود کے بگاڑ کے سبب بیت المقدس کو تباہ کرادیا تھا۔ برکت کسی زمین میں اس کی ذاتی چیز نہیں ہوتی اچھی پیداوار اور نیک اعمال سے برکت بڑھ جاتی ہے۔ بدامنی اور ظلم سے چھن جاتی ہے — آگے فرمایا اور ہم ہر ایک بات کو جاننے والے ہیں۔

سلیمانؑ کے کام میں جو ہوا لگائی گئی تھی وہ تجارتی ہوا کہلاتی ہے جو اب بھی جہازرانوں کے بہت کام آتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام "تجارتی ہوا" مشہور ہے۔ اس ہوا کی حرکت، بعض جگہ جہاں گرم و سرد ہواؤں کا صعود و نزول ہوتا ہے، معلوم نہیں ہوتی — پھر آہستہ آہستہ چلنے لگتی ہے۔ پھر تیز ہو جاتی ہے۔ یہ قسطنطنیہ کے قریب عموماً نرم چلتی ہے۔ باربرداری کے وقت نرم ہوا مفید رہتی ہے۔ اور واپسی میں تیز ہوا منزل مقصود کی طرف جلدی لے جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ[1] رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ (ص۔ ۳۶) ہم نے سلیمانؑ کے لیے وہ ہوا کام میں لگادی تھی جو اس جگہ نرم چلتی تھی جہاں وہ سامان لینے کے لیے پہنچا کرتا تھا۔ وہ ہوا باربرداری کے وقت نرم چلتی تھی تاکہ جہازوں کو صدمہ نہ پہنچے اور واپسی میں تیز تاکہ منزل مقصود تک جلد پہنچ جائیں۔ دونوں حالتوں میں سلیمانؑ کے مقصد کے مطابق چلتی تھی۔ جیسا کہ دوسرے کاروباری لوگوں کے کام میں معاون ہوتی ہے — یہ غلط ہے کہ وہ سلیمانؑ کے حکم سے نرم و تیز ہوتی رہتی تھی۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے سورج، چاند، دریاؤں، نہروں وغیرہ کو ہمارے کام میں لگا رکھا ہے۔ تمام کائنات کو ہمارے لیے مسخر کر دیا ہے ہم اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ان سے کام لیتے ہیں۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکار اند — تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار — شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری (سعدی)

مزید تحقیق

تجارتی ہوائیں سلیمانؑ داؤدؑ کے وارث ہوئے، حکومت اور تجارت میں ترقی حاصل کی بیت المقدس سے لے کر سواحل افریقہ تک لمبے سفر کرتے رہے۔ تجارتی ہواؤں سے بہت فوائد حاصل ہوتے رہے۔ جب ساحل فلسطین سے ان کے جہاز روانہ ہوتے تو ہوا تیز چلتی اور جلد منزل مقصود تک لے جاتی۔ یہ ہوا ہمیشہ اسی طرح پر چلتی آئی ہے۔ اور جب حضرت سلیمانؑ سامان تجارت وغیرہ لے کر واپس لوٹتے، تو یہاں کی ہوا آہستہ آہستہ چلتی اور یہی اس کی دائمی رفتار ہے۔ یہ جنوبی اور شمالی قطبین کی ہوائیں ہیں۔ جہاں چھ مہینے کے دن اور چھ مہینے کی رات — وہاں رات کو بالکل تاریکی نہیں چھا جاتی،

---

[1] مترجمین و مفسرین عموماً یہاں امر کے معنی حکم لیتے ہیں۔ خواجہ صاحب "کام" لکھتے ہیں۔ اہل لغت لکھتے ہیں کہ جہاں اس کے معنی حکم ہوں اس کی جمع اوامر آتی ہے جو قرآن میں کہیں نہیں آئی۔ اور جہاں اس کے معنی معاملہ، حادثہ واقعہ، حالت یا کام ہوں اس کی جمع امور ہوتی ہے جو قرآن میں بکثرت وارد ہوتی ہے۔ مؤلف

بلکہ کچھ کچھ روشنی رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز اپنے محور پر گھومتی ہو، اس سے بجلی کی رو پیدا ہوتی ہے اور اوپر جاکر بادلوں پر پڑ کر کچھ روشنی دیتی ہے اور وہ علاقے روشن رہتے ہیں۔ ان چھ چھ مہینے کے دن اور رات کے اگر حصّے کئے جائیں تو وہاں کے پورے ایک دن اور ایک رات کے بارہ حصّے ہوتے ہیں، یعنی صبح کاذب سے لے کر کچھ حصّہ سورج طے کرے تو دن کا چھٹا چھٹا (۱/۶) حصہ ہوتا ہے تو گویا صبح ایک مہینہ کی ہوئی، اور ایسا ہی شام کا اندازہ لگاؤ تو ایک مہینہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے چند جملوں میں ان علاقوں کا کا نقشہ اور ہواؤں کی صفت بیان فرمادی، یعنی)

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ (السبا۔ ۱۲) اور کام میں لگادی سلیمان کے واسطے ہم نے ایک ہوا (اس ہوا کی تعریف یہ ہے) صبح اس کی مہینہ ہے اور شام اس کی مہینہ ہے (جبھی تو دن رات چھے چھے مہینے کے ہوتے ہیں۔ مفسرین کی یہ تفسیر غلط ہے کہ جنہوں نے صبح کی سیر مہینہ کی راہ اور شام کی سیر مہینہ کی راہ کی ہے۔ ہواؤں کی چال، ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ غرض یہ یہ اس جگہ کی ہوائیں ہیں، جہاں کی صبح و شام ہمارے یہاں کے ایک ایک مہینے کے برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کا کیسا خاصہ بیان فرمایا ہے، لیکن عجائب پرستوں سے اللہ کی پناہ جنہوں نے اصلیت کو بگاڑ کر خوبیوں پر پردے ڈال دیئے)

وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ (ایضاً) اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے پگھلے ہوئے تانبے کا ایک چشمہ جاری کر دیا (توراۃ میں ہے کہ لوگ خود لوہا ڈھال کر صنعت کے طور پر چیزیں بنایا کرتے تھے یہ ـــــ چشمہ کیوں جاری کیا؟

جنّ مزدور و کاریگر

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ (ایضاً) اور جن قوم میں سے اس (سلیمانؑ) کے آگے خدا کے حکم سے کام کرتے تھے اور جو کوئی ان میں ہمارے حکم سے سرتابی کرے۔ ہم (خدا) اس کو دوزخ کے عذاب سے چکھائیں گے (یہ سب کام خدائی ہی ہیں۔ اسی لیے "نحن" فرمایا ہے)

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَاۗءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ۭ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (سبا۔ ۱۳) (اور وہ جن لوگ) بناتے تھے۔ اس (سلیمان) کے لیے، جو وہ چاہتا تھا قلعوں سے اور تصاویر (نقشے، محاریب (جائے حرب) اور علم حاصل کرنے کے لیے کئی ایک شکلیں وغیرہ۔ انسانی ڈھانچے یا دوسرے حیوانات اور جانوروں کی جان پہچان کے لیے تصویریں، ڈاکٹری کے فن میں مدد دینے والی چیزیں اور علمی تحقیقات میں ترقی کرنے کے سامان) اور حوضوں جیسے برتن، پانی اکٹھا رکھنے کے بڑے بڑے ظروف (لگن، پرات وغیرہ) اور دیگیں جو جمی رہتی تھیں (اور ہر وقت ان میں کھانے پکتے رہتے تھے، وہ جن (جو فی الحقیقت انسان ہی تھے) یہ کام اور اس کے علاوہ بہت سے اور کام بھی کرتے تھے۔ مثلاً ان میں عمارتیں بنانے والے غوطے لگانے والے، زنجیروں میں جکڑے ہوئے آدمی بھی تھے اور بار امانت اٹھانے والے انسان بھی تھے۔ اور حق امانت سے غافل، ظلوم و جہول بنی آدم بھی تھے۔ ناریت کا غلبہ آدمی کی پیدائش ہی میں شامل ہے۔ اس میں ناری خاکی وغیرہ عناصر موجود ہیں۔ یہ غلط ہے کہ آدمؑ سے پہلے کوئی بنی جان پیدا کئے گئے ہوں۔ ان جنوں ہی سے منافق و مومن بھی تھے۔ سلیمان

کی موت پران کی غیب دانی کی قلعی کھل گئی ۔۔۔ یہی لوگ سزا کے قابل اور عفو کے لائق بھی ہیں[1] ۔۔۔ ان کے انسان ہونے میں کوئی شبہ نہیں ۔ جن، شیاطین، طیر اور انس سب صفاتی نام ہیں۔ سب آدم کی اولاد ہیں۔ مذکورہ بالا انعامات کے بعد فرمایا اے داؤد کی اولاد (اللہ کا) شکر ادا کرو اور یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ میرے بندوں میں شکر گزار بہت تھوڑے ہیں۔

رحلت سلیمانؑ

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ

(سبا - ۱۴) (جب سلیمانؑ فوت ہوئے تو خیر خواہوں کو خیال گزرا کہ آپ کی موت کو صیغۂ راز میں رکھا جائے تاکہ وہ لوگ (عمالقہ کے جن) جو آپ کے رعب سے کام کرتے تھے، منحرف نہ ہوجائیں اور کوئی کام ادھورا نہ رہ جائے۔ پس ان کی نعش کو ممی کرکے شیشے کے مکان میں لکڑی کے سہارے کھڑا کر دیا، مگر دیمک کی خبر ممی کا عمل کرنے والوں کو بھی نہ ہو سکی) پس جب ہم نے سلیمان پر موت کا حکم جاری کر دیا تو مطلع کیا ان کی موت سے مگر ایک کیڑے نے جو اس لکڑی کو کھاتا جاتا تھا (لاش گر پڑی تو) جن بے نقاب ہو گئے (یعنی) کہ اگر وہ (جن) غیب دان ہوتے تو (خدمت گاری اور غلامی کے اس) ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔

جن

جن کی تشریح دو مختلف مقامات پر گزر چکی ہے۔ یہاں محل و مقام کی مناسبت سے مختصراً اتنا ہی کافی ہے کہ بنی اسرائیل نے "جبارین" کے ساتھ جنگ کرنے میں بزدلی دکھائی۔ اس سزا پر چالیس برس تک جنگلوں میں سرگردان رہے۔ آخر ان میں جفاکش اور دلیر لوگ پیدا ہوئے۔ بادشاہ طالوت نے پہاڑی قوم عمالقہ پر فتح حاصل کی۔ داؤدؑ و سلیمانؑ کے وقت ان پر پوری طرح قابو پا لیا گیا۔ پہاڑی عوام عموماً توہمات کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایسے ہی تھے۔ جادو وغیرہ کے قائل تھے۔ غیب بینی کے مدعی، جادوگر، کراماتی پیر، کاہن، قدامت پسند ملّا، پنڈت، جوتشی اور پوپ ہمیشہ عوام کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو پاک و مقدس ظاہر کرتے ہیں۔ انہی کو جن کہا جاتا۔ حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ نے انہیں دبائے رکھا اور ان سے کام لیے۔ لیکن بغاوت کی چنگاریاں ان کے سینوں میں سُلگ رہی تھیں۔

کرسئ سلیمان پر جسد

حضرت سلیمان انسان تھے۔ انسانوں سے بھول چوک ہو جانا بعید نہیں۔ وہ اپنی کسی غلطی سے فتنہ و تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے تخت پر ایک جسد[2] لایعقل کو بٹھا دیا۔

جیسا کہ ارشاد ہے:

---

[1] یہ تمام باتیں مختلف آیات سے ماخوذ ہیں:

[2] تاریخ میں ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں جب امیر امان اللہ خان والی افغانستان اپنی غلطی کا شکار ہو کر ولایت کی طرف فرار پہ مجبور ہوا تو اس کے تخت پر بھی چند دن کے لیے ایک جسد لایعقل کو بٹھا دیا گیا۔ جس کا نام "بچہ سقہ" مشہور ہوا۔ خود پاکستان میں جسد لایعقل یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوتے رہے ہیں۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ۝ (ص-۳۴) اور ہم نے سلیمان کو آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی (تخت حکومت) پر ایک (بےعقل اور بے) وقوف شخص کو لا بٹھایا، اس آزمائش میں سلیمانؑ نے کوئی ناشکری یا گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ صبر و شکر کے ساتھ استقلال قائم رکھا، وہاں سے چلے گئے، اور (پھر بارگاہ ایزدی میں) انابت کی (اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کیا اور خدا سے لازوال روحانی بادشاہت کی دعا کی، جس پر غیر کا قبضہ ناممکن ہے۔

مُلکِ سلیمان

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ (ص-۳۵) کہا اے میرے رب میرے واسطے بخشش کر اور مجھے ایسی بادشاہی (توفیق اعمال صالح اور اطمینان قلب) دے جو میرے سوا کسی اور کو شایاں نہ ہو (لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى) اے خدا تو بڑا ہی فیاض ہے (مطلب یہ ہے کہ دنیوی حکومت تو آنی و فانی ہے، آخرت کی دائمی مسرت عنایت فرما (منزل ششم صـ۱۴ و ۶۴)

رحلت سلیمان

مولوی صاحبان کے خیال میں سلیمانؑ دیوؤں پر حکمرانی کرتے تھے۔ ہوا پر اختیار رکھتے تھے۔ ان کی سلطنت ایسی عظیم الشان تھی کہ ان کے سوا کوئی دوسرا اس کا اہل ثابت نہ ہو سکا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی حکومت صرف شام پر تھی اور انہوں نے سبا تک سفر بھی کیا۔ جب ان کی موت وارد ہوئی تو ان کا فرزند تخت نشین ہوا۔ ان کے بدن کو ممی کر کے ایک شیشے کے مکان میں ایک موٹھے کے سہارے کھڑا کر دیا گیا۔ جب جنّ (عمالقہ) حاضری کے لیے آتے تو انہیں کہا جاتا کہ دیکھو وہ سلیمانؑ کھڑے ہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو وہ سرکشوں کی سزا کے لیے نکلیں گے۔ گھر کے لوگ حقیقت سے باخبر تھے۔ زندہ شخص کا کھانا پینا گھر والوں کے ذمے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کیسے بے خبر رہ سکتے تھے۔ جب ابن سلیمان کی حکومت مستحکم ہو گئی تو زمین کے ایک کیڑے نے سونٹے کو کھایا اور لاش زمین پر آ رہی۔ کثیف جسم خاکی مرنے والے کے ساتھ نہیں جاتا — جب قوم جنّ کو معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم غیب دان ہوتے تو خواہ مخواہ اب تک رسوا کن عذاب (محکومی) میں نہ رہتے (سبا-۱۴) اس واقعہ نے ان کی غیب بینی کی شیخی کرکری کر دی — سلیمان کے بعد ایک وقت تک ان کی اولاد برسر اقتدار رہی۔

ایروپلین

بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلیمانؑ نے ایروپلین بنائے تھے لیکن یہ نہیں سوچتے کہ ایروپلین کے ساتھ یہ بات کیا مناسبت رکھتی ہے کہ شام کی طرف تیز اور دوسری طرف ہلکا چلے۔

شیاطین مطیع سلیمان

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝ (انبیاء-۸۲) — (جب حضرت سلیمان نے فن جہازرانی سے فائدہ اٹھا کر اور تجارتی ہوا سے حسب منشا کام لے کر اپنے علاقے کو دوبارہ فتح کیا تو قوم جنّ کو (عمالقہ) پوری طرح قابو میں لے آئے، جیسا کہ فرمایا) اور شیطانوں میں سے بعض کو (اس کے قابو میں دیا) جو اس (سلیمان) کے لیے غوطہ زنی کرتے تھے۔ (تاکہ وہ موتی اور اسفنج نکالیں) اور اس کے سوا کئی دوسرے کام بھی کرتے تھے اور ہم (خدا خود ہی ان کے نگران و محافظ تھے (اگر ہماری مدد نہ ہوتی تو ایسے سرکشوں کو سلیمان قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا) (منزل چہارم صـ۱۰۱ و ۲)

قرآن مجید میں داؤد و سلیمان علیہما السلام کا تذکرہ مختلف سورتوں میں ہماری معنوی نظم و ترتیب سے بے نیاز ــــ پھیلا ہوا ہے۔
اس وجہ سے یہاں بھی کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی جاسکتی۔

عجب نہیں جو پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

ایک مقدمہ داؤد کی محراب میں

وَهَلْ اَتٰكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ (ص ۲۱) اور کیا تیرے پاس ان جھگڑنے والوں کی بھی خبر آئی ہے، جب وہ دیوار پھاند کر عبادت خانے میں داخل ہو گئے۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلٰی دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰی بَعْضُنَا عَلٰی بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰی سَوَآءِ الصِّرَاطِ (۲۲) جب وہ داؤد کے پاس آئے تو وہ ان سے گھبرا گیا۔ انہوں نے کہا ــــ "ڈرو نہیں، ہم دو فریق ہیں۔ ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہم میں منصفانہ فیصلہ کر دیجئے۔ بے انصافی نہ کیجئے اور ہمیں سیدھی راہ پر ڈال دیجئے۔

اِنَّ هٰذَآ اَخِیْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ (۲۳)
(ان دونوں میں سے ایک نے کہا۔ مقدمے کی کیفیت یہ ہے کہ) یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ۹۹ دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک (ہی) دنبی ہے۔ پس وہ کہتا ہے (مطالبہ کرتا ہے) کہ یہ ایک دنبی بھی میرے حوالے کر دے اور بات چیت میں مجھ پر زیادتی کرتا ہے۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰی نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ (۲۴)

داؤد کی صریح غلطی

(اس مقدمے میں جناب داؤد سے صریح غلطی یہ ہوئی کہ فریق ثانی کا بیان لئے بغیر فیصلہ دے دیا یعنی اس کو ظالم قرار دے دیا۔ چنانچہ ان کا فیصلہ یہ ہے)

اس (۹۹ دنبیوں والے) نے تیری دنبی کو اپنی دنبیوں میں شامل کرنے کا مطالبہ کر کے تجھ پر ظلم کیا ہے۔ اور اکثر شریک (رشتہ دار) ایسے ہوتے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں، مگر جو لوگ مومن (امن پسند خدا پرست) اور نیکوکار ہیں (وہ ایک دوسرے پر سختی نہیں کرتے) اور ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔

الحاصل وہ لوگ چلے گئے۔ بعد میں آپ کو خیال آیا کہ میں نے بہت بڑی غلطی کی کہ یکطرفہ فیصلہ دے دیا۔ جو فی الحقیقت سخت گناہ تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہے) اور داؤد نے گمان کیا کہ ہم نے (مقدمہ بھیج کر) اس کی آزمائش کی ہے (اور وہ اس امتحان میں پورے نہیں اترے فوراً اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے) پس وہ (داؤد) اپنے پروردگار سے بخشش مانگتا ہوا اور جھکتا ہوا (سجدے میں) گر گیا۔ اور خدا کی طرف

رجوع کیا۔

فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ (۲۵) پس ہم نے اس کو معاف کر دیا۔ اور تحقیق اس کو ہمارے نزدیک قرب اور اچھا مقام حاصل تھا۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (۲۶) اے داؤد! ہم نے تجھے اس زمین (کے کچھ حصے) میں حاکم بنایا ہے۔ (تو نے یک طرفہ فیصلہ دے کر غلطی کی ہے) لوگوں کے درمیان (پوری تحقیقات کے بعد) ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا کرو اور اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی نہ کرنا، یہ تم کو اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گی۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ حساب کا دن بھول گئے[1] منزل ششم ص۵۰۲ تا ۵۰۸

سلیمانؑ کے گھوڑے

سورۃ ص کی آیت ۳۰ میں سلیمانؑ کو نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ کہا گیا ہے۔ یعنی اچھا بندہ، اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والا۔ اگلی تین آیات میں اس "اچھائی اور رجوع الی اللہ" کی تشریح یا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ (ص۔۳۱) جب اس (سلیمان) کے سامنے خاصے کے گھوڑے پیش کئے گئے (یہ گھوڑے بہت ہی عمدہ تھے یہ کس وقت پیش کئے گئے تھے؟) نماز عصر کے موقع پر (گھوڑوں کی دیکھ بھال میں اچھے بندے، رجوع کرنے والے سلیمان کو نماز کا خیال آگیا) فَقَالَ اِنِّيْ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ (۳۲) (سلیمان نے) کہا میں اللہ کی محبت سے (غافل ہو کر) مال سے محبت کرتا ہوں (اور یاد خدا پر مال کو ترجیح دے رہا ہوں۔ یہ بات ٹھیک نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ گھوڑوں کے شغل میں نماز کا وقت فوت ہو جائے ——— دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ میں جو گھوڑوں وغیرہ اسباب جنگ سے اُنس رکھتا ہوں یہ خدا ہی کے سبب سے ہے۔ عالم اسباب میں جابر عمالقہ کی سرکوبی کے لیے یہ سامان رکھتا ہوں۔ تاکہ یہ ظالم لوگ دین الٰہی کو پامال نہ کرنے پائیں۔ حقیقی بھروسہ تو مجھے اللہ ہی پر ہے ——— الحاصل نماز کا خیال آیا تو حکم دیا کہ گھوڑوں کو لے جاؤ کہ میں ذکر الٰہی کروں، پھر منگوالوں گا)

حتّٰی کہ گھوڑے پردے میں چلے گئے (اوجھل ہو گئے)[2] آپ نے نماز ادا کی یہ ہے اوّاب یعنی رجوع الی اللہ کا ثبوت۔

اس کے بعد خدام کو حکم دیا۔

رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۖ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ (۳۳) (ان گھوڑوں کو) میرے پاس واپس لاؤ (وہ واپس لائے گئے اور آپ نے ماہرین فن کی طرح اچھی طرح ان کی دیکھ بھال کی) پھر ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

---

[1] اتنی سی بات تھی جسے مفسرین نے افسانہ بنا دیا اور محترم پیغمبر کی آبرو کا بھی کچھ خیال نہ کیا۔

[2] یہاں مفسرین نے خواہ مخواہ اپنی طرف سے سورج کو ٹھونسنے کی کوشش کی ہے۔

بلقیس وسلیمان

بلقیس کو سلیمانؑ کا خط پہنچتا ہے۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (نمل۔ ۳۰) از طرف سلیمان رعیی سلامتی پسند بادشاہ) خدائے رحمن ورحیم کے نام سے شروع ہوتا ہے ۔۔۔ تم (لوگ، ملکہ اور اہل دربار) مجھ پر چڑھائی نہ کرو اور صلح میں داخل ہو کر آجاؤ (اسلام کے معنی بصلح درآمدن" بھی ہیں)

وہ امراء سے مشورہ کرتی ہے۔ وہ اپنی جنگی قوت پر فخر کرتے ہیں۔ سلیم الطبع اور دور اندیش ملکہ ان سے اتفاق نہیں کرتی اور حضرت سلیمان کی طرف ایک عظیم الشان ہدیہ ارسال کرتی ہے۔ ہُدہُد ان قاصدوں کے ساتھ واپس آیا۔ اس نے دربار بلقیس کا آنکھوں دیکھا حال عرض کیا۔ سلیمان نے ہدیہ پسند نہیں کیا اور امراء کی تعلّی کے پیش نظر ہدہد کو حکم دیا۔

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (نمل۔ ۳۷)
اے ہدہد! تو ان کی طرف مڑ جا (اگر وہ پیغ صلح نہیں کرتے اور اپنی بہادری جتاتے ہیں تو) پھر ہم ان پر ایسی فوجیں لائیں گے، جن کا وہ مقابلہ نہیں کر سکیں گے اور ہم انہیں اس (حکمرانی) سے ذلیل بنا کر نکال دیں گے اور وہ ماتحت ہو کر رہیں گے۔

جب ہدہد نے ملکہ کو یہ پیغام پہنچایا، تو وہ صلح کی ملاقات کے لیے رضامند ہو گئی اور لکھا کہ میں اپنے درباریوں سمیت فلاں روز، فلاں وقت پر حاضر ہوں گی۔

عرش بلقیس

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (النمل۔ ۳۸)
قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ (النمل۔ ۳۹) حضرت سلیمانؑ کے دربار میں اصلی باشندے اور فاتحین کے مہذب افراد بھی تھے۔ اجلاس میں دونوں قسم کے لوگ مدعو کئے جاتے تھے) قوم جن میں سے ایک شہ زور نے کہا، میں اس (تخت) کو تیرے پاس لانے والا ہوں اس سے پہلے کہ تو اپنے پروگرام کے مطابق اپنی جگہ سے اٹھے اور بلاشبہ میں اس تخت کے لانے پر قوت والا، امانت دار ہوں (اس کا خیال تھا کہ اس تخت کے ٹکڑے ہوئے حصے الگ الگ کر کے لے آئے گا۔ تاہم یہ بھی قوت کا کام ہے۔ اور چونکہ وہ قیمتی معدنیات سے مرصع تھا، اس لیے اس نے اپنے امانت دار ہونے کا ذکر کیا)

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۚ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ (النمل۔ ۴۰) (اس کے جواب میں) اس شخص نے جس کے پاس کتابی علم تھا، کہا۔ کہ "میں اس کو تیرے پاس تیری نظر کے تیری طرف واپس آنے سے پہلے لے آنے والا ہوں (یہ کتابی علم جرِ ثقیل سے متعلق تھا۔ بلند پرجون کی تعمیر میں بھاری پتھر اسی علم کے ذریعے لے جائے جاتے تھے نیز جہاز رانی اور بھاری گاڑیوں کے موڑنے میں بھی کام دیتا تھا۔ فن تعمیر میں اس کا استعمال مدت

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہائے دراز سے ہوتا آیا ہے ـــــ ماہر جرِ ثقیل نے اس جنّی پہلوان سے کہا کہ جب وہ تخت اٹھوا کر قلعے سے باہر کی طرف موڑا جائے اور تیری نظر اس پر پڑے ہیں تو اپنی نظر کو اپنی طرف لوٹائے، اتنے میں وہ تخت اس مضبوط گاڑی پر قائم ہو جائے اور پھر اسے مناسب تجاویز کے ساتھ اس مقام پر لایا جائے گا، جہاں حضرت سلیمان کا دربار ہے ـــــ اس تقابل میں جنّاتی قوت پر علمی قوت کی فوقیت ثابت ہوتی ہے (سو جب اس (سلیمان) نے اس (تخت) کو اپنے پاس ٹھہرا ہوا دیکھا تو (اپنی علمی قوت پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے) کہا "یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفر کرتا ہوں (یعنی انبیاء بھی آزمائش میں ڈالے جا سکتے ہیں جس میں شکر و کفر دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ چنانچہ سلیمانؑ کہتے ہیں) جو شخص شکر کرے، وہ اپنی جان ہی کے لیے شکر کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں سنوارتا۔ اس میں اُس کا اپنا ہی فائدہ ہے) اور جو کفر کرے (اس کا کفر اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑتا) بلاشبہ میرا رب (اپنی ذات میں) بے پرواہ، بزرگی والا (کامل مطلق) ہے۔ ـــــ (انسان کو علمی استعداد و قوت علیم مطلق کے فیضان ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ سورج[2] سے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خود کوئی علم نہیں رکھتا۔ نیچر کی عظیم مشینری میں صرف ایک پرزے کی حیثیت رکھتا ہے)

قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ (النمل - ۴۱) تخت کو منگوانے میں دو مقصد پیشِ نظر تھے۔ اوّل اپنی قوی حکمت و اقبال مندی کا اظہار، دوم بلقیس کی عقل کا امتحان ـــــ یعنی اسے دکھایا جائے کہ سورج کو کوئی باطنی بصیرت حاصل نہیں ہے۔ بصیرت خدا ہی کی طرف سے بخشی جاتی ہے۔ اس غرض سے سلیمانؑ نے اپنے صنّاعوں سے کہا کہ (اس (ملکہ) کے تخت کو ایسی صورت میں بدل دو کہ (وہ ظاہری نگاہ سے) پہچانا نہ جائے تاکہ ہم دیکھیں کہ وہ (عقل سے) ہدایت پاتی ہے یا ان لوگوں میں شامل ہوتی ہے جو باطنی بصیرت سے راہ نہیں پاتے۔

فَلَمَّا جَاءَتْ قِيلَ أَهَكَذَا عَرْشُكِ قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ ۝ (النمل ۴۲)

سو جب وہ (ملکہ صلح کی ملاقات کے لیے) آئی، تو اس سے پوچھا گیا۔ کیا ایسا ہی ہے آپ کا تخت! وہ بولی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی تخت ہے۔ اور جب اسے سمجھایا گیا کہ سورج تمہارا معبود عقلی بصیرت سے خالی ہے۔ بصیرت اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے تو اس نے کہا، ہم کو اس سے پہلے آپ کی دانش (اور حسنِ سلوک) کا علم (رہبر کی معرفت) دیا گیا تھا۔ اور (اسی لیے) ہم صلح پسند بن کر آئے ہیں۔

وَصَدَّهَا مَا كَانَت تَّعْبُدُ مِن دُونِ اللَّهِ إِنَّهَا كَانَتْ مِن قَوْمٍ كَافِرِينَ (النمل - ۴۳) اور اس (ملکہ) کو اس چیز (آفتاب پرستی) نے روک رکھا تھا، جس کی وہ خدا کے سوا عبادت کرتی تھی۔ بے شک وہ (اس سے پہلے) قدر ناشناس لوگوں میں سے تھی۔

قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۖ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَن سَاقَيْهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّن قَوَارِيرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (النمل - ۴۴) (سورج اپنی ذات

---

[1] ممکن ہے کہ اہرام مصر کی تعمیر میں اس سے کام لیا گیا ہو۔ مرتب

[2] یاد رہے کہ اہل سبا اور بلقیس سورج کے پجاری تھے۔

سے اشیاء کو نمودار نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ایسی آنکھوں کی بھی ضرورت ہے جو سورج کی درخشندگی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر زندہ مخلوقات
کی بینائی میں انتشار نور اور انعکاس کی قوت نہ ہوتی، تو سورج کے باوجود دنیا میں تاریکی ہی تاریکی ہوتی۔ اور روشنی آگے ہی آگے چلی جاتی
اس کے پلٹنے (منعکس ہونے) کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ کائنات کی مختلف اشیاء (سورج، ہوا، بینائی وغیرہ) میں علیم و حکیم خدا ہی مناسب ترتیب
و تاثیر (تاثر) دیتا ہے۔ سورج کو خود ایسی مناسبت کا کوئی علم ہے نہ قدرت۔ وہ ستاروں کو ہماری نگاہ میں گم کر دیتا ہے۔ تاریکی ان
کو پھر سے نمایاں کر دیتی ہے۔ ان حقائق کو ذہن نشین کرنے کے لیے حضرت سلیمانؑ نے اس محل میں، جہاں آپ فروکش تھے، شیشوں
کا فرش لگا دیا تھا۔ اس کے دروازے کے سامنے سورج موجود تھا۔ اس کے باوجود وہ فرش ظاہری نظر کو ٹھہرا ہوا پانی دکھائی دے رہا
تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے مناسب وقت پر ملکہ کو اس محل میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ جیسا کہ ارشاد ہے) "آپ محل میں داخل
ہو جائیے" پھر جب اس (ملکہ) نے اس (فرش) کو دیکھا اسے گہرا پانی خیال کیا اور (مرعوب ہو کر) اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھایا۔ اس
(سلیمانؑ) نے کہا، یہ شیشوں سے جڑا ہوا محل ہے (جب ملکہ پر اس دلیل کی حقیقت کھل گئی تو) بولی اے میرے پروردگار بلاشبہ میں
نے (شرک کر کے) اپنی جان پر ظلم کیا اور (اب) میں سلیمان کے ہمراہ ہو کر اللہ رب العالمین ہی کی مسلم بن گئی (پہلے اس نے صلح
پسندی کا اور پھر دانش مندی کا ثبوت دیا۔ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے اسلام کی سعادت نصیب کی حضرت سلیمان
نے اس کو آج کل کے شخصیتوں کی طرف منسوب فرقوں ص۱ کی طرح "سلیمانی" نہیں بنایا۔ بلکہ وہ اسی طرح رب العالمین کی مُسلمہ بن گئی۔
جس طرح سلیمان اس ذات واحد کا مسلم تھا ـــــ داؤد و سلیمان کے مذکورہ بیان سے علم و حکمت کی خوبیاں واضح ہوتی ہیں۔

منزل پنجم ص ۷۹ تا ۸۴

ص۱ احمدی، بہائی، بابی، مالکی، شافعی وغیرہ

ذکر ایوبؑ

حضرت ایوبؑ کے متعلق مفسرین نے خاصی افسانہ[1] نگاری سے کام لیا ہے جو زیادہ سے زیادہ محتاط ہیں، وہ بھی قرآنی تصریحات میں رنگ آمیزی سے بچ نہیں سکے۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

حضرت ایوب علیہ السلام کو دنیا کی تمام نعمتیں میسر تھیں، لیکن اپنے درجے کے لحاظ سے ان سے کوئی تساہل یا غلطی سرزد ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش میں ڈال دیا۔ ان کے کھیت جل گئے مواشی مر گئے مال و اولاد اکٹھی چھت کے نیچے دب کر مر گئی۔ دوست آشنا الگ ہو گئے، بدن میں آبلے پڑ کر کیڑے پڑ گئے۔ بیوی بھی اکتانے لگی۔ تب آپ نے دعا کی جو قبول ہوئی ـــ حکم دیا کہ زمین پہ پاؤں ماریں۔ پاؤں مارنا تھا کہ قدرت نے وہاں ٹھنڈے پانی کا چشمہ نکال دیا اسی سے نہاتے اور پیتے۔ وہی شفا کا سبب بنا ہوا گھرانے کے لوگ جو دب کر مر گئے تھے۔ اللہ نے اپنی مہربانی سے ان سے دُگنے عطا کئے۔ سونے کی ٹڈیاں برسائیں۔ (علامہ عثمانی حاشیہ انبیاء ۸۴ و ص ۴۱ تا ۴۴)

خواجہ صاحب لکھتے ہیں:۔

وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (الانبیاء: ۸۳) اور ہم نے ایوب کو ہدایت دی (جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بلاشبہ مجھے سخت تکلیف پہنچی ہے اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ (حضرت ایوب علیہ السلام سے شیطان نے کوئی غلطی کرا دی۔ جیسا کہ وہ اعتراف کرتے ہیں اِنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ (ص-۴۱) مجھے شیطان (یعنی بُرے جذبات) نے ایک جگہ گاڑ دیا ہے۔ (ہلنا جلنا مشکل ہو گیا ہے)

وہ اس غلطی کے سبب کسی جلدی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک ٹھنڈا قدرتی چشمہ دکھلایا، جس میں گندھک، معدنیات اور جڑی بوٹیوں کے اجزا ملے ہوئے تھے۔ وہ لکڑی کے سہارے یا کسی اور طرح چل کر وہاں پہنچے۔ انہیں حکم دیا کہ

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ۔ (ص-۴۲) اس ٹھنڈے چشمے میں اتر کر پاؤں سے پانی کو خوب ہلاؤ تاکہ جو اشیاء نیچے بیٹھی ہوئی ہیں۔ وہ پانی میں حل ہو جائیں۔ پھر غسل کرو اور پینے میں بھی یہی پانی استعمال کرو۔ متواتر یہ عمل جاری رکھو یہاں تک کہ آرام آ جائے ـــ یہ ایسا ہی ہے جیسے اکثر لوگ دوا پیتے وقت بوتل کو ہلا لیا کرتے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۔ (ص-۴۳) اور اس کو اس کے

---

[1] بائیبل میں فسانۂ ایوبؑ بے حد موثر مفصل اور قابل مطالعہ ہے۔ مرتب

(پہلے) اہل خانہ اجو الگ ہو گئے تھے) دے دیئے اور (آئندہ کے لیے) ان کے ساتھ ان کے مثل (یعنی پچھلی عمر میں اتنی ہی اولاد پیدا ہوئی، جتنی پہلے تھی) یہ ہماری طرف سے ایک رحمت تھی اور رجوع کرنے والوں کے لیے ایک نصیحت (یعنی ہر رجوع کرنے والا شخص ہماری رحمت سے اسی طرح مستفیض ہو سکتا ہے۔

خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (ص - ۴۴)

اور (اے ایوب!) تو اپنے ہاتھ میں تنکوں کا مٹھا پکڑ اور ان کو نصیحت کر کہ اتحاد میں کتنی قوت ہے، اور الگ الگ رہنے میں کتنی کمزوری اور برائی ہے ـــــ نا اتفاقی مصائب کی جڑ ہے۔ لقمان نے اپنی اولاد کو ایک درخت کی ایک ایک ٹہنی لانے کو کہا وہ لے آئے تو باپ نے کہا اگر سارا درخت لانے کو کہا جاتا تو نہ لا سکتے۔ مگر ٹہنی ٹہنی کر کے سارا درخت آ گیا۔ جمعیت قوت و برکت سے بھرپور ہوتی ہے۔ الغرض حضرت ایوبؑ کو گذشتہ باتوں سے درگزر کرنے اور آئندہ پابند قول و قرار رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا اور عہد شکنی نہ کرنا (پس انہوں نے فرمان الٰہی کی تعمیل کی اور قبیلے کی گذشتہ بے اتفاقی کو نظر انداز کر کے شیر و شکر ہو گئے اور صبر و استقلال کا پورا ثبوت دیا جیسا کہ فرمایا) بالتحقیق ہم نے اس (ایوبؑ) کو صابر پایا، بے شک وہ بہت اچھا بندہ تھا، وہ رجوع کرنے والا تھا۔

(تلخیص از منزل چہارم صـ ۶۸-۶۹ و منزل ششم صـ ۶۷ تا ۸۹)

ذکرِ یونس علیہ السلام

وَذَا النُّونِ إِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ (انبیاء - ۸۷) اور ذوالنون (یونس) کا (ذکر کر) جب کہ وہ غصے ہو کر چلا گیا (گویا اپنے مالک سے بھاگ کھڑا ہوا۔ إِذْ أَبَقَ - صافات ۱۴۰) پھر اس نے خیال کیا کہ ہم اس پر تنگی نہیں ڈالیں گے (قوم پہ عذاب آنے میں تاخیر ہو گئی۔ وہ زیادہ صبر نہ کر سکے فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ - القلم ۴۸ اور حکم الٰہی کے خلاف قوم کو چھوڑ کر بھاگ نکلے بحیرہ[ل] روم کے کنارے پر ایک بھری ہوئی کشتی میں سوار ہوئے۔ جب وہ کشتی ڈوبنے کے قریب ہوئی، تو ملاحوں نے سمجھا کہ سمندر کا دیوتا ناراض ہے۔ اس کی ناراضی دور کرنے کے لیے بھینٹ چڑھانی چاہیئے۔ انہوں نے قرعہ اندازی کی۔ قرعہ حضرت یونسؑ کے نام پہ نکلا۔ یونس نے اپنے بچاؤ کے لیے کہا کہ "قرعہ کا کیا اعتبار ہے؟ میں قرعہ پھینکتا ہوں۔ وہ کسی دوسرے کے نام پہ نکل آئے گا"۔ حضرت یونسؑ نے قرعہ ڈالا، تو خدا نے یونسؑ ہی کا نام نکالا۔ ملاحوں نے ان کو سمندر میں پھینک دیا۔ ایک شارک مچھلی تجویز الٰہی سے منہ کھولے ہوئے پاس ہی موجود تھی۔ یونسؑ اس کے پیٹ میں پہنچ گئے۔ اپنی اس حالت زار کو دیکھ کر انہوں نے اپنے "ظلم" کا اقرار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جرأت دلائی۔ انہوں نے چاقو وغیرہ سے مچھلی کا پیٹ چاک کر دیا۔ وہ الٹ کر مر گئی (یا مر کر الٹ ہو گئی۔ مرتب) حضرت یونسؑ اس سخت مصیبت کے باعث بیمار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پانی کی لہروں کے ذریعے سے انہیں ایک بے سایہ کنارے پہ ڈال دیا۔ قدرت الٰہی سے وہاں کدو کا بیج بھی پہنچا ہوا تھا۔ کدو کی بیل حسب معمول جلدی سے اُگ کھڑی ہوئی اور انہیں گرمی وغیرہ سے بچانے کا باعث بنی۔ اگر وہ اپنے "ظلم" کا اعتراف اور اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی کا اظہار نہ کرتے مچھلی ہی کے پیٹ میں رہتے اور وہیں سے خدا تعالیٰ کے حضور پیش ہو جاتے — منزل چہارم ص۲۵۴

سورہ صافات میں مذکورہ حالات اس طرح بیان ہوئے ہیں۔

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (صافات ۱۳۹) یونس البتہ (بالضرور میرے تعالیٰ) رسولوں میں سے تھا — إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ (۱۴۰) (اس وقت بھی رسول ہی تھے۔ زمرۂ انبیاء سے خارج نہیں کیے گئے تھے) جب اپنے مالک تعالیٰ سے بھاگ گئے۔ صبر و انتظار کرتے تو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں ہجرت کا حکم ملتا یا عذاب ہی ٹل جاتا۔ جیسا کہ ان کے بعد ہوا۔ قوم نے رجوع کیا۔ خدا تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ گھبراہٹ کی حالت میں بخشش مانگنا اور توبہ کرنا فضیلت و سعادت کی بات ہے۔ عذاب

[ل] یہ بحیرہ روم، بحر ظلمات یعنی اٹلانٹک اوشن کا ایک حصہ ہے۔

کی خواہش کرنا اشرار کا شیوہ ہے۔ عذاب نہ کسی کے کہنے سے آتا ہے نہ ٹلتا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کون سا کام کس وقت کرنا مناسب ہے۔ انسان کو صابر رہنا چاہیئے۔ بے صبری تکالیف کا باعث بن جاتی ہے۔ ہمارے رسول کریم کو حکم کہ ——

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ (القلم-۴۹) تو اپنے رب کے حکم پر ٹھہارہ اور مچھلی والے (یونس) کی مانند نہ بن جانا جب اس نے (اپنے رب کو) پکارا، اس حال میں کہ وہ غم سے بھرا ہوا تھا —— اس سے صبر کی تاکید ثابت ہوتی ہے۔ یونسؑ سے بے صبری ظاہر ہوئی کہ خدا میری بات کیوں نہیں مانتا اور قوم پر عذاب نہیں بھیجتا۔ جب ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو فرض ناشناس غلام کی طرح اپنے آقا سے بھاگ نکلے (اَبَقَ[1]) اور کشتی پر سوار ہو گئے اور نینوا سے شام کی طرف کہیں دور دراز علاقے میں نکل جانا چاہا اور سمجھ لیا کہ خدا کا ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ (فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ - انبیاء-۸۷) گھبراہٹ میں انسان کی زبان سے ایسے کلمات نکل جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ واقعات پیش آئے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ (۱۴۵) ہم (خدا) نے (نہ کہ مچھلی نے) اس کو چٹیل میدان میں لا پھینکا اس حال میں کہ وہ بیمار تھا۔

وَأَنْبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِنْ يَقْطِينٍ (۱۴۶) اور ہم نے اس پر کدو کا (بیل دار) درخت اگا دیا (اس میدان میں ایسی نازک حالت میں یونسؑ کی حفاظت کی کہ قدرتی طور پر کدو کا بیج قریب کر دیا۔ وہ جلدی سے اُگ آتا ہے۔ اس کے پتے چوڑے ہوتے ہیں، قدرے سائے کا کام دیتے ہیں اور اس پر مکھی نہیں بیٹھتی، یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی)

وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ[2] (۱۴۷) اور ہم نے اس (یونسؑ) کو ایک لاکھ (انسانوں) بلکہ زیادہ کی طرف بھیجا (یعنی انہوں نے آثار عذاب دیکھتے ہی توبہ کر لی۔ بلکہ دوسروں کو بھی ہدایت کرنے لگے۔ اس طرح انہوں نے اپنی ایک لاکھ کی تعداد میں اضافہ کر لیا اور عذاب ٹل گیا) منزل ششم ص ۳۹ تا ۴۱

ظلمات سورہ ظلمات میں پکارا کہ (اے خدا) تیرے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، تو پاک ہے۔ بلاشبہ میں ہی ظالموں میں سے ہوں (جو مصیبت مجھ پر آئی یہ میرے ہی فعل کا نتیجہ ہے —— ظلمات ایک بہت بڑے سمندر کا نام

---

[1] ابق العبد ابقاً و اباقاً (تاج۔ راغب۔ محیط) "الآبق" اپنے فرائض منصبی سے احتراز کر کے بھاگ جانے یا چھپ جانے والا۔

[2] "او" بمعنی بل، یعنی وہ ایک لاکھ بلکہ زیادہ تھے۔ (بصائر ذوی التمییز، مجدالدین فیروز آبادی الجزء الثانی ص ۳۹ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۵ء) خبر مبتدا محذوف فی محل رفع "اوهم یزیدون" محل رفع میں مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی "بلکہ وہ زیادہ ہوتے جاتے تھے"۔ والتقدیر۔ و ارسلناک الی مائۃ الف معها زیادہ۔ ہم نے تجھے بھیجا ایک لاکھ کی طرف اس کے ساتھ زیادہ بھی تھے (برہان فی علوم القرآن علامہ زرکشی۔ الجزء الرابع ص ۲۰۹، ۲۱۰ مطبوعہ مصر ۱۹۵۸ء)

بھی ہے، بحیرہ روم اسی کا حصہ ہے اور ظلمات کے معنی اندھیروں کے بھی ہیں۔ ایک مچھلی کے پیٹ کا اندھیرا، دوسرا پانی کے نیچے ہونے کا اندھیرا۔ اور اگر اس وقت بادل تھا تو وہ ایک اور اندھیرا تھا منزل چہارم ص۲۵۵ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذَٰلِكَ نُنجِي الْمُؤْمِنِينَ ۝ (الانبیآء۔ ۸۸) (جب یونس نے نہایت عاجزی سے اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی کا اظہار کیا اور اپنے ظلم کا اقرار کیا) تو ہم (خدا) نے اس کی دعا قبول کی اور اسے غم سے نجات دی، اور اسی طرح ہم ایمانداروں کو نجات دیا کرتے ہیں (اس میں سب ایمان دار داخل ہیں، جو سچے موحّد ہوں ......) منزل چہارم ص ۲۵۵

طیّ السّمار۔ آسمان کا لپیا جانا

(تخلیق نظام شمسی)

یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ كَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَیْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِیْنَ (الانبیاء ۱۰۴)

اس رکوع کے آغاز میں نیکوں کی دینوی کامیابی اور اُخروی فلاح کا ذکر ہے۔ سنت اللہ غیر متغیر ہے۔ اللہ تعالیٰ قواعد اٹل ہیں۔ صالحین کی امداد میں بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ ارشاد ہے (اس عجیب واقعہ کو) یاد کرو جس دن ہم اس آسمان کو جس میں خدا تعالیٰ نے نیبولا کا سمندر پیدا کر رکھا ہے۔ اَلْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (الطور ۶) تحریرات کے مٹھے کی طرح لپیٹے (اور چکر دیتے) ہیں (نیبولا کا سمندر اسی طرح چکر کھاتا ہے۔ جس طرح تحریروں کے مٹھے کو لپیٹا جاتا ہے اس مٹھے کا مرکز جسے نکلیئس کہتے ہیں، مجتمع ہوتا ہے اور کاغذوں کے سرے کھلے اور ڈھیلے ہوتے ہیں۔ بیچ والا حصہ سورج بن جاتا ہے، باقی حصے قوت مدافعت سے مناسب فاصلوں پہ پھینکے جاتے ہیں، جو سیارے اور چاند بن جاتے ہیں۔ اس طرح ایک نظام شمسی تیار ہو جاتا ہے۔ اور سیاروں کے پوست سرد ہونے پہ جملات و نبات و حیوانات کا ظہور ہوتا ہے۔ اور صاحب اختیار ہستیاں زمین کی خلافت کے لیے پیدا کی جاتی ہیں۔ اس طرح کے لیے تمام ارتقاؤں کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔ سماء جو کئی قسم کے ایتھروں کا مجموعہ ہے۔ اپنے دباؤ سے قوت کشش کا موجب بن جاتا ہے آگے فرمایا) جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کو شروع کیا۔ اسی طرح اس کو دوہراتے بھی جاتے ہیں (اور نیبولا کے نئے سمندروں سے نئے نئے عوالم بنائے جاتے ہیں، اس حال میں کہ) یہ ہم پہ ایک وعدہ ہے (ہم آئندہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ کیوں کہ) بلاشبہ ہم ایسا ہی کرنے والے ہیں۔ (منزل چہارم صہ ۲۶) دوسرے مقام پہ ارشاد ہے۔

وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ (زمر ۶۷)

اور زمین ساری اس (خدا تعالیٰ) کی مٹھی میں ہے (اس کا مشاہدہ یہاں نہیں تو دوسرے عالم میں) قیامت کے دن (ضرور ہوتا ہے) اور آسمان اس (خدا تعالیٰ) کے داہنے ہاتھ (یعنی مکمل قبضے) میں لپیٹے ہوئے ہیں (یہ زمین و آسمان، ستارے وغیرہ ملے جلے ہوتے ہیں، باری تعالیٰ انہیں گردش میں لاتا ہے۔ یعنی کاغذوں کے مٹھے کی طرح پھیرتا ہے پھر سورج پیدا ہوتا ہے۔ اور دوسرے ستارے چھوٹے ہونے کے سبب جلدی ٹھنڈے ہو کر آبادی کے قابل بن جاتے ہیں۔ سورج بہت بڑا ہونے کی وجہ سے گرم رہتا ہے۔ ایسے

لے سماوات پر مفصل بحث اس سے قبل گزر چکی ہے، یہاں کچھ تکرار اور کچھ اضافہ بھی ہے۔

عظیم کارخانے کو بنانے اور مناسب طرح سے تھامنے والا ایک ہی قوی و قدیر ہاتھ ہے۔ جو نقصان اور غلطی سے پاک ہے۔ ایسے عظیم کاموں میں حقیر و فانی مخلوق کو شریک کار سمجھنا ناقابل معافی شرک ہے۔ لہٰذا پاک ہے وہ (خدا) اور بہت بلند (ورا الورا) اونچے سے اونچا ہے، اس سے جو شریک بناتے ہیں۔ منزل ششم صـ۱۳۲)

سبع طرائق

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ (مومنون۔ ۱۷) ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے (یہ سات ایتھر ہیں جو ایک دوسرے کی مطابقت میں واقع ہیں۔ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (الملک۔ ۳) ان کے ذریعے سے حرکت و حرارت و نور اور کشش و مداخلت زمین پر اترتے رہتے ہیں۔ اور تمہارے جسم کے اوپر کے حصے بھی سات راستے بنائے ہیں۔ دو آنکھیں، دو کان، دو نتھنے اور ایک دہن۔ ان کے ذریعے سے تمہارا بھی قیام ہے)

حج و قربانی وغیرہ

حج کی اصل غرض یہ تھی کہ ملک میں کانفرنس کی جائے اور لوگ حاضر ہو کر اپنے مناسب حقوق طلب کریں۔ ایسی کانفرنسیں ہر ملک میں ہونی چاہئیں تاکہ تمام اقوام عالم میں اتحاد و امن کی فضا قائم ہو اور سب کو مناسب حقوق حاصل ہوتے رہیں۔

آج کل مسلمانوں نے اس کو خیالی رسوم کا مجموعہ بنایا ہے۔ کہیں ایک ٹوٹے ہوئے پتھر کو چوما جاتا ہے۔ کہیں جھوٹی روائتیں پھیلائی جاتی ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے منع فرمایا ہے۔ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ ۝ (حج ۳۰) سو تم ان پتھروں کی پلیدی سے بچو (جن کی پوجا کی جاتی ہے۔ یا چوما جاتا ہے) اور جھوٹ بات (اور روایت) سے بچو (اس آیت میں حجر اسود کے تقدس کو ختم کیا ہے اور اس کے متعلق جو جھوٹی روایتیں مشہور ہیں کہ آدم اسے بہشت سے لائے تھے اور اس کا رنگ نورانی تھا اور اب ہمارے گناہوں کے سبب سیاہ ہو گیا ہے) ان سے بھی پرہیز کرو۔

اور کہیں نسل حیوانی کو ضائع کیا جاتا ہے اور غریب پروری کی بجائے ان کو کاٹ کر زمین میں دبا دیا جاتا ہے کوئی معقول و خدا ترس انسان اس کی حمایت نہیں کر سکتا۔

اور ٹیلوں کو شیطان سمجھ کر سات سات کنکر مارے جاتے ہیں۔ مسجد کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کی بجائے اسے بالعموم بند رکھا جاتا ہے اور حج کے اصلی مقصد یعنی شوریٰ سے کام نہیں لیا جاتا۔ حاجی صاحبان وہاں سے کوئی ٹھوس انفرادی و اجتماعی فائدہ حاصل کر کے نہیں آتے، البتہ مٹی اور پانی کو متبرک سمجھ کر ساتھ لے آتے ہیں۔

اسی سورۂ حج میں ارشاد ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ۝

(حج ۳۴)

(منسک کے تین معنی ہیں۔ خالص (۱) عبادت کے طریق۔ خالص (۲) اور سچی باتیں اور صحیح مشورے خالص عبادت (۳) کی جگہ ۔۔۔ اس آیت میں طریق عبادت مراد ہے۔ جہاں بھی سچائی اور موحدانہ عبادت ہو، اس میں شامل ہو جانا لازم ہے نیز قرآن حکیم فضول تفریقوں کی حمایت نہیں کرتا، جیسا کہ ارشاد ہے) ہم (خدا) نے ہر امت کیلئے عبادت کا کوئی نہ کوئی طریقہ (و جائے) ٹھہرایا ہے تاکہ (لوگ معبد کی طرف جائیں تو گھر سے خوراک کا انتظام کر کے چلیں اور

لے حج کا مختصر ذکر پہلے بھی گزر چکا ہے۔

دوسرے علاقے پہ اپنے کھانے کا خواہ مخواہ بوجھ نہ ڈالیں، ان جانوروں پر جو اللہ نے انہیں دیئے ہیں، اللہ کے نام کا ذکر کریں (غیر اللہ کا نام نہیں) سوئم سب (اُمتوں) کا معبود ایک ہی ہے، اسی کے حضور گردن جھکا دو، اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری دیجئے۔ (یہ اصلاحات اس لئے فرمائیں کہ لوگوں نے اپنی غذاؤں اور حیوانات پہ غیر اللہ کا نام شروع کر دیا تھا۔ غیر کی پوجا ہو رہی تھی ——

یہودی قربانیوں کے خون کا بیت المقدس میں خاص جگہوں پر ساتھ چھڑکاؤ کیا کرتے تھے اور گوشت کو جلا دیتے تھے۔ ان کے خیال میں وہ خون اور گوشت خدا کو پہنچ جاتا تھا۔ مشرکین مکہ بھی ایسا ہی کرتے تھے —— مکہ بے زراعت وادی میں تھا۔ یہ بات نہایت ہی مناسب تھی کہ جو لوگ وہاں مشورت اور حصول حقوق کے لیے جمع ہوں، ان میں سے دولت مند اپنے ساتھ جانور لے جائیں تاکہ انہیں ذبح کر کے خود بھی کھائیں اور غربا کو بھی کھلائیں۔ خواہ مخواہ بے ضرورت ذبح کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (حج - ۳۷) اللہ تعالیٰ کو ان (قربانیوں) کے گوشت اور خون نہیں پہنچتے لیکن اس کو تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے۔ (خدا کا خوف اور لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کرنا تقویٰ ہے بے ضرورت جانوروں کو ضائع کرتے رہنا بلاشبہ خلاف تقویٰ ہے)

منزل چہارم ص ۲۸۳ تا ۲۸۴ ملخصاً)

لہ اور ہم وہاں دیتے ہیں۔ دونوں کی لغویت ظاہر ہے۔ قرآن جو "حکیم" بھی ہے، ہرگز اس کا ذمہ دار نہیں۔ کوئی حکمت ایسے فعل عبث کی اجازت نہیں دے سکتی۔

واقعہ اِفک

واقعہ افک میں راویوں نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ رض کو ملوث کیا ہے اور مفسرین بھی بلا اختلاف اسی رو میں بہہ گئے ہیں ــــ خواجہ صاحب نے سختی سے اس کی تردید کی ہے۔ جو بات اللہ تعالیٰ نے نہیں کی، کسی کو کیا حق ہے کہ اس کو اپنی طرف سے بنا کر اللہ کے ذمے لگا دے۔ معاذ اللہ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ (النور - ۱۱) کفار، مومنوں کو ہر طرح تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ ان کی بیویوں کو راہ چلتے چھیڑا کرتے تھے۔ ان کے متعلق بری افواہیں پھیلایا کرتے تھے ــــ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔

لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ لَنُغْرِیَنَّكَ بِهِمْ (احزاب - ۶۰)	اگر منافق، مریض القلب لوگ اور شہر میں جھوٹی افواہیں پھیلانے والے باز نہ آئے تو ہم تجھ (پیغمبر) کو ان پر مسلط کر دیں گے۔

مسلمانوں میں سے حوصلہ مند عورتیں جنگوں میں شامل ہوتی تھیں۔ فوج کے لیے روٹی پانی کا انتظام کرتی تھیں ــــ ایک جنگ میں تین، چار عورتیں پانی کی تلاش میں راستہ بھول گئیں۔ جنگ ختم ہوئی ان کے شوہروں نے انہیں ڈھونڈا۔ بعض نیک دل لوگ انہیں لشکر میں پہنچا گئے۔ جب یہ خبر منافقوں کو پہنچی تو انہوں نے سازش کر کے یہ بہتان باندھا کہ یہ بدکار عورتیں ہیں۔ اسی لیے چھپی رہیں۔ بعض مومن بھی شبہ میں پڑ کر ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ــــ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبیؐ اور مومنینؓ میں سے کوئی بھی غیب دان نہیں ہوتا ــــ اللہ ہی غیب دان ہے جس نے ان کی پاک دامنی کی شہادت دی۔ اللہ نے مومنوں کو آئندہ ایسے بہتانوں میں شریک ہونے سے منع فرمایا ہے اور تاکید کی کہ تخمینی باتیں نہ بنایا کرو۔ اور صریح ثبوت کے بغیر کسی پر الزام مت لگاؤ۔

ان آیات میں نبی کی بیوی کا اشارہ تک نہیں۔ روایت پرست خواہ مخواہ اس کو حضرت عائشہ رض کے ذمے لگاتے ہیں۔

(منزل چہارم ۲۴۰۰)

آیہ نور

آیت نور بھی مہمات قرآنی میں سے ہے۔ مفسرین کرام نے اپنی اپنی ذہنی رسائی کے مطابق اس کے عمیق معانی بیان کئے ہیں۔
اس ضمن میں خواجہ صاحب کی تلاش و تحقیق ملاحظہ فرمائیے۔

اللہ نور السمٰوٰت والارض ط مثل نورہ کمشکوٰۃ فیہا مصباح ط المصباح فی زجاجۃ ط الزجاجۃ
کانہا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ ولا غربیۃ لا یکاد زیتہا یضیء ولو لم
تمسسہ نار ط نور علی نور ط یہدی اللہ لنورہ من یشاء ط (نور - ۳۵) (نور کے معنی ہیں ظاہر کرنے والا اور ہدایت دینے والا۔
اللہ تعالیٰ آسمانوں اور جنسِ زمین کو امکان محض سے خارجی وجود میں لایا ہے۔ پھر ہر شے کو اس کی مناسبت سے پیدائش دے کر اس پیدائش کے لائق اس کو ہدایت دے دی۔ اعطیٰ کل شیٔ خلقہ ثم ھدیٰ طٰہٰ ... اس آیت میں خدا کے ہادی ہونے یعنی ہدایت دینے کی مثال بیان فرمائی ہے)

طاق
اللہ آسمانوں اور جنس زمین کا نور ہے۔ اس (نور) کے ہدایت دینے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک طاق ہے (جو چراغ کی روشنی کو سمیٹ کر ایک طرف لے جاتا ہے اور دیکھنے والے کے لیے چراغ کے نور کو مجتمع کر کے بڑھا دیتا ہے۔
یہ طاق کیا ہے؟ انسانی جسم جو روح کو مدد دینے کے لیے بنایا گیا ہے)
اس طاق میں ایک چراغ ہے (یہ چراغ انسان کی روحانی فطرت ہے، جس پر اس کو خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا ط (روم - ۳۰)

چراغ
وہ چراغ ایک شیشے (کی چمنی) میں ہے (شیشہ چراغ کے نور کو ترقی دیتا ہے۔

شیشہ
وہ شیشہ موتی کی طرح چمکنے والے ستارے کی مانند ہے (اس چراغ کا نور درخشاں شیشے میں ضرور ترقی پائے گا۔ شیشہ دماغ ہے جو فطرت انسانی کے لائق بنایا گیا ہے۔ تمام جسم حواسِ ظاہری کے ذریعے سے روح کو قوت پہنچاتا ہے۔
اس طرح روح کو غور و فکر میں مدد ملتی ہے)

زیتون
وہ (چراغ) زیتون کے مبارک (خیر کثیر والے) درخت سے جو نہ شرقی ہے، نہ غربی (تیل حاصل کر کے) روشن کیا جاتا ہے (یہ زیتون کا شجر غیر ہے، جو ہر جگہ موجود ہے۔ اس کی تلاش کے لیے شرق و غرب کے سفر کی ضرورت نہیں)

تیل
اس درخت کا تیل خود ہی جگمگانے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ اگرچہ اسے آگ نہ چھوئے (یعنی بیرونی اکتسابی تعلیم کے بغیر

بھی روشنی حاصل ہوتی ہے اور اگر اس کے ساتھ تعلیم بھی شامل ہو جائے تو نورٌ علیٰ نور ہے۔)

اللہ کی رہنمائی یہ نور پر نور (کا اضافہ) ہے۔ (یعنی ہدایت پر ہدایت ہے) اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت کے لیے (جسے چاہتا اور طالب دیکھتا ہے) رہنمائی کرتا ہے۔ (طالب صادق ضرور ہی ہدایت حاصل کر لیتا ہے۔ مَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ ط (تغابن - ۱۱)

مطلب یہ ہے کہ حقیقی ہادی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ پیغمبر کو بھی یہ قدرت حاصل نہیں کہ اپنی خواہش سے کسی کو ضرور ہی ہدایت یافتہ بنا سکے۔ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ (القصص - ۵۶)

امثال اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کر رہا ہے (تاکہ وہ سمجھ جائیں) اور اللہ تعالیٰ کو ہر شے کا پورا پورا علم ہے۔

مساجد (اس ہدایت کے لیے کہیں سفر کرنے کی ضرورت نہیں یہ) ان گھروں (مسجدوں) ہی میں مل جاتی ہے، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کو (ظاہری باطنی پلیدی سے) پاک اور برتر رکھا جائے اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے ..... فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ (النور۔ ۳۶) منزل چہارم ص ۲۵۲-۲۵۲)

مدّظل — سائے کا پھیلاؤ

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا۔
(الفرقان - ۴۵)

کیا تو نے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا؟ (اس کی قدرتوں پہ غور نہیں کیا؟) کہ کس طرح اس نے سائے کو پھیلایا۔ اور اگر وہ چاہتا تو اُسے ساکن (وقائم) بنا دیتا۔۔۔۔ پھر ہم نے سائے کو اپنی طرف بلا تکلف سمیٹ لیا۔ (جب رات پڑتی ہے تو زمین کا سایہ سورج کے دوسری طرف مخروطی شکل کی طرح پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اگر زمین اور سورج دونوں کی حرکت بند ہو جائے تو سایہ ساکن ہو جائے گا۔ اگر زمین کا خط استوا مدار زمین پہ واقع ہوتا تو خط استوا کے ایک طرف ہمیشہ رات رہتی اور دوسری طرف ہمیشہ دن رہتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ہمارے فوائد کی خاطر سورج کو لے آتا ہے اور اندھیرے کو اپنی طرف سمیٹ لیتا ہے اور رات آہستہ آہستہ خدا تعالیٰ کو سجدہ کرتی ہوئی دوسری طرف چلی جاتی ہے تمام اشیاء کے سائے خدا ہی کو سجدہ کر رہے ہیں اور کوئی بھی اس کے حکم وقانون سے باہر نہیں۔ وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (الرعد ۱۵) آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب کے سب طوعاً یا کرہاً خدا کے حضور سجدہ ریز ہیں (مشرک بھی دکھ میں اسی کو پکارتے ہیں سب کو اس کے قانون فطرت سے دینا پڑتا ہے جسم سے غلاظت نکالنے کے لیے کون ہے جو مجبور نہیں!) اور ان (سب) کے سائے بھی (سجود الٰہی سے بے نیاز نہیں)

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ (النحل - ۴۸)

کیا وہ لوگ نہیں دیکھتے ہر اُس چیز کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ اس کے سائے (جب وہ سایہ افگن ہوتی ہے تو) اللہ تعالیٰ کے حضور ساجد (و ذلیل) ہو کر دائیں طرف اور بائیں اطراف سے مڑتے (اور لوٹتے) رہتے ہیں اور سائے اسی طرح ساجد و ذلیل ہیں جس طرح) وہ لوگ (جن کے وہ سائے ہیں ساجد و) ذلیل ہیں۔

جمع وواحد کی حکمت

اگر ہم لب دریا کھڑے ہو کر اس کے بہاؤ کی طرف رُخ کریں، تو ہمارا دایاں دریا کا دایاں کنارہ اور ہمارا بایاں دریا کا بایاں کنارہ ہوگا۔ زمین بھی مغرب سے مشرق کی طرف رواں ہے۔ پس زمین کا دایاں جنوب اور بایاں شمال ہے۔ شمال کے معنی بھی بائیں کے ہیں اور شمائل اس کی جمع ہے، حرکت زمین سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمس و قمر اور انجم مغرب کی طرف آ رہے ہیں زمین کی جنوبی طرف کی اشیاء کے سائے اس کی دائیں جانب

مڑتے ہیں اور شمالی اشیاء کے سائے بائیں اطراف سے لوٹتے ہیں۔ یہی حال دائرہ قطب جنوبی اور دائرہ قطب شمالی کی اشیاء کا بھی ہوتا ہے جب کہ وہاں سورج کی روشنی کئی مہینوں تک پڑتی رہتی ہے۔ زمین کے جنوب کی طرف آبادی بہت کم ہے۔ اور سایہ افگن چیزیں بھی قلیل ہیں۔ اس قلت کے اظہار کے لیے لفظ یمین مفرد لایا گیا ہے۔ اور شمال کی طرف بہت زیادہ آبادی ہے اور پہاڑ وغیرہ بھی بکثرت ہیں۔ اس کثرت و جمعیت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لفظ شمائل جمع آیا ہے۔ مخلوقات میں تغیر و تبدل پیدا کرنا خدا کے لیے ایسا ہی سہل ہے، جیسا کہ سایوں کو ردو بدل کر دینا)

منزل سوم ص ۲۴۲ و ۲۴۳)

دابّۃ الارض

دابّۃ الارض کے متعلق روایات وتفاسیر میں عجیب وغریب کہانیاں مرقوم ہیں۔ جن کے متعلق مولانا عثمانی کی رائے یہ ہے کہ "دابّۃ الارض کے متعلق بہت سے رطب ویابس اقوال وروایات تفاسیر میں درج کی گئی ہیں"۔ (زیر تفسیر آیہ دابۃ الارض) معتبر ترین روایت یہ سمجھی گئی ہے کہ۔

قیامت سے پہلے مکّے کا پہاڑ "صفا"، پھٹ جائے گا۔ اس میں ایک جانور نکلے گا جو لوگوں سے باتیں کرے گا کہ اب قیامت نزدیک ہے اور سچّے ایمان والوں کو اور چھپے منکروں کو نشان دے کر جدا کر دے گا (موضح القرآن شاہ عبدالقادر دہلوی) خواجہ صاحب اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے" اور جب ان پر (ان کے جرائم کی وجہ سے گرفت کا) حکم صادق آتا ہے تو ہم اس وقت بھی زمین سے کوئی نہ کوئی چلنے پھرنے والا (مبلغ) نکال کھڑا کرتے ہیں۔ جو ان کے ساتھ کلام کرتا ہے کہ لوگ ہماری (اللہ تعالیٰ کی) آیتوں کو نہیں مانتے"، منزل پنجم۔ ص ۹۸

"دابہ" کے معنی میں انسان شامل ہے۔ اس کا ثبوت لغت اور قرآن مجید کی متعدد آیات میں ملتا ہے۔ مثلاً وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْھُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِہٖ ۚ وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ ۚ وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰٓی اَرْبَعٍ ط (النور۔ ۴۵) اللہ نے پیدا کیا ہر چلنے پھرنے والے کو پانی سے، پھر ان (چلنے پھرنے والوں) میں بعض اپنے پیٹ پر چلتے ہیں (جیسے سانپ اور مچھلی) اور بعض دو پاؤں پر چلتے ہیں (جیسے آدمی اور ملیور) اور بعض چار پاؤں پر چلتے ہیں (جیسے گائے بھینس وغیرہ)

عمر نوح علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر بائیبل میں ساڑھے نو سو۹۵۰ سال بتائی گئی ہے۔ ہمارے ہاں بھی قرآن حکیم کے ظاہری الفاظ سے یہی سمجھ لیا گیا، لیکن تاریخ نے اب تک اس کی کوئی شہادت نہیں دی کہ انسانوں کی عمریں بائیبل کے بیان کے مطابق کسی گذشتہ زمانے میں ہزاروں سال تک پہنچی رہی ہوں۔ اس کے متعلق ہمارے معقول پسند لوگ مختلف مسالک اختیار کرتے ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہوئے پائے گئے ہیں کہ قرآن حکیم ماضی کے تاریخی حوالوں (مندرجہ بائیبل وغیرہ) کی صحت کا ذمہ دار نہیں۔ لوگ جو مانتے چلے آرہے تھے۔ قرآن نے اسی طرح نقل کر کے حکیمانہ نتائج اپنے اسلوب کے مطابق نکالے ہیں۔

بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ ساڑھے نو سو۹۵۰ سال سے مراد نوح علیہ السلام کی مدت بعثت ہو سکتی ہے۔ یعنی اتنی مدت تک ان کی شریعت و برکات قائم رہیں۔ خواجہ صاحب ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ اور خود قرآن ہی کے الفاظ سے مشکل کا حل نکالتے ہیں۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (عنکبوت-۱۴) اور بالتحقیق ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (تاکہ وہ ان کو دردناک عذاب آنے سے پہلے ڈرائے) پس وہ ان میں پچاس "عام" کم ہزار سنہ" رہا۔

لغت کی معروف کتاب "مصباح المنیر" میں لکھا ہے کہ سنہ کے معنی فصل کے بھی ہیں۔ قرآن مجید میں سنین کا لفظ فصلوں کے قحط پر بھی بولا گیا ہے وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ (اعراف-۱۳۰) اور ہم نے پکڑ لیا۔ فرعون والوں کو قحطوں میں ۔۔۔ سنین کو لوگ مختلف طرح سے گنتے تھے۔ مِمَّا تَعُدُّوْنَ (حج و سجدہ-۶) کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن "عام" پورے سال کو کہتے ہیں۔ وَفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ۔ (لقمان-۱۴) حضرت نوحؑ کی عمر کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سنہ اور عام کے دو مختلف لفظ استعمال کر کے واضح ہے کہ ان میں ضرور کچھ فرق ہے، ورنہ "عام" کی اس فقرے میں لانے کی کوئی وجہ[2] نہ تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سنہ کے معنی فصل ہی کے ہیں۔ اگر سال میں کم از کم چار فصلیں سمجھی جائیں تو اڑھائی سو سال ہوئے۔ ان میں سے پچاس۵۰ عام رد دیں تو دو سو رہ گئے۔ اور اتنی عمر والے انسان دیکھے گئے ہیں۔ قرآن نے ایسے طرز بیان سے دکھایا ہے۔ تورات کا بیان ایسا ہی تھا۔ لوگوں نے سمجھنے میں غلطی کی (منزل نقم ص۵۵)

"لین" نے بھی مصباح المنیر" کی تائید میں لکھا ہے کہ "سنہ کا اطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے، جو سال میں چار ہوتی ہیں"

---

[1] قرآن مجید بھی لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ (بقرہ-۹۶) کہہ کر اس خیال کی تردید کرتا ہے۔ یعنی ہزار سال کی عمر بھی مل جائے تو عذاب سے بچاؤ نہیں ہو سکتا۔ لہجہ کلام سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہزار سال کی عمر نہیں ہو سکتی۔

[2] فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ ـــ بغیر عام کے نحوی ترکیب کے لحاظ سے جملہ اپنے مفہوم کو پوری طرح ادا کر رہا ہے۔

طوفانِ نوحؑ

"طوفان نوح کے متعلق اختلاف چلا آرہا ہے کہ وہ تمام دنیا میں آیا تھا یا خاص ملکوں میں ..... جو لوگ عام طوفان کے قائل ہیں ان میں سے اکثر کے نزدیک موجودہ دنیا کے کل انسان نوحؑ کے تین بیٹوں کی اولاد ہیں" (عثمانی ملخصاً)

اس کے متعلق خواجہ صاحب کی تحقیق ملاحظہ فرمایئے۔

قوم نوح نے ان کو وحی الٰہی میں کاذب کہا اور بولے کہ پاگل ہے اور دھمکایا گیا ہے نوح علیہ السلام نے دعا کی کہ میں عاجز آگیا ہوں۔ پس (اے خدا!) تو ہی ان سے (میرے ستانے کا) بدلہ لے! (القمر۔ ۹ و ۱۰)

فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَىٰ أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ (۱۱و۱۲)
پھر ہم نے موسلادھار پانی کے ساتھ آسمان کے دروازے کھول دیئے اور زمین کو پھاڑ کر چشمے بہا دیئے۔ پس پانی اس کام کے مطابق جس کا اندازہ لگایا گیا تھا مل جل کر فراہم ہوگیا (اور قوم نوح کے ظالم کر غرق کر دیئے گئے)۔

وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ ۝ (۱۳) اور ہم نے اس (نوح) کو تھوڑے سے مومنین سمیت (تختوں اور میخوں والی (معمولی کشتی) پر اٹھایا۔

تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا جَزَاءً لِّمَن كَانَ كُفِرَ (۱۴) جو ہماری نگرانی میں چلتی تھی۔ بدلہ اس شخص کا جس کی (ہمدردی) کی قدر نہ کی گئی۔

وَلَقَد تَّرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (۱۵) اور بالتحقیق ہم نے اس (کشتی کو (مدتوں تک) بطور نشان کے چھوڑ رکھا پھر کیا ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا! (اس کشتی کا کوئی نہ کوئی ٹوٹا ہوا حصہ رسول کریم کے زمانے تک کوہ جودی پر محفوظ رکھا گیا تھا۔ لیکن بعدازاں لوگ اس گلنے سڑنے والی لکڑی کو محفوظ نہ رکھ سکے[1]۔ یہ ایک معمولی کشتی تھی۔ طوفان نوح کل دنیا پر نہیں آیا۔ صرف نوحؑ کی ظالم قوم ہی پکڑی گئی تھی اللہ تعالیٰ نے نوحؑ کو کشتی سے اترتے وقت فرمایا ـــــ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ ۚ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ (ھود۔ ۴۸) اے نوح! ہماری طرف سے سلامتی اور برکات (ترقیات) کے ساتھ اتر (جو سلامتی اور برکات) تجھ پر اور ان جماعتوں پر ہیں جو تیرے ساتھ والوں کی قسم سے ہیں (یعنی مومنوں سے ہیں (خواہ وہ تیرے ساتھ ہوں یا دنیا کے دوسرے علاقوں میں ہوں) اور کچھ دوسری

لہ اب بھی کبھی اخبارات میں اس کشتی کی تلاش یا دستیابی کی کوئی خبر نظر آتی رہتی ہے۔ واللہ اعلم

جماعتیں ہیں۔ جنہیں ہم ابھی دنیا کا فائدہ دیں گے۔ پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح تمام کرہ ارض پر نہیں آیا تھا۔ بہت سی مومن بلکہ غیر مومن جماعتیں بھی کشتی سے باہر دنیا کے دوسرے علاقوں میں موجود تھیں۔)

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ (صافات۔ ۷۷) اور ہم نے نوح کی اصلی اولاد کو باقی رکھا — اس کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ "تنہا اس کی اولاد سے زمین کو آباد کر دیا" (عثمانی) خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صرف ان کی اولاد کو باقی رکھا اور تمام دنیا کو ہلاک کر ڈالا۔ (منزل ہفتم ص ۴۴)

اسوۂ حسنہ

"اسوۂ حسنہ" کا مسئلہ بھی مسلمانوں میں نہایت اعلیٰ اہمیت کا حامل ہے۔ عام طور پر اس سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ "چاہیے کہ ہر معاملہ، ہر ایک حرکت و سکون اور نشست و برخاست میں اُن کے نقش قدم پر چلیں اور ہمت و استقلال میں اُن ہی کی چال سیکھیں" (عثمانی، زیر آیہ اُسوہ)

اس عقیدے کی بنا پر اور اس کی تکمیل و اتباع کے لیے حدیث کے ان تمام ذخیروں کی ضرورت لاحق ہوئی، جن میں آپؐ کی ہر حرکت و سکون کے حالات مرتب کئے گئے ہیں۔ پھر ان میں صدق و کذب کو پرکھنے کے لیے معیار متعین کئے گئے۔ اس کے باوجود اس کی تسلیم و عدم تسلیم سے امت میں اختلاف کثیر کی راہیں کھلیں کسی کے نزدیک ایک بات "اسوہ" میں شامل ہے تو دوسرے کے نزدیک وہی بات اسوہ سے خارج ہے ــــ یہ موضوع ایسا ہے جس سے کوئی پڑھا لکھا مسلمان بے خبر نہیں ہو سکتا۔ (الا ماشاء اللہ)

اسوہ کی تشریح و تفہیم کے لیے ایک اور اصطلاح "سنت" کے نام سے وضع کی گئی۔ جس کا بیشتر حصہ قرآن سے باہر سمجھ کر اسلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں سے ہر ایک اتنا ہی اہم ہے، جتنا دوسرا۔ اس کو "کتاب و سنت" کہا جاتا ہے۔ کتاب کو علم اور سنت کو اس کی عملی شکل سمجھا جاتا ہے۔ کتاب ہر فرقے کے پاس ایک ہی ہے اور سنت مختلف فرقوں کی مختلف ہے، جس کے بعض حصے ایک دوسرے سے موافقت رکھتے ہیں اور بعض تضاد کی حد تک محل اختلاف بھی ہیں۔ اس سے سیاسی اور دینی دونوں قسم کی جنگ آزمائیاں ہوئیں جن سے ہماری تاریخ کے اوراق آپس ہی کی تلواروں سے لہولہان چلے آ رہے ہیں۔[1] خواجہ صاحب نے "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" کے قدیم اصول کی روشنی میں آیات کے سیاق و سباق سے فائدہ اٹھا کر اسوۂ کے معنی متعین کئے ہیں وہ خود تو قرآن حکیم کے اس حصے کی تفسیر نہ لکھ سکے۔ کیوں کہ زندگی نے انہیں مہلت نہ دی۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں کہیں عرض کیا جا چکا ہے۔ متعدد سورتوں کی تفسیر ان کے خطبات سے فائدہ اٹھا کر عبداللہ پہلوان مرحوم نے اپنے الفاظ میں مرتب کی۔ اسی کی تلخیص حاضر خدمت ہے۔

۱؎ اوپر جو کچھ اسوہ و سنت کے متعلق لکھا گیا ہے۔ یہ بھی حتمی و قطعی نہیں" مختلف الخیال لوگوں نے اس میں کئی شاخیں نکالی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا کون سا مسئلہ ہے جس میں شاخیں بلکہ شاخسانے نہیں نکالے گئے؟ ہم نے اس جگہ عمومی تعریف پر اکتفا کیا ہے قدرے تفصیل کے لیے دیکھئے "سنت کا تشریعی مقام" تالیف مولانا محمد ادریس میرٹھی۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۔
(احزاب - ۲۱)

(اقوام عرب نے متحد ہو کر لشکر جرار کی صورت میں تھوڑے سے مسلمانوں پر چڑھائی کر کے انہیں کچلنے کی تیاریاں کیں۔ مسلمانوں نے استقلال سے ان کا مقابلہ کیا اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ اسی بنا پر اس سورہ کا نام "احزاب" یعنی (مخالفوں کی جماعتیں) رکھا گیا۔ اس کے رکوع ۲ اور ۳ میں جنگ احزاب کا ذکر ہے۔ آغاز سورہ میں تبنی کی قدیم رسم کو ختم کرنے کا حکم ہے۔ ساتھ ہی رسول کریم سے عملاً رسم تبنی کروائی گئی۔ جس سے تمام عرب بھڑک اٹھا۔ رسول کریمؐ مسلمانان عالم کے لیے افضل و اکمل نمونہ ہیں۔ آپؐ کا اسوہ حسنہ جو قرآن مجید میں بالتصریح موجود ہے۔ حیات انسانی کے ہر شعبہ کے لیے خضر راہ کا حکم رکھتا ہے)

ترجمہ آیت:

بالیقین تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک نیک نمونہ تھا۔ اس شخص کے لیے جو اللہ (کی رحمت) اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرتا ہے۔ آیت میں مذکور تینوں باتوں میں رسول کریم اعلیٰ نمونہ ہیں۔

۱۔ رجائے الٰہی (اللہ سے امید رکھنا)

۲۔ روز آخرت (اللہ سے امید رکھنا)

۳۔ اللہ تعالیٰ کو ہر حال میں پیش نظر رکھنا۔ اس کے ذاکر رہنا۔ کوئی کام اس کی رضا کے خلاف نہ کرنا۔ سارا دین اس میں آگیا۔

یہ اسوہ ایسا نہیں جو آپؐ کی ذات سے مختص ہو، بلکہ ہر وہ شخص جو یہ صفات اپنے اندر پیدا کرلے، صاحب اسوہ حسنہ بن سکتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے غیر نبی ساتھیوں کے متعلق ارشاد ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (الممتحنہ - ۴)

تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھ والوں میں نیک نمونہ ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا ہم تم سے اور تمہارے غیر اللہ معبودوں سے الگ ہیں ..... الخ

اس کے بعد ایک آیت چھوڑ کر پھر فرمایا،

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ..... الخ (۶) تمہارے لیے ان میں نیک نمونہ ہے۔ (خصوصاً) ایسے شخص کے لیے جو اللہ اور روز آخرت کی امید رکھتا ہو۔

ان آیتوں نے پوری طرح واضح کر دیا کہ نیک نمونہ کس کا ہو سکتا ہے اور کس بات میں ہو سکتا ہے؟

نبی اور نبی پر ایمان لانے والے عوام بھی صاحب اسوہ حسنہ ہو سکتے ہیں۔ وہ غیر مومنوں کو راہ راست کی تبلیغ تو کریں گے،

لیکن ان کی سوسائٹی سے الگ رہیں گے۔ ان کے معتقدات کی تائید نہیں کریں گے۔ اللہ کے سوا کسی سے فوق الفطرت آس امید نہیں لگائیں گے۔ آخرت پر ایمان لانے کے تقاضے پورے کریں گے۔

ہم ابراہیمؑ اور ان کے ساتھ والوں کا اُسوہ تلاش کرنے کے لیے قرآن حکیم سے باہر نہیں جاتے۔ انہی متعلقہ آیات اور ان بزرگوں سے متعلق دوسری آیات میں ان کا اُسوہ کافی شرح و بسط سے مِل جاتا ہے۔

جب یہ بات مسلّم ہے تو صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ تلاش کرنے کے لیے ہمیں دور دراز کے سفر کرنے اور صدیوں بعد کے پُر اختلافات لٹریچر میں سرگرداں ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ بالخصوص جب کہ رازدار نبوت حضرت عائشہؓ کا یہ قول بلا اختلاف مسلّم سمجھا جاتا ہے کہ "کان خلقہ القرآن" آں حضرت کی سیرت، اخلاق، اسوہ جو کچھ بھی کہہ لو سراسر قرآن ہی قرآن تھا۔

قرآن نے "اسوہ" کے ساتھ "حسنہ" کی شرط لگا دی اور پھر بتا دیا کہ "حسنہ" کیا ہوتا ہے۔ اب اور کیا چاہیے! جس قسم کی باتیں اسوہ حسنہ نہیں ہو سکتیں، قرآن نے ان کا نمونہ بھی بتا دیا۔ مثلاً عَبَسَ وَ تَوَلّٰی (عبس ۱) آپ نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا۔ یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ط (تحریم ۱) اے نبی تو بیویوں کی رضامندی کے لیے اللہ کی حلال کردہ چیز کو کیوں حرام کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ امت نے آج تک ایسی باتوں کو "حسنہ" نہیں سمجھا۔ بعض صحابہؓ نے اپنے رشتہ دار کفار سے خفیہ تعلقات قائم رکھے تھے، ان کے لیے رفقائے ابراہیم کا اُسوہ پیش کیا، جو ایسے لوگوں سے قطعاً الگ ہو گئے۔

بہرحال قرآن حکیم کی اس روشنی سے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں (منزل پنجم صـ ۲۸۷ و ۲۸۶ تلخیص و تشریح)

ازواج النبیؐ (صلی اللہ علیہ وسلم)

روایات نے ازواج النبیؐ کے مبحث کو اتنا الجھا دیا ہے کہ

"حقیقت خرافات میں کھو گئی"

انہی روایات کی بنا پر غیر مسلموں نے مقدس پیغمبرؐ پر ایسے ایسے شرمناک اعتراضات جمائے اور جار ہے ہیں کہ ان کا سلسلہ ختم ہی ہونے نہیں پاتا۔ جب تک موضوعات سے واضح انکار کر کے خالص قرآن کا دامن نہیں تھاما جائے گا۔ حضورؐ کی پاکیزہ شخصیت کا ملکوتی جمال اہلِ عالم کی نظروں کے سامنے نہیں آ سکے گا۔ خواجہ صاحب نے اپنی نگارشات اور خطبات میں نہایت شرح و بسط سے اس پر کلام کیا ہے۔ جو تفسیر کے مختلف مقامات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس پورے دفتر کی تلخیص و ترتیب بھی آسان کام نہیں۔ تاہم جو کچھ اور جیسا کچھ عاجز راقم سے ہو سکا، پیش خدمت ہے۔

سورہ احزاب کے رکوع ۲ و ۳ میں جنگ احزاب میں مسلمانوں کی فتح و کامرانی اور حصول، غنائم کا ذکر ہے۔ مال غنیمت اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کا پانچواں حصہ حاکم اعلیٰ کو ملتا ہے، جسے وہ مناسب مواقع پر ذی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں پر خرچ کرتا ہے، (انفال - ۴۱) چار حصے مجاہدوں کے ہوتے ہیں۔ مال "فے" جو بغیر جنگ ہاتھ آ جائے، اس میں کسی غنی کا حصہ نہیں ہوتا۔ وہ سب کا سب ذی القربیٰ، مساکین اور مسافروں پر خرچ کر دیا جاتا ہے۔ رسول کریمؐ بحکم قرآن خود غنی تھے (الضحیٰ - ۸) جنگوں میں جان و مال سے حصہ دیا کرتے تھے۔ مال غنیمت کے اپنے حصے سے بھی محتاجوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ آپ کی زندگی ہی سے غنی تھے۔ حضرت خدیجہؓ کا جو روپیہ آپ کو حاصل ہوا، اس سے زمین خریدی، جس کی نہایت معقول آمدنی تھی۔ اسی وجہ سے آپ جنگوں میں سبقت کے ساتھ مالی امداد فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا ہے کہ "میں تم لوگوں سے کوئی اجر نہیں مانگتا، مجھے اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے۔"

حاصل کلام یہ کہ جنگ احزاب کا مال و متاع آیا اور پہلے بھی آپ بفضلہ تعالیٰ غنی تھے۔ ایسے حالات میں قدرتی طور پر ازواجؓ مطہرات کو دنیوی آرائش وغیرہ کی خواہش پیدا ہوئی یہ بات ان کے اُمہات المومنین ہونے کے منصب سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ حضورؐ دنیوی خواہشات میں انہماک نہیں رکھتے تھے۔ آپ کا مدعا بالکل واضح تھا کہ بیت نبوت میں داخل ہونے والیاں دنیوی لذتوں اور آسائشوں کا خیال دماغ سے نکال کر آئیں۔ بلاشبہ اُمہات المومنین نیکوکاری اور طہارت و تقویٰ میں اعلیٰ درجے پر تھیں، پھر بھی مصالح رسالت کے اقتضاء سے بحکم الٰہی انہیں آگاہ کر دیا کہ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا

جَمِیْلًا (احزاب-۲۸) اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دے کہ اگر تمہیں دنیا کی زندگی[1] اور اس کی زینت مطلوب ہے تو آؤ میں تمہیں کچھ مال و متاع دوں اور اچھی طرح رخصت کر دوں (میرے پاس تو میری اندرونی زندگی کی شاہد بن کر، دنیوی خواہشوں اور امنگوں سے قطع نظر کر کے رہنا ہوگا)

اِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا (۲۹-۳۳) اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی (رضامندی) اور دار آخرت کی خواہش مند ہو تو بالیقین اللہ تعالیٰ نے تم میں سے نیکوکاروں کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا (۳۰-۳۳) اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو صریح بے حیائی کا کام کرے گی، اس کے لیے عذاب دگنا بڑھا دیا جائے گا۔ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے نہایت آسان ہے۔

وَمَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِیْمًا (۳۱-۳۳) جو کوئی تم میں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی اور اچھے کام کرے گی، ہم اسے اس کا اجر دو دفعہ دیں گے۔ (جیسا کہ اہل کتاب کے مومن قرآن ہونے پر بھی دوہرے اجر کا وعدہ ہے۔ (القصص-۵۴ و حدید-۲۸)

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۳۲-۳۳) اے نبی کی عورتو! تم عام عورتوں میں سے کسی کی مانند نہیں ہو، اگر تم تقویٰ کی پابندی کرو (دوسری عورتیں دعویٰ سے حقوق کا مطالبہ کر سکتی ہیں۔ بیوہ ہونے پر دوسری شادی کرنے کی مجاز ہیں۔ مگر تم اپنے عہد کی پابندی کے سبب اس کی مجاز نہیں ہو۔ پس اخلاق کو بلند رکھو۔ اور غیر مردوں سے گفت و گو کرتے ہیں آواز میں نرمی و نزاکت پیدا نہ کرو، اور، ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص جس کے دل میں (جذبات کے بھڑکنے کی) بیماری ہو وہ (تمہاری طرف) طمع کر بیٹھے اور (تمہیں چاہیے کہ ہمیشہ) کھری بات کہا کرو (جس میں کوئی نرمی اور پیچیدگی نہ ہو)

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ[2] وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا (۳۳-۳۳) اور اپنے گھروں میں ٹھہرو بے ضرورت

---

[1] مفارقت مراد ہے [2] "اہل البیت" کے معنی بیویاں اور صرف بیویاں ہیں۔ بسند قرآن، مَا یُتْلٰى فِیْ بُیُوْتِكُنَّ۔ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ۔ بیوت بیت کی جمع ہے۔ نبی ﷺ کی بیویاں مخاطب ہیں انہی کو بار بار کہا جاتا ہے "تمہارے گھر" یعنی تم گھر والیاں ہو، اہل بیت ہو۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیم ؑ کی بیوی کو اہل البیت کہا گیا ہے بَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ (ھود-۷۳) "علیکم" جمع مذکر مخاطب ہے۔ اس کے باوجود کسی نے آج تک اس سے اختلاف نہیں کیا کہ یہاں مخاطب ابراہیم ؑ کی بیوی ہی ہیں۔

باہر نہ نکلو یا البتہ بوقت ضرورت منع نہیں۔ نکلو تو سادگی سے نکلو) اور پرانی جاہلیت کی سی نمائش نہ کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اے گھر والو! اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ تم سے (روحانی وجسمانی) پلیدی دور کرے اور تمہیں اچھی طرح پاک وصاف رکھے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا (۳۴) خدا تعالیٰ کی نشانیوں اور دانائی کی باتوں سے جو کچھ تمہارے گھروں میں تلاوت کیا جاتا ہے، اس کا خود بھی، ذکر کرتی رہو (اور دوسری عورتوں کو بھی سناتی رہو۔ ظاہر ہے کہ نبی ﷺ کے گھروں میں قرآن حکیم کے سوا کسی چیز کی تلاوت نہیں ہوتی تھی۔ اسی میں آیات ہیں اور اسی میں آیات کی حکمت یا شرح بھی ہے)، بالیقین اللہ تعالیٰ نہایت باریک بین اور نہایت خبردار ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْۤ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (احزاب ۵۰)

اے نبی! بالتحقیق ہم نے حلال کر دیں (رہنے دیں) تیرے لیے وہ بیویاں جن کے مہر تو دے چکا اور جن کا مالک ہوا تیرا دایاں ہاتھ (تو نے انہیں آزاد کر دیا تو بعض ان میں سے اپنی رضا و رغبت سے واپس نہیں گئیں، بلکہ تیرے پاس ہی رہنا چاہا) ان میں سے جنہیں پھیر لایا اللہ تجھ پر (یعنی راغب کیا ان کو تیری طرف ابھی نکاح میں نہیں آئیں۔ ضرورۃً ان سے نکاح ہو سکتا ہے)

اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں جو تیرے ساتھ وطن چھوڑ آئی ہیں۔

اور وہ مومن عورت جو اپنی مرضی سے اپنا نفس نبی کو بخش دے بشرطیکہ نبی کا ارادہ اس سے نکاح کرنے کا ہو۔ (یہ قاعدے حضور نے اپنے اجتہاد سے اپنی ذات کے لیے مقرر کر لیے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ماضی کے لیے ان کو حلال قرار دے کر آئندہ کے لیے اصلاحات فرمائیں اور مزید نکاح کرنے سے منع فرما دیا اور ایسی قیود عائد کر دیں، جو عام مومنین پر عائد نہیں ہیں۔ جیسا کہ فرمایا)

یہ (قیود) خالص تیرے لیے ہیں دوسرے مومنین کے علاوہ ہم کو معلوم ہے جو کچھ ہم نے فرض کر دیا ان (مومنوں) پر، ان کی (آزاد) بیویوں کے بارے میں اور ان کی لونڈیوں کے حق میں (سزا وغیرہ اور دوسری ہدایات کے بارے میں، مختلف حالات کے مطابق مختلف احکام ہیں۔ ہم نے یہ قیود جو تیرے لیے خاص ہیں اس لیے واضح کر دیں کہ عورتوں کی طرف سے نکاح

۱ؔ صیغہ واحد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت چچا ایک ہی تھا اور ماموں بھی ایک ہی۔

کی درخواستوں کی بھرمار سے تجھے چھٹکارا ہو جائے اور آئندہ نکاح کی اجازت ہی ختم کردی۔ لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْ م بَعْدُ ۔۔۔ اسی بنا پر فرمایا۔)

تاکہ تجھ پر کوئی تنگی نہ ہو (اکثر درخواست گزاروں کو مایوسی و ندامت ہوتی تھی اور آپ کو بھی ان کی دل جوئی میں تکلف ہوتا تھا۔) اللہ ہمیشہ ہی سے بخشنے والا مہربان ہے۔

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ط وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ط ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ط وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا ۝ (الاحزاب - ۵۱)

(ماضی میں حسب ضرورت جو کچھ تو نے کیا جائز و مناسب تھا (وجس ربوبی) کو چاہتا جدا کر دیتا اور جسے چاہتا اپنے پاس جگہ دیتا تھا۔ اور جو جدا کر دی گئیں تھیں ان میں سے کسی کو پھر بلا لیا تو اس میں تجھ پر کوئی گناہ نہیں (کیونکہ اس میں تیری کسی خواہش کا شائبہ تک نہ تھا۔ بلکہ یہ سب کچھ انہی کی خوشی کی خاطر تھا) تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غم گین نہ ہوں۔

(ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے ربانی مقاصد کی تکمیل اور شغف سے اتنی فرصت و رغبت ہی نہیں تھی کہ ازدواجی زندگی کے جھمیلوں اور خواہشوں کے لیے وقت نکال سکیں۔ آپ اللہ کے دین کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ اور اس حد تک آگے نکل چکے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صبر و استقامت کی تلقینات کے ساتھ کبھی کبھی ایسے ارشادات بھی نازل ہو جاتے تھے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۔ (شعراء - ۳) شاید تو گھونٹ مارے اپنی جان اس بات پر کہ وہ یقین نہیں کرتے۔ یعنی ان بدبختوں کے غم میں اپنے کو اس قدر گھلانے کی ضرورت نہیں۔ کیا ان کے پیچھے آپ اپنی جان کو ہلاک کر کے رہیں گے! دل سوزی اور شفقت کی بھی آخر ایک حد ہے۔ (عثمانیؒ)

اس مفہوم کی اتنی آیات ہیں کہ ان کو جمع کریں تو ایک مبسوط مقالہ یا کتاب سی تیار ہو سکتی ہے ۔ روایات نے ایسے مقدس رسول کی جو تصویر کھینچی ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تیاری میں ضرور دشمنان اسلام و رسولؐ کا ہاتھ تھا جو منافقانہ طور پر مسلمانی کا بہروپ بھرے ہوئے تھے۔

یقیناً آپ نے ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں نہیں کیں۔ یقیناً خود عورتیں شرف نسبت حاصل کرنے کے لیے آپ کے نکاح میں آنے کے لیے بے تاب رہتی تھیں۔ یقیناً وہ ہر قسم کے حقوق سے دست بردار ہو کر بعد نبیؐ عمر بھر کے لیے تجرد کا عہد کر کے عملاً لونڈیاں بن کر ایک قسم کی رضا کارانہ رہبانیت کو قبول کرنا بھی اپنے لیے باعث فخر و شرف سمجھتی تھیں۔ آپ نے پھر بھی اس کو بوجھ سمجھا اور بعض کو اپنے سے الگ بھی کر دیا (مِمَّنْ عَزَلْتَ) وہ پھر بھی آپ کے نام پہ دھونی لگا کر بیٹھی رہیں اور اس در کو چھوڑ کر کسی دوسرے در کو تاکنا بھی گوارا نہ کیا۔ (مرتب عفی عنہ) قیود کی مختصر شرح اور سن لیجئے۔

۱۔ عام مومنین کے لیے جائز تھا کہ مہر ادا کرنے یا مقرر کرنے کے بغیر بھی نکاح کر لیں اور بعد میں کمی بیشی کے بھی مجاز تھے۔
۲۔ آپ نے اپنے اوپر یہ قید لگائی کہ آپ پر وہی عورت حلال ہے، جس کا مہر آپ ادا کر چکے ہوں۔
۳۔ عام مومنین آزاد بیوی نہ ملنے پر عام لونڈیوں سے نکاح کر سکتے تھے آپ نے یہ قید لگائی کہ آپ کی آزاد کردہ لونڈی اپنے اہل کی طرف جانا پسند نہ کرے اور خدائی تصرف سے آپ ہی کے پاس رہنا پسند کرے، تو سابق منکوحات کی وفات پر آپ اس سے نکاح کے مجاز ہیں۔
۴۔ آپ نے یہ پابندی بھی قبول کی کہ صرف مہاجر رشتہ داروں کی بیٹیوں سے نکاح کر سکتے ہیں، غیر مہاجرین سے نہیں۔
۵۔ عام مومن ہر مومنہ، بیوہ، باکرہ یا مطلقہ سے نکاح کی درخواست کر سکتے ہیں۔ آپ نے اپنے لیے یہ قید گوارا کی کہ آپ کی درخواست و ایما کے بغیر خود بخود کوئی مومنہ اپنا نفس آپ کو بخش دے، تو آپ بشرط ضرورت اس سے نکاح کر سکتے ہیں۔
یہ قیود صرف اس لیے لگائی گئیں کہ نکاح کی درخواستیں ترک جائیں (کما مَرّ) اور کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو — نیز آپ نے اپنے لیے طلاق کا حق بھی قائم رکھا جیسا کہ ایک مرتبہ اس پر عمل بھی ہوا (من عزلت) یہ بھی عورتوں سے خلاصی پانے کی ایک صورت ہے۔
مذکورہ بالا چار قسم کی قید جو آپ نے اپنے اوپر لگائی تھی، خدا نے اس کو حلال ٹھہرایا۔ یعنی (۱) جن کا مہر ادا کیا جا چکا (۲) ملک (۳) اپنے نفس کو ہبہ کرنے والیاں۔ (۴) ماموں، چچا، خالہ، پھوپھی کی مہاجر بیٹیاں۔ یہ سب کی سب اپنے حقوق چھوڑ کر برضاد رغبت "ما ملکت" یعنی ملک یمین بن گئیں۔ اس سلسلے کی آخری آیت نے مستقبل کے لیے مہر لگا دی۔

لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا (الاحزاب-۵۲)

اس کے بعد تیرے لیے کوئی عورت حلال نہیں ہے اور نہ یہ (حلال ہے کہ) ان کی بجائے تو دوسری بیویاں تبدیل کرے۔ اگرچہ تجھے ان کا حسن خوش لگے۔ مگر یہی (حلال ہیں جو تیرے پاس ملک یمین بن کر رہ رہی ہیں، اور سب کی سب ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اور تمام حقوق سے دست بردار ہو کر صبر قناعت سے شاکرانہ زندگی گزاری ہیں۔ یہ حقیقت میں ملک یمین ہیں، اصطلاحی لونڈیاں ہرگز نہیں) مراد اپنا ہاتھ جن کا مالک ہوا اب اگر کوئی بیوی انتقال بھی کر جائے تو اس صورت میں بھی تو دوسری عورت کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتا) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگہبان ہے اس بیان سے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ حضورؐ کی زندگی پر حرف نہ آئے اور کوئی شبہ نہ کیا جائے — پھر بھی دشمنوں نے اپنوں کا بہروپ بھر کر اس مقدس ہستی پر وہ وہ تہمت تراشیاں کیں اور بھولے مسلمانوں نے قبول کر لیں کہ معاذ اللہ — ازواج النبیؐ کے متعلق مزید حالات مختلف مواقع پر آئیں گے ان شاء اللہ۔

—————— ٥ ——————

حقیقت درود

کتاب اللہ العظیم کے معجزات میں سے ایک عظیم معجزہ یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس پر اور اس کے مصنف (عزّوجلّ) پر اعتماد کرکے اسی سے اس کے معانی و مطالب دریافت کریں، وہ ان کی بہترین مدد کرتی ہے اور اُن کو ظلمات سے نکال کر نور کی فضاؤں میں لے آتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی تفسیر میں زیادہ تر اسی اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔ درود کی حقیقت سمجھنے کے لیے بھی انہوں نے اللہ اور کتاب اللہ ہی کی طرف رجوع کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (احزاب ۔۵۶)

اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ کرتے ہیں۔ اے ایمان دارو تم (بھی ہر وقت) اس (نبی) کی خیر میں لگے رہو اور (اس کی) سلامتی چاہو، جو سلامتی چاہنے کا حق ہے۔

اس کی شرح اسی سورہ کی آیت ۔۴۳ میں فرمائی گئی ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۔

(الاحزاب ۔۴۳) وہ (خدائے پاک) اور اس کے فرشتے (اے مسلمانو تم پر صلوٰۃ کرتے ہیں (صلوٰۃ سے مراد و مقصود کیا ہے؟) تاکہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے اور تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا کرتا ہے۔

اس آیت میں نہایت سہولت و وضاحت سے درود کی حقیقت اور غرض و غایت کھل کر سامنے آگئی کہ عقائد و اعمال کی تاریکیوں، غلطیوں، لغزشوں اور کوتاہیوں سے (جن میں دنیا میں انسانیت ٹاک ٹوئیاں مار رہی اور ٹھوکر پر ٹھوکر کھا رہی ہے) نکال کر، ہدایت، معقولیت، صداقت، حقانیت اور علم و عمل کی روشنی میں لے آنے کا نام صلوٰۃ[1] یعنی درود ہے ــــ اور اس مقام کا حصول اللہ کی توفیق اور بحکم خدا فرشتوں کی امداد سے ہوتا ہے۔

"صلوٰۃ" کے معنی ہیں بانس کو گرم کر کے سیدھا کرنا۔ انسانوں کو آزمائشوں کی بھٹی میں ڈال کر اللہ اور درستی کی صفات سے

---

[1] هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ ... الخ کا مطلب قاموس قرآنی مولفہ حسن محمد و موسیٰ مطبوعہ اسکندریہ ۱۹۶۲ء صفحہ ۴۳۸ میں لکھا ہے۔ یعنی بکو جیئق یدعوکم الی الخیر و یامرکم بالطاعۃ لیخرجکم من الظلمات الضلال و المعصیۃ الی نور الہدی و الطاعۃ مومنو! تم پر یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ تمہیں خیر کی طرف دعوت دیتا ہے اور طاعت کا حکم دیتا ہے تاکہ تم گمراہی اور معصیت کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت و طاعت کی روشنی میں لے آئے۔

متصف کرتا ہے۔ فرشتے بھی بحکم خدا اعلیٰ خیالات اور میلانات دلوں میں القا کرکے مومنوں کی اعانت کرتے ہیں۔

رسول کریم کتاب و ایمان سے ناواقف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ سکھایا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْإِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (الشوریٰ) تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان، لیکن ہم نے بنایا یہ نور (قرآن) اس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں رہنمائی کرتے ہیں۔

یہاں بھی وہی "نور" ہے جو اوپر آیۂ درود (صلوٰۃ) میں آچکا ہے۔ اللہ نے آپؐ کو اپنی بے اندازہ نعمتوں سے نوازا اور وہ کچھ سکھایا جس کا آپ کو کوئی علم نہ تھا۔ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (نساء - ۱۱۳) جس طرح صلوٰۃ (درود) میں مومنوں کو نبیؐ کے ساتھ شریک فرمایا، اسی طرح تعلیم میں بھی وہی الفاظ مومنوں کے لیے استعمال کیے جو نبیؐ کو مخاطب کرکے فرمائے ہیں عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ ۲۳۹) تم کو وہ کچھ سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے۔ اس معجزانہ انداز بیان سے کتاب حکیم نے شخص پرستی کی جڑ کاٹ دی (سبحان اللہ العلی العظیم) کہاں وہ لوگ جو اپنے انبیاء کو اللہ اور ابن اللہ مانتے ہیں اور کہاں یہ پاک تعلیم جو بشری سطح پر (باستثنائے رسالت) رسول و غیر رسول میں مساوات قائم کرتی ہے۔

خدا اور کارکنان قدرت (ملائکہ) نبیؐ کی بہتری اور خیر میں لگے ہوئے ہیں۔ مومنوں کا بھی فرض ہے کہ اس کی خیر و سلامتی میں لگے رہیں۔ نبیؐ پر نزول قرآن اعلیٰ درجے کی خیر ہے جس کے ذریعے سے کائنات انسانی کے لیے فلاح دارین کے دروازے کھل گئے اور خود حضورؐ مقام محمود پر فائز ہوگئے۔

آج بھی صلوٰۃ (درود) کا تقاضا ہے کہ ہم مقاصد رسالت کی تکمیل میں لگے رہیں۔ غیر مذاہب کی طرف سے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر جو معاندانہ حملے ہوتے رہتے ہیں۔ اور طرح طرح کی بہتان تراشیاں شائع کی جاتی ہیں۔ علم و عقل سے ان کا سدباب کریں۔ آپؐ کی معصوم و مقدس سیرت اور اسلام کی پاکیزہ شکل مخلوق خدا کے سامنے پیش کریں۔ یہ ہے صلوٰۃ علی النبی کی اصلی تعمیل۔

اس ضمن میں ایک اور آیت بھی سامنے لے آئیے، جس میں حضورؐ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ مومنوں پر صلوٰۃ (درود) بھیجیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (توبہ - ۱۰۳) اوپر ذکر آرہا ہے ان مسلمانوں کا جن سے معرکہ تبوک کے موقع پر بمقتضائے بشریت قصور سرزد ہوا۔ پھر انہوں نے نادم ہو کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا۔ اِعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ (توبہ - ۱۰۲) اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور اپنے رسول کو حکم دیا کہ

اے نبی! صلوٰۃ کر ان پر بے شک تیری صلوٰۃ (درود) ان کے لیے تسکین کا باعث ہوگی اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

یعنی اب ان پر کوئی مواخذہ باقی نہیں۔ ایک قسم کی روحانی کدورت و ظلمت وغیرہ جو گناہ کا طبعی اثر ہے، صدقہ و زکوٰۃ دینے اور نبی کی صلوٰۃ (دعا، خیر خواہی وغیرہ) سے دور ہو جاتی ہے۔

ان آیات کریمہ نے بتایا ہے کہ

۱۔ اللہ اور فرشتے نبی پر صلوٰۃ کرتے ہیں۔ مومنو! تم بھی اس پر صلوٰۃ کرو۔

۲۔ اللہ اور فرشتے مسلمانوں پر صلوٰۃ کرتے ہیں، تاکہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔

۳۔ خود نبی بھی بحکم خدا مسلمانوں پر صلوٰۃ کرتے ہیں کہ انہیں تسکین حاصل ہو اور گناہ کی ظلمت دور ہو۔

۴۔ آج صلوٰۃ النبیؐ کی تعمیل یہ ہے کہ ان پر سے اغیار کے الزامات دور کیے جائیں اور مقاصد رسالت کی احسن طریقے سے تکمیل کی جائے۔

"آیت صلوٰۃ" (درود) کے بالکل ساتھ ہی "آیت ایذا" بھی تعرف الاشیاء با ضدادھا کے مصداق ہو کر درود کی تشریح کرتی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا (الاحزاب ۵۷)

جو لوگ ایذا دیتے ہیں اللہ کو (اللہ کو اس لیے کہ رسول کو اللہ ہی کے لیے دکھ دیا جاتا تھا) اور اس کے رسول کو، اللہ نے لعنت کی ان پر دنیا اور آخرت میں اور ان کے واسطے تیار کر رکھا ہے عذاب رسوا کرنے والا ——— قرآن حکیم آپ ہی اپنی تفسیر کرتا جاتا ہے۔ صلوٰۃ علی الرسول اور صلوٰۃ علی المومنین سراپا خیر ہی خیر ہے تو ایذائے رسول اور ایذائے مومنین شر ہی شر ہے۔ اس لیے اگلی آیت میں اس کی مزید تاکید و تکرار ہے۔

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا۔ (احزاب ۵۸)

اور وہ لوگ جو ایذا دیتے ہیں مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر اس کے کہ انہوں نے کچھ (گناہ) وغیرہ کیا ہو، پس اٹھایا انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ ——— اللہ نے اپنی کتاب کو "مفصل" فرمایا۔ هُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا (انعام ۱۱۴) کتاب پاک اپنی تفصیل کا حق ادا کرتی جا رہی ہے، لیکن روایات نے اس کی تفصیل پر جو پردے ڈال رکھے ہیں، ان کی وجہ سے اس کی وضاحتیں ارباب روایت کو دکھائی نہیں دیتیں۔

یہ ایذا دہی کا سلسلہ مزید آیات ۵۹، ۶۰ و ۶۱ تک چلا گیا ہے۔ آیۂ صلوٰۃ (درود) کے ساتھ اس مضمون کو اس تفصیل سے لانے میں کیا حکمت ہے؟ اور ربط آیات کی معنویت کیا کہہ رہی ہے؟ بے لوث غور کرنے والوں کے لیے یہ مقام محل تدبر ہے۔ ؏

"سمجھے گا تو جب بے رنگ نہ ہو ادراک" (اقبال)

زیدؓ و زینبؓ

زیدؓ جو حضور کے متبنیٰؓ تھے، اپنی بیوی زینبؓ کو طلاق دینا چاہتے تھے۔ رسول کریم کو یہ انقطاع گوارا نہیں تھا۔ دو وجہوں سے، اوّل ـــــ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے کہ حتی الامکان طلاق تک نوبت نہ آنے پائے۔ اور اگر یہ اقدام ضروری ہو تو جب تک وہ سارے حالات موجود نہ ہوں جو طلاق کا تقاضا کرتے ہیں، یک بیک طلاق نہ دی جائے۔ دوم ـــــ آغاز سورہ احزاب میں متبنیٰؓ کی قدیم رسم کو سختی سے ختم کر دیا گیا اب نہ وہ بیٹا ہے اور نہ اس کی بیوی بہو۔ لہٰذا اس سے خود نکاح کر کے اسی رسم کو پوری طرح ملیامیٹ کرنا مناسب تھا، لیکن نبی کریم مقتضائے بشریت قدیم ترین رائے عامہ اور ایک متفقہ رسم کے خلاف قدم اٹھانے سے ہچکچاتے تھے۔ آپ کے دل میں یہ بات تھی۔ زید اپنے اس ارادے سے باز آجائے اور طلاق واقع نہ ہو ـــــ اتنی سی بات تھی جس کو نادان دوستوں نے اتنا اچھالا کہ مقدس پیغمبر کی تقدیس کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ رنگ رنگ کی روایتیں ایجاد کر ڈالیں۔ معاذ اللہ۔ اب دیکھئے آیت اور اس کی سیدھی تفسیر خواجہ صاحب کے ملفوظات ہیں۔

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِيٓ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ج وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشٰهُ ط فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِيٓ أَزْوَاجِ أَدْعِيَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ط وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا ٥ (احزاب ۳۷)

(اے نبی! وہ وقت یاد کر) جب تو اس شخص (زید) سے کہتا تھا، جس پر اللہ تعالیٰ نے نعمت کی (پیدا کیا۔ وغیرہ) اور تو نے بھی اس پر نعمت کی (آزاد کر دیا، بیاہا اور مالی مدد دی) کہ (اے زید!) اپنی بیوی کو اپنے اوپر تھام رکھو (طلاق نہ دے) اور اللہ سے ڈر (یک بیک علیحدگی اللہ کو پسند نہیں ...... اور (اے نبی!) تو لوگوں سے (رسم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے) ڈرتا تھا۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ تو اس تعالیٰ سے ڈرے۔ پھر جب زید نے اس (زینب) سے قطع تعلق کر لیا تو (تیری ناآمادگی کے باوجود) ہم نے اس سے تیرا نکاح کرا دیا (اس رسم شکنی کی وجہ یہ تھی) کہ مومنوں کے لیے کوئی تنگی نہ رہے، ان کے منہ بولے بیٹوں کی (مطلقہ) بیویوں (سے نکاح) کے بارے میں۔ جب کہ وہ ان سے قطع تعلق کر لیں۔ اللہ تعالیٰ کا (یہ رسم شکنی کا) حکم ہو کر رہنے والا تھا۔

اسی سورۂ احزاب کی آیت ۴۹ میں ہے کہ ـــــ "مسلمانو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو اور بغیر چھوئے طلاق دے

دو تو ان کی کوئی عدت نہیں"
اس سے خواجہ صاحب نے یہ سمجھا ہے کہ زید اور زینب میں شروع ہی سے موافقت نہیں ہوئی۔ اس لیے عدت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ ایک اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ۔

نکتہ:

نبی کریمؐ کے ذاتی امر کو تسلیم نہ کرنے پر زید کافر نہیں ہو گیا، لیکن اولوالعزم بھی ثابت نہ ہو سکا۔
(یہ تحریر منزل پنجم۔ سورۂ احزاب کی مختلف آیات کی تفسیر سے ماخوذ ہے اور کہیں مولف کی تصریحات بھی ہیں)

خاتم النبیینؐ (صلعم)[1]

(دلیل اول)

قبل قرآن کی تمام کتب سماوی کے اصل تن محفوظ نہیں رہے تھے، بلکہ ان کی بولیاں بھی تقریباً مردہ ہو چکی تھیں۔ ان زمانوں میں موجودہ سفری اور پیغام رسانی کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے اقوام و ممالک بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔ اشاعت عامہ کے ذرائع بھی مفقود تھے۔

ایجادانی دور کی داغ بیل پڑنے سے پہلے ضرورت تھی ایک ایسی الہامی کتاب کی جو آپس میں قریب آجانے والے تمام ممالک عالم کے لیے ہدایت کا ذریعہ بن سکے اور وہ ایسی زبان میں ہو جس میں دائمی زندگی کی روح اور عام پھیل جانے کی استعداد ہو— اسی لحاظ سے قرآن نہایت مناسب وقت پر نازل ہوا اور خدائی حفاظت کے ساتھ اقطاع عالم میں پھیلتا چلا گیا اور اسی طرح زندہ و پائندہ و پھیلتا رہے گا۔ ظاہر ہے کسی زندہ کی موجودگی میں اس کے جانشین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم کے بے بدل اور خاتم الکتب ہونے کی یہی دلیل کافی ہے۔ لیکن مزید تفصیل کے لیے دلائل ذیل بھی ہدیہ اہلِ نظر کی جاتی ہیں۔ (وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب خواجہ احمدالدین رحمتہ اللہ علیہ)

معنی رسول — قاصد۔ شاہی قاصد فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ (یوسف۔ ۵۰) جب یوسفؑ کے پاس شاہی قاصد پہنچا۔ یعنی بادشاہ کا بھیجا ہوا۔

ارسال عام — ہر چیز اللہ ہی کی بھیجی ہوئی ہے وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ (حجر ۲۲) وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (مرسلات ۔۲) اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (مریم ۔۸۵) ہم ہواؤں کو بھیجتے ہیں قسم ان ہواؤں کی جو معمولاً بھیجی جاتی ہیں۔ ہم کفار پر شیاطین کو بھیجتے ہیں۔

وسعت معنی رسول — رسولوں کے خلفا اور عام مبلغ بھی رسول ہیں وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَا (الزخرف ۔۴۵) ہم نے تجھ سے پہلے جو رسول بھیجے ہیں۔ ان سے پوچھ لے ۔۔۔۔ الخ حضورؐ کے وقت کوئی صاحب وحی رسول موجود نہیں تھا۔ لہٰذا ان کے خلفا ہی مراد ہیں۔ جس کی تائید آیہ ذیل سے ہوتی ہے۔

---

[1] یہ مبحث منزل اول کے صفحہ ۲۰۲ سے صفحہ ۲۶۶ تک پھیلا ہوا ہے

فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ (یونس ۹۵) جو لوگ تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں اُن سے پوچھ لے۔

ہر بستی میں رسول

اللہ تعالیٰ کسی بستی کو بے خبری میں ہلاک نہیں کرتا۔ لَمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ (انعام ۱۳۲) تیرا رب بستیوں کو بے خبری میں ظالمانہ ہلاک نہیں کرتا ... حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا ... (قصص ۶۰) جب تک کہ اُن کی بڑی بستی میں کوئی رسول کھڑا نہ کر دے مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (اسرائیل ۱۶) ہم عذاب نہیں دیا کرتے جب تک کہ رسول کھڑا نہ کریں۔

بلاشبہ کسی قوم کی ہلاکت کے وقت کوئی نہ کوئی سمجھانے والا ضرور کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ وہ اصلی رسول ہو یا نائب و خلیفۂ رسول۔

ہر امت میں رسول

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ج فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ..... الخ (یونس ۵۰) ہر اُمت کے لیے کوئی نہ کوئی رسول ضرور ہوتا ہے جب وہ ان لوگوں کے پاس آتا ہے تو ان میں منصفانہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

دوزخیوں کا اعتراف

دوزخیوں کی ہر جماعت رسول اور نذیر کے آنے کا اقرار کرتی ہے۔

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ (الملک ۹)	جب بھی جہنم میں کوئی فوج ڈالی گئی تو اس کے داروغوں نے ان سے پوچھا "کیا تمہارے پاس کوئی نذیر نہیں آیا؟" بولے "کیوں نہیں، ہمارے پاس ضرور نذیر آیا پس ہم نے جھٹلایا اور کہا۔ خدا نے کچھ نہیں اُتارا"

جب وہ جہنم کی طرف ہانکے گئے زمرہ زمرہ ہو کر اور اس کے دروازے کھولے گئے، تو اس کے داروغوں نے کہا۔ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ ... قَالُوْا بَلٰى (الزمر ۷۱)

"کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول نہیں آئے تھے۔ جو تمہارے سامنے تمہارے رب کی آیات تلاوت کرتے تھے"..... بولے "کیوں نہیں"

غیر نبی اور تلاوت

آیات تلاوت کرنے والے غیر نبی اور غیر رسول بھی ہو سکتے ہیں۔ جب کفار کے سامنے آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کے چہرے بدل جاتے ہیں اور يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا (الحج ۷۲) ان لوگوں پر دست درازی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، جو ہماری آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔

یہ بھی بظاہر عام رسول ہی ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ ...... اے رسولو! پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو.....

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ط (المومنون ۵۴) پھرانہوں نے اپنے مقصود اصلی کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا ..... الخ

اطاعت دو قسم رسول کی اطاعت دو قسم کی ہوتی ہے۔ اول، بحیثیت رسالت الٰہیہ۔ جو مستقل بالذات ہے۔ اس لحاظ سے اس کی اور خدا (قرآن) کی اطاعت میں کوئی فرق نہیں۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء۔ ۸۰)

دوم، بحیثیت ناظم ملک۔ یہ اطاعت رسول کی وفات کے بعد اس کے غیر ملہم ناظم میں منتقل ہو جائے گی۔ اور اسی طرح آگے سے آگے منتقل ہوتی رہے گی۔ ایسے رسولوں کا سلسلہ جاری رہنا چاہیئے۔ ہمیشہ ہمیشہ جیسے کہ اس آیت میں ہے :

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ..... الخ (الاعراف ۔ ۳۵)

اے اولاد آدم! اگر تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں جو تمہارے آگے میری آیات پڑھیں تو جو تقوی اختیار کرے گا اور سدھر جائے گا۔ ایسے لوگوں کو کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۞ ۞ ۞ ۞

ایسے رسول قرآن حکیم ہی کی آیات سنائیں گے۔ قرآن قیامت تک ایسے رسولوں کے ذریعے شائع ہوتا رہے گا۔ جیسا کہ آیہ ذیل سے واضح ہے۔

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ط (الانعام ۱۹) جس کو بھی یہ قرآن پہنچے اس کے لیے یہی نذیر ہوگا۔ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

نتیجہ رسول کے اس وسیع معنی کے لحاظ سے عام مبلغین اور خلفاء رسول ہماری ختم نبوت کی بحث سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔

خاص رسول خاص رسول وہ ہیں جو بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے وحی پاتے ہیں اور وحی یعنی دینی علوم کا ایک نصاب اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ جس کی تکمیل اس ہستی پر ہوئی جس کو خود اللہ تعالیٰ ہی نے خاتم النبین کے لقب سے سرفراز فرمایا اور صرف محمد ہیں۔ ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی نے آج تک یہ دعوی نہیں کیا۔ جناب بہاء اللہ ختم نبوت کے سرے ہی سے منکر ہیں۔ وہ بھی خاتم ہونے کا دعوی نہیں کرسکتے۔

بہاء اللہ ان کے نزدیک حکیم مطلق خدا کے دینی علوم کبھی حتمی، قطعی اور ابدی نہیں ہوسکتے یعنی ہمیشہ قابل تنسیخ رہتے ہیں بلکہ خدا بھی عام نوع انسان کو کبھی کوئی ایسی وحی نہیں دے سکتا جس پر لوگ اطمینان قلب اور صدق و یقین کے ساتھ عامل ہوسکیں اور صحیفہ فطرت کی طرح اسے اپنی یقینی تحقیقات کی بنیاد بنا سکیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی بھی قابل تنسیخ کتاب یقینی تحقیقات کی بنیاد نہیں بن سکتی۔

شرحِ ایں نکتہ

اس نکتے کو ذرا تشریح سے سمجھیئے!

قرآن مجید نے میراث کے نہایت معقول قواعد مقرر کر دیئے — حرام عورتوں کی فہرست قدرتی اصولوں کے مطابق پیش کر دی — نکاح کے قواعد سیدھے سادے قابل عمل تجویز فرمائے — میاں بیوی کی جدائی کو ناپسند فرمایا — طلاق میں رکاوٹیں ڈالیں۔ رجوع کے لیے تین ماہ مقرر کیے حمل ہو، تو پوری مدت تک رجوع ہو سکتا ہے۔

ظہار

لوگ ایسی اصلاحوں سے جل گئے تھے۔ لیکن کامل کتاب کا فرض تھا کہ غلط رسوم کی پوری طرح بیخ کنی کر دے — بعض مومن بھی ابتداءً رجوع کے لیے انتظار نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے جاہلیت کی کافرانہ رسم سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ لوگ بیوی کو ماں کہہ دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اب رجوع کی گنجائش نہیں رہی۔ اس طرح رجوع کے تمام قواعد ملیا میٹ کیے جا سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ظہار" محض بکواس ہے۔ ماں کہنے سے بیوی ماں نہیں بن سکتی۔

ناجائز قسمیں

ناجائز اور مضر قسم کے عہد توڑنے کے لائق ہوتے ہیں۔ ایسی قسم کہ زید بیوی کو ماں سمجھے گا۔ یا ماں سے کلام نہیں کرے گا یا فلاں عورت سے بدکاری کرے گا۔ ایسی قسموں کو توڑنا اور کفارہ دینا لازم ہے۔

جائز قسمیں

لیکن اگر کوئی شخص یہ عہد کرے کہ وہ اپنے زوجہ کی وفات کے بعد نکاح نہیں کرے گا (یا نہیں کرے گی) تو ایسا عہد جائز ہے۔

فتنہ دعی

اسی طرح کوئی شخص شرعی قواعد کو اصولاً توڑے بغیر دنیی ضرورت کے لحاظ سے کسی کو اپنا دعی (منہ بولا بیٹا) بنا لے تو یہ عہد جائز ہے، لیکن اس کا اثر متعدی نہیں ہو گا۔ یعنی وہ اپنی بہن یا بیٹی کا نکاح اپنے دعی سے کر دے تو کوئی حرج نہیں۔ اور اگر خود اپنے دعی (منہ بولے بیٹے) کی بہن، بھتیجی یا مطلقہ بیوی سے نکاح کرے تو اس میں بھی کوئی ممانعت نہیں ہو سکتی۔ لیکن بیٹا حقیقی ہو تو ایسے نکاح قطعاً ناجائز ہیں — اگر دعی کو حقیقی بیٹا سمجھ کر متعدی امور میں حقیقی بیٹے والے قواعد جاری کر دیئے جائیں تو میراث، حلّت و حرمتِ عورات اور نکاح و طلاق کے تمام قواعد درہم برہم ہو جائیں گے۔

کفار، دعی کو حقیقی بیٹا قرار دے کر اس کا نسب دعی بنانے والے کے ساتھ قائم کرتے اور اس کے حقیقی باپ کا نام تک نہیں لیتے تھے۔ اس وجہ سے ادعیاء کے اپنے والدین اور خاندانوں کا پتا تک نہیں رہا تھا۔ اس طرح اصلی حقوق میراث اور قواعد حلت و حرمت ملک میں مفقود ہو کر رہ گئے تھے۔ حقیقی کی جگہ مصنوعی نے لے لی تھی۔ ان حالات میں اسلامی قواعد کی تکمیل کے لیے مصنوعی زور و شور ختم کرنا ضروری تھا۔

رسول کریمؐ نے زید کو دعی بنایا تھا۔ زینب نیک بی بی تھی، لیکن شکل کے اعتبار سے پسندیدہ نہیں تھی۔ آپ نے یہ خیال کر کے کہ زید اپنی حالت کے پیش نظر اس نکاح کو غنیمت سمجھے گا۔ اور زینب بھی آرام سے اپنا وقت گزارے گی۔ دونوں کا نکاح کرا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس تذکرے کی تمہید میں مرد عورت کی جو خوبیاں بیان فرمائی ہیں وہ روحانی پاکیزگی اور قلبی اخلاص سے ..... متعلق ہیں

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ .... الخ احزاب-۳۵) ان میں کسی جسمانی خوبی کا ذکر تک نہیں — اسی کے ساتھ ہی یہ فرمایا کہ

زیدو زینب :

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔

(احزاب - ۳۶)

جب اللہ بحیثیت احکم الحاکمین اور اس کا رسول بحیثیت قاضی کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن مرد اور مومن عورت کا اس میں اپنا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے، وہ کھلی گمراہی کا شکار ہو گیا (اس کام میں مومن مرد (زید) نے عصیان کیا۔ عورت نے نہیں کیا۔ مومن مرد و عورت کے اوصاف اس سے اوپر والی آیت میں بہ تفصیل آچکے ہیں)

خطائے زید

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عصیان[1] و قصور سراسر زید کا تھا، زید ہی کو تنبیہ بھی ہوئی۔ زینب کی خطا ہوتی تو اُسے بھی ضرور تنبیہ کی جاتی — رسول کریم فیصلۂ الٰہی کے مطابق زید کو کہتے تھے۔ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (احزاب-۳۷) اپنی بیوی کو طلاق نہ دے اور اللہ سے ڈر — یہ فیصلہ بالکل درست تھا، لیکن اس کی تہ میں رسول کریم کو اپنا بچاؤ کرنا بھی مقصود تھا۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ زید طلاق دے اور اس کے بعد آپ کو زینب سے نکاح کرنا پڑے، طبعی بیزاری کے علاوہ سارے عرب کی ملامت کا ہدف بننے سے آپ ڈرتے تھے کہ "دیکھو جی "بیٹے" کی بیوی سے نکاح کر لیا" لیکن زید نے منع کرنے کے باوجود طلاق دے ہی دی۔ اس نے اس مدت میں زینب کو چھوا تک نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ اگر مس کرنے سے بغیر طلاق دی جائے تو عدت نہیں ہوگی۔ بظاہر اس کا مقام سورۂ "بقرہ" یا "نسا" یا "طلاق" ہے لیکن حکیم مطلق خدا نے اس کو اسی جگہ لانا مناسب سمجھا۔

باریک حکمتیں

طلاق کے بعد رسولؐ پر نمونہ بننے کا موقع آ گیا تو فرمایا۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (احزاب-۴۸) کفار و منافقین کا کہا نہ مان۔

اگر رسول کریم کو یہ حکم نہ دیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ اللہ کے نزدیک میراث، حرمت و حلت عورات اور نکاح و طلاق کے احکام کوئی اہمیت نہیں رکھتے — اس حکم کے بغیر وہ تمام قواعد و احکام بالکل نامکمل بلکہ نکمے بن جاتے۔ ان کی تکمیل کے لیے کسی اور نبی کے

---

[1] مفسرین قرآنی تصریح کے خلاف زینبؓ کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ "بقول عثمانیؒ حضرت زینبؓ زید کے نکاح میں آئیں تو وہ ان کی آنکھوں میں حقیر لگتا۔ مزاج کی موافقت نہ ہوئی۔ جب آپس میں لڑائی ہوتی تو زید آ کر حضرت سے شکایت کرتے ...... الخ۔

دیکھیے حاشیہ آیت "قضی زید" (احزاب-۳۷)

آنے کی ضرورت باقی رہتی۔ لہٰذا رسول کریم کا اس ابتلا میں کامیاب ہو جانا اور لوگوں کے خوف سے بے نیاز ہو کر، صرف خوفِ خدا کے تحت ایسی پکی اور پرانی رسم کا عملاً خاتمہ کر دینا آپ کے خاتم النبیین ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور واقعی شاہد، مبشر، نذیر اور سراج منیر تھے (احزاب - ۴۵) بلاشبہ آپ صلوٰۃ خدا و ملائکہ و مومنین کے مستحق تھے (احزاب - ۵۶) اور بلاشبہ قرآن مجید مومنوں کے لیے "فضل کبیر" کا باعث ہوا (احزاب - ۴۷)

لوگوں نے اس نکاح کی ایسی تعبیریں کی ہیں جو شانِ نبوت کے قطعاً منافی ہیں[1]، لیکن قرآن حکیم اسے حضورؐ کے "خاتم النبیین" ہونے کی دلیل ٹھہراتا ہے۔ اور آپ کی مذکورہ بالا فضیلتوں ...... کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔

خاتم ایک ہی ہو سکتا ہے

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (احزاب ۴۰) یعنی محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کا بھی باپ نہیں (زید تو الگ رہا) لیکن (اُسے باپ سے بھی زیادہ تمام انسانوں کی بہتری منظور ہے۔ اس لیے کہ) وہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے اور اللہ نہیں چاہتا کہ ایسے نکاح کا موقع پیدا ہونے پر اسے نکاح کا حکم نہ دے کہ اپنے پیغاموں کو ناتمام اور ناقص چھوڑ دے اور ان کی تکمیل کے لیے کسی اور نبی کی ضرورت پیش آئے۔ ہرگز نہیں۔ لہٰذا محمد ہی) خاتم النبیین ہے، اور اللہ تعالیٰ کو تمام باتوں کا علم ہے (علیم مطلق خدا تمام نوع بشر کے لیے علوم دینی کی مکمل کتاب نازل کرنے پر قادر ہے، جو ہمیشہ ہمیشہ کام دے سکے اور اُسے منسوخ کرنے کا کوئی دعویٰ نہ کر سکے)

نبوت کی پوری تاریخ میں "خاتم النبیین" کا لقب آپؐ کے سوا کسی کو نہیں دیا گیا۔

بعثت خاتم

حضورؐ کی بعثت سے پہلے دنیا ایک گھر کے حکم میں نہیں آئی تھی۔ مختلف اقوام کے مختلف مذاہب موجود تھے، جن میں اصل حق بھی تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی اپنی قومی و ملکی خصوصیات بھی رکھتے تھے، جن کے باعث فرقہ بندیاں پیدا ہو جانی لازم تھیں۔ جب رسل و رسائل اور ذرائع سفر کی سہولتوں کی وجہ سے ممالک بعیدہ کے قریب آنے اور دنیا کے ایک بننے کا وقت آنے والا تھا۔ تو اس وقت تمام انسانوں کے لیے ایک متحد کر دینے والی کتاب کی ضرورت تھی۔ جو یہ بتائے کہ تمام مذاہب حقہ کی بنیادی باتوں میں کوئی اختلاف نہیں، قومی خصوصیات پر دینی اصول کی روشنی میں عقل و شوریٰ کے تحت عمل درآمد کیا جا سکتا ہے۔ فضول اختلافات میں الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر رسولوں کے سلسلے کے خاتمے کے وقت ایک آخری رسول اور آخری کتاب نازل نہ ہوتی تو لوگوں کو یہ کہنے کی گنجائش رہتی کہ ہمارے پاس کوئی متحد کرنے والا بشیر و نذیر نہیں آیا۔ چنانچہ

---

[1] جو بیہودہ و لغو قصے اس مقام پر حاطب اللیل مفسرین اور مورخین نے درج کر دیے ہیں۔ ان کی نسبت حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: "لا ینبغی التشاغل بھا" (وہ ناقابل التفات ہیں) ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔ "احببنا ان نضرب عنھا صفحاً لعدم صحتھا فلا نوردھا۔" ہم ان کو غیر صحیح ہونے کی وجہ سے نظر انداز کرتے ہیں۔ (عثمانیؒ)

اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ کی اصلی تعلیم پیش کر کے فرماتا ہے۔

یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ عَلٰی فَتْرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ م بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

(مائدہ ۲) ۱۹۔

اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا — جو رسولوں کے بند ہو جانے کے وقت تمہارے لیے (ہمارے احکام) کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس بشیر و نذیر نہیں آیا (اہلِ کتاب کے پاس ہزاروں بشیر و نذیر آ چکے تھے یہ بشیر و نذیر رسولوں کے بند ہونے کے وقت آنے والا تھا) سو تمہارے پاس (موعود) بشیر و نذیر آگیا۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

فترت

لغت کی معروف کتاب مصباح المنیر میں فترۃ کے معنی یوں لکھے ہیں ——— وقوله تعالٰی علی فترۃ من الرسل ای علی انقطاع بعثهم ودروس اعلام دینهم — یعنی اللہ تعالیٰ کے قول علی فترۃ من الرسل کے معنی ہیں، رسولوں کی بعثت کے منقطع ہونے پر اور ان کے دین کے نشانوں کے گم ہو جانے پر"۔

یہی معنی درست ہیں۔ ورنہ ان کے پاس ہزاروں بشیر و نذیر آ چکے تھے۔ اب صرف یہی ایک بشیر و نذیر باقی رہ گیا تھا۔ جس کے نہ آنے پر وہ بطور حجت کہہ سکتے تھے کہ مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ۔

اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد پر وحی والے بشیروں اور نذیروں کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

یوسف خاتم نہیں

ویسے تو خاتم النبیین کا تخیل پہلے سے موجود تھا۔ لیکن خاتم تو ایک ہی ہو سکتا ہے۔ مومن آلِ فرعون نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ تم یوسفؑ کی زندگی میں اس کی وحی میں شک کرتے تھے جب وہ فوت ہوئے تو تم نے کہا کہ اب اللہ تعالیٰ ان کے بعد کوئی رسول مبعوث نہیں کرے گا۔ (مومن ۔۳۴) اس سے معلوم ہوا کہ وحی یوسفؑ میں شک کرنا اور اس وحی کو خاتم الکتب سمجھنا دونوں باتیں غلط ہیں۔ خاتم الکتب ایک ہی کتاب ہو سکتی ہے۔

اس شخص نے یوسفؑ کے خاتم ہونے کی نفی کی ہے۔ مطلق ختم نبوت کا انکار نہیں کیا۔

موسیٰؑ دعا مانگتے ہیں اور اُدھر سے جواب ملتا ہے۔

دعا وَاکْتُبْ لَنَا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ اِنَّا ھُدْنَآ اِلَیْکَ ۔

جواب قَالَ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِہٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ؕ

رحمت خاص فَسَاَکْتُبُھَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۔

خاص لوگ اور خاص نبی اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ ۔

خاص نبی کے خاص کام يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔

کامیابی پانے والے فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔

خطاب عام قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (الاعراف۔ ۱۵۶ تا ۱۵۸)

دعا اے خدا ہمارے لیے اس دنیا اور آخرت میں بھلائی لکھ دے۔ ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔

جواب میرا عذاب اسے پہنچتا ہے، جسے میں پہنچانا چاہوں اور میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے خصوصاً ان کے لیے، جو متقی، زکوٰۃ دینے والے ہیں اور ہماری آیات کو مانتے ہیں۔

نبی کی پیروی کرتے ہیں، جو ان کے پاس تورات وانجیل میں مکتوب ہے۔ وہ معقول باتوں کا حکم دیتا اور برائیوں سے روکتا ہے۔ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال اور خبیث چیزیں حرام ٹھہراتا ہے۔ اور بوجھ اور طوق جو اُن پر پڑے تھے، اتارتا ہے۔ جن لوگوں نے اسے مانا، تقویت دی، مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس پر اُترا، وُہی لوگ کامیاب ہیں۔

کہہ دے اے انسانو! بلاشبہ میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ پس تم اللہ اور اس کے رسول نبی اُمّی پر ایمان لاؤ جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت یافتہ بن جاؤ —— ان آیات میں مکرر غور کیجیے۔

نگاہ باز گشت امت محمدیہ رحمت خاص کی مستحق ہے۔ اب کوئی ناسخ قرآن کتاب آئے گی، تو وہ امت مسلمہ کو خاص رحمت سے محروم کرنے والی ہو گی۔

آپ معقول باتوں کا حکم دیتے ہیں۔ اب جو کتاب آئے گی وہ معقول باتوں کو منسوخ کرنے والی ہو گی۔

آپ نامعقول سے روکتے ہیں۔ اس بات کو منسوخ کرنے والی کتاب نامعقول کو جاری کرنے والی ہو گی۔

آپ طیبات کو حلال اور خبیثات کو حرام کرتے ہیں۔ اس کی ناسخ کتاب اس کا الٹ کرنے والی ہو گی۔

آپ بوجھ اور طوق اتارتے ہیں۔ کیا اب نئے بوجھ اور طوق لادنے والی کتاب کا انتظار ہے؟

رسول اکرمؐ کی نورانی اصلاحات اس "نور" میں مندرج ہیں جو آپ کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ اگر کوئی کتاب ان اصلاحوں کی مخالفت کرے گی، تو ظاہر ہے کہ وہ خود اصلاح سے دور ہو گی۔ اور اگر بالکل مخالفت نہیں کرے گی، تو وہ قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتی پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تحصیل حاصل اور فعل لغو کو اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن و رسولؐ کی خصوصیت

رسولِ مقبولؐ بحکم رب العالمین بہ تکرار فرماتے ہیں کہ میں ہر دور کے تمام انسانوں کے سے بہیجے احکم الحاکمین کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسا جامع الکل شخص اصولی تعلیم ہی لے کر آئے گا۔ اور اصول کا وصف یہ ہے کہ وہ تبدیل و تنسیخ سے مبرا و منزہ ہوں۔ ورنہ وہ اصول ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے یہی قرآن ہمیشہ تک انسانوں کو پہنچتا رہے گا۔ گزشتہ چودہ صدیوں نے اس بات کی عملاً تصدیق کر دی ہے کہ قرآن محفوظ چلا آرہا ہے اور دنیا کے گوشے گوشے میں متن و تراجم کے ذریعے پہنچ رہا ہے۔ یہ شرف آج تک کسی سماوی کتاب کو حاصل نہیں ہو سکا۔

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ یَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۔

(توبہ - ۳۲ - ۳۳)

یہ لوگ اپنے منہوں (کی پھونکوں) سے اللہ کے نور (قرآن) کو بجھانا چاہتے ہیں۔ اور اللہ اپنے نور (قرآن) کو پورا کر کے رہے گا۔ اگرچہ کافر برا مانیں خدا ہی نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق، کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو تمام ادیان پر غالب کرے اگرچہ مشرک برا مانیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اس دین الحق کے سامنے سب دین (بابی بہائی وغیرہ) مغلوب ہوں گے۔ سب ادیان پر غالب آنے والا دین الحق لاناً خاتم الادیان اور اس کا لانے والا خاتم النبیینؐ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حسب وعدہ اپنے نور کو پورا کر دیا — اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ — اور آئندہ کے لیے اس کی رضامندی دین اسلام ہی میں منحصر ہے وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ ایسے کامل اور خدا کے پسندیدہ دین کے بعد کسی اور دین کی کیا ضرورت ہے؟

دلیل دوم

شانِ قرآن بزبانِ قرآن

پہلی دلیل کا تعلق زیادہ تر رسول و نبی کے لفظ سے تھا۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں خود قرآن کی ایسی خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں، جن سے اس کے ناقابلِ تنسیخ و تبدیل ہونے کا مکمل ثبوت مل جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے خاتم الکتب اور اس کے لانے والے کے خاتم النبیین ہونے میں شبہ نہیں رہتا۔ ملاحظہ فرمائیے!

۱- وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ (الحاقہ - ۶۱) قرآن حق الیقین ہے، جو یقین کا بلند ترین اور آخری مرتبہ ہے۔ حق الیقین کو کون کو منسوخ کر سکتا ہے؟

۲- فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ (یونس - ۳۲) حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ حق الیقین کو منسوخ کرنے والا غلط کار اور گمراہی کا ہی معلم ہو سکتا ہے۔

اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ

مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ ... صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (الانعام ۔ ۱۱۵) دیکھیے یہ ایک آیت کتنے اہم نکتے بیان کر رہی ہے۔

ا۔ کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حکم تلاش کروں (یعنی اللہ کا فیصلہ قطعی ہے، وہ فیصلہ کیا ہے، اور کہاں ہے!)

ب) اس نے تمہاری طرف یہ مفصل (فیصلہ کن) کتاب اتاری ہے (اس کے گواہ کون ہیں اور کیا گواہی دیتے ہیں؟)

ج۔ ہم نے جنہیں کتاب دی ہے وہ اس کو تیرے رب کی طرف سے اترا ہوا حق جانتے ہیں۔ پس تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا (یعنی یہ "حق ہے" "ربانی" ہے اور شک و شبہ سے پاک ہے)

د۔ اور تیرے رب کے کلمے صدق و عدل میں مکمل ہیں (صدق و عدل کو منسوخ کرنے والے کذب، ظلم ہی ہوں گے)

ہ۔ ان کلموں میں تغیر و تبدل کا کوئی امکان نہیں۔ ان کا مصنف تعالیٰ زندہ جاوید سننے والا اور جاننے والا ہے ــــ اگر ایسی صفات کے ہوتے ہوئے بھی قرآن خاتم الکتب نہیں ہے اور ایسی صفات (حق و عدل و حکم) بھی منسوخ کیے جانے کے لائق ہیں تو زمین و آسمان کی کسی چیز کی بھی خبر نہیں (اَنّٰی تُؤْفَکُوْن)

۴۔ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۗ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۔ (الاعراف ۲۰۱) یہ کتاب جو تیری طرف اتاری گئی ہے تیرے سینے میں اس کے ساتھ ڈرانے سے کوئی تنگی نہ ہو اور یہ مومنوں کے لیے نصیحت ہے۔ اے لوگو! تم اس قرآن کی پیروی کرو جو تمہارے رب سے تمہاری طرف اترا ہے اور اس کے سوا دوسرے اولیا کی پیروی نہ کرو۔ تم کم ہی نصیحت قبول کرتے ہو۔

یعنی بحیثیت وحی قرآن کے سوا کسی اور شخص یا کتاب کی پیروی قطعاً ممنوع ہے ــــ ایسا دعویٰ خاتم الکتب کے سوا کون کر سکتا ہے؟

۵۔ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (الاعراف ۱۸۵) قرآن کے بعد اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟ استفہام انکاری ہے۔ قرآن کے بعد کوئی کتاب بطور ایمان ماننے کے لائق نہیں آئے گی۔

۶۔ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل ۔ ۸۹)
تمام جن و انس جمع ہو کر اور ایک دوسرے کے مددگار بن کر بھی اس قرآن کی مثل نہیں لا سکتے۔

۷۔ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۔ طور ۔ ۳۴ (بلکہ اگر سچے ہیں تو اس کی مثل ایک بات ہی لا کر دکھائیں۔

۸۔ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ (هود ۔ ۱۴) اگر (مذکورہ بالا چیلنج) قبول نہ کریں تو جان لو کہ یہ (قرآن) علم الٰہی کے مطابق نازل ہوا ہے۔

۹۔ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (فرقان ۔ ۶) کہہ دے یہ (قرآن) زمین و آسمان کے تمام

اسرار کو جاننے والے نے نازل کیا ہے۔

ثابت ہوا کہ قرآن اللہ کے علم و اسرار کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اب وہ تعالیٰ اپنے علم کے خلاف کوئی دوسری کتاب نہیں بھیجے گا۔ اگر اور کوئی کتاب نازل ہوگی تو اُسے اپنی ضرورت و فوقیت منوانے کے لیے قرآن کی بے مثلیت کا انکار کرنا پڑے گا۔ جو بحکم قرآن باطل ہے۔ لہٰذا یہی خاتم الکتب ہوا۔ یہی کتاب عزیز غیر مغلوب اور اٹوٹ ہے۔

۱۰۔ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ

(حٰم۔ سجدہ ۴۲) وہ کتاب عزیز ہے، جس میں جھوٹ کا دخل نہیں آگے سے نہ پیچھے سے، اتاری ہے حکمتوں والے، تعریفوں والے نے۔

دلیل سوم

صحیفہ فطرت

صحیفہ فطرت (کائنات) اللہ تعالیٰ کے غیر محدود علم و قدرت کی تخلیق ہے۔ تمام انسانی علوم اسی سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ اُم العلوم ہونے کی وجہ سے ہماری تحقیقات کی اصل و بنیاد ہے۔ ہم اس کو سمجھنے میں غلطیاں بھی کرتے ہیں۔ اور پھر ان کی تصحیح کے لیے اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ تصحیح جبھی ممکن ہے کہ تحقیقات کی اصل بنیاد (یعنی صحیفہ فطرت) بے غلط محفوظ اور ناقابل تنسیخ ہو۔ اگر یہ خود ہی غلط، قابل تنسیخ اور ردّ و بدل کے قابل ہو، تو ایسی مشتبہ بنیاد سے یقینی علم اور قطعی نتائج حاصل کرنا ناممکن ہے۔

بنود نقطۂ از علم ایں کتاب غلط　　کہ[1] فہم ناقص ما کرد انتخاب غلط (بیدل)

بے شمار صداقتیں نیچر کی گہرائیوں میں مکتوم و مدفون ہیں۔ ان کا حصول محدود عقل انسانی کے لیے دشوار ہے۔ کلام الٰہی ان کو سہل الحصول اور قریب تر کر دیتا ہے۔ اس کا منصب نیچر کی توضیح دینا ہے۔

کلام الٰہی

صحیفہ فطرت ہی کی طرح اُس کلام الٰہی کا ناقابل تنسیخ، محفوظ اور اٹل ہونا بھی ضروری ہے۔ جو تمام نوع بشر کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہو۔

مختلف اقوام کی الگ الگ قومی خصوصیات کو تمام نوع بشر پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لاد دینا اور مخصوص سزائی احکام میں تمام انسانوں کو مبتلا کر دینا سراسر ظلم ہے۔ اس لیے ضرور ہے کہ اللہ کا وہ کلام جو تمام انسانوں کے لیے مقصود ہے ایسے تمام اطواق و اغلال سے پاک ہو (اعراف - ۱۵۸) نیز فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا (النساء - ۱۶۰)

یہود کے ظلم اور اللہ کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کے سبب ہم نے ان پر کئی حلال چیزیں حرام کر دیں۔ ظاہر ہے کہ تمام ناکردہ گناہ انسانیت پر ہمیشہ کے لیے حلال کو حرام نہیں کیا جا سکتا ہے۔

جو کتاب تمام انسانوں کے لیے ہو گی، وہ صرف اصولی شریعت پیش کرے گی۔ انسانی عقل کو معطل نہیں کرے گی۔ بلکہ اس کی مدد کرے گی اور جزئیات (جو غیر محدود اور زمانی و مکانی ہوتی ہیں) کو انسانی عقل و شوریٰ پر چھوڑ دے گی۔ جزئیات کے لیے رسولوں اور نبیوں کا انتظار اصولی کتاب کی ناقدری اور نوع کو جھگڑوں میں پھنسانا اور تنزل میں گرانا ہے۔ اگر کوئی نئی نبوت اصول کو پیش

---

[1] "کہ" بمعنی "بلکہ" واقع ہوا ہے۔

کرتی ہے۔ تو اسے "خاتم" ہونے کا دعویٰ کرنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ اس کے برعکس تغیرات عالم کے سبب نبوت کے جاری رہنے کی "خوشخبری" سناتی ہے تو اس کا مطلب واضح ہے۔ وہ خود منسوخ ہو کر بعد میں آنے والی نبوت کے لیے جگہ خالی کر دے گی — اور اس کو اس بات کا کوئی علم نہیں کہ تغیراتِ عالم اصولوں کی نفی نہیں کیا کرتے۔ بلکہ اصولوں کے ماتحت واقع ہوتے رہتے ہیں۔

صحیفہ فطرت ایسی بے بدل کتاب کا خالق تعالیٰ، اس کی مدد کے لیے[1]، تمام نوع انسان کی خاطر اپنے علوم دین کا ایک معین و مشخص، بے غلط، بے بدل، محفوظ اور ابدی کورس بھی عنایت کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی حکمت مطلقہ کا یہ تقاضا قرآن کی صورت میں پورا ہوا۔

اگر تمام الٰہی کتابیں قابل تنسیخ مان لی جائیں، تو وہ تدریجاً ناقابل تسلیم و تعمیل بنتی جائیں گی۔ پھر ان میں سے کوئی بھی علمی و عقلی تحقیقات کی صحیح بنیاد بننے کے قابل نہیں ہوگی۔ لہٰذا کسی ایک کتاب کا ناقابل تنسیخ ہونا لازم ہے۔ اور جس پر وہ نازل ہو وہی "خاتم النبیین" ہوگا۔

عقلی دین

دنیا بھر کے دانش مند چاہتے ہیں کہ تمام نوع انسان کے لیے ایک ریشنل (عقلی) دین ہو۔ لیکن ابھی تک یہ بات ان کے علم میں نہیں لائی جا سکی۔ یہ کام جو انسانی عقل کے بس کا نہیں۔ خالق کائنات نے اپنے ذمے لیا اور قرآن حکیم کی صورت میں ایک قطعی عقلی دین، اکمل و اعلیٰ طور پر مرتب کر کے دے دیا۔

افسوس ہے کہ اس علم و عقل کے زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں، جو خدا کو بھی اس پر قادر نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک خدائی کتابیں ہمیشہ قابل تنسیخ رہتی ہیں اور کل نوع انسان کو کبھی کوئی ایسی کتاب نہیں دی جا سکتی جو علمی و عقلی تحقیقات کی اٹل بنیاد قرار دی جا سکے۔ اور جس پر تمام نوع انسان مطمئن ہو کر متحد ہو سکے۔

یہ لوگ اپنی "آسمانی کتاب" "البیان[2]" کو تو چند ہی سال کے بعد منسوخ کر چکے ہیں اور اب ان کی کتاب "اقدس[3]" بھی دیر سویر اپنے کسی جانشین کی منتظر ہے۔ جو اس کو منسوخ ٹھہرائے، اسی غلط اعتقاد کی وجہ سے یہ لوگ "خاتم النبیین" کے منکر ہیں ان کی بنیاد گرنے والے کنارے پر ہے —

انسانی فطرت سچے دین کے مطابق خلق کی گئی ہے۔ وہ بدلنے والی چیز نہیں — وہ کبھی دو اور دو کو تین یا پانچ نہیں کہہ سکتی۔ حق ہمیشہ حق اور بے بدل ہے۔ باطل ہمیشہ باطل ہی رہے گا۔ قرآن حکیم نے نوع انسانی کے عقلی بلوغ کے آغاز میں ہی بے بدل اور اختلافات سے پاک دین پیش کر دیا ہے۔ فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا‌ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا‌ ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَـلۡقِ اللّٰهِ‌ ؕ ذٰ لِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (الروم - ۳۰) پس (اے رسول!) تو مائل بحق ہو کر اپنی

---

[1] یعنی اس کو سمجھنے اور اس کے خزائن سے استفادہ کرنے کے لئے (مرتب)

[2] محمد علی باب کی کتاب [3] بہاء اللہ کی کتاب

توجہ اصل دین کی طرف قائم رکھو اور اللہ کی بنائی ہوئی فطرت پر جما رہ، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی پیدائش میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہ قائم رہنے والا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

کامل دینی کورس

دینی علوم کا کورس نوع انسانی کی استعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے بتدریج سکھایا گیا ہے۔ اس کی کوئی بات کبھی منسوخ نہیں ہوئی۔ منسوخ وہی باتیں ہوتی ہیں جو قومی و ملکی خصوصیات یا سزائی احکام ہوں، اصل حق منسوخ ہونے کی قابلیت نہیں رکھتا —— ایسا کورس یک وقت تفصیل کے ساتھ انسانیت کے عہد طفولیت میں دے دینا حکمت الٰہی کے خلاف ہے۔ وہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے معین و مشخص ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ مناسب وقت پر مکمل صورت میں لوگوں کو پہنچا دیا جائے۔ یک وقت پورا کورس نازل ہونا حکمت الٰہی کے خلاف کیوں ہے! اس کے ثبوت میں چند دلائل ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ وید مقدس

وید مقدس کی زبان نزول قرآن سے بہت پہلے مر چکی تھی —— ہزارہا سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی اشاعت ہندوستان سے باہر کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ کسی دوسرے ملک میں اس کا ترجمہ[۲] تک نہیں پہنچا اور نہ ہی اسے ترجمے کے قابل سمجھا گیا۔ حالانکہ دعویٰ یہ ہے کہ کل دنیا کے لیے ہے۔

بالکل اسی طرح دوسری مدعی الہام کتابوں کی بولیاں بھی مُردہ ہو چکی تھیں۔ مسیح کی اپنی بولی والی انجیل تو دنیا میں موجود ہی نہیں۔ ایسے زمانوں میں جب کہ کوئی پلٹنے والی زبان (بولی) ہی وجود میں نہیں آئی تھی، ایک ابدی صحیفے کا نازل کرنا حکمت الٰہی کے خلاف ہوتا۔

۲۔ وید اور قرآن میں فرق

انسان کی تخلیق کے بعد بولیاں بننا شروع ہوئیں۔ فن تحریر بہت بعد میں ایجاد ہوا، جو پہلے تصویری شکل میں تھا۔ یعنی حروف کی بجائے اشیاء کی تصویروں سے کام لیا جاتا تھا۔ جب اس فن کی تکمیل ہوئی تو فسانوں کا زمانہ آیا۔ فسانہ نویسی کے دور کے بعد تاریخی دور آیا۔ قبل تحریر کے زمانے کی تعلیمات زبانی روایت پر مبنی ہوں گی۔ تحریر کے دور میں روایتی تعلیمات کا محفوظ طور پر تحریر میں آنا امر محال ہے۔ آریہ صاحبان تسلیم کرتے ہیں کہ وید مقدس کا الہام دو ارب سال قبل ہوا اور وہ آج سے چار پانچ ہزار سال قبل قید

---

[۱] آریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وید مقدس تمام نوع انسانی کی دائمی ہدایت کے لیے آج سے اربوں سال قبل ابتدائی انسان (یا چند انسانوں) پر نازل ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے خدائی وحی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا۔ "مرتب"

[۲] سنا ہے کہ میکس مولر (جرمنی) نے اس کا ترجمہ کیا ہے جو آریوں کے نزدیک مستند نہیں ہے۔

تحریریں لائے گئے۔ ناممکن ہے کہ وہ اربوں سال زبانی زبانی رہتے ہوئے تغیر و تبدل سے محفوظ رہ سکے ہوں — اس سے ظاہر ہے کہ جو وحی کل نوع انسان کے لیے مقصود ہو، تاریخ و تحریر کے زمانوں سے قبل اُسے نازل کر کے زبانی روایات کے حوالے کر دینا حکمت الٰہی کے خلاف ہے۔

قرآن حکیم اپنے عہد کی عینی تاریخ ہے۔ جو ہمیشہ حفظ کیا جاتا اور لکھا جاتا رہا ہے اور بہت جلد دور دراز ممالک میں پہنچ گیا۔ اور تمام سابقہ الہامی کتب کے برعکس ان لوگوں کے ہاتھ کا لکھا ہوا آج تک موجود ہے جو اس کے نزول کے زمانے میں زندہ[1] موجود تھے۔ اس کے اندر تمام حالات، اعتراضات مع جوابات درج ہیں، جو اس وقت کئے جانے ممکن تھے کوئی واقعہ کوئی مخالفت تک درج ہونے سے رہ نہیں گئی۔ اور ظاہر ہے کہ موقع کی صفائی سے زیادہ کوئی صفائی نہیں ہو سکتی — اس کے روزِ اول ہی سے اس کی پہلی آیت اور اندر کی بے شمار آیات میں لکھا ہوا چلا آتا ہے کہ یہ کتاب ہے، المکتوب ہے، محفوظ ہے، اس میں باطل کو کسی راہ سے گھسنے کی گنجائش نہیں، یہ خدا کی طرف سے ہے۔ وغیرہ ذالک

۳۔ آغاز انسان وصحف سماوی

انسانی پیدائش کا آغاز (عراق۔ یا۔ تبت) ایک خاص علاقے میں ہوا۔ جب نسل میں افزائش ہوئی۔ وہ جگہ اور اُس جگہ کی پیداوار ناکافی محسوس ہوئی تو افراد اور خاندانوں میں اپنی بقا کے لیے جھگڑے پیدا ہوئے۔ غالب عنصر نے قبضے جمائے اور مغلوبوں کو بھاگنا پڑا۔ ان سے نئے نئے علاقے آباد ہوتے گئے۔ لڑائی جھگڑوں میں کدورتیں اور کینے بھی بڑھتے گئے۔ ایک دوسرے کو ملیچھ[2]، چنڈال[3] اور راکشش[4] کے ناموں سے یاد کرتے تھے۔ لڑائیاں ہوتی تھیں۔ میل ملاپ کے راستے مسدود تھے۔ جدائی کے محرکات کا اندر دورہ تھا ایسے تفریق و تبعید کے سلسلے میں دین کی عام اشاعت ناممکن تھی۔ اشاعت تو رہی ایک طرف غالب لوگ مغلوبوں کی کتابوں کو نذرِ آتش کر دیا کرتے تھے۔ خود وید مقدس کی ۱۱۲۷ شاکھاؤں[5] میں سے کتنی رہ گئی ہیں؟ صحف ابراہیمؑ کہاں ہیں؟ صحف موسیٰؑ اور دیگر انبیاء کی کتابوں کا جو حال ہوا، ان کے پڑھنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ جن زمانوں میں برہمن، چھتری، ویش اور شودر (چار برن) کی تقسیم ضروری سمجھی جاتی تھی اور ان کا دھرم بالکل الگ الگ قرار دیا جاتا تھا اُس وقت لوگ حریت و مساوات کے درس و تعلیم کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

۱؎ لندن میوزیم میں آج تک وہ قرآن موجود ہے، جس کی تلاوت کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ شہید ہوئے۔ ہمارے پیش نظر قرآنی نسخوں میں اور اس قدیم ترین نسخے میں ایک حرف کا فرق نہیں۔ یہ شرف یا اعجاز دنیا کی کسی اور کتاب کو حاصل نہیں۔

۲؎ پلید۔ ناپاک قوم۔ جنگلی، وحشی آدمی، کافر بے دین، ۳؎ کمینہ بخت۔ کنجوس۔

۴؎ جنگلی، وحشی شیطان بدروح ۵؎ شاکھا۔ غالباً شاخ کی دوسری یا ابتدائی شکل ہے جس کے معنی مدفصل کے ہوں گے۔

پھر جب آبادی بڑھتی گئی اور تلخ تجربوں سے عقل و فہم میں اضافہ و ترقی ہوتی رہی اور مختلف اقطاع میں پھیلی ہوئی دنیا وسائل کی ایجادات سے ایک گھر بننے کے قریب ہوگئی، تو اس وقت ان بچھڑے ہوؤں کو متحد کرنے والا دینی علوم کا مکمل کورس نازل کیا گیا۔ اس کے لیے یہی وقت مناسب تھا۔

۴۔ تغیرات کے بعد

تمام علوم کی تدوین تک۔

تمام انتظامات میں ان کی مناسب شکل اختیار کرنے تک۔

تمام کائنات میں اس کے بالغ و معتدل ہونے تک۔

جلد جلد تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ پھر ایک مقام پر پہنچ کر وہ اپنے کام پورے طور پر انجام دینے لگتے ہیں — بچپن یعنی نشو و نما کے تغیراتی دور میں بچوں کو ہر ہر بات میں والدین (وغیرہ) کی سرپرستی کی ضرورت لاحق رہتی ہے — پھر جب پختگی اور بلوغ کا وقت آتا ہے، تو بہت سے کام ان کی اپنی ذمہ داری پر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔

دین کا مکمل، بے بدل اور ابدی کورس اصول کا متکفل ہوگا۔ جزوی اور فروعی امور و اختلافات کو عقل انسانی کے حوالے کر دے گا۔ مذکورہ بالا دلیل کی رو سے لازم ہے کہ وہ کورس عقلی بلوغ کے وقت اپنی تکمیلی صورت میں ملے، فالحمد للہ کہ وہ کتاب جس کے ساتھ جاہلیۃ اُولیٰ کا دور ختم ہوا، وہ صرف قرآن حکیم ہی ہے۔

لیکن اگر وہ آخری، مکمل اور ابدی کورس تمام جزوی و فروعی اختلافات کا فیصلہ بھی اپنے ذمے لے لے گا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ انسانی فہم و شعور کو معطل بنانے والا ہوگا۔ نیز اس کی ضخامت اتنی ہو جائے گی کہ جو پوری دنیا میں بھی نہیں سما سکے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلمات بے حد و حساب ہیں۔ تمام سمندر سیاہی اور تمام درخت قلم بن جائیں، اس پر مزید سات سمندر اور بھی شامل کر لیے جائیں تو بھی کلمات الٰہی یقیناً ختم نہیں ہو سکتے۔ اس بارگاہِ جلیل کی عظمت کے سامنے تو پھولوں سے بھرے ہوئے نو و آسمان بھی ایک برگ سبز سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے —

از تو بہارِ طرب نزل، جوش بدانہ باغ ازل
نُہ آسمان گل در بغل، یک برگ سبز گلشنت (بیدلؒ)

۵۔ آخری کورس کا موزوں وقت

دینی علوم کا وہ آخری کورس تمام انسانی اختلافات و اعتراضات کو رفع کرنے والا ہوگا۔ اس کے لیے مکمل ہونا لازم ہے اور اس کا موزوں وقت وہی ہو سکتا ہے جب کہ دنیا میں مذہبی اختلافات اور دین کے متعلق اعتراضات کا کافی ذخیرہ جمع ہو چکا ہو تاکہ

وہ علمی طور پر ان کے جواب دے سکے۔ نزول قرآن کے بعد اعتراضات نیا لہجہ اور نئے نئے بہروپ تو بنا سکتے ہیں، لیکن بنیادی طور پر کوئی نیا اعتراض پیدا نہیں کیا جا سکتا جس کا جواب قرآن میں موجود نہ ہو ۔۔۔ یہ شرف قرآن ہی کو حاصل ہے جس نے رفع اختلافات اور رفع اعتراض کے لیے علمی و عقلی بحث کی ہے۔ کوئی مدعیٔ وحی کتاب اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

۶- چار وید

بھارتی آریوں کا عقیدہ ہے کہ چار وید آغازِ نوعِ انسان میں نازل ہوئے اور وہی ساری دنیا کے لیے ہمیشہ ہمیشہ رہنمائی کا کام دیتے رہیں گے۔ ان کے بعد خدا اور بندوں میں ہم کلامی (یا وحی) کا تعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ ویدوں کی موجودگی میں کسی دوسری کتاب اور رشی (رسول و نبی) کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے تو وہ قطعاً غلط، باطل اور کذب و افترا ہے۔

اس عقیدہ، خیال یا اعتراض کی بنا پر دنیا بھر کے مصلحین (انبیاء وغیرہ انبیاء) کی پوزیشن پر اتنی زبردست زد پڑتی ہے کہ ان کی کوئی بات قابل تسلیم نہیں رہتی۔ اس زبردست حملے کی وضاحت مسلمہ آریہ لیڈر دیانند کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" کے چودھویں سمولاس (باب) میں ملتی ہے۔ جہاں مصنف نے تمام مذاہب کے مقدس مذہبی بانیوں اور رہنماؤں پر سخت بازاری قسم کے الفاظ میں نہایت دل آزار تبصرہ کیا ہے اور لاکھوں روپے کے صرف سے اس کی اشاعت بھی ہوتی رہی ہے۔

خواجہ صاحب کے زمانہ حیات میں آریہ دھرم کا بہت زور اور چرچا تھا، دوسرے مذاہب کے بعض افراد بھی اس دھرم کو قبول کر رہے تھے۔ بعض مسلمان بھی اس کا شکار ہو چکے تھے۔ آج کل بھی جا رہے ہیں۔ اُن کا یہ چارہ یہاں کے بے بس مسلمانوں کے لیے دامِ صیاد بنا ہوا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس کی اہمیت کے پیش نظر "ختم نبوت" کے ضمن میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور ان لوگوں کے مندرجہ بالا خیالات کو قطعی دلائل کے زور سے بالکل باطل ثابت کر دیا ہے۔ اس کی تلخیص ملاحظہ فرمائیے۔

یکساں استعداد

اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے آغاز میں جس انسان یا انسانوں کو پیدا کیا ان ہی خدا سے ہم کلامی کی استعداد بھی پیدا کی۔ بعد کے تمام انسان انہی کی اولاد ہیں اور ان کا ایسی ہی استعداد رکھنا لازم ہے۔ اگر آج کے انسان مکالمہ الٰہیہ کے قابل نہیں تو ابتدائی انسان بھی اس کے قابل نہیں ہو سکتے۔

الہام نتیجہ عمل ہے؟

آریہ کہتے ہیں کہ ابتدائی انسانوں کو نیک اعمال کی وجہ سے شرفِ مکالمہ عطا ہوا تھا۔ انہیں اس پر روشنی ڈالنی چاہیے کہ وہ کون سے نیک عمل تھے، جو اُس وقت کیے جا سکتے تھے اور اب نہیں ہو سکتے؟ اور اگر نیک عمل ہر وقت کیے جا سکتے ہیں اور الہام ان کا نتیجہ ہوتا ہے تو صرف چار رشیوں پر الہام کو منحصر نہیں کیا جا سکتا۔

قدرتی الہام امر واقعہ یہ ہے کہ الہام خاص کے علاوہ عام قدرتی الہام ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ بندے کی اپنے مولا سے ہم کلامی عظیم شرف، ذریعہ استقامت اور اطمینان قلب کا باعث ہوئی ہے نیز اس سے وجود باری پر ایک مزید تجرباتی دلیل قائم ہوتی ہے۔

عدم الہام کی دلیل اگر اس پر اصرار ہو کہ آغاز آفرینش میں ایک مرتبہ الہام ہو کر پھر ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا ہے، تو اس پہلے الہام کے وقوع پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی بلکہ تمام انسانوں میں الہام کا نہ پایا جانا اس بات کی دلیل ہو گا کہ پہلے بھی کبھی الہام نہیں ہوا۔

بے شمار شواہد تاریخ و تجربہ شاہد ہے کہ بے شمار انسانوں نے الہام کے بیٹے دعاوی کئے ہیں۔ بے شک ان میں بعض کاذب بھی ہو سکتے ہیں لیکن سب پر کذب کی تلوار نہیں چلائی جا سکتی جب کہ وہ خدا کے سچے مومن ہوتے ہوئے اپنی مشاہدہ کی ہوئی قلبی واردات بیان کر رہے ہوں اور اس کے نتائج نے ان کی صداقت پر مہر تصدیق بھی ثبت کر دی ہو۔ انبیاء و اولیاء کی کامیابیاں احسان کے بڑے بڑے متمرد مخالفوں کی ناکامیاں اس کی واضح دلیل ہیں۔

خواب دنیا میں بے شمار آدمی ایسے ملیں گے، جن کے خواب حرف بحرف پورے ہوتے رہے۔ یہ غیبی اطلاعات ثابت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فیوض و تصریحات کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔

عدم قابلیت ان حالات میں یہ محض تکلف ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر ضرورت کے دنیا کے روز اول ہی میں علوم دینی کا مکمل کورس دے دیتا۔ جب کہ اس سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت ہی پیدا نہیں ہوئی تھی (یعنی ایم اے کا نصاب پہلی جماعت کے بچے کو)

وید کے مصنف؟ وید منتروں (وید کے حصوں) کے مختلف مجموعوں پر مختلف رشیوں کے نام درج ہیں۔ اور کئی منتروں کے خاتمے میں متعلقہ کے طور پر آ گئے ہیں جس سے معلوم ہوا ہے کہ وہی ان کے مصنف ہیں۔ لیکن آریہ کہتے ہیں کہ "یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے مراقبہ کر کے ان منتروں کا مطلب پہلے پہل سمجھا تھا۔ یہ ان کے مصنف نہیں ہیں بلکہ اصلی مصنف خدا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ منتر ان رشیوں سے قبل نازل ہو چکے تھے لیکن پہلے[1] والے لوگ ان کے مفہوم سے ناآشنا تھے۔ پھر ان کے نزول کا کیا فائدہ۔

بے ضرورت اور قبل از وقت ابتدائی انسان جو والدین کے بغیر خلق کئے گئے تھے، ان کے اصول اور فروع نان اطراف میں سے کوئی نہ تھا۔ یعنی نہ ان کے دادا، نانا، چچا، ماموں اور نہ بہن بھائی ہی تھے ان کو ان رشتوں کے حقوق (وراثت وغیرہ) کے متعلق کیسے کوئی حکم دیا جا سکتا تھا؟

---

[1] یعنی جن پر وید منتر نازل ہوئے اور دوسرے تمام لوگ جو رشیوں سے قبل ہو چکے تھے۔

وہ لوگ ابھیشک (رسوم تخت نشینی) کو کیا جانتے تھے؟ انہوں نے گنگا جمنا کے مقام اتصال کو کب تیرتھ (مقدس مقام) بنایا تھا؟ اور اس وقت تغلق اقوام (ملیچھ، راکشش، شودر) کا کیا علم تھا؟ ان ابتدائی سیدھے مادر پدر لوگوں کو نیوگ[1]، بدمعاشوں، قزاقیوں اور جنگ کے طریقوں اور چال بازیوں کا ذکر سنانا مستوں کو سرود سنانے کا مصداق تھا۔ (یعنی جب ان چیزوں کا وجود ہی دنیا میں نہیں تھا، تو ویدوں میں ان کا ذکر کیوں ہے؟ اور ابتدائی لوگوں کو اس سے کیا فائدہ پہنچا؟)

وید میں ذکر قبل وید

اگر وید واقعی ابتدائی انسانوں کو ملے تھے، تو ان کے اندر ماضی کے قدیم ترین بزرگوں اور دیگر اقوام قدیمہ کا ذکر کیوں ہے؟ جو وید سے پہلے ہو گزری تھیں۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ

وید اور تبت

وید کا نزول تبت میں ہوا تھا اور واقع یہ ہے کہ تبت میں کوئی اس کو جانتا بھی نہیں۔ یہ کیسے ہوا کہ صرف بھارتی آریہ ویدوں کے پرستار بنے اور دوسرے ممالک کے آریہ ان سے بالکل شناسا نہیں۔ آریہ اقوام میں عناصر پرستی اور دیوتا پرستی کا اشتراک تو ضرور ہے لیکن اصل وید منتروں کا بالکل اشتراک نہیں۔

وید میں ان دقتوں کا ذکر تو ہے، جب آریہ بھارت کے اصلی باشندوں کو مغلوب کر رہے تھے۔ بھارت کے موسموں کا بھی ذکر ہے، لیکن تبت کا کچھ ذکر نہیں ــــ اور شمالی ہند کی گرمی، سردی اور برسات کے لحاظ سے مہینوں کا تقرر ہوا ہے۔ ویدوں میں تیرتھ بھی ہند کے ہیں نہ کہ تبت کے۔

وید کی زبان

وید میں بقول سوامی دیانند صاحب مقلوب الفاظ بھی ہیں مقلوب الفاظ لوگوں میں کثرت استعمال کے باعث بطور غلط العام رائج ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وید اس زمانے میں تصنیف ہوئے جب غلط العام اور مقلوب الفاظ کا رواج ہو چکا تھا۔ ایسے الفاظ ابتدائی الہام میں نہیں ہو سکتے۔

وید منتروں کے سُر

ویدوں میں گندھاری وغیرہ سُروں کے مطابق منتر بنائے گئے ہیں مقامی سُر[2] اور راگ کسی خاص مقام میں عرصہ تک لوگوں کے قیام سے ان کے لب و لہجہ میں فرق آ جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ پس گندھاری سُر قندھار کے آباد ہونے کے مدت بعد پیدا ہو سکتا ہے اور اس سُر والے منتر اس کے بھی بعد تصنیف ہو سکتے ہیں۔

قدامت وید

آریہ کہتے ہیں کہ وید منتروں کے معنی پہلے پہل رشیوں نے بتائے جن کے نام ہر منتر کے آغاز میں مکتوب ہیں۔ اس سے قبل وید منتر محض رٹے جاتے تھے بے سمجھے ہوئے۔ اور کوئی کام نہیں دے سکتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ وید منتر انہی رشیوں کے عہد میں دنیا کو ملے جبکہ ان کی افادیت ثابت ہو سکی۔ اور وہی

---

[1] ہندوؤں میں اولاد حاصل کرنے کا ایک خاص طریقہ

[2] جیسے پوربی، پہاڑی، ملتانی وغیرہ۔

ان کے مصنف ہیں۔ جو پیدائش انسان کے مدت بعد پیدا ہوئے۔ بقول آریہ "تبت میں ویدوں کا نزول" خلاف واقعہ ہے۔ تبت کے بدھ ان سے بالکل بے خبر ہیں۔ وید ہندوستان ہی کی پیداوار ہیں۔

الحاصل وید مقدس کو کسی ایک شخص نے بہت بعد کے زمانے میں مرتب کر کے ابتدائی انسانوں کی طرف منسوب کر دیا ہے، جو محض ایک خوش اعتقادی ہے۔

وید کی اشاعت؟ بالفرض اگر ابتدائی انسانوں کو دینی علوم کا مکمل کورس دیا گیا تھا، تو چونکہ اس کا کل نوع انسان کے لیے ہمیشہ تک رہنا مقصود تھا۔ لہٰذا اس کے لیے لازم تھا کہ وہ بحفاظت الٰہی ساری دنیا میں پھیل جاتا۔ لیکن وہ تو بھارت کے بھی ہر گوشے میں نہ پہنچ سکا۔ بنارس (کاشی) کے چند پنڈتوں میں سے کوئی ایک وید کا ماہر کوئی دو کا، کوئی تین کا اور بمشکل کوئی ایک آدھ چار وید کا عالم بتایا جاتا ہے۔ جو کورس تمام انسانوں کے لیے ہو، اس کے لیے ضرور ہے کہ وہ سہل الحصول ہو، عام اشاعت کے زمانے میں ملے اور عام اشاعت کے قابل ہو (یہ صفات صرف قرآن مجید میں ہیں)

آریہ صاحبان کہتے ہیں کہ وید کی عمر دو ارب سال ہے۔ اس طویل مدت میں نہ ان کا متن پھیلا، نہ چاروں ویدوں کا کوئی مستند ترجمہ شائع ہوا۔ "ستیارتھ پرکاش" منو شاستر پہ حواشی چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ویدوں کی اشاعت کو بالکل ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

باب[1] وبہا ایران میں محمد علی باب نے اپنی کتاب "البیان" کے وحی ہونے کا دعویٰ کیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ان کی جماعت کے ایک اہم رکن حسین علی نوری عرف بہاء اللہ صاحب نے "کتاب اقدس" پیش کر دی، جس نے "البیان" کو منسوخ کر دیا۔ لیکن "کتاب[2] اقدس" کے گنبد بے در کی اشاعت دنیا بھر میں تو کیا ان کے اپنے حلقوں میں بھی تسلی بخش طور پہ نہیں ہو رہی ہے۔ اسلام کے اصل الاصول توحید سے انحراف کر کے بہاء اللہ صاحب کو مظہر (اوتار) کی حیثیت دی جا رہی ہے۔

بائیبل بائیبل کے تراجم کی بلا شبہ بڑی اشاعت ہو رہی ہے لیکن ترجمہ کی اشاعت اصل کتاب کی اشاعت نہیں کہی جا سکتی۔ اشاعت اس کو کہتے ہیں کہ زبان قابل فہم اور سہل الحصول ہو۔ متن و ترجمہ ساتھ ساتھ ہوں۔ معمولی علم والے خود دیکھ سکیں کہ ترجمہ کہاں تک متن سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور کہاں کہاں مترجم نے دانستہ یا نادانستہ متن سے انحراف کیا ہے۔ مردہ زبانیں نہ سہل الحصول ہوتی ہیں، نہ عام اشاعت کے قابل۔

وید کا لغت وید کے ایک ایک لفظ کے بیسیوں معانی بنائے جاتے ہیں۔ جب زبان ہی مردہ ہو تو کون یہ فیصلہ دے

---

[1] باب یعنی وہ دروازہ جس میں سے نکل کر خدا کا موعود ظہور کرے۔ چنانچہ یہ دعویٰ بہاء اللہ صاحب نے کر دیا۔

[2] بہائی مذہب کی اشاعت و ترقی کے متعلق بہت مبالغہ آمیز بیان شائع کیے جاتے ہیں۔ لیکن کتاب اقدس کسی قیمت پہ نہیں مل سکتی۔ یا للعجب

سکتا ہے کہ کسی لفظ کے کسی خاص جگہ اور خاص ترکیب میں کون سے خاص معنی مراد لیے گئے ہیں ؟ آگ کو سامنے رکھ کر اگنی (آگ) سے متعلق منتر پڑھنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ یہاں اگنی سے مراد خدا کی ذات ہے عجیب بات ہے ؎

" جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے "

قرآن حکیم

قرآن حکیم کے سوا کسی بھی مدعی الہام کتاب کو صحیح معنی میں اشاعت عام نصیب ہی نہیں ہوئی۔ قرآن پاک کے اندر ایسی عظیم قوت موجود ہے کہ وہ خود ہی اپنی زبان کو زندہ رکھنے کا ضامن ہے۔ اس پر کبھی موت کا وقت نہیں آئے گا۔ زندہ کے ہوتے ہوئے اس کے جانشین کی تلاش فعل عبث ہے اور جانشین[1] بھی ایسا جس کے مدعی خود ہی اس کو ہرنے والا مانتے ہیں۔

آں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمتِ اولا یزال است و قدیم

الہام دو قسم

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ الہام کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ بلاشبہ اللہ والوں کا خوف و غم دور کرنے، بشارت دینے، دلوں کو ثابت رکھنے اور ان میں اطمینان و سکینت ڈالنے کے لیے اب بھی الہام ہوتے ہیں۔ لیکن دینی علوم کے مکمل کورس کو بدلنے والا کوئی الہام ممکن نہیں۔ عام قدرتی الہام میں انسانی جذبات کا دخل ضرور ہوتا ہے۔ لیکن تصرف الٰہی کے تحت خاص طور پر ہونے والا الہام نہایت محفوظ، مکمل اور بے بدل ہوتا ہے۔

قادیانی

جناب مرزا صاحب کی قادیانی جماعت قرآن کریم کو کامل اور ناقابل تنسیخ سمجھتی ہے اور اس کے بعد کسی اور کتاب کے نازل ہونے کی قائل نہیں بلکہ ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن ایسی کامل کتاب ہے، جس کی کامل پیروی سے رسول و نبی ظہور میں آسکتے ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب اسی کی پیروی سے اُمتی نبی بن گئے۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اُمتی نبیوں کو نہ ماننے والا کافر ہے۔ علم و عقل کی رُو سے یہ دعویٰ سرتا پا غلط ہے بوجوہ ذیل:-

۱— جو قرآن کامل (ان کے بقول) اپنے پیروؤں کو نبی و رسول بنا دیتا ہے کیا وہی کامل قرآن خود موجود ہوتا ہوا دوسرے لوگوں کو مرزا صاحب پر ایمان لائے بغیر معمولی مسلمان بھی نہیں رکھ سکتا۔ حد ہو گئی، اس تضاد کو کیا کہیے!

---

[1] کتب بہائیہ کتاب اقدس، کتاب مبین، الواح مبارکہ وغیرہ

قرآن کامل لیکن بے کار

جب مرزا صاحب نے قرآن مجید کی پیروی شروع کی تھی۔ لیکن ابھی وہ نبی و رسول نہیں بنے تھے تو جس قرآنی قوت نے ان کو مسلمان اور مسلمان سے مومن اور مومن سے صالح اور صالح سے صدیق اور صدیق سے نبی بنا دیا تھا۔ کیا وہی قوت مرزا صاحب کو نبی بنا دینے کے بعد قرآن میں نہیں رہی (معاذ اللہ) یا کیا مرزا صاحب نے قرآن پاک کی وہ قوت اور نور سارے کا سارا اپنی ذات میں جذب کر لیا ہے اور دوسرے تمام لوگوں کا براہ راست قرآن سے رشتۂ استفادہ منقطع کر دیا ہے؟ جب سورج خود موجود ہے تو چاند سے اس کی روشنی لینا کہاں تک معقولیت پر مبنی ہے؟ کیا وجہ ہے سورج خود موجود ہو کر چاند کے واسطے کے بغیر اپنی روشنی نہیں دے سکتا؟ اگر چاند سورج کو گہنا دیتا یا بے نور کر دیتا ہے تو ہم کو بھی نور نہیں دے سکتا۔

۲۔ بقول مرزا صاحب قرآن کامل ہے، اپنے اندر "نبی گری" کی قوت رکھتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ قوت اچانک تیرہ سو سال بعد پیدا نہیں ہو گئی شروع سے اس کے ساتھ رہی ہو گی۔ اور مرزا صاحب سے قبل بھی کئی نبی و رسول کامل قرآن نے بنائے ہوں گے۔ کیا ان کو مانے بغیر ان زمانوں کے مسلمان کافر ہو جاتے تھے؟ اگر نہیں تو اب مرزا صاحب کو مانے بغیر کیوں کافر ہو گئے؟ جب مرزا صاحب کسی سابق امتی نبی کو مانے بغیر قرآن مجید کے اسی مفہوم کو سمجھ کر، جسے امت صدیوں سے اتنی چلی آ رہی ہے، نبی کے درجے تک پہنچ گئے، تو اب قرآن مجید کی قدر گھٹانے کے لیے یہ کیوں کہا جا رہا ہے کہ قرآن مجید مرزا صاحب کے بغیر بے کار اور بے روح ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآن، محمدؐ اور اس کا نازل کرنے والا خدا تعالیٰ اور ان کے فرمودہ تمام احکام و اعمال کی تعمیل بے نتیجہ ہے۔ ان میں سے کوئی "اصل" نہیں "اصل" صرف مرزا صاحب ہیں۔

مرزا صاحب کے بغیر سب کچھ بے کار

مسلمانوں نے قرآن کے ہوتے ہوئے تورات و انجیل وغیرہ صحف ربانی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی، حالانکہ ان پر ایمان لانا فرض اور منصوص قرآنی ہے، لیکن قادیانی حضرات قرآن عزیز کو کامل مانتے ہوئے مرزا صاحب کے بغیر محض ناقص قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ قرآن مجید تو رہا ایک طرف احادیث میں بھی کہیں مرزا صاحب کا ذکر نہیں۔ تاویل کی پٹاری جو چاہیں نکال لیں۔

رسولوں پر بالتبع ایمان

۳۔ ہم رسولوں کو اس لیے نہیں مانتے کہ ان کے بغیر اللہ پر ایمان لایعنی ہے یا ان پر ایمان اور اللہ پر ایمان یکساں چیز ہے

ایسا ایمان یقیناً کفر و شرک ہے۔ ہم رسولوں کو بالتبع مانتے ہیں نہ کہ بالاستقلال۔

خدائے تعالیٰ پر ایمان لانا لازم ہے۔ اسی سے دل روشن اور مطمئن ہوتے ہیں، وہی واحد حکم ہے، اسی کی رضا مندی مطلوب ہے۔ اس کی رضا کے حصول کے طریقے قرآن کی محفوظ وحی میں مفصل آگئے ہیں۔ ہم اسے اس وجہ سے مانتے ہیں کہ وہ اللہ احکم الحاکمین کا سچا حکم نامہ ہے اس لیے نہیں کہ محمد رسول اللہ اُسے پیش کرتے ہیں، بلکہ اس کی سچائی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ انہیں بھی سچا رسول مانیں اور ان سب کو بھی جو اس میں مذکور ہیں اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ دینی صداقتوں کو آشکارا کرتا رہا ہے۔

مرزا صاحب اس قسم کے بالتبع ایمان کا بھی ہم سے مطالبہ نہیں کر سکتے، کیوں کہ وہ محض امتی رسول ہیں اور امتی رسول رہتی دنیا تک بے شمار ہو سکتے ہیں۔ لوگ کس کس کو تلاش کرتے پھریں؛ جب قرآن مجید کو کامل سمجھتے ہیں اور اس کے لیے کوئی تکملہ پیش کرنے کے بھی مدعی نہیں تو کیا محض کافر سازی اور تفرقہ پردازی کے لیے ایسے لوگوں کی تشریف آوری ضروری ہے!

امتی نبی ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی کا صالح، شہید اور صدیق ہونا۔ پھر کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ایسے لوگوں کے درجات اور مراتب کا تجسس کرتے پھریں کہ فلاں شخص کس پانی میں ہے۔ پھر اس کے حسن و قبح کو بیان کر کے لوگوں کو اس طرف مائل یا متنفر کریں۔ ہمیں ذاتیات کو نظر انداز کر کے حق جہاں ملے لے لینا چاہیئے۔ لوگوں کی نیکی بدی سپرد خدا کرنی چاہیئے۔ کامل کتاب نے ہمیں ایسے جھمیلوں میں پڑنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

اختلافات سے دلیل

۳۔ دنیائے انسانیت رنگا رنگ اختلافات کا ایک ہنگامہ زار ہے۔ مثلاً مرد، عورت بچہ، جوان، بوڑھا، مجرد، شادی شدہ۔ مریض، صحت مند، قوی۔ کمزور، فہیم، غبی۔ مہذب، وحشی، امیر، غریب، غلام، آزاد، مضطرب، مطمئن وغیرہ۔

پہاڑی، میدانی، بری اور بحری باشندے۔ گرم ممالک، سرد علاقوں، غاروں، محلوں اور قلعوں میں رہنے والے، خوراک، لباس، مزدوری، تجارت اور دیگر پیشوں کے لحاظ سے بھی بے شمار اختلافات ہیں۔

حکومت بھی کہیں جمہوری ہے ۔۔۔۔ کہیں پاپائی اور کہیں مطلق العنان آمریت۔

جنگ کے طریقے مختلف اقوام میں مختلف چلے آتے ہیں۔ علاج معالجہ کے لیے بھی اصول و قواعد الگ الگ ہیں۔

خیالات و اعتقادات، اوضاع و اطوار، رسم و رواج اور آئین و قوانین کے اختلافات کی بھی کوئی حد نہیں۔

یہ تمام اختلافات نزول قرآن مجید کے وقت موجود تھے۔ ان کے باوجود خدائے حکیم و علیم کی طرف سے ایک ہی قرآن تمام

لہ مرزا صاحب خود کہتے ہیں کہ قرآن اپنے مطیع کو نبی بنانے کی قوت رکھتا ہے۔ جیسے کہ وہ خود کامل اطاعت نبی بن گئے۔ اور اپنے آپ ہی کو قرآن کے نبی گری کے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

نوعِ انسان کے لیے کافی سمجھا گیا اور کھلے لفظوں میں فرمایا گیا کہ محمد جمیع انسانوں اور تمام عالمین کے لیے نذیر ہے اور ہر جس شخص کو جب بھی یہ قرآن پہنچے، اس کے لیے یہی ڈرانے والا ہوگا۔

اب مزید اختلافات کون سے پیدا ہوں گے، جن کے حل کے لیے نئی کتاب اور نئے نبی کی ضرورت ہے جو قرآن کو منسوخ یا ناکافی کہنے کی جرأت کرے؟

پس قرآن مجید ہی خاتم الکتب اور حضرت محمدؐ ہی خاتم النبیین ہیں۔

ساری دنیا کے لیے ایک نبی

جب کہ دنیا قربِ مسافت اور ایجادو وسائل کی وجہ سے ایک گھر کی مانند بن رہی ہے، تو اگر اس وقت جزوی اختلافات کے لیے نئی نئی کتابوں کے نازل ہونے کی ضرورت ہے، لازم تھا تو رسول کریمؐ کے عہد میں بھی ہر ملک بلکہ ہر قریہ میں الگ الگ رسول آتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

کفار کا خیال تھا کہ یہ نبی تنہا ساری دنیا کے لیے کس طرح پیغام بر ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں فرمایا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيرًا ۝ فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۝ (فرقان ۵۱ و ۵۲)

اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا مبعوث کر دیتے پس تو کافروں کا کہنا نہ مان اور اس قرآن کے ذریعے ان کے ساتھ بڑی کوشش جاری رکھ (قرآن اب بھی موجود ہے اور یہی حکم آپ کے جانشینوں پہ عائد ہوتا ہے)

دین کو تدریجاً تکمیل کی طرف لانے کے لیے جو رسول دینی آتے رہے، وہ سب بیشک نعمت الٰہی تھے۔ جب کامل ہو چکا اور نعمت پوری ہو گئی تو اب جو مدعی کامل ..... نعمت کو ناقص سمجھے احتیاطاً یہ دعویٰ کرے کہ دین تو کامل ہے، لیکن اب مجھ پر ایمان لانا بھی دین میں داخل ہو گیا ہے۔ مجھ سے قبل تنہا قرآن باعث نجات تھا اور لوگ مجھے مانے بغیر مومن و مسلم ہو سکتے تھے، لیکن اب مجھے مانے بغیر قرآن کسی کو بھی مسلم نہیں بنا سکتا ۔۔۔ ایسے مدعی یقیناً کامل نعمت کی ناقدری کرتے ہیں اور ناقدری نعمت تعلیم دینے والے ہرگز نعمت نہیں دے سکتے۔

جو کتاب تمام دنیا کو اتحاد کی تعلیم دیتی ہو۔ جو شخص اس کو بے اثر اور معطل ٹھہرائے، وہ اتحاد عالم کا دشمن ہے۔ بدلتی رہنے والی کتابیں آج ایک صراط کو مستقیم کہیں گی اور کل دوسرے کو۔ وہ انسانیت کو ایک متفقہ صراط مستقیم پہ قائم نہیں کر سکتیں۔

حاصل یہ ہے کہ ایک بے بدل کتاب کا دنیا میں ہونا ضروری ہے اور اسی کا لانے والا خاتم النبیین ہے۔

فقط اسلام ہی دین ہے

۵۔ ارشاد باری ہے اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران - ۱۹) اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اس پہ مزید یہ

ؔ صدیوں سے معجون فلاسفہ اپنے شفا بخش خواص سے مریضوں کو نفع دیتی رہی ہے۔ لیکن اب فلاں حکیم صاحب پہ ایمان لائے بغیر وہی معجون اپنے تمام مجربہ اجزاء کے باوجود کسی ایک شخص کو بھی نفع نہیں پہنچا سکتی۔ اس قسم کا دعویٰ کہاں تک معقولیت پر مبنی ہو سکتا ہے؟ مرتب عفی عنہ

فرمایا کہ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران ۸۶) اسلام کے سوا کوئی بھی دین قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کو کبھی کوئی دین پسند آئے اور کبھی کوئی دوسری قسم کا دین۔ — چار ہزار سال پیچھے مڑ کر دیکھئے اُس وقت بھی ابراہیمؑ اسلام ہی کو پیش کر رہے تھے۔ اس دور کی استعداد کے مطابق اجمال تھا بعد میں درجہ بدرجہ تفصیل ہوتی گئی۔ لیکن ساتھ ہی انسانی فرقہ بندی نے اس پر مذہبیت یعنی یہودیت و نصرانیت کے رنگ چڑھائے۔ قرآن نے اس کو پھر سے ملاوٹوں سے پاک کر کے پوری تفصیل و تکمیل کے ساتھ پیش کر دیا۔ یہ تصدیق ہے تنسیخ نہیں۔ دعائے ابراہیمؑ ملاحظہ فرمائیے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ ... رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا (بقرہ ۱۲۸)

اے ہمارے رب ہم دونوں (ابراہیم و اسماعیل) کو اپنے مسلم (فرماں بردار) بنا اور ہماری اولاد سے ایک امت مسلمہ ..... اے ہمارے رب! ان میں ایک رسول (معلم اسلام) مبعوث فرما۔

صرف ایک آخری رسول کی دعا کی ہے نہ کہ رسولوں کے سلسلے کی، اور اس امت کا نام مسلم ہی رکھا۔ اللہ نے بھی یہی نام پسند فرمایا۔ ایسی تصریحات کے باوجود جو لوگ احمدی، بابی اور بہائی وغیرہ بنتے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہو سکتے ہیں۔ کیا آج تک کسی بھی نبی نے اپنے نام کی طرف اپنی جماعت کو منسوب کیا ہے؟

نزول قرآن کے وقت مختلف مدعی الہام کتابیں موجود تھیں۔ مختلف فرقے بھی تھے۔ لیکن کسی کتاب نے یہ نہیں کہا کہ دین ایک ہے اور وہ صرف اسلام ہے جو سب کا مشترکہ دین ہے۔ قرآن کریم ہی نے مناسب وقت پر یہ فریضہ انجام دیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دین تو اسلام ہی ہے لیکن کوئی مشخص و معین چیز نہیں۔ خدا تعالیٰ کسی وقت کوئی نیا حکم دے وہی اسلام ہے۔ تورات کے وقت یہودیت اسلام تھی انجیل کے وقت نصرانیت اسلام تھی۔ اگر یہ بات درست ہے تو اللہ تعالیٰ یہودیت و نصرانیت والے اسلام سے روک کر پرانے ابراہیمی اسلام کی طرف کیوں دعوت دیتا ہے — وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (بقرہ ۱۳۶) یہودی (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ یہودی بن جاؤ اور عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی بن جاؤ — تو راہ راست پا جاؤ گے تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ (نہیں) بلکہ ہم ابراہیمؑ کے طریقے پر ہیں۔ جو ایک ہی طرف کا تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ یہودی و نصرانی طریقے پر نہیں تھے۔ وہ خالص اسلام کے پیرو تھے۔ اسلام بے بدل ہے۔ اور بے بدل رہے گا۔

وحی و صحیفہ فطرت

۲ — وحی الٰہی، صحیفہ فطرت کی باریکیوں کی تہ تک پہنچنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ نئے نئے علوم حاصل کرنے کے لیے صحیفہ فطرت

لہ۔ اور اب احمدیت اور بہائیت وغیرہ اسلام ہیں۔ معاذ اللہ

تحقیقات کی بے غلط اور بے بدل بنیاد ہے۔ اسی طرح وحی الٰہی بھی "خدائی چیز" ہونے کی وجہ سے آئندہ تحقیقات کی بے غلط اور بے بدل بنیاد ہے۔ علوم کی دو قسمیں ہیں:

(الف) اولیات و بدیہیات جو تمام عاقل و بالغ انسانوں کے مشترک و مسلمہ علوم ہیں۔ جنہیں نظرتاً ہم ماننے کے لیے مجبور و مجبول ہیں۔ یہ علوم متعارفہ ہیں جو شروع ہی میں کام دیتے ہیں۔

(ب) علوم متعارفہ یا بنیادی علوم کی ترکیب سے نئے نئے نتائج نکلتے رہتے ہیں۔ ترکیب میں پیچیدگیاں بڑھتی جاتی ہیں اور غلطی کے امکانات بھی زیادہ ہوتے رہتے ہیں ـــ ان نتائج کو نظریات کہتے ہیں۔ یہ علوم کی دوسری قسم ہے۔ تمام اختلافات انہی میں ہیں۔

یہی نظریات کامل غور کے بعد جب یقینی بن جاتے ہیں، تو حقائق قرار پاتے ہیں۔ اور آئندہ علوم کے لیے علوم متعارفہ کا کام دیتے ہیں۔

بحث کو فریقین کے مسلمہ علوم متعارفہ اور حقائق سے شروع کرنا چاہیے۔ مسلمات کے بغیر کوئی بحث نہیں اٹھائی جا سکتی۔
نظریات کی غلطیاں صحیفہ فطرت ہی سے نکالی جا سکتی ہیں، کیوں کہ تحقیقات کی بنیاد وہی ہے۔
اولیات و بدیہیات، صحیفہ فطرت کی آواز ہیں۔ اسی کے بتانے سے ہم ان کو جانتے اور بنیادِ تحقیقات مانتے ہیں۔
بالکل اسی طرح صحیفہ وحی جو صحیفہ فطرت کا مددگار ہے، بے غلط اور بے بدل بنیادِ تحقیقات ہے۔ وہ خود ہی ہمیں اپنی بدیہیات (المحکمات[1]) سے روشناس کراتا ہے۔ اور ہماری تحقیقات کی بنیاد قرار پاتا ہے۔ تاکہ ہم اپنے نظریات، معلومات اور مسلمات کو اس کی کسوٹی پر کس کر غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح تسلیم کریں۔ اگر ہم اس کو اپنے نظریات و مسلمات کے تحت لانے کی کوشش کریں گے تو ہرگز صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکیں گے۔
انسانی نظریات و مسلمات مختلف ہوتے ہیں۔ وحی کے فیصلے محکم اور اٹل ہیں۔ مختلف کو محکم پر حاکم بنانا خسران مبین ہے۔
وحی الٰہی حکماء و عوام دونوں کی رہنمائی کرتی ہے، لیکن ان دونوں فریقوں کے نظریات کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔

صحیفہ فطرت کی بے مثلیت

صحیفہ فطرت جو کتاب مکنون، ام الکتاب اور لوح محفوظ ہے اس وجہ سے "محفوظ بنیاد" ہے کہ اس کا مقابلہ کوئی انسان نہیں کر سکتا، اور کوئی اس کی مثل تخلیق کرنے پر قادر نہیں ہے۔ یہ تعلیم ہم کو خود اسی سے ملی ہے۔ ہم کوئی علم و ہنر باہر سے نہیں لائے (یعنی یہی کائنات منبع علوم ہے اور اسی کو سمجھنے کے لیے علوم مرتب ہوئے)

وحی کی بے مثلیت

بالکل اسی طرح ضروری ہے کہ وحی الٰہی بھی خود ہی بتائے کہ وہ "بے مثل" ہے۔ خود اس کے

---

[1] اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ (آل عمران ـ ۷)

اہل زبان۔ بڑے مدعیان فصاحت و بلاغت اس کے مقابلے کی کوشش میں ناکام ہو کر اس کے حضور سربسجود ہوگئے۔ اور پکار اٹھے ـــ "ماھذا قول البشر" (یہ انسانی کلام نہیں ہے)

لغات، صرف و نحو اور معانی و بیان کے اماموں نے اس کو اپنا امام تسلیم کیا۔ عربی لغت اور گرامر کے غیر مسلم مصنفین بھی اسی کو سند میں پیش کرتے ہیں۔ پھر اس کے بے مثل ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟

خدائی تصرف کے تحت نازل شدہ وحی کا ہر حیثیت سے بے مثل ہونا لازم ہے۔ ایسی بے مثلیت کا دعویٰ قرآن حکیم کے سوا آج تک کسی صحیفۂ وحی نے نہیں کیا۔ جس دلیل سے صحیفہ فطرت بے مثل ہے۔ ٹھیک اسی دلیل سے صحیفۂ وحی بے مثل ثابت ہوتا ہے (یعنی وہ خدا کا کام ہے اور یہ خدا کا کلام) جس کتاب اور کتاب کو پیش کرنے والے نے یہ دلیل پیش نہیں کی سا اس کو اس کی بے مثلیت کی خبر ہی نہیں۔ قرآن فرماتا ہے۔

بقائے انفع

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ (رعد۔ ۱۷) جو چیز لوگوں کو نفع دیتی ہے وہی زمین میں قائم رہتی ہے قرآن حکیم نے اپنے اصل متن کی صورت میں قائم و دائم اور کامیاب ہو کر ثابت کر دیا کہ اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے ـــ اس مفہوم کی کوئی آیت دنیا کی کسی الہامی کتاب میں ہو تو اس کے ماننے والے پیش کریں۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ط اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط (مائدہ: ۳) آج کافر تمہارے دین (کو مٹانے) سے مایوس ہوگئے، پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھی سے ڈرتے رہو۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا۔

حاصل یہ کہ صحیفۂ فطرت اور صحیفۂ وحی (قرآن مجید) دونوں خدا کی تخلیق و تصنیف ہونے کی حیثیت سے بے غلط اور بے بدل اور بے مثل ہیں۔ جیسے کوئی انسانی قوت ارض و سما اور کوہ و بحر و بر کی تخلیق نہیں کر سکتی، اسی طرح قرآنی سورتوں کی مثل بھی کوئی نہیں بنا سکتا۔

قرآن میں اغلاط؟

بعض معاند[1] کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں غلطیاں ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض کم فہموں کو صحیفۂ فطرت میں بھی غلطیاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ

کہتے ہیں کہ دنیا میں نصف سے زیادہ بچے قبل بلوغ مر جاتے ہیں۔ یہ غلط کام ہے۔

پیشگی اطلاع دیئے بغیر لوگوں کو مرنے پر مجبور کر دینا ـــ غلطی ہے۔

سانپوں، بچھوؤں، چوہوں کو پیدا کرنا ـــ خطاکاری ہے۔

---

[1] متعصب پادری اور آریہ سماجی وغیرہ

بجلیاں گرانا، زلزلوں سے تباہی مچانا ـــــ بالکل بے جا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

کیا ایسے طفلانہ اعتراضات سے صحیفۂ فطرت کے بے غلط ہونے کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر واقعی صحیفہ فطرت اغلاط سے پُر ہوتا۔ تو اس کا عظیم و مستحکم نظام درہم برہم ہونے سے کیسے بچ سکتا تھا! اس کا دوام و قیام استحکام ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ...... اس میں جو کچھ (تعمیر و تخریب کا ظہور) ہو رہا ہے، ایک اٹل نظام کے مطابق ہوتا آیا ہے ـــــ ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ :

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (ملک - ۳ و ۴)

تم رحمان کی پیدائش میں کوئی اختلاف نہیں دیکھو گے۔ پھر غور سے دیکھو۔ کیا تم (اس میں) کوئی نقص، غلطی یا بگاڑ دیکھتے ہو۔ (بے شک) بار بار نگاہِ تجسس کو گھما کر دیکھو، تمہاری نگاہ حیرت سے تھک کر لوٹ آئے گی۔

قرآن مجید پوری حفاظت اور پہروں کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ اس کا اندازِ بیان پوری صراحت سے پکار رہا ہے کہ وہ خدا کی آواز ہے اس کا متکلم خدا کے سوا کوئی نہیں۔ اگر سورہ فاتحہ کی طرح کوئی بات بندوں کے منہ سے کہلوائی ہے تو اس کی تصریح خود ہی کر دی ہے کہ اس کے اصل متکلم بھی ہم تعالیٰ ہی ہیں ـــــ ہم تین[1] مختلف طریقوں سے وحی کرتے ہیں۔ انہی سے نزول قرآن میں

---

[1] وحی کی تین قسمیں ذیل کی دو آیتوں سے ثابت ہوتی ہیں:

آیت اول :- وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ (شوریٰ - ۵۱) کسی بشر کو میسر نہیں ہے کہ خدا اس سے کلام کرے۔

۱۔ مگر وحیاً یعنی مناسب جبرک کے ذریعے بشری روح ہی سے وہ بات کہلوائے ـــــ یا

۲۔ "من ورائی حجاب" یعنی اس طرح کہ اسے محسوس ہو خود اللہ تعالیٰ پس پردہ مجھے خطاب فرماتا ہے۔

۳۔ یا کوئی ایلچی یعنی فرشتہ بھیجے پھر وہ خدا کے اذن و مشیت کے مطابق وحی کرے اس تعالیٰ کی عظمت و حکمت اس بات کی مقتضی ہے کہ انہی تین طریقوں سے کلام کرے۔ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (۲ - ۵۲) اور اسی طرح ہم نے تیری طرف ایک روح (قرآن مجید) کی وحی کی ہے۔ تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب (ربانی) کیا ہے اور ایمان کیا ہے! ـــــ ان تینوں قسموں کے نمونے دیکھئے۔

۱۔ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (انعام - ۱۰۴) اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا (انعام - ۱۱۴) وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (شوریٰ) فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (ذاریات - ۵۰) ایسی آیات میں بشر رسول کو متکلم بنایا گیا ہے

۲۔ قرآن حکیم کا بہت زیادہ حصہ "من وراء حجاب" کے طور پر نازل ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کلام کیا گیا ہے" دوسری مدعی الہام کتب میں کلام خدا و کلام بشر مخلوط ہو گیا ہے۔ قرآن اس سے قطعاً محفوظ ہے ــــ کامل اور آخری وحی کا فرض ہے کہ وہ خود واضح الفاظ میں اعلان کرے کہ وہ تمام انسانوں کے لیے اور تمام اقوام عالم کے لیے اور جو لوگ ابھی پیدا نہیں ہوئے اور آئندہ زمانوں میں پیدا ہوتے رہیں گے ان کے لیے بھی اور ہر اس شخص کے لیے جس کو بھی وہ (وحی) پہنچے تنہا بشیر و نذیر ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ خاتم الکتب ہے اور اس کا پیش کرنے والا

دعاوی قرآن

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) اپنے بندے سے خود کلام کر رہا ہے۔ اس کی مثالوں کی ضرورت نہیں۔ الٰہی وحی جناب موسیٰؑ پر دوسرے پیغمبروں سے زیادہ نازل ہوئی۔ لیکن جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو بہت ہی زیادہ ایسا شرف مکالمہ حاصل ہوا۔

۳۔ فرشتہ کے تکلم کی مثال یہ ہے۔ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّکَ ج (مریم ۶۴) وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (صافات ۱۶۴) وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (اسرائیل ۔ ۲۳) اور اس قسم کی آیات کثیرہ۔

قرآن حکیم ان تینوں قسموں میں نازل ہوا ہے۔ اگلی آیت میں "کذالک" کا اشارہ یہی کہہ رہا ہے۔

آیت دوم: اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ ..... الخ۔ ہم نے تیری طرف وحی کی جس طرح کی وحی کی نوح اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف ..... الخ

۲۔ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (النساء ۔ ۱۶۳) اور (جس طرح) داؤد کو زبور دی ..... الخ

۳۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (اور (جس طرح) موسیٰ کے ساتھ کلام کیا جو کلام کرنے کا حق ہے (النساء ۱۶۴)

اس آیت میں بھی تین ہی طریقے بیان فرمائے ہیں۔

۱۔ "اَوْحَيْنَآ" یعنی فرشتہ کو بھیج کر وحی پہنچانا۔

۲۔ "اٰتَيْنَا" جس کو پہلی آیت میں "وَحْيًا" فرمایا ہے۔ یعنی مخاطب وحی بشر کی روح سے بات کہلوانا حضرت داؤد کو زبور اسی طرح ملی تھی۔ وہ پوری زبور میں "ایاک نعبد وایاک نستعین" کی طرح خود ہی بولتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

۳۔ "كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى" پہلی آیت کے "مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ" کا ترجمان ہے ــــ کلام تو تمام رسولوں سے ہوتا رہا ہے، لیکن تمام رسولوں میں "من وراء حجاب" کا زیادہ شرف موسیٰؑ کو ملا تھا۔ اس فضیلت درجات اور خصوصیت کا اظہار آیات ذیل سے ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ..... دَرَجٰتٍ ..... (البقرہ ۲۵۳)

یہ جو رسول ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجے بلند کئے۔

۲۔ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (اعراف ۔ ۱۴۴) اے موسیٰ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خاتم النبیین ہے — یہ تمام دعاوی قرآن پاک ہی موجود ہیں اور اس کے سوا کسی دوسری کتاب میں ان میں سے ایک دعویٰ بھی نہیں ملتا۔ قرآن اپنے متعلق ۱۴۰۰ برس سے بآواز بلند پکارتا چلا آرہا ہے کہ وہ لاریب ہے۔ بے غلط ہے، بے بدل ہے، صدق و عدل میں مکمل ہے۔ سب پر حکم ہے اور حق الیقین ہے یہی باتیں ہیں جو اس کو تمام مدعی وحی سے ممتاز اور "لاشریک لہٗ" ماننے پر مجبور کرتی ہیں۔ سنیئے۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ (یونس ۳۲) — پس حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ (الاعراف ۳) — قرآن جو تمہارے رب کی طرف سے تم کو ملا ہے۔ اس کی پیروی کرو۔ اس کے سوا دوسرے اولیا کی پیروی نہ کرنا — تعجب کے لہجے میں دریافت کرتا ہے۔

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ — اس کے بعد کون سی حدیث ہے جس کو مانیں گے؟ (استفہام انکاری ہے۔ یعنی کوئی حدیث نہیں)

پیروی کی دو قسمیں

اول — وحی محفوظ کی پیروی پورے ایمان و اطمینان قلب کے ساتھ — جو اٹل ہے۔

دوم۔ عقلی و انتظامی پیروی۔ جو حالات کے تقاضے سے بدلتی رہتی ہے اور ارتقا کے لیے اس کا بدلتے رہنا ضروری ہے۔ اس کی پیروی بھی قرآن مجید ہی سکھاتا ہے۔ جیسے والدین کے ساتھ احسان کا حکم ہے۔ وغیرہ ذالک

حفاظت قرآن

اب ذرا حفاظت قرآن کی اعجازی شان کے متعلق غور کریجئے۔

۱۔ ہر دور میں قرآن مجید کے لاکھوں حافظ موجود چلے آرہے ہیں۔
۲۔ قرآن مجید کی زبان زندہ جاوید بن گئی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں رضا) نے تعجب کرا چلے پیغاموں اور کلام کے ساتھ لوگوں سے ممتاز کیا۔ سوائے جو میں نے تجھے دیا اور شاکر رہ —

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ "من وراء حجاب" کا طریقہ کلام امتیاز و فضیلت رکھتا ہے۔

یہ تینوں اقسام کی وحی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آتی ہے اور واسطہ جبریل یا روح القدس یا روح الامین ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ جبریل ایک ہی قسم کی وحی لانے والے ہیں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قلب رسولؐ پہ جبریل کے واسطے کے بغیر قرآن اتارا ہی نہیں گیا نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ (بقرہ ۹۷) جس طرح قرآن مجید کو رمضان میں یا لیلۃ القدر میں اتارنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دوسرے دنوں میں نہیں اترا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن مجید ان تینوں طریقوں ہی سے اتارا گیا۔ ان میں سے کسی طریقے کی وحی قرآن سے باہر غیر محفوظ نہیں چھوڑی گئی اور یہ بھی آیت سے ظاہر ہے کہ ان تین طریقوں کے سوا اللہ تعالیٰ کا کسی بشر کے ساتھ کلام کرنے کا کوئی چوتھا اور پانچواں طریقہ ہے ہی نہیں۔

۳- خود اس کے اندر زبان کو زندہ رکھنے کی قوت موجود ہے۔
۴- اس کی اشاعت تمام مدعی الہام کتابوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔
۵- اس کی تلاوت جس کثرت سے ہو رہی ہے، کسی اور کتاب کو نصیب نہیں۔
۶- بلکہ اس کے مخالف بھی اپنے اعتراضات کے ذریعے اس کی اشاعت میں مدد دے رہے ہیں۔

دو قسم مدعی الہام مدعی الہام کتابیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن کی اشاعت ہو رہی ہے وہ کسی لحاظ سے بھی قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ فصاحت بلاغت، اصل متن کی موجودگی۔ نوع انسان کی تمام بنیادی ضروریات کے لیے اصولی رہنمائی وغیرہ وغیرہ۔

دوسری قسم ان کتابوں کی ہے، جن کی اشاعت سے، ان کے روز اول ہی سے گریز کیا جا رہا ہے۔ وہ صرف قرآن پر اعتراض کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ اپنے اوپر اعتراض سے بچنے کے لیے یہی پناہ ڈھونڈتے ہیں کہ اپنی کتابوں کو پیش ہی نہ کیا جائے۔

اس کشمکش میں "بقائے اصلح"، کے اصول کے مطابق قرآن حکیم کو مدد پہنچ رہی ہے وہ خود بھی اس اصول کو اس سے بہتر لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ (رعد۔ ۱۷) جو چیز لوگوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہو وہ زمین میں قائم ہو جاتی ہے   مزید سنیئے۔

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (توبہ۔ ۳۳) تاکہ اس (دین) کو تمام ادیان پر غالب رکھے۔

اللہ کی ذمہ داری دنیا میں بہت سی الہامی کتابیں موجود ہیں، جو آپس میں شدید قسم کے اختلافات رکھتی ہیں۔ بعض اختلافات میں تطبیق ممکن ہے اور بعض میں قطعی ناممکن۔ بیک وقت متدین کو کس طرح صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ اس کا فیصلہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام اللہ تعالیٰ ہی کے ذمے ہونا چاہیے کہ اس کے نام پر کہی گئی باتوں میں سے کس کو اپنائیں، کس کو چھوڑیں؟ چنانچہ یہ عظیم ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی صورت میں پوری کی۔ اس نے کھلے لفظوں میں اپنے حکم ہونے کا دعویٰ کیا۔ فرقہ بندی کو شرک کہا۔ تمام کتابوں کی روح کی تصدیق کی، تمام امتوں کو ایک امت ظاہر کیا اور ایک ہی ان سب کا رب منوایا۔ اسی کے خوف و تقویٰ اور عبادت کی دعوت دی یہ تمام مباحث قرآن میں مفصلاً موجود ہیں۔ اس کے بعد لاکھوں رسول آئیں، لاکھوں کتابیں لائیں، ان کو بجبرلہ الہام کہنے کی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن وہ انسانی تمنا کے دخل سے محفوظ نہیں ہوں گی ــ حکومت ہمیشہ قرآن ہی کی رہے گی، جو بے بدل اور حق الیقین ہے۔

لہ عاجز مرتب گزشتہ ۴۰-۵۰ برس سے اپنے بہائی احباب سے تقاضا کر رہا ہے کہ جناب محمد علی باب کی کتاب "البیان"، اور جناب بہاء اللہ کی کتاب اقدس، کا تعارف تو کرائیں۔ ہمیشہ ٹال مٹول ہی ہوتا رہا ہے۔ آخری مرتبہ ۳۰ / اگست، ۱۹۷۰ کو شام کے وقت بہائی سنٹر کراچی حاضر ہوا بہائی صاحبان بہت اخلاق سے ملے۔ دو کتابیں بھی ہدیۃً، عنایت فرمائیں لیکن "البیان" اور "اقدس"، کے متعلق معذوری ظاہر کی۔

محمد صحف اولیٰ میں

انجیل کے مطابق تکمیل راستی کا معلم فارقلیط یعنی احمد ہی ہے۔ "استثناء" اور "اعمال" کی پیش گوئیوں کے موافق وہی تمام نبیوں کا موعود "النبی الامّی" ہے۔ جو "وہ نبی" کے نام سے قوموں میں مشہور چلا آتا ہے۔ حضرت خلیل اور اسماعیل علیہما السلام نے اسی رسول کے متعلق ـــــ جو دوبارہ دنیا میں اسلام کو لانے والا ہے ـــــ دعا کی تھی کہ وہ بذریعہ اسماعیلؑ ابراہیمؑ کی اولاد سے ہو۔

بہائیت پر تبصرہ

جناب بہاؤاللہ صاحب نے تکمیل نبوت اور اتمام دین کا کہیں دعویٰ نہیں کیا۔ ان کے خیال میں مظاہر اللہ[1] آتے رہیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ان کی کتاب مظہریت یا نبوت دیر سویر منسوخ و معطل ہونے والی ہے ایسی صورت میں وہ دوسری مدعی الہام کتابوں پر حَکَم بننے کی قابلیت نہیں رکھ سکتی۔

بہائی صاحبان کہتے ہیں کہ تمام الٰہی کتابیں رفع اختلافات اور تحکیم کے لیے آئی ہیں۔ لیکن انہیں انصاف سے سوچنا چاہیئے کہ کیا ان سب کے اپنے اندرونی اختلافات کو رفع کرنے کے لیے ایک کامل اور بے بدل حَکَم کی ضرورت نہیں؟ کیوں نہیں! یقیناً ہے اور اس حقیقی ضرورت کو قرآن حکیم نے پورا کیا ہے اس کی شہادت کمال وضاحت سے اس کے اندر موجود ہے۔ اس نے ہر اختلافی مسئلے پر معقول، مفصل اور مدلل بحث کی ہے اور اپنا بے بدل حَکَم ہونا ثابت کر دیا ہے ـــــ اگر بہائی حضرات یا کوئی اور مذہب والا ایسا دعویٰ کرے جو اس کی مسلمہ کتاب میں موجود نہیں تو مدعی سست، گواہ چست کا مصداق ہوگا۔

بہائی حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ "تمام الہامی کتابیں اپنے اپنے وقت میں کامل ہوتی ہیں" قرآن اپنے آپ کو دائمی اور کُلّی کامل کہتا ہے۔ دائمی اور کُلّی کامل کے ہوتے ہوئے وقتی اور جزئی کاملوں کی ضرورت باقی رہے گی؟ وقتی و ابدی کاملوں کو یکساں قرار دینا قرینِ انصاف نہیں ہو سکتا۔

بہائی صاحبان فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تمام نبیوں[2] سے جناب بہاؤاللہ پر ایمان لانے اور ان کی امداد کا وعدہ لیا تھا ان سے التماس ہے کہ جناب بہاؤاللہ میں کون سی ایسی خصوصیت ہے، جس کے سبب ہم انہیں اس وعدے کا مصداق سمجھیں کیا وہ خاتم النبیین ہیں؟ کیا وہ ابدی اور بے بدل کتاب لائے ہیں؟ آپ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے بعد ان سے بھی بلند مرتبہ رسول

---

[1] یہ ان کی اصطلاح ہے انبیاء کے لیے۔ مشہور بہائی مبلغ جناب محفوظ الحق علمی اپنی کتاب "قیامت" میں لکھتے ہیں۔ "امتوں کا پیغمبروں کے ذریعے اٹھنا ہی قیامت کا مقصود اصلی ہے ایسا ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا چنانچہ حضرت مسیح کی آمد قیامت تھی، حضرت باب کی تشریف آوری قیامت تھی، حضرت بہاؤاللہ کی جلوہ گری قیامت کبریٰ ہے اور آئندہ بھی قیامتیں ہوتی رہیں گی اور پہلے بھی بے شمار قیامتیں ہوتی رہی ہیں یہ سلسلہ دائمی ہے"۔ ـــــ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تکمیل دین و خاتمیت انبیاء کے قائل نہیں (مرتب عفی عنہ)

[2] "ابتداء سے جس قدر نبی ہوئے خدا نے سب کی زبانی ان دنوں کی خبر دی تھی۔ تمام اہل مذاہب اسی دور جدید (یعنی دور بہاؤاللہ) کے منتظر تھے" (ص ۲۷۷، ۲۸۱۔ ایضاً)

آنے والے ہیں۔ جو ان سے کامل تر شریعتیں لائیں گے۔ پھر ان میں بلحاظ رسالت کون سی زائد خصوصیت پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے انہیں "موعودِ کل"[1] مان لیا جائے! موعودِ کل دراصل خاتم النبیین ہو سکتے ہیں جس پر بشارتیں صادق آتی ہیں[2]۔

اس کے علاوہ ایسے تاکیدی عہد خداوندی کا کوئی ثمرہ بھی نظر نہیں آتا۔ جناب بہاء اللہ کسی نبی کی زندگی میں نہیں آئے۔ کسی نبی نے ان کی مدد نہیں کی۔ بلکہ جناب باب نے بھی انہیں کوئی مدد نہ دی یہاں تک کہ بابیوں کا الگ فرقہ بہائیوں کے خلاف موجود چلا آ رہا ہے۔

بہائی احباب جن آیات کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، ان کا صاف ترجمہ و تفسیر حسب ذیل ہے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران - ۷۹ و ۸۰) کسی بشر کے لیے لائق نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت دے۔ پھر وہ لوگوں سے کہے کہ "اللہ کے سوا میرے غلام بن جاؤ" ـــ لیکن (وہ یہ کہے گا کہ) رب والے بن جاؤ۔ اس لیے کہ تم (خود لوگوں کو) کتاب کی تعلیم دیتے چلے آرہے ہو۔ اور نہ ہی یہ لائق ہے کہ وہ تمہیں حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بنالو (اگر بات یہ ہے تو) کیا وہ تم کو تمہارے مسلم ہو چکنے کے بعد کفر کا حکم دے رہا ہے؟

اس کے بعد فرمایا کہ اولو العزم انبیاء کو بھی یہی تاکید رہی ہے کہ اگر ان کے وقت میں کوئی رسول آجائے تو وہ بشرح صدر اس سے تعاون کریں۔ اپنی "اولوالعزمیت" کے زعم میں ہرگز علیحدگی اختیار نہ کریں اور اپنا اور اس کا الگ الگ فرقہ نہ بنائیں۔

اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (آل عمران - ۸۱) اور جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں

---

۱ ... "حضرت بہاء اللہ جو موعودِ کل ہیں"... (ص ۲۵۵ ایضاً)

۲ دیکھئے کتاب اعمال باب ۳ آیات ۲۱ تا ۲۴ "..... ضرور ہے کہ وہ (مسیح) آسمان میں اس وقت تک رہے، جب تک وہ سب چیزیں بحال نہ کی جائیں جن کا ذکر خدا نے اپنے پاک نبیوں کی زبانی کیا ہے جو دنیا کے شروع سے ہوتے آئے ہیں۔ چنانچہ موسیٰ نے کہا خداوند تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے مجھ سا نبی پیدا کرے گا۔ جو کچھ وہ تم سے کہے۔ اس کی سننا اور یوں ہوگا کہ جو شخص اس نبی کی نہ سنے گا وہ امت میں سے نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ بلکہ سموئیل سے لے کر پچھلوں تک جتنے نبیوں نے کلام کیا، ان سب نے ان دنوں کی خبر دی ہے۔"

ظاہر ہے کہ محمدؐ کے سامنے جو بھی آیا نابود ہو گیا۔ کہاں ہیں۔ امرائے قریش اور دیگر مخالف قبائل اور بہاء اللہ کے مخالفین کا کیا بگڑا!

"مرتب"

سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب وحکمت سے (حسب حالات) بخش دوں۔ پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے اس کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔

فرمایا: "کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟"

انبیاء: (ہاں) "ہم نے اقرار کیا"

فرمایا: "سو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ شاہدوں سے ہوں۔
پھر جو اس پختگی کے بعد انحراف کرے، تو وہی لوگ فاسق ہیں"

اس آیت کے مطابق کئی نبیوں کے وقت میں دوسرے رسول آتے رہے۔ اور ایک دوسرے کی وحی کی تصدیق کرکے، ربانی مقصد میں تعاون کرتے رہے۔۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اصل دین اسلام ہے جو سب کا مشترکہ ہے اور شخصیتوں کے ادل بدل سے اس میں تبدیلی نہیں آتی ۔۔ کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی مقصود حقیقی نہیں ہوسکتی۔ یہ بلند و برتر تعلیم قرآن حکیم ہی کی شان ہے چنانچہ اس کے ساتھ ہی فرماتے ہیں۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ٥ (آل عمران-۸۳) پھر کیا یہ لوگ الٰہی دین کے سوا کچھ اور طلب کرتے ہیں۔ حالانکہ جو کوئی آسمان اور زمین میں ہیں۔ چاروناچار سب اسی کے مسلم (زیر فرمان) ہیں اور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔

اس سے زیادہ اسلام کے مشترکہ دین ہونے کا ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ خود رسول کریم کو اسی صف میں کھڑا ہونے کا حکم ہوتا ہے!

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (آل عمران-۸۴)

(اے محمد!) اعلان کردے کہ (میں اور میرے اتباع) ہم (سب) نے اللہ تعالیٰ کو مانا اور (اللہ کے اس دین کو) جو ہم پر نازل کیا گیا اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل کیا گیا۔ اور جو موسیٰ، عیسیٰ اور (دیگر) نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے ملا۔ ہم ان میں سے کسی میں اختلاف پیدا نہیں کرتے۔ اور ہم خدا ہی کے مسلم (فرمانبردار) ہیں۔

ان آیات سے یہ ثابت کرنا کہ یہ عہد خاص جناب بہاء اللہ کے متعلق تمام گزشتہ انبیاء سے لیا گیا تھا، آیات کے ساتھ انصاف ہے یا ظلم؟ ۔ یہ تو ایک عمومی عہد ہے ہر ایسے رسول کے متعلق جو نبی کے وقت میں آئے اور وہ نبی اسے اپنا مصدق پاکر ایمان لائے اور اس سے تعاون کرے ۔۔ اگر کوئی مدعی، ربانی وحی کا مصدق نہیں ہے تو اس پر ایمان لانا اور اس سے تعاون کرنا قطعاً بے معنی اور خارج از آیت ہے صحف ربانی اور تاریخ سے ثابت ہے کہ جس جس نبی کے وقت کوئی رسول آیا، اس نے اس عہد ربانی کو نبھایا اور جس کے وقت میں نہیں آیا، اس مشروط عہد کا مکلف بھی نہیں ہوا۔

سورہ احزاب میں بھی نبیوں کے ایک عہد کا ذکر ہے۔ وہاں بھی یہی مقصد پیش نظر رکھا گیا ہے کہ "راستی" کو ہر صورت چل چل کر یا تنہا تنہا (جیسے حالات ہوں) پہنچا دو۔ تم سے تمہاری راستی کے متعلق پرسش ہوگی اور کفار کو ان کی مخالفت کی سزا ملے گی۔ وہ آیت حسب ذیل ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ لِّيَسْــَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (احزاب۔۸) جب ہم نے تمام نبیوں سے (ان کے وقت میں تبلیغ رسالت کا) عہد لیا اور تجھ سے (جو اس وقت ہیں) اور نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ ابن مریم (وغیرہم) سے بھی، تاکہ راست بازوں سے ان کی (عملی) راست بازی کے متعلق (اللہ تعالیٰ) سوال کرے (اور انہیں ان کا نیک بدلہ دے) اور کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔

بہرحال ان آیات میں تیرہ سو سال بعد کی پیداوار "بہائیت" کے گھسنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

قادیانی نبوت؛

مرزا صاحب کی نبوت کے حق میں جن آیات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب ان کی یہ تاویل تفسیر فرماتے ہیں۔

پہلی آیت جس سے ثابت کیا جاتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ صالح، شہید، صدیق اور نبی بن سکتا ہے۔ حسب ذیل ہے۔

آیت منعم علیہم

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (نساء-۶۹) اور جو اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی اطاعت کرے، تو وہ لوگ ان کے ساتھ جا ملتے ہیں، جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالحوں سے اور یہ لوگ بہت اچھے ہیں رفیق ہونے میں۔

اس آیت سے اوپر منافقوں کا ذکر آ رہا ہے۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ وہ لوگ اچھے لوگوں کی معیت و رفاقت سے محروم رہیں گے۔ یہ شرف صرف ان لوگوں کو نصیب ہوگا جو احکام کی پیروی سچے دل سے کریں گے۔ آیت میں اس بات کا شائبہ تک نہیں کہ عام مسلمانوں کو نبی وغیرہ بننے کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے۔ اس کے لیے کوئی اور واضح سند درکار ہے جس میں ارشاد ہو کہ "لوگو! اگر تم نبی بننا چاہتے ہو تو یوں کرو"۔

آیت نہایت صفائی سے کہہ رہی ہے کہ اللہ اور رسول کے مطیع لوگ موت کے بعد ان اعلیٰ رفیقوں سے جا ملتے ہیں۔ جو انعام الٰہی حاصل کر رہے ہیں۔ یعنی نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحوں کی انعام یافتہ جماعت کے ہمراہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی رفاقت کوئی معمولی بات نہیں۔ بلکہ بہت ہی اچھی بات ہے، جیسا کہ فرمایا وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ نبوت، صدیقیت وغیرہ حاصل کرنے یا نہ کرنے سے سروکار نہیں۔

حضرت یوسفؑ نے بر سرِ حکومت ہو کر دعا مانگی تھی۔ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (یوسف) اے خدا تو مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صالحین کے ساتھ حقیقی ادراک والحاق موت کے بعد ہی ہوتا ہے ـــــ تیرہ سو سال سے اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی اطاعت کرنے والے ہوتے رہے ہیں۔ لیکن (قادیانی معنی کے لحاظ سے) کسی ایک کو بھی نبیوں کی معیت نصیب نہ ہوئی۔ ایسے معنی پہنانا آیت کے ساتھ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟

آیہ خاتم النبیین

دوسری آیت "خاتم النبیین" پیش کی جاتی ہے۔ اس کے متعلق خواجہ صاحب لکھتے ہیں ـــــ "خاتم" کے معنی "مَا یُخْتَمُ بِہٖ" ہیں۔ یعنی جس کے ساتھ کسی شے پر مہر لگائی جائے۔ یا کسی شے کو ختم کیا جائے۔ کیونکہ "ختم" کے معنی ہیں مُہر کردن، تمام خواندنِ قرآن شریف، و بآخر رسانیدنِ چیزے ـــــ پس خاتم النبیین کا مطلب یہ ہوا کہ جناب محمد رسول اللہؐ کے ذریعے نبیوں پر مہر لگ چکی ہے، یا آپ کی آمد سے نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ـــــ اللہ تعالیٰ کفار کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے، یعنی ان کا اندر ایسا بند ہو جاتا ہے کہ اس میں ہدایت داخل نہیں ہو سکتی جس پارسل یا لفافے یا اور کسی چیز پر مہر لگائی جائے۔ جب تک اس مہر کو توڑا نہ جائے، وہ مختوم ہی رہے گی۔ خود مرزا صاحب بھی اس سے یہی معنی سمجھتے ہیں ـــــ ان کے دعویٰ نبوت کے بعد لفظ "ختم" کے معنی تو بدل نہیں سکتے۔ دیکھئے ان کا اپنا اعتراف۔

"حسب تصریح قرآن کریم نبی اس شخص کو کہتے ہیں جس نے احکام و عقائد دین جبرئیل کے ذریعے سے حاصل کئے ہوں۔ لیکن وحی نبوت پر تو (فی ۱۳) تیرہ سو برس سے مہر لگ گئی ہے۔ کیا یہ مہر اس وقت مسیح کی آمد پر ٹوٹ جائے گی؟ (ازالۃ الاوہام۔ ۵۳۴)

اور دیکھئے ـــــ آں حضرت خاتم الانبیاء اور قرآن مجید خاتم الکتب ایک ہی معنی میں ہیں۔ نہ قرآن کے بعد کوئی کتاب آسکتی ہے۔ نہ محمد رسول اللہؐ کے بعد کوئی نبی آسکتا ہے" (ازالہ اوہام ۱۲۷ و ۱۳۷)

اگر کسی کو محمدؐ کے بعد نبی بننے کا وہم پیدا ہو گیا ہو تو مرزا صاحب کی یہ تحریر اس کے ازالے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اگر اس کے بعد وہ خود نبی بن بیٹھیں تو اس کے سوا کیا کہا جائے گا کہ جس "وہم" کا انہوں نے "ازالہ" کیا تھا خود ہی اس کا شکار ہو گئے۔ استغفر اللہ۔

آیہ غلبہ دین

تیسری آیت حسب ذیل ہے۔ خواجہ صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ قادیانی حضرات اس سے کیا معنی کرتے ہیں؛ صرف اپنی تشریح پیش کر دی ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ (صف)

اللہ وہ ہے جس نے بھیجا اپنا رسول ہدایت اور دین کے ساتھ تاکہ اس کو غالب کرے ہر دین پر ـــــ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ کی رسالت قیامت تک جاری رہے گی، اس طویل زمانے میں ایک آن کے لیے بھی آپ کی رسالت میں تعطل پیدا نہیں ہو گا ـــــ "ہدایت" اور "حق" ایسی چیز نہیں کہ کچھ عرصے بعد وہ ضلالت اور باطل بن جائیں اور انسان کو دوبارہ ہدایت وحق بتانے کے لیے نبی کی ضرورت پیش آئے۔ قیامت تک جو مخالفانہ عقائد، خیالات اور نئے نئے دین ایجاد ہوں گے،

قرآن مجید میں ان سب کی تردید پہلے ہی سے موجود ہے اور وہ تمام گذشتہ و آئندہ ادیان پر غالب رہے گا اور قیامت تک لوگوں کو پہنچتا رہے گا۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ (انعام-۱۹) میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تم کو اس کے ذریعے ڈراؤں اور اس کو بھی، جسے یہ پہنچے۔

یہ قرآن گزشتہ چودہ صدیوں سے لوگوں کو پہنچ رہا ہے اور قیامت تک پہنچتا رہے گا اور اسی کے ذریعے سے محمد ﷺ ان کو جنہیں یہ پہنچے گا، ڈراتے رہیں گے اور آپ اسی کے ذریعے تمام ادیان پر غالب رہیں گے۔ آپ کا ڈرانا اور غلبہ ایک لمحے کے لیے بھی ٹل نہیں سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تیرہ صدیوں تک تو آپ کسی بروز[1] کی مدد کے بغیر کل ادیان پر غالب رہے اور اب یہی آیت بروز کی دلیل بن جائے حاشا وکلا۔

آیہ بعث فی الامیین

چوتھی آیت۔ اس سے پہلی آیت ساتھ ملانے سے بات سمجھ میں آئے گی۔ لہذا پہلے اس کو دیکھیے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (جمعہ-۲) وہی (خدا) ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں کا، پڑھ کر سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں اور انہیں پاک کرتا ہے اور تعلیم دیتا ہے کتاب اور عقلمندی کی اور اس سے پہلے وہ صریح بھول میں مبتلا تھے

——— اب آیت حوالہ سنئے۔

آیہ لما یلحقوا بہم

وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (جمعہ-۳) اور اٹھایا اس رسول کو دوسرے لوگوں کے واسطے بھی انہی میں سے جو ابھی نہیں ملے ان میں۔ وہی تعالیٰ ہے زبردست حکمت والا۔ خواجہ صاحب اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"آخرین منہم" میں "آخرین" کا عطف دو طرح ہو سکتا ہے۔

۱۔ "امیین" پر جو آیت ۲ کا آغاز ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو امیوں میں رسول بنا کر بھیجا، لیکن وہ صرف امیوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ "آخرین" جو ابھی ان امیوں میں شامل نہیں ہوئے، ان کے لیے بھی یہی رسول ہوگا۔ اس لفظ "آخرین" میں تمام وہ لوگ بھی جو بعد کے زمانوں میں تا قیامت پیدا ہونے والے تھے، ان سب کے لیے وہی ایک رسول فرائض رسالت

---

[1] یاد رہے کہ مرزا صاحب نے تمام انبیائے سلف کے خلاف نبوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کئی چولے بدلے۔ ان میں سے ایک چولہ یہ بھی تھا کہ "میں مستقل نبی نہیں ہوں صرف ظلی اور بروزی نبی ہوں" یہ نبوت مرزا صاحب کی ایجاد ہے۔ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں سوجھی اور نہ ہی خدا و جبریل نے اس کا کہیں ذکر کیا۔

انجام دے گا۔

۲۔ دوسری صورت میں اس کا عطف "یُعَلِّمُهُمْ" کی ضمیر "هُمْ" پر ہوگا، یعنی وہ رسول ان امیوں کو بھی کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور دوسرے لوگوں (آخرین) کو بھی جو ابھی ان امیوں میں شامل نہیں ہوئے۔ یہ دوسرے کون ہیں؟ سب کے سب تا قیام قیامت کے لوگ، جن کا الحاق بُعدِ زمانی و مکانی کے سبب ابتدائی امی مخاطبین سے نہیں ہو سکتا تھا (لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ) ——— دونوں صورتوں میں کل زمانوں کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی تلاوتِ آیات، تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت کے فاعل ثابت ہوتے ہیں۔ کسی نبی امت (احمدی وغیرہ) اور کسی نئی رسالت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

ظل و بروز

رسول کریمؐ اپنی زندگی میں دنیا کی تمام اقوام کے لیے آپ ہی رسول ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن تمام اقوام تک بہ نفسِ نفیس آپ پہنچ نہیں سکے، نہ ہی آپ کا کوئی ظل و بروز غیر ملحق و غیر حاضر اقوام میں مبعوث ہوا اور بعد رحلت بھی تیرہ صدیوں تک آپؐ ہی "ظل و بروز" کی مدد کے بغیر بذریعہ قرآن مزکّی و معلّم کہلاتے رہے۔ اب اتنی طویل مدت کے بعد "ظل و بروز" کہاں سے نکل آیا؟ لہٰذا یہ آیت کسی نئی نبوت کے منافی ہے نہ کہ مثبت۔

آیہ قطع وتین

پانچویں آیت وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۙ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۔ (حاقہ۔ ۴۴ تا ۴۶) اگر یہ (رسول) بنا لاتا ہم پہ کوئی بات تو ہم پکڑ لیتے اس کا داہنا ہاتھ، پھر کاٹ ڈالتے اس کی گردن۔

احمدی صاحبان اس آیت سے دلیل لاتے ہیں کہ اگر مرزا صاحب کاذب اور مفتری ہوتے تو ان کو مہلتِ حیات نہ ملتی! ——— الہامات کے دعوٰی کے بعد برسوں تک ان کا زندہ رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سچے ملہم اور رسول تھے۔ خواجہ صاحب اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ آیت ظاہراً رسول کریمؐ کی اعلیٰ پوزیشن، خاتمیت، کاملیت وغیرہ سے متعلق ہے اگر اتنی عظیم، عالمی اور روحانی ذمہ داری والا شخص اللہ تعالیٰ پر ایک بات بھی جھوٹی لگا دیتا تو اسے ہرگز زندگی کی مہلت نہ ملتی ——— ظاہر ہے کہ:

اس وقت آپ کے قتل کیے جانے کے پورے اسباب موجود تھے۔ مرزا صاحب کے زمانے کی طرح کوئی امن کی حکومت موجود نہیں تھی۔ آپؐ دفاعی جنگوں میں ہمیشہ مجاہدوں کے ساتھ میدانِ کارزار میں شریک جنگ رہے۔ آپ پر ایسی حالتیں بھی آئیں کہ آپ کے قتل ہو جانے کی افواہیں پھیلائی گئیں، ایک دنیا آپ کے قتل کے درپے تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کے مطابق آپ کو دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے ہمیشہ بچائے رکھا۔ اگر آپ (معاذ اللہ) کاذب و مفتری ہوتے تو کفار آپ کو قتل کر کے آپ کے کذب و افترا کو فوراً ثابت کر سکتے تھے۔ ۲۳ برس کی مہلت تو بڑی بات ہے آپ کو ایک آن ہی میں ختم کر دیا جاتا ——— لہٰذا یہ آیت آپؐ کے ابدی رسول ہونے کی بیّن دلیل ہے جس سے کسی آئندہ نبی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

ہر مفتری مقتول نہیں ہوتا

یہ بھی یاد رہے کہ ہر مفتری کا مارا جانا ضروری نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ کوئی جھوٹا مدعی دنیوی متاع سے محروم کر دیا جائے۔ بلکہ اس کے برعکس ارشاد ہے کہ: قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ

يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (یونس ۶۹-۷۰ اے رسول!) کہہ دے (آخر کار) ان کو ہماری طرف لوٹنا ہے۔ پھر ہم ان کو سخت عذاب چکھائیں گے ان کے کفر کے سبب۔

اس آیت سے پوری طرح واضح ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھنے والوں کو دنیا میں متاع حاصل ہو جاتا ہے —— پھر یہ بھی فرمایا ہے:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰىٓ اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا (اعراف ۳۷) اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ یہ لوگ جو ہیں، ان کو ملے گا ان کا جو حصہ کتاب (مقدر) میں لکھا ہے۔ یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے فرشتے ان کی جان لینے کو آئیں گے تو کہیں گے "جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ کہاں ہیں؟" وہ کہیں گے، "وہ ہم سے گم ہو گئے"۔

اس آیت سے بھی جھوٹ باندھنے والوں کو موت تک ان کا نصیب ملنا صاف ثابت ہے۔ اور لیجئے وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (یونس ۶۰) اللہ پر جھوٹ باندھنے والوں نے قیامت کو کیا سمجھ رکھا ہے؟..... الخ یعنی ایسوں کا فیصلہ روز قیامت ہوگا۔

بہت زیادہ صراحت اس آیت میں ملتی ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللهُ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللهِ غَيْرَ الْحَقِّ (انعام ۹۳) اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا کہے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے۔ حالانکہ اس کی طرف کچھ وحی نہ کیا گیا ہو اور جو کہے کہ میں بھی اتار لیتا ہوں مثل اس کے جو خدا نے اتارا ہے اور (کیا ہو؟) اگر تو دیکھے جب ظالم موت کی بے ہوشیوں میں ہوتے ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوتے ہیں (کہتے ہیں) اب نکال کر لے جاؤ اپنے آپ کو اس گرفت سے آج تم کو رسوائی کا عذاب ملتا ہے اس سبب سے کہ تم اللہ پر جھوٹی باتیں کہتے تھے۔

لہ خدا پر جھوٹ باندھنے والے خواہ دنیا میں کیسی ہی طاقت رکھتے ہوں اور اپنے ساز و سامان پر مغرور ہوں لیکن انہیں حقیقی بھلائی اور کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ تھوڑے سے دن دنیا کے مزے اڑالیں۔ انجام کار ان کا معاملہ خدا کی طرف رجوع ہوگا۔ چنانچہ اپنے جرائم کی پاداش میں سخت عذاب کا مزہ چکھیں گے۔" (عثمانی رح)

ان آیات سے ثابت ہے کہ دنیا میں ممکن ہے کہ مفتری عذاب سے محفوظ رہیں اور انہیں سامان بھی ملیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ گرفت کا آغاز یہیں سے ہو جائے ــــ ان آیات نے احمدی استدلال کو کالعدم کردیا فہو المراد ــــ الحمدللہ علی ذالک

نئی رسالت کی دو وجوہ

کسی رسول کے بعد یا ساتھ دوسرے رسول و نبی کی ضرورت دو وجوہ سے ہو سکتی ہے۔

۱۔ پہلا رسول محدود زمانے کے لیے ہو اور وہ تنہا کافی و کامل نہ ہو۔ احمدی حضرات بتائیں کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قسم کا رسول یا نبی سمجھتے ہیں؛ جو ان کے بعد یا ساتھ مزید نبی و رسول تجویز کرتے ہیں عام طور پر یہ بتایا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کی نبوت کی غرض "اشاعتِ ہدایت کی تکمیل" ہے۔

لیکن اس کا مطلب واضح نہیں ہو سکا کیا اس سے یہ مراد ہے کہ اب مرزا صاحب کی اس تکمیلی کوشش کے بعد کسی اور "اشاعتِ ہدایت" کرنے والے کی ضرورت باقی نہیں۔

۲ــــ یا کہ مرزا صاحب نے تمام اہل مذاہب میں ہدایت کی اشاعت کردی ہے اب ان کے بعد کوئی نیا دین پیدا نہیں ہو گا۔ یہ دونوں باتیں باطل ہیں۔ کیونکہ ہدایت کی اشاعت کے لیے کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں یہ کام امت کے ذمے ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۰۴) تم میں ایک ایسی جماعت (ہمیشہ) موجود رہنی چاہیئے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکتی رہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کی نبوت و رسالت اختلافات اُمت کو ختم کرنے کے لیے برپا ہوئی ہے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے اختلافات کا فیصلہ قرآن مجید سے کیا۔ یا اپنی وحی سے ــــ اگر قرآن سے کیا ہے اور قرآن کافی و قول الفصل ہے تو مرزا صاحب کی نبوت کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر دوسری صورت ہے تو ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کے ظہور سے عقائد میں مزید اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔ تفرق و تحزب کو تقویت پہنچی ہے۔

مرزا صاحب کو اپنی نبوت میں تذبذب و تردّد

آخری بات

مرزا صاحب کی نبوت مسلّمہ منہاج نبوت کی تکذیب کرتی ہے ــ اس لیے کہ

۱ــــ ان کے مخالف بڑے زور سے کہتے رہے کہ مرزا صاحب مدعی نبوت ہیں۔ لیکن مرزا صاحب برسوں تک ان معترضوں اور مخالفوں کی تردید کرتے رہے۔ پھر بقول احمدی حضرات اخیر میں آپ نے اعتراف فرمایا کہ "میں سچ مچ رسول و نبی ہوں" آپ تمام انبیاء میں سے ایک کو ہی مثالاً پیش کریں جس کو اپنے دعویٰ کے متعلق مدتوں تذبذب و تردّد رہا ہو۔

۲۔ مرزا صاحب نے تحدی کے ساتھ جو پیش گوئیاں کیں، وہ غلط ثابت ہوئیں۔ کسی ایک نبی کا نام لو جس کی ایک پیش گوئی بھی غلط ہوئی ہو۔

۳۔ مرزا صاحب نے خدا کے حضور فیصلے پیش کئے۔ اور ان کے خلاف فیصلے صادر ہوتے رہے۔ وہ اپنے ہی منظور کردہ بیانات کے مطابق صادق نہیں ٹھہرے۔ نمونہ کے لیے کوئی ایسا رسول پیش کرو۔

۴۔ تمام انبیاء و رسل وہبی طور پر ہوئے ہیں۔ مرزا صاحب کی طرح کوئی ایک بتائیے، جو اکتساب یا کوشش سے بنا ہو۔

۵۔ کوئی ایسا رسول یا نبی بتائیے، جو کشف یا خواب میں خود خدا بنا ہو یا جس نے عیسیٰ علیہ السلام کا نام یسوع رکھ کر گالیاں دی ہوں۔[1]

(منزل پنجم ص۳۶۰ تا ۳۶۲)

---

[1] یہ سب باتیں مرزا صاحب کی تصانیف میں پھیلی ہوئی ہیں۔

عرضِ امانت

آیہ امانت کے سمجھنے میں مفسرین کو مشکلات پیش آئی ہیں۔ سوچنے والوں نے حمل اور امانت کے معنی میں بہت کچھ طبع آزمائی کی ہے۔ خواجہ صاحب کے ملفوظات میں اس کے متعلق کوئی تفصیل تو نہیں۔ مختصراً جو کچھ ہے پیش کیا جاتا ہے۔

عقل نعمت عظمیٰ ہے۔ انسان کو اس سے نوازا گیا ہے۔ آسمان و زمین اور پہاڑوں کو عقل مند نہیں بنایا۔ انسان حامل امانت ہے۔ دوسری کوئی مخلوق اس ذمہ داری کو اٹھانے کی اہل نہیں۔ احسن تقسیم کار کے مطابق جس کو جو کام مناسب سمجھا، سونپا گیا۔ انسان کو صاحبِ اختیار بنایا گیا۔ اس کو انکار و اقرار دونوں کی صلاحیت ملی ہے۔ وُہ بڑا نیک اور بڑا ظالم بھی بن سکتا ہے۔ اچھی بات کو قبول نہ کرنا جہل ہے۔ کسی چیز کا بے محل استعمال ظلم ہے۔ امانت کا حامل بن کر اسے نباہنا لازم ہے۔ ورنہ سزا کا مستوجب ہوگا۔ جیسا کہ فرمایا۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (احزاب ۷۲، ۷۳)

تحقیق ہم نے امانت (توحید، خلافت، ذمہ داری وغیرہ) کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، پس انکار کیا انہوں نے (بزبان حال) اس کے اٹھانے سے اور ڈر گئے اس (عدول حکمی) سے اور اٹھا لیا (حکم الٰہی سے توحید کی ذمہ داری کو) انسان نے (اور نہ نباہا اس امانت کو) تحقیق وہ تھا بے باک نادان (شریر، ضدی، بھلائی کا دشمن، برائی پر حریص وغیرہ۔ یہ اس لیئے) تاکہ اللہ عذاب کرے منافق مردوں کو اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو (لام عاقبت بمعنی "تاکہ") اور رجوع کرے اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں پر (اگر کوئی بھول چوک اور خطا و لغزش ہو جائے تو اصلاحِ نفس اور توبہ و انابت ضروری ہے) اور اللہ تو ہمیشہ سے بخشنے والا، مہربان ہے۔

"حمل" کے معنی یہ بھی ہیں کہ زمین آسمان اور پہاڑوں نے حکم کو اٹھا دیئے، رفع کرنے یا نہ ماننے سے انکار کیا یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حکم ہو اللہ کا اور ہم اس کو اٹھا دیں یا ہٹا دیں۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ لیکن صاحب اختیار انسان نے اس کو ذمہ لے کر اٹھا دیا (حملہا الانسان) یعنی رد عدول حکمی کی اور ظالم و جاہل بنا۔ منزل پنجم صفحہ ۲۸۹

ذکر داؤد علیہ السلام

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّیْرَ ج وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ (سبا-۱۰) ہم (خدا تعالیٰ) نے داؤد کو اپنی طرف سے فضل دیا تھا۔ اے پہاڑو (یعنی اے پہاڑ کے رہنے والو) چلا کرو (دن بھر) اس (داؤد) کے ہمراہ اور (حکم دیا) طیر کو[1] (یعنی اسے جاسوسوں اور راستے مجزوں۔ سب فرمان برداری کیا کرو، جس کو جس کام پر لگا دیں، حکم بجا لایا کرو۔ خدا نے اپنے فضل سے عمالقہ کا کوہستانی علاقہ داؤد کے ماتحت کر دیا۔ آپ نے ان کی نگرانی پر مخبر لگا دیئے کہ اگر کوئی سازش وغیرہ کریں تو ان کو مناسب سزا دی جائے یا حالات کے تقاضے کے مطابق عمل کیا جائے) اور ہم نے اس داؤد کے لیے لوہا نرم کر دیا۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ط اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ کہ بنا پوری زرہیں اور کڑیاں (پروئی ہوئی ایک دوسری میں) اندازے سے جوڑ (یعنی کو عملی طریق پر زرہ وغیرہ بنانے کی سمجھ عطا کی گئی۔ پہلے وہ زرہیں لوہے کی تختیوں کو موڑ کر بنائی جاتی تھیں اور کنڈیوں سے جوڑی جاتی تھیں، بائبل میں جس زرہ کا ذکر ہے کہ جالوت پہن کر آیا تھا، وہ اسی قسم کی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے داؤد کو لوہا پگھلانے کا علم دیا۔ انہوں نے کڑیوں والی زرہ ایجاد کی۔ یہ کام کوئی خارق عادت نہیں تھا۔ یہ ایک کاریگری تھی۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے وعلمنٰہ صنعۃ لبوسٍ لکم (انبیاء ۸۰)

---

[1] صحیح مسلم میں ابن مسعود کی روایت سے ہے ان ارواح الشھداء فی اجواف طیر خضر۔ شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں اور ابن ماجہ میں انہی کی روایت سے ہے ارواح الشھداء عند اللّٰہ تعالیٰ کطیر خضر۔ شہیدوں کی روحیں اللہ تعالیٰ کے ہاں سبز پرندوں کی طرح ہیں۔ ان احادیث سے فائدہ اٹھا کر بعض لوگوں نے طیر سے مجازاً انسان مراد لئے ہیں۔ ایسے انسان جو روحانی طور پر بلند پرواز ہوں۔ جاسوس بھی چونکہ عام انسانوں سے بعض خصوصیات میں ممتاز اور تیز ہوتے ہیں اس لیے خواجہ کا خیال اس طرف گیا ہے۔ امام راغب سے بھی اس کی تائید ملتی ہے۔ ویقال تطایر اذا اسرع۔ تفصیل سورۂ انبیاء کی تفسیر میں دیکھئے۔

ملائکہ اولی اجنحۃ

بعض قومیں رسولوں اور فرشتوں کو بطور معبود مانتی ہیں۔ قرآن نے ان کو اللہ کے بندے اور مخلوق بتایا ہے۔ رسُل اور ملائکہ صرف ذریعے ہیں پیامِ الٰہی کو پہنچانے کے ۔۔۔ ان کو خدا کی طرح ماننا قطعاً ناجائز ہے۔ متصرفِ حقیقی اور قادرِ مطلق صرف خدا کی ذات ہے چنانچہ سورہ فاطر کا آغاز اسی بات سے ہوتا ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ سب تعریفیں (حقیقتاً) اللہ (کامل مطلق) کے لیے ہیں وہ از سرِ نو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (انسانی زندگی کا انحصار ارض و سما کے وجود پر ہے۔ بقائے حیات کے لیے اسباب و ذرائع کا خالق بھی وہی ہے) فرشتوں کو پیغام رسانوں کی حیثیت سے بنانے والا ہے۔ دو دو۔ تین تین اور چار چار جنحوں[1] والے (ملائکہ اس کے رکن بندے اور محکوم ہیں۔ جو دو دو، تین تین، چار چار بلکہ ہزاروں اور لاکھوں دران گنت اطراف یا بازو رکھتے ہیں صرف چار پر خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ جیسا کہ فرمایا) اضافہ کرتا رہتا ہے تخلیق میں جو چاہتا ہے (ملائکہ محض ذرائع ہیں جب وہ ارادہ فرماتا ہے تو یہ ذرائع اس کے حکم کو من وعن انجام دیتے ہیں۔ اور ذراتِ کائنات کو اللہ کے حکم کے مطابق توڑتے اور جوڑتے ہیں۔

وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ۔ (انبیاء ۲۷)

---

[1] لغت بمیلان، جھکاؤ۔ اجنحۃ جناح کی جمع ہے بمعنی جہت یا طرف مثلاً فوج کے اطراف اور یمین و یسار وغیرہ "جنحوں والے" یعنی ایک جہت سے حاصل کر کے دوسری جہت یا جہات میں پہنچانے والے۔ ۲۔ جناح بمعنی بازو یعنی ذریعہ جس سے کام کیے جاتے۔ ۳۔ جناح بمعنی پر۔ یہ معنی سرعتِ سیر پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی فرشتے حکمِ خدا کی بجا آوری میں تاخیر و تساہل نہیں کرتے۔ پر یا بازو کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ کارگاہِ فطرت کے ذرے کی ماہیت کو سمجھنے سے بڑے بڑے دماغ قاصر ہیں۔ پھر وہ خالقِ لطیف و خبیر کی ماہیت کیا سمجھیں گے۔ واجب کی حقیقت کو ممکن کبھی نہیں پا سکتا۔ (راغب وغیرہ)

بعث بعد الموت

دوبارہ جی اٹھنے کے متعلق عام عقیدہ یہ ہے کہ آدم سے لے کر آخری انسان تک کا بعث روز قیامت یک بارگی ہوگا۔ خواجہ صاحب کی تحقیق یہ ہے، کہ ہر انسان کا بعث اس کی موت کے ساتھ ہی واقع ہو جاتا ہے۔ اس کا اظہار انہوں نے جابجا کیا ہے مثلاً سورۂ یٰسین میں ایک شخص تین موجود رسولوں کی پیروی کی تلقین کر رہا ہے اور توحید کی دعوت دیتا ہے۔ باطل پرست لوگ اس کو قتل کر دیتے ہیں۔ اس موقع پر لکھتے ہیں:

"مالک یوم الدین نے جو سریع الحساب بھی ہے، اسے فوراً نیک بدلہ دیا۔ یہ نہیں کہ وہ ایک نہایت لمبے زمانے تک تہ خاک رہا، بلکہ اسی وقت عالم آخرت میں پہنچا اور ـــــ قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۖ قَالَ يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ (یٰس-۲۶) اسے کہا گیا، جنت میں داخل ہو جا۔ اس (فدائے قوم) نے جنت میں (داخل ہوتے ہی) کہا اے کاش میری قوم جانتی؛ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ (ایضاً ۲) کہ میرے رب نے مجھ پر بخشش کی اور مجھے عزت والوں سے کر دیا۔ اے کاش میری قوم بھی نیکی کرتی، برائی سے بچتی اور انعام کی مستحق بن جاتی لیکن اس کی قوم بے حد سرکش تھی۔ اس لیے اللہ نے اُسے تباہ کر دیا جیسا کہ آیت ۲۸ سے ثابت ہے۔ وَمَا أَنزَلْنَا..... خَامِدُونَ ایک ہی دھماکے سے سب بجھ گئے یعنی زلزلے کے ساتھ ہی پس گئے[1]۔ اس پر حاشیہ لکھتے ہیں، "اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نیک و بد مرنے کے ساتھ ہی اپنے مناسب مقام پر پہنچا دیے جاتے ہیں۔ کسی طویل مدت تک سب بے فائدہ، بے کار نہیں رکھے جاتے۔ خدا تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے (سریع الحساب)۔ فرشتے ظالموں کو ان کی موت کے وقت کہتے ہیں کہ آج کا دن تمہارے بدلے کا ہے (انعام ۹۳) آل فرعون کو غرق ہونے کے بعد آگ میں ڈال دیا گیا (مومن-۴۶) ہاں ظالموں کو تھوڑا سا وقت برزخ میں رہنا پڑتا ہے۔

برزخ جہاں ان کی حالت بے ہوشی میں کراہنے والے مریضوں کی سی ہوتی ہے اس کے بعد ہوش میں لا کر جہنم رسید کیے جاتے ہیں۔ ان کو ضائع نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ان کو درست اور سیدھا کیا جاتا ہے۔ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ (الحاقہ-۳۱) (پھر اس کو دوزخ میں داخل کر دو) اسی غرض کے لیے فرمایا جاتا ہے۔ یہ بھی رحمت ہے کہ ان مجرموں اور روحانی مریضوں کے ساتھ جہنم کا سلوک ماں جیسا ہوتا ہے۔ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ (القارعہ-۹) ہاویہ یعنی دوزخ اس کی ماں ہے) اور وہ جہنم اس کے لیے کافی ہے (البقرہ ۲۰۶) بچہ لاکھ روئے چلائے۔ اگر ماں اس کے لیے آپریشن مناسب سمجھتی ہے، تو اس کے آرام کی خاطر آپریشن کرا لیتی ہے اور اس کی آہ و بکا کی مطلق پروا نہیں کرتی۔ اس طرح عذاب و انعام کا سلسلہ ہر آن جاری رہتا ہے۔

طفل می نالد ز نیشِ احتجام مادرِ مشفق در آں دم شادکام۔ (رومی ؒ)

(منزل پنجم۔ تفسیر سورۂ یٰس ص ۲۰۲، ۲۰۴)

---

[1] یہ آیت دراصل انبیاء سے متعلق ہے۔ ملائکہ کے متعلق دوسری آیات موجود ہیں، مثلاً يَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (نحل ۵۰) انہیں جو حکم دیا جاتا ہے اس کو کرتے ہیں۔

نفخ صور و برزخ وغیرہ

اسی سورہ یٰسین کی آیت ۵۱ میں مذکورۃ الصدر مفہوم کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ ..... بشریوں سے ہمیشہ یہی برتاؤ ہوتا رہا ہے اور ہر شخص یا ہر قوم خدا کے حضور پیش ہو کر اپنے کاموں کے متعلق بدلہ پاتی رہی ہے۔ اب بھی ایسا ہی ہوگا۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ اور قرنا میں پھونکی گئی (یہ استمراری بات ہے۔ یہ کام ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ ارشاد ہے، پھونکا گیا قرنا میں۔ جب پکارنے والا قریب ہی سے پکارتا ہے، خوفناک، مکروہ چیز کی طرف، کوئی انکار نہیں کر سکتا، پکارنے والے کی پکار کی طرف چلا جاتا ہے، اس کے حکم میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی) پس وہ سب لوگ قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف دوڑے جاتے ہیں (قبروں کے معنی کثیف مادی اجسام کے نہیں ہیں، ورنہ پکارے جانے کے بعد قبریں خالی نظر آئیں، سب اپنی اپنی موت کے وقت لطیف اجسام یعنی نسمہ و روح کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔ کفار کو پہلے برزخ میں داخل کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کی پیشی ہوتی ہے۔ اس سے کسی کو چارہ نہیں اور نہ کوئی واپس آ سکتا ہے۔ کفار اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کر کے عزت نہیں پاتے۔ اس لیے کچھ مدت انہیں برزخ میں رکھا جاتا ہے۔ مومن کے لیے یہ لفظ قرآن مجید میں بالکل نہیں آیا۔ الحاصل موت کے ساتھ ہی حاضری ہو جاتی ہے۔ ہر ایک کی پیشی الگ الگ ہے اگر ایک ہی دن۔ آدم سے قیامت تک کا آخر انسان سب اکٹھے اٹھیں گے تو ہر ایک کے ذرات ملنے محال ہیں۔ یہ ذرات کثیف و مادی تو اور کام میں لگ چکے ہوتے ہیں، اور لطیف چیز (نسمہ) پیش ہوتی ہے۔ جو جہاں بھی ہوتا ہے، بلا عذر حاضر ہو جاتا ہے۔

قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا ۜ هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ (۵۲) بولے۔ ہم پر افسوس! کس نے ہمیں اٹھا دیا، ہماری (غفلت کی) خواب گاہوں سے (ہاں یاد آ گیا) یہ وہی چیز ہے جس کا رحمٰن نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اور (اس وعدے کے پیغام پر) رسولوں نے سچ کہا تھا۔

انفرادی قیامت کے علاوہ گروہی قیامت میں ایک دھماکہ ہوتا رہا ہے پھر سب کے سب مثل عاد، ثمود وغیرہ تباہ اور گرفتار ہوتے رہے ہیں، نیک لوگ بھی بعض دفعہ ساتھ ہی پس جاتے ہیں۔ مگر اجر کے لحاظ سے وہ اعلیٰ مراتب پر فائز ہوتے ہیں۔ کسی کے ساتھ ظلم نہیں کیا جاتا۔

إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ (۵۳)

محض ایک دھماکہ ہوتا ہے، پھر اس وقت وہ سب ہمارے سامنے حاضر ہو جاتے ہیں (اور کثیف مادی اجسام زمین ہی پر رہ جاتے ہیں، لطیف جسم نسمہ روح کے ساتھ ہوتا ہے اور اچھے یا برے اعمال کے مطابق سکھ یا دکھ پاتا ہے) کسی نفس پر ذرا بھر ظلم نہیں کیا جاتا اور ہمیشہ یہی کہا جاتا ہے۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۵۴) پس آج کا دن (انصاف کا دن ہے) کسی نفس پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور تمہیں اپنے اعمال ہی کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ (منزل پنجم تفسیر سورۃ یٰسین ص ۴۶۹ تا ۴۸۱)

کہانت اور شیطانی وحی

سورہ والصافات کے پہلے رکوع میں شیطان، ملاء اعلیٰ اور شہاب ثاقب کا ذکر آتا ہے۔ خواجہ صاحب اس رکوع کا "مضمون اور نظم و ربط" بیان فرماتے ہیں۔

"موجودات عالم کا تمام سلسلہ اللہ تعالیٰ کے حکم و حکمت کے تحت نہایت باقاعدگی اور انتظام کے ساتھ چل رہا ہے۔ جو چیزیں اس میں ذرا بھی مخل ہوتی ہیں، انہیں رد کر دیا جاتا ہے۔

زمین آسمان اور ستاروں کے مطلعوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی نے دنیا کے آسمان کو ستاروں سے مزین کیا ہے جو لوگ اس تعالیٰ سے اعراض کر کے ماہ و انجم کی پوجا کرتے ہیں، باطل پرست ہیں۔ جاہلیت میں مشرکین عرب کا ایک گروہ کاہنوں کے نام سے مشہور تھا۔ یہ لوگ شیاطین کی پرستش کرتے تھے۔ آبادی سے دور راتوں کو تنہا نشینی کرتے، شیطانوں کے لیے ہون[1] کرتے خوش بو جلاتے اور ان سے دعائیں مانگتے تھے کہ ہمیں آئندہ واقعات و حادثات کی اطلاع دی جائے۔ پھر وہ معمول بن کر شیطانوں کی طرف سے اطلاع کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ ظاہر ہے کہ غیب دانی کا یہ طریقہ سراسر لغو اور فضول ہے۔ اس طریقے سے ان کاہنوں کے دل میں جو کچھ بھی خیالات پیدا ہوتے، وہ انہیں "الہام" بتا کر پیش گوئیاں کرتے اور نذر و نقد وصول کرتے۔ اس سلسلے کی بنیاد محض اس جاہلانہ اعتقاد پر قائم تھی کہ شیطان آسمانوں پر جا کر فرشتوں کی باتیں سنتے ہیں۔ پھر اپنے پجاری کاہنوں کو مطلع کر دیتے ہیں۔

قرآن نے اس باطل عقیدے کی تردید کی ہے کہ شیاطین ملائکہ سے ہرگز وحی حاصل نہیں کر سکتے اور نہ چھپ کر ملائکہ کی باتوں کو سن سکتے ہیں۔ بلکہ ان میں آسمان تک پہنچنے کی قوت ہی نہیں۔ جیسا کہ سورۃ الحجر (۱۶-۱۸) میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۙ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ۝

اور ہم نے آسمان میں برج بنائے۔ اور دیکھنے والوں کے لیے مزین کیا اور ہر شیطان مردود سے انہیں محفوظ رکھا۔ لیکن اگر کوئی (شیطان) چوری چھپے کوئی بات (بزعم خویش) سننے کی کوشش کرے تو شہاب کا جلتا ہوا انگارا اس کا تعاقب کرتا ہے۔ — سورۃ الشعراء میں بھی وارد ہے۔

---

[1] ہون یا ہوم ہندوؤں کی ایک مذہبی رسم ہے، جس میں منتر (وید کا حصہ) پڑھتے ہوئے آگ میں گھی ڈالتے جاتے ہیں۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝

شیطان اس (قرآن) کو لے کر نہیں اترے اور نہ یہ کام ان سے کوئی مناسبت رکھتا ہے۔ اور نہیں اس کی استطاعت ہی نہیں دی گئی بلکہ انہیں تو ملائکہ کی باتیں سننے سے دور ہی رکھا گیا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہے کہ عہد نبویؐ میں عوام کا یہ خیال تھا کہ شیطان براہ راست ملاءِ اعلیٰ سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں پیش گوئیوں کا کام کاہنوں سے مخصوص تھا پھر جب قرآن حکیم کے ذریعے بعض پیش گوئیوں کا ظہور ہوا، تو کفار نے آپؐ کو بھی کاہن کا خطاب دیا اور مشہور کیا کہ آپؐ کو ملائکہ کے ذریعے نہیں بلکہ شیاطین کے ذریعے پیش گوئیاں حاصل ہوتی ہیں۔ آیت بالا میں ان کے اتہام و الزام کی تردید ہے کہ شیاطین کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں، ان میں ایسی کوئی قوت نہیں اور نہ وہ ملائکہ کی باتیں سن سکتے ہیں۔

شیطانوں کے ذریعے عام لوگوں کو وحی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ قرآن اس سوال کا جواب دیتا ہے۔

اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ (الانعام ۔ ۱۲۲)

یقیناً شیطان اپنے دوستوں کی طرف وحی کرتے ہیں تاکہ وہ تمہارے (یعنی مسلمانوں کے) ساتھ جھگڑا کریں ــــ صافات کے رکوع اول میں اسی باطل عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔

آغاز سورہ میں جو قسمیں یا دلائل ہیں وہ اثبات توحید کے لیے ہیں اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ (صافات ۴) یقیناً تم سب کا معبود صرف ایک ہی ہے۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (۵) (ایسا معبود جو تنہا) آسمانوں کا، زمین کا، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور (ستاروں کے مطالع و) مشارق (یعنی ان کے مقامات ظہور و طلوع) کا پروردگار ہے۔

مگر افسوس کہ لوگ ستاروں کی پرستش کرتے، انہیں غیب بینی (علم نجوم) کا ذریعہ قرار دیتے اور ان کے پروردگار کی اطاعت سے غفلت اختیار کرتے ہیں)

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ (۶) یقیناً ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی (عظیم الشان) زینت سے مزین کیا ہے۔ مقصود آیت یہ ہے کہ لوگ اس حقیقت سے واقف ہو جائیں کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی احکم الحاکمین، احسن الخالقین، مالک و ناظم کائنات بھی ہے، اس کی حاکمیت میں کوئی جن و انس یا فرشتہ و شیطان دخل نہیں دے سکتا۔ لہٰذا یہ خیال باطل ہے کہ شیطان آسمانوں میں پہنچ کر، فرشتوں کی باتیں سن کر کاہنوں اور مکاروں تک پہنچا سکتے۔

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (۷) ــــ ہر سرکش شیطان سے (ان آسمانوں اور ستاروں کو) اپنی حفاظت میں رکھا ہے۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ (۸) دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (۹) وہ (شیاطین) اوپر کے لوگوں (فرشتوں) کی گفت و گو ہرگز نہیں سن سکتے، اس وجہ سے کہ (انہیں دفع کرنے کے لیے ہر طرف سے (ان پر دہکتے ہوئے شہاب) پھینک کر انہیں دھکیل دیا جاتا ہے اور ان کے لیے لازمی عذاب ہے۔ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۱۰) — لیکن اگر کسی شیطان (کاہن) نے (کوئی بات) جھپٹ لی جھپٹ لینے سے تو شہاب کا دھکتا ہوا انگارہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ ان کی اپنی خلقت کا یہ حال ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَم مَّنْ خَلَقْنَا ۚ إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ (۱۱) ان سے پوچھ دیکھئے! کیا یہ لوگ اپنی خلقت میں سخت تر ہیں، یا ہماری دوسری مخلوقات؟ ہم نے ان (شیطانوں، کاہنوں) کو لیس دار مٹی سے پیدا کیا ہے (بس یہ ہے ان کی حقیقت)

منزل ششم تفسیر والصافات ص۶ تا ۸

ـلـه آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی کئی مرتبہ کاہنوں پر شہاب گرے تھے۔

ذبح عظیم

مفسرین کی اکثریت حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح قرار دیتی ہے۔ لیکن خواجہ صاحب نے اسحاقؑ کو ذبیح سمجھا ہے۔ اور اس ضمن میں بعض روایتی باتوں (بہشت سے مینڈھے کا آنا) کا انکار کیا ہے۔

جب بیٹا باپ کے ساتھ کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گیا تو انہی دنوں ابراہیمؑ نے ایک خواب دیکھا اور اپنے بیٹے سے کہا اے میرے چھوٹے بیٹے! (یا بنی) میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں تو دیکھ تیرا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ اسحاق نے کہا! اے میرے باپ! جو حکم تجھے ملا ہے اس پر عمل کر۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تُو مجھے صابروں سے پائے گا۔

یاد رہے کہ بنی تصغیر ہے بنی کی یعنی میرا چھوٹا بیٹا۔ آپ کا بڑا بیٹا اسماعیلؑ خدمت کعبہ کے لیے عرب ہی میں رہ گیا تھا۔ اس وقت وہ ساتھ نہیں تھا۔

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ (الصافات ۱۰۳)

پس جب دونوں (باپ بیٹا) ایک فیصلے پر متفق ہو گئے (یعنی باپ ذبح کرنے اور بیٹا ذبح ہونے پر) تو اُس (ابراہیمؑ) نے اس (اسحٰقؑ) کو ماتھے کے بل لٹا دیا وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ (۱۰۴) اور ہم نے اُسے پکارا کہ اے ابراہیم! قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۱۰۵) تو نے (تو) خواب (ہی) کو سچ کر دکھایا حالانکہ خواب کی تعبیر خواب کے مشاہدے سے مختلف ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف کی تعبیروں سے ظاہر ہے۔ خواب میں انگور نچوڑنے کی تعبیر بادشاہ کو شراب پلانا، سر پر روٹیوں کو پرندوں کے کھانے کی تعبیر سول پر چڑھایا جانا۔ سات موٹی گائیں اور سات دبلی گائیں۔ پھر سات ہری بالیں اور سات خشک، تعبیر میں کہ سات خوش حالی کے برس اور سات قحط کے برس بن جاتے ہیں۔ اسی طرح خواب میں بیٹے کو ذبح کرنے کی تعبیر سچ مچ مادی جسم کو ذبح کرنے کا حکم نہیں تھا۔ اصل تعبیر یہ تھی کہ حضرت اسحاق تمام عمر دین کی خدمت کے لیے اپنی راحت و آرام کی قربانی دیتے رہیں۔ تبلیغ کی راہ میں جو رکاوٹیں پیش آئیں ان کو صبر و تحمل سے برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں۔

لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ جذبۂ فداکاری اور حضرت اسحاقؑ کی تسلیم و رضا ان کے صدق و خلوص اور جوشِ اطاعت کا بے مثال ثبوت ہے ـــ اس مبارک جذبے کی وجہ سے وہ مستحقِ انعام ٹھہرے پہلا انعام یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق کی جان بچائی۔ دوسرا یہ کہ اس واقعے کو آنے والی نسلوں کے لیے بطور یادگار باقی رکھا۔ جیسا کہ فرمایا۔ ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ) (۱۰۵)

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ (۱۰۶) درحقیقت یہ (واقعہ) ایک واضح آزمائش تھی۔ (اللہ تعالیٰ نے عین موقع پر حضرت

ابراہیم کو اس بلا سے نجات عطا فرمائی)

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (۱۰۷) اور ہم نے اس (اسحٰق) کو ایک بڑی قربانی کا فدیہ دیا (یعنی ان کو زندہ رکھا، تاکہ وہ عمر بھر راہ خدا میں قربان ہوتے رہیں) (منزل ششم۔ تفسیر والصافات صلا تا ۲۴)

بلاشبہ مفسرین کی اکثریت حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح اللہ تسلیم کرتی ہے اور ان کے پاس اس کے لیے مضبوط دلائل بھی ہیں لیکن حضرت اسحٰقؑ کو ذبیح اللہ ماننے میں بھی خواجہؒ منفرد نہیں ہیں چنانچہ۔ ابن کثیر کی مندرجہ ذیل روایات اس کی مؤید ہیں۔

قال حمزة الزيات عن ابي ميسرة رحمه الله قال: قال يوسف عليه السلام للملك في وجهه ترغب ان تاكل معي وانا والله يوسف بن يعقوب نبي الله بن اسحاق ذبيح الله ..... ان اسحاق جادلي بالذبح و هو بغير ذالك اجود۔ ۔ ۔ فقال ابن مسعود رضي الله عنه ذالك يوسف بن اسحاق ذبيح الله ..... وهذا صحيح عن ابن مسعودؓ..... وكذا روى عكرمه ابن عباسؓ انه اسحاق ..... وعن ابيه العباس وعلى ابن ابي طالب مثل ذالك .... عن ابي هريرة عن كعب الاحبار انه قال هو اسحاق۔

(ابن کثیر الجزء السادس تفسیر الصافات ص۲۹،۲۸ مطبوعہ بیروت)

اس عبارت میں جن لوگوں کے نام آئے ہیں (ابو میسرہ، ابن مسعود، ابن عباس، حضرت عباس حضرت علی، حضرت ابوہریرہ، کعب الاحبار رضی اللہ عنہم سب کے سب اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت اسحٰق ——ذبیح اللہ تھے۔ تفسیر زیر نظر (ابن کثیر) میں اور بھی کئی نام اس کے مؤید ملتے ہیں۔

اللہ کے حضور جھگڑنا

سورۂ زمر آیہ ۳۰ و ۳۱ ملاحظہ فرمائیے۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۔ (اے رسول) تو میت ہے اور یہ لوگ بھی میت ہیں ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ۔ پھر تم (رسول اور دوسرے لوگ) پیشی کے دن اپنے رب کے حضور جھگڑتے ہوئے آؤ گے ـــــ مفسرین کے نزدیک یہ جھگڑا انبیاء و مومنین کے ساتھ کفار کریں گے اور حجتیں نکالیں گے ..... بہتر یہی ہے کہ لفظ "اختصام" کو عام ہی رکھا جائے ..... (عثمانی رح) خواجہ صاحب اپنے مذاق کے مطابق کہتے ہیں کہ یہ جھگڑا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مبالغہ پسند مسلمانوں سے متعلق ہے کہ ـــــ رسول بقول تو خدا کے بندے (عبد) بنتے رہے اور تم انہیں "خود خدا" کہتے رہے، وہ خدائی صفات کو خدا کے لیے خاص کرتے رہے اور تم انہیں خدائی صفات میں شریک بلکہ اصل مالک بناتے رہے، وہ خوارق کا انکار کرتے رہے (جیسا کہ متعدد آیات سے ثابت ہے) اور تم ان کی طرف طرح طرح کے غیر معقول افسانے منسوب کرتے رہے۔ خدا تعالیٰ کے حضور رسول امین تمہارے جھوٹ اور افترا سے برئیت کا اظہار کرتے ہیں اور عرض کرتے ہیں (بقول مسیح)، اے اللہ تو پاک ہے، میں ایسا دعویٰ کیوں کر سکتا تھا جو میری شان کے شایان نہیں۔ (سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ (مائدہ ۱۱۶) رسل و مبلغین حق اور ضدی اشرار خدا تعالیٰ کے حضور جھگڑتے ہیں۔ اللہ والے بری قرار دیئے جاتے ہیں اور کذب و افترا کرنے والے اپنے کیے کا بدلہ پاتے ہیں اور جہنم ہی میں ڈالے جاتے ہیں۔

(منزل ششم صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰)

انبیاء پر سلام مگر....

سورہ صافات میں متعدد انبیائے کرام علیہم السلام کا ذکر آیا ہے اور ہر نبی کے تذکرے کے خاتمے پر — سلام آیا ہے۔ مثلاً سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ (۱۰۹) سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ (۱۱۹) سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ (۱۳۰) لیکن حضرت لوط اور حضرت یونس کے ضمن میں سلام نہیں آیا۔ باوجود سے کہ انہیں "مرسلین" میں تسلیم فرمایا ہے۔ وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۱۳۳) وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۱۳۹) خواجہ صاحب نے اس پر طویل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں نے اپنے مخاطبین کے مقابلے میں اولوالعزمی کا ثبوت نہیں دیا۔

تفصیل تفسیر والصافات منزل ششم میں ملے گی۔

یوم — عرش — کرسی

یوم —— عرش اور کرسی یہ تینوں الفاظ خاص طور سے غور طلب ہیں۔ علمائے لغت اور مفسرین ان پر اپنی اپنی تحقیق پیش کرتے رہے ہیں۔ اسی کو سامنے رکھ کر اور موجودہ علمی ریسرچ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جدید مفسرین نے بھی اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس ضمن میں خواجہ صاحب کے خیالات ملاحظہ فرمایئے۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ..... أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۔ (الاعراف-۵۴)

بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہے، جس نے (اس زمین سے متعلقہ) آسمانوں اور (خود) اس زمین کو چھ زمانوں میں پیدا کیا۔

"یوم" کا لفظ ایسے زمانے پر بولا جاتا ہے جس میں کوئی معین کام کیا جائے۔

۱۔ بارہ گھنٹے کی روشنی کے وقت کو بھی یوم کہتے ہیں۔

۲۔ زمین کی محوری حرکت کے چوبیس گھنٹوں کو بھی یوم ہی کہا جاتا ہے۔

۳۔ آدمی کی ولادت کے وقت کو بھی یَوْمَ وُلِدَ ہی بولتے ہیں۔

۴۔ کئی دن تک جاری رہنے والی جنگ بھی یَوْمَ حُنَیْنٍ ہی کہلاتی ہے۔

۵۔ قوم عاد پر سات رات اور آٹھ دن تک چلنے والی آندھی کی مدت (الحاقہ) بھی یوم نحس کہلائی (قمر-۱۹)

۶۔ یوم ہزار سال کا بھی ہوتا ہے۔ سجدہ-۵)

۷۔ اور یوم پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے (معارج-۴)

ان سب صورتوں میں کسی معین کام کی ابتدا سے تکمیل تک کے وقت کو "یوم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ہر شے کی پیدائش کے چھ درجے ہیں۔ انسان کی مادی پیدائش کے چھ مدارج مندرجہ ذیل ہیں۔

نطفہ — علقہ — مضغہ — عظام — لحم — خلقاً آخر۔ بعض اصحاب نے زمین و آسمان کے مدارج حسب ذیل بیان کئے ہیں ملک۔ فلک۔ جماد۔ نبات۔ حیوان۔ انسان لیکن صحیح مراتب وہی ہیں جن کا ذکر سورۃ السجدہ آیت ۱۰ تا ۱۲ میں کیا گیا ہے اور وہ بھی چھ ہی ہیں۔

اب آیئے عرش کی طرف۔ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ۔ پھر اپنی مخلوقات پر حکومت کرنے کے لیے وہی تنہا عرش پر آیا (مسیح وغیرہ کوئی اس کے داہنے نہیں بیٹھ سکتا) مخلوق کے تمام کاموں کی تدبیر اس کے قبضۂ قدرت میں ہے (يُدَبِّرُ الْأَمْرَ۔ یونس)

عظیم الشان حکومت کی تربیت کرنے والا وہی ہے۔ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (توبہ - ۱۲۹)
وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ (زمر - ۷۵) اور (چشم بصیرت سے) دیکھتا ہے فرشتوں کو عرش کے گرد، حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے ہوئے۔

ہر ہر ذرّے کا عرش (حکومت خداوندی) اس کے ساتھ ہے۔ اس لیے ہر ذرّہ حامل عرش ہے، یعنی قانون خداوندی کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ ان اجزائے لاتیجزی (ایٹم) میں کوئی تصادم نہیں ہوتا (فرد واحد کس سے تصادم کرے گا؟) مگر حوال العرش والوں میں اس وجہ سے کہ وہ مرکب ہیں۔ موثر و متاثر اور منفی و مثبت کا معاملہ جاری رہتا ہے۔ جیسے مرض و صحت، طاقت و ناطاقتی، غلبہ و شکست، جذب و دفع میں تصادم ضروری ہے۔ الحاصل تمام مقامات، اسباب اور سامانوں کی زمام مالکِ عرش، صاحبِ حکومت، رحمان کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس عرش پر وہی راست آیا۔ کسی دوسرے کیلئے ممکن ہی نہیں کہ وہ اس میں شریک ہو سکے۔ تمام موجودات اسی کی تسبیح اور اسی کی حمد پر دلالت کر رہی ہے (يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ) وہی شہنشاہ عادل ہے جو ہر معاملے کا بہترین فیصلہ کرتا ہے۔ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ اس کے سوا کون علیم الکل، عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ کون ہر قسم کی حمد و ستائش کا سزاوار ہے؟ الحمد للہ رب العالمین۔ (منزل ششم تفسیر سورۂ زمر صفحہ ۱۴۰ و ۱۴۱)

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (الحدید - ۴) وہی (خدا) ہے جس نے (اس زمین سے متعلقہ) آسمانوں اور (خود) زمین کو چھ زمانوں میں پیدا کیا (اللہ تعالیٰ ہر زمین کو اسی طرح پیدا کرتا ہے۔ یہ زمین کل کائنات کے مقابلے میں ایک ذرّے سے بھی کم حیثیت ہے۔ اس میں کون سی حکمت و معقولیت ہے کہ اللہ اس ذرّہ بے مقدار (زمین) کو تو چار دنوں (زمانوں) میں پیدا کرے اور باقی تمام کائنات کو صرف دو دن میں مکمل کر دے؟) (اللہ تعالیٰ نے ہر زمین اور اس سے متعلقہ سماوات کو اسی طرح بنایا ہے کہ اس میں متصرفانہ دخل دیا جا سکتا ہے۔ اگر انسان شریانہ

لہ مولانا عثمانی اس موقع پر لکھتے ہیں ..... زمین و آسمان کی سلطنت، اور عرش عظیم یعنی تخت شاہنشاہی کا مالک وہی ہے، امام راغب لکھتے ہیں۔ ذوالعرش المجید ...... ھو اشارۃ الی مملکتہ وسلطانہ لا الی مقر یتعالیٰ عن ذالک عرش کا مطلب مملکت اور حکومت ہے۔ اس تعالیٰ کے قرار پکڑنے کی جگہ نہیں اس کی ذات اس سے بلند ہے۔

کہ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ ..... قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ حٰمٓ السجدہ ۹ و ۱۰) یہ سب کام چار دن میں ہوا دو روز میں زمین پیدا کی گئی اور دو روز میں اس کے متعلقات کا بندوبست ہوا ...... فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ پھر کر دیئے وہ سات آسمان دو دن میں (عثمانی ؒ)

مداخلت سے بحر و بر میں فساد[1] پیدا کر سکتا ہے تو کیا خدا تعالیٰ بغرض اصلاح احوال معقول مداخلت نہیں کر سکتا! اس کی حکیمانہ مداخلت کو رکاوٹ سمجھنا بالکل بے معنی ہے ۔ اسباب کو پیدا کرنا، ترتیب دینا، ان میں تصرف جاری رکھنا عین حکمت و رحمانیت کے مطابق ہو رہا ہے ۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف - ۵۴) اسباب کے سرے (آغاز کار) یا کنجیاں اس کے قبضے میں ہیں ۔ اور ان کا علم اسی کو ہے ۔ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (انعام - ۵۹) یہی اوپر کی کنجیاں عرش کہلاتی ہیں جس طرح کوئی شے اللہ تعالیٰ کے علم و رحمت کے احاطہ سے باہر نہیں اسی طرح اس کی "کرسی" بھی سب پر حاوی ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۔

پس ہر ہر ذرے کا عرش اس کے ساتھ ہے، ہر زمین اور اس کے متعلقہ سماوات کا عرش ان کے ساتھ ہے ۔ دوسری بے شمار زمینوں اور ان کے سماوات کا عرش بھی ان کے ساتھ ہے ۔ جس طرح انسان بار امانت کا حامل ہے، اسی طرح تمام انفرادی و اجتماعی موجودات حامل عرش ہیں۔ یعنی عرش کی محکوم ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی حکومت کو سنبھالے ہوئے ہیں، ایک عرش کے حاملین کے ارد گرد بے شمار عرشوں کے حامل ہیں۔ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (زمر - ۷۵) سے دوسرے محکوم ہی مراد ہیں ۔ سات قسم کے، پتھر (اثیر) اور کثیف ارضی مادہ ۔ یہ آٹھوں امن کے وقت اور شکست و ریخت کے وقت بھی حامل یا محکوم ہی ہوتے ہیں ۔ البتہ شکست و ریخت کے وقت ملائکہ الگ اور برکنار ہو جاتے ہیں۔ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا (حاقہ) ان سے ان کے مناسب مواقع پر کام لیا جاتا ہے ..... اور یہ ظاہر ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد ہی ان پر حکمرانی کا موقع آتا ہے اس لیے فرمایا) پھر وہ (خدا) عرش پر ٹھیک بیٹھا (راست آیا)، اس کے ساتھ عرش حکومت پر متمکن ہونے کی کسی اور کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی) وہ (خدا جزو جزو) جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے (مثلاً آسمانی تاثیرات، بیج، پانی اور حشرات الارض وغیرہ) اور جو اس زمین سے نکلتا ہے (نباتات، پانی، لاوا، روح و نسمہ وغیرہ) اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے (سماوی تاثیرات، بارش، شہاب ثاقب وغیرہ) اور جو آسمان میں چڑھتا ہے ..... (پاک کلمات اعمال، ارواح وغیرہ) اور وہ (خدا ان تمام تغیرات میں) تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو۔ اور اللہ ہر حال میں) تمہارے کاموں کو دیکھنے والا ہے منزل ہفتم ۔ سورہ حدید ص۴

وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۔ اور فرشتے رحمن کو تم خدا کی بیٹیاں بناتے اور عرش کو قائم رکھنے والے بتاتے ہو زلزلوں وغیرہ تباہیوں کے وقت آسمان میں خدمت گری کے اہل نہیں رہتے ۔ البتہ وہ آسمان سے برکنار ہو کر کفار کو گرفتار کر کے آگ میں لے جاتے ہیں کفار کو اس وقت مہلت نہیں ملتی مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ (حجر - ۸) اسباب کے سرے جو اللہ تعالیٰ کی تحریک سے کام کرتے ہیں، عرش الٰہی ہیں ۔ اس عرش کو زمین اور سات آسمانوں (یعنی آٹھوں) نے امن اور تباہی، ہر حال میں اپنے سر پہ اٹھایا ہوا ہے ۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان نے بار امانت

---

[1] ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ ..... (روم - ۴۱) لوگوں کے ہاتھ کی کمائی سے جنگل اور دریا میں فساد ظاہر ہوگا۔

اٹھایا ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ ۔ (الاحزاب ۷۲)

اور فرشتے آسمان سے برکنار ہوتے ہیں اور اس دن (کس) اپنے (سروں) پر تیرے رب کے عرش کو آٹھ (سات آسمان اور آٹھویں زمین) اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں (ثمانیہ کی تنکیر تحقیر کے لیے ہے بحکوم چیزیں عالم کے مقابلے میں حقیر ہی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آسمان کے اس حصۂ زمین کے اس (تباہ شدہ) علاقے کو پھر درست کرتا ہے، جیسے اُس نے پہلے بنایا اور نئے ملائکہ کو خدمت پر مامور کرتا ہے۔ زمین اور اس سے متعلقہ آسمان کہتے ہیں اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ (حم السجدہ - ۱۱) ہم فرماں برداری کو حاضر ہیں۔ (منزل ہفتم۔ الحاقہ ص۲۴۶)

کرسی

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (بقرہ - ۲۵۵) اس تعالیٰ کی کرسی (یعنی عرش) نے آسمانوں اور زمین کو سما لیا ہے (کوئی جگہ نہیں جہاں اس کے قوانین کام نہ کرتے ہوں) اور اس کو ان دونوں (یعنی قوانین اور جن مخلوقات پر وہ قوانین جاری ہوتے ہیں) کی حفاظت گراں نہیں گزرتی۔ وہی ہے بلندی و عظمت والا (منزل اول بقرہ ص۲۷۴)

کرسی کے متعلق امام راغب کہتے ہیں۔ فقد روی عن ابن عباس ان الکرسی العلم وقیل کرسیہ الملک۔ بقول ابن عباس کرسی سے مراد علم ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ اس تعالیٰ کی کرسی سے مراد بادشاہت ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ...

(مومن ۷) وہ لوگ جو اٹھاتے ہیں حکم (اللہ کا، یعنی حکم بردار ہیں۔ یہ ابتدائی سلسلے والے ہیں۔ اللہ کو جو وراء الوراء ہے کوئی نہیں دیکھ سکتا، مگر رویت قلبی سے اس کا امکان ہے) اور جو اس کے اردگرد ہیں (یعنی ذرات ہوں یا مرکبات سب کے سب) اپنے پروردگار کی ستائش کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ وہ سبوح و قدوس ہے، منزہ و مبرا ہے۔ کسی عرش و کرسی و تخت وغیرہ میں محدود و مقید نہیں۔ ان کی تسبیح اس لیے ہے کہ وہ فرماں بردار ہیں) اور ایمان رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور بخشش مانگتے ہیں (اپنے پروردگار سے۔ یہ ہے نیچر وغیرہ کا نیکوں کی خیر خواہی میں لگے رہنا۔ یہ حاملین اور ماحول والے بزبان حال خیر طلب ہیں) ان لوگوں کے لیے جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں (اور اگر حامل امانت انسان سرکش ہو جائے تو یہی کائناتی اشیا تباہی کا باعث ہو جاتی ہیں۔ راست باز کے لیے ہر طرف سے رحمت کی بارش ہوتی ہے۔ الحاصل یہ اشیا کہتی ہیں) اے ہمارے ربوبیت کرنے والے! تو نے ہر چیز کو اپنی رحمت اور علم سے احاطہ کیا ہوا ہے (رحمت عام ہوا، بارش وغیرہ سے تو کفار بھی محروم نہیں۔ لیکن کوشش اور ایمان و عمل صالح سے خاص انعامات حاصل ہوتے ہیں سب۔ الحاصل یہ کارکنان قدرت کہتے ہیں کہ اے رحیم و کریم!) توبہ کرنے والوں اور اپنے راستے پر چلنے والوں کو بخش دے اور ان کو دوزخ کے عذاب سے بچالے (منزل ششم سورہ مومن ص۱۴۹)

خلاصہ

مفسر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عرش و کرسی کا مطلب حکومت سلطنت، بادشاہت احکم رانی ہے اور حاملین عرش سے مراد اللہ تعالیٰ کی اولین تخلیق یا اساس کائنات ہے جس کو عام علمی اصطلاح میں ایٹم، جز لایتجزیٰ، بسائط، عناصر، سالمات وغیرہ کہا جاتا ہے اور "من حولہ" یا عرش کے گرد والے وہ مرکبات ہیں جو مختلف موالید و طبقات میں وجود پذیر ہوتے ہیں۔

حمل عرش یا عرش کو اٹھانے کا مطلب حکم برداری ہے۔ ملائکہ وہ کارکنان قدرت، خدام الٰہی ہیں جو اس کائنات میں تصرفات کا واسطہ بنتے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔

آسمانی مخلوق

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْہِمَا مِنْ دَآبَّۃٍ ط وَھُوَ عَلٰی جَمْعِہِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ (شوریٰ۔ ۲۹)

آسمانوں اور زمین کی مخلوقات اس (خدا) کی نشانیوں میں سے ہے ۔اور چلنے پھرنے والے (دو پاؤں پر، چار پاؤں پہ یا پیٹ کے بل چلنے والے) جو ان دونوں (ارض وسما) میں پھیلائے (یہ سب بھی اُسی کی نشانیوں میں سے ہیں) اور وہ (خدا) ان کو ارتقا دے کر جب (بھی) چاہے جمع کر دینے کی قدرت رکھتا ہے ۔فضائی، سماواتی اور ماورائے نظام ارضی مخلوقات جو دوسرے کُرّوں میں مقیم ہے۔ اگر کسی وقت مشیت خداوندی کے تحت آپس میں مل جائیں، کیا بعید ہے — یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اہل جہنم کو کفر...... کفر و شرک اور فسق و فجور کے امراض سے پاک صاف کر کے اہل جنت کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔

(منزل ششم صہ ۲۲۰ و ۲۲۱)

شق القمر

شہاب ثاقب یا گرنے والے پتھر ستاروں ہی کے ٹکڑے ہوتے ہیں دُم دار ستارہ ایسے ہی پتھروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ شہاب ثاقب کے جتھے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ اکثر کرۂ ہوائی میں پہنچ کر رگڑ سے جل جاتے ہیں۔ ان میں بعض سطح زمین پر گر جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حفاظت نہ ہو تو یہی ستارے دنیا کو تباہ کر دیں۔ آسمان میں تباہی کے بہت سے اسباب موجود ہیں۔ زمین میں بھی زلزلے آتے رہتے ہیں۔ لزبن کے ایک زلزلے سے پانچ منٹ میں ساٹھ ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔ زمین میں آتش خیز پہاڑ پھٹ جاتے اور سارا گرد کے علاقے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اٹلی میں کوہ وسوویس کے پھٹنے سے کئی شہر تباہ ہو گئے اسی طرح بڑی بڑی جنگوں میں بہت سے لوگ اکٹھے ہی مارے جاتے ہیں، عام وباؤں، طوفانوں، قحطوں، سخت آندھیوں اور ژالہ باریوں سے بڑی بڑی قومیں بیک وقت ہلاک ہو جاتی ہیں۔ یہ گرفت کی ساعت سخت اور کڑی ہے۔ سورۂ قمر میں اسی ساعت کے ثبوت میں کرۂ قمر کے پھٹنے کو اس کے بعد اقوام نوح، عاد، ثمود، فرعون اور قوم لوط کے حالات کو بطور شواہد پیش کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ جس طرح یہ لوگ قدرتی قواعد کے مطابق نہ کہ خارق عادت کے طور پر، گرفتار عذاب و ہلاکت ہوتے تھے، یہی قانون اب بھی جاری ہے اور جاری رہے گا۔

چاند زمین سے چھوٹا ہونے کے سبب زمین کے گرد گھومتا ہے۔ اس میں بہت سے آتش خیز پہاڑ ہیں۔ جو کبھی بجھ جاتے ہیں اور کبھی بجھے ہوئے پہاڑ زور شور سے پھٹ پڑتے ہیں۔ چاند میں زلزلے بھی آتے ہیں۔ زمانہ ماضی میں وہ کئی مرتبہ پھٹ چکا ہے۔ اس کی شکست و ریخت کا پتا چلتا ہے۔ یہ داغ اصل میں غار اور شگاف ہیں جو اس کی سطح پر نمودار ہیں۔ عوام اجرام سماوی کو شکست و ریخت سے منزّا سمجھتے ہیں[1]۔ اگر ان کو چاند کے پھٹنے کا کوئی نشان دکھایا جائے تو وہ اس سے اعراض کریں گے (یُعْرِضُوا) اور نظر کا دھوکا قرار دیں گے (سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ) جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ سورہ القمر کے نزول سے بہت پہلے چاند کسی بڑے زلزلے یا پہاڑ کے پھٹنے سے پھٹ چکا تھا۔ ۱۹ اپریل ۱۸۸۲ء کو بھی چاند کے غیر روشن حصے میں ایک آتش خیز پہاڑ پھوٹ پڑا تھا اور قریباً دس میل کے میدان میں اس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ماہرین علم ہیئت جو ستاروں کا مطالعہ کلاں ناشیشوں کے ذریعے سے کرتے رہتے ہیں۔ ایسی باتوں کا خیال رکھ سکتے ہیں۔ لیکن عام لوگ اس سے بے خبر ہی رہتے ہیں[2]۔

قرآن حکیم میں یہ کہیں نہیں فرمایا گیا کہ چاند کے دو ٹکڑے الگ الگ ہو گئے اور دور کے ممالک کے لوگوں نے بھی انہیں دیکھا

---

[1] بعض صنم پرست قومیں تو چاند، سورج اور تاروں کو دیوتا اور انسانی تقدیر کے خالق سمجھتی ہیں۔

[2] یاد رہے کہ یہ تحقیق اس زمانے میں پیش کی گئی جب چاند پر جا کر ٹہلنے اور تحقیق کا خیال تک بھی کسی کو نہیں آیا تھا۔

اور اگر گواہی دی۔ اگر ایسا ہوتا تو مکے والے رسول کریمؐ اور مومنینؓ کے قتل کے درپے نہ ہوتے اور انہیں مکے سے نہ نکال دیتے اور پھر سینکڑوں میل سفر کر کے ان پر حملہ نہ کرتے۔ بلکہ دوسرے ممالک کے لوگ بھی اس حیرت انگیز واقعہ کو دیکھ کر بے تامل اسلام کی حقانیت پر ایمان لے آتے۔ اور تمام کتب تاریخ میں اس کا ذکر پایا جاتا۔ اور قدرتی قانون کے مطابق اس وقت مدوجزر کے حساب میں بھی فرق پڑ جاتا، جس کی وجہ سے زمین پر بھی خیر نہ گزرتی۔

"شق" کے معنی دو الگ ٹکڑے کر دینا سمجھے گئے ہیں۔ حالانکہ معمولی شگاف پڑ جانے کو بھی "شق" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جیسے کہ ارشاد ہے۔

یعنی جب ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں۔ پھر زمین کو شق کرتے ہیں جو شق کرنے کا حق ہے (یعنی پھاڑتے ہیں) پھر زمین کو پھاڑ کر اس سے اناج وغیرہ اُگتے وقت اس کے دو ٹکڑے ہو جایا کرتے ہیں اور وہ دو الگ الگ حصوں میں بٹ جاتی ہے۔

قرآن مجید سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ نے بھی چاند کو دو حصوں میں الگ الگ ہوتے نہیں دیکھا۔ اور یہ بھی کہیں نہیں لکھا کہ حضورؐ کی دو انگلیوں کے اشارے سے چاند دو حصوں میں پھٹ گیا۔ خواجہ صاحب شق قمر کے معجزہ نہ ہونے میں منفرد نہیں۔ قدماء میں بھی متعدد بزرگ ان کے ہم نوا ملتے ہیں۔ چنانچہ امام رازی لکھتے ہیں۔ وقال بعض المفسرین المراد سینشق۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ چاند (قریب قیامت) پھٹ جائے گا۔ (زیر تفسیر سورہ قمر)

امام ابوحیان اندلسی (البحر المحیط جلد ۸ صفحہ ۱۷۳) امام حسن البصری کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔ ان المعنی اذا جاءت الساعۃ انشق القمر بعد النفخۃ الثانیہ مطلب یہ ہے کہ جب قیامت آئے گی تو دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے بعد چاند پھٹ جائے گا۔

امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کا خیال یہ ہے کہ فی الواقع چاند کے دو الگ الگ ٹکڑے نہیں ہوئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دیکھنے والوں کو ایسا کر دیا کہ انہیں دو نظر آنے لگے۔ ("الاسلام یتحدی" مصنفہ۔ وحید الدین خان ص ۲۱۸)

شاہ ولی اللہؒ کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

قال بعض من له معرفة بعلم الاثر والحكمة الطبيعية كان من هذا القبيل انشقاق القمر فانه حادثة قليلة الوقوع جعلها الله تعالى امارة بقرب القيامة كما جعل الخسف والزلازل والملاحم آيات له ..... وليس يجب ان يكون انشقاقه البتة انشقاقا بعين القمر بل يمكن ان يكون ذالك بمنزلة الدخان وانقضاض الكوكب والخسوف والكسوف مما يظهر في الجو لاعين الناس فيستعمل بازائها في اللغة العربية الفاظ وضعت لما يقع على انفس هذه والاشياء ("تاویل الاحادیث" لشاہ ولی اللہؒ ص ۱۰۲، ۱۰۳) ایک ایسے عالم نے جسے علم الاثر اور حکمت طبیعیہ کی معرفت ہے کہا ہے کہ چاند کا شق ہونا اس قسم کے معجزات میں سے ہے، کیونکہ یہ بھی قلیل الوقوع حادثہ تھا، اسے اللہ تعالیٰ نے قرب قیامت کی علامت بنایا جیسا کہ اس نے سورج اور چاند کو گرہن لگنے، زلزلوں اور جنگوں کو اس کے لیے نشانیاں بنایا... یہ ضروری نہیں کہ بعینہ چاند میں انشقاق واقع ہوا ہو۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ دھوئیں یا ستارے کے ٹوٹنے یا سورج اور چاند کو گرہن لگنے کی طرح کا ہو جیسا کہ فضا میں لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ان چیزوں کے لیے عربی لغت کے وہ الفاظ استعمال کئے گئے جو فی الواقع ان کے لیے وضع کئے گئے۔

(قصص انبیاء کے رموز اور ان کی حکمت غلام مصطفیٰ قاسمی ص ۴۲-۴۳)

والعادیات

اس سورۃ کی ابتدائی آیات کو مفسرین نے مجاہدین پر منطبق کیا ہے۔ خواجہؒ ان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔
سابقہ سورہ (زلزال) میں زلزلوں کا ذکر ہے، جن میں دیگر قدرتی فوائد کے علاوہ سزا کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ اس سورۃ میں اس بدامنی کا بیان ہے جو ڈاکو لوگ دنیا میں پھیلاتے اور جیسا کرتے ہیں، ویسا پاتے ہیں۔ (زلزال) میں ذرہ بھر نیکی و بدی کے دیکھ لینے کا بیان ہے۔ اس سورۃ میں ارشاد ہے کہ انسان ایسی شرارتیں دانستہ کیوں کرتا ہے؟ اس کی دو وجہیں ہیں۔ (۱) ناشکر گزاری (۲) مال سے محبت۔ تمام فسادات اور ڈاکے وغیرہ انہی دو وجوہ سے ہو رہے ہیں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا (۱) شہادت ہے تیز دوڑنے والے (ڈاکوؤں کے گھوڑوں) کی، جو ہانپ جاتے ہیں (وہ پچھلی رات لوگوں کی نیند کے وقت شب خون مارتے اور ڈاکے ڈالتے ہیں)

فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا (۲) پھر (سموں کے) رگڑنے سے آگ جھاڑنے والوں کی۔

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا (۳) پھر صبح (امن کے وقت) غارت گری مچانے والوں کی۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا (۴) پھر انہوں نے اس وقت (جب کہ زمین نم ناک ہوتی ہے) گرد و غبار اٹھایا۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (۵) پھر اس وقت کسی جماعت کے وسط میں جا گھسے (اور ان پر مصیبت برپا کر دی۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۶) (یہ منظر اس بات کی دلیل ہے کہ) بلاشبہ انسان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ (۷) اور وہ خود اس بات پر گواہ ہے (اپنی برائی کو دیکھتا ہے (در باز نہیں آتا)

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۸) اور وہ مال کی محبت میں بڑا سخت ہے۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ (۹) کیا وہ نہیں جانتا کہ جو چیز قبروں میں ہوتی ہے نہ وبالا ہو جاتی ہے (جسم انسانی ٹوٹ پھوٹ کر دوسرے اجسام کا حصہ بن جاتا ہے)

وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ (۱۰) اور وہ چیز جو سینوں میں ہے، حاصل کر لی جاتی ہے (یعنی روح (نسمہ) پیش ہو جاتا ہے۔

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ (۱۱) بلاشبہ ان کا رب اس دن ان (کے حال) سے خبردار ہوتا ہے (جب وہ جسم کے اندر کی ملفوف چیزوں کو جانتا ہے تو کیا غیر ملفوف اعمال سے غافل ہو سکتا ہے ؟) منزل ہفتم صہ ۲۶۶

القارعة

اس سورہ میں بھی خواجہؒ نے مفسرین سے اختلاف کیا ہے۔ سابقہ سورتوں سے مربوط کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ! ــــ زلزلوں کے وقت جب کہ پہاڑوں اور انسانوں کا کوئی وزن ووقر نہیں ہوتا، روحانی نیکیوں ہی کا وزن ووقار قائم رہتا ہے۔ جن بدعملوں کا وزن ووقار قائم نہیں وہ ٹھوکریں کھاتے اور ذرا سے صدمے سے ہاویہ یعنی آگ کے گڑھے میں گر جاتے ہیں۔ روح کی مضبوطی اور اور قیام پہاڑوں سے بڑھ کر ہے۔ سابقہ سورہ میں ڈاکہ کے ذریعے بدامنی اور ہلچل پھیلانے کا ذکر ہے۔ اس سورہ میں خدائی گرفت سے نہ بچ سکنے کا بیان ہے۔ آخری آیات کا ترجمہ بھی دیکھ لیجیے۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ (۶) سو جس کے تول بھاری ہوئے (یعنی انہوں نے وزن دار عمل کئے، حق سے زیادہ قائم رہنے والی اور مضبوط چیز کوئی نہیں ہوسکتی۔ حق ضرور روشن ہوگا اور اپنی رونق دکھائے گا، جیسے کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے)

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۷) تو وہ شخص خوشی کی زندگی میں ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (۸) (لیکن جس کے تول ہلکے ہوئے (انہوں نے بے وزن اور بے دلیل، مقلدانہ عمل کئے ــــ بے دلیل باتوں کا کوئی وزن نہیں ہوتا)

فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۹) تو اس کی ماں ہاویہ ہے (جہنم کا ہسپتال ماں کی طرح علاج کرتا ہے[1] جہنم ہی اس کا مولیٰ ہے، دوست اور مربی ہے۔ مَاْوٰکُمُ النَّارُ هِیَ مَوْلٰکُمْ (حدید ۱۵) تمہاری یعنی کافروں کی، جائے پناہ آگ ہے، وہی (آگ) تمہاری مددگار ہے (اس سے معلوم ہوا کہ جہنمیوں کو اگر کوئی مدد اور پناہ ملے گی تو آگ ہی کے ذریعے سے ملے گی)

(منزل ہفتم ص ۲۶۷،۲۶۸)

---

[1] راقم آثم نے پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کی کسی کتاب (غالباً ملفوظات) میں پڑھا ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کوئی شخص دوزخ میں نہیں رہے گا۔ دلیل یہ ہے کہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ہر عُسر (دکھ) کے ساتھ یُسر (سکھ) کا ہونا لازم ہے۔ دوزخ بھی ایک عُسر ہے اس کے بعد جنت کا یُسر ملنا ضروری ہے۔

الفیل

خواجہ صاحب نے اس سورہ کو عام روش سے ہٹ کر عقل و تجربہ کی نظر سے دیکھا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ (۱) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا! اریمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے جبری مذہبی کی راہ سے مکہ کے امن کو مٹانے اور مسجد حرام سے ذکر الٰہی کرنے والوں کو بھی روکنے کے لیے بڑے ساز و سامان کے ساتھ حملے کی تیاری کی۔ بہت سے ہاتھی بھی ساتھ لیے۔ پہاڑوں میں بعض درے ایسے بھی ہوتے ہیں جو خاص خاص موسموں میں وبائی بن جاتے ہیں جب وہ لشکر سخت وبائی درے سے گزر رہا تھا، تو ان میں سے بہت سے لوگ بیمار ہو کر اس لمبے درے میں گر پڑے اور قریب مرگ ہو گئے۔ یہ کام اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیروں اور داؤں کو مٹانے کے لیے کیا۔ مکہ شہر امن تھا۔ مناسب تو یہ تھا کہ دوسرے شہروں کو بھی ایسا ہی مامون بنایا جاتا یہ کیسی شرارت ہے کہ محل امن کو محل فساد بنایا جائے۔ اور امن والی مسجد میں بھی خلل ڈالا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام زمین میں برکت کے سامان فراہم کئے ہیں وَجَعَلَ فِيۡهَا رَوَاسِىَ مِنۡ فَوۡقِهَا وَبٰرَكَ فِيۡهَا (حم سجدہ ۱۰) (اللہ نے) زمین میں اس کے اوپر سے پہاڑ رکھ دیئے اور اس کے اندر برکت رکھی۔ ہمیں چاہیئے کہ پوری دنیا کو بابرکت بنائیں اور اپنے بداعمال سے کسی جگہ کو بھی منحوس نہ بنالیں۔

اَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِىۡ تَضۡلِيۡلٍ (۲) کیا ان کے داؤ کو ملیا میٹ نہیں کر دیا (وہ اپنی جنگی تجاویز کو روبہ عمل لانے کے قابل ہی نہ رہے — یہ وبائی سزا پرندوں کے بھیجنے سے پہلے اور الگ واقع ہوئی۔ جنگوں میں مردار خوار اور شکاری پرندے ساتھ لگا دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ لاشوں کو کھا جائیں) وَاَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ (۳) اور (بعد میں) ان پر (مردار خوار) پرندے بکثرت بھیجے (یعنی پہاڑی گدھوں نے) ان میں کچھ حرکت پائی تو ان کی موت کو یقینی بنانے کے لیے درے کے کناروں سے ان پر پتھر پھینکے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔

تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ (۴) وہ (جانور) ان (قریب مرگ لوگوں) کو پتھروں کا نشانہ بناتے تھے (پھر ان کو نوچ نوچ کر کھا جاتے تھے)

فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ (۵) سو انہیں کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا (بدامنی پھیلانے والوں اور جبر مذہبی کرنے والوں سے ایسی سزائیں کچھ بعید نہیں ہیں) منزل ہفتم صہ۲۱

الکوثر

گزشتہ سورہ "ماعون" نے بتایا کہ مکذبین یتامیٰ کو دھکے دیتے مسکین کو کھانا نہ کھلاتے تھے۔ اس سورۃ میں خیر کثیر کے شکریے میں نماز اور غریب نوازی کی تعلیم دی گئی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ (۱) بلاشبہ ہم نے تجھے خیر کثیر عطا فرمائی (حضورؐ کسی شخص کے محتاج نہیں تھے۔ ازواج مطہرات زکوٰۃ دیتی تھیں۔ غریبوں کو آپؐ کے گھر سے کھانا ملتا تھا۔ وہ آپؐ کے گھر سے . . . . . متاع و سامان حاصل کر سکتے تھے۔ آپ ملکی کاموں میں صدقہ بھی دیتے تھے۔ بلکہ مالی مدد دینے میں پیش پیش ہوتے تھے اللہ نے آپ کو نبی بنایا تھا۔ بحکم خدا صاف کہہ دیتے تھے کہ مجھے کسی اجر کی ضرورت نہیں۔

سب سے بڑی خیر قرآن مجید ہے۔ نعمت کی قدر لازم ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ (۲) سو تو اپنے رب کے لیے نماز ادا کر (مکہ غیر ذی زرع . . . . . وادی میں واقع ہے، اس لیے بوقت ضرورت یتامیٰ و مساکین کی پرورش کے لیے) اونٹ ذبح کر (وہمی یہود کی تقلید مت کر جو اونٹ کے ذبح کرنے کو بدشگونی سمجھتے ہیں۔ اگر انسان فوائد کے لیے اونٹ یا گائے کو ذبح کرنے کی ضرورت پڑے، تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ البتہ جانوروں کو ضائع کرنا اور گڑھوں میں دبا دینا بلاشبہ فساد ہے۔ اسی طرح کھیتی کو جلانا بھی فساد ہے جیسا کہ آج کل بھی شر پسند لوگ کرتے ہیں۔ قربانیوں کے لیے خاص دن مقرر کرنا محض وہم ہے۔ اللہ کو گوشت نہیں پہنچتا تقویٰ پہنچتا ہے اور تقویٰ گوشت سے مختص نہیں۔

اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ (۳) بلاشبہ (ایسے نیک کاموں میں) جو تیرا دشمن ہے، بے خیر رہے گا۔ (چنانچہ آپ کا انجام بخیر ہوا۔ اعلیٰ کامیابیاں حاصل ہوئیں، مخالفین کا انجام اگلی سورتوں میں دکھایا ہے)

(منزل ہفتم ۲۷)

اللّھب

گذشتہ سورہ " النصر میں " توحید کی برکت سے اللہ کی مدد اور لوگوں کے فوج در فوج مسلمان ہونے اور غلبہ اسلام کا ذکر ہے سورۂ لہب میں اس کے خلاف اشتعال پذیر مخالفین کی تباہی کا ایک نمونہ پیش کیا گیا۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ دشمنانِ توحید کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ابولہب کسی شخص کا نام نہیں۔ اس کے معنی ہیں شعلے کا باپ یعنی غصّے کی شدت سے بھڑک اٹھنے والا ـــــ اپنی ہی آتش غضب میں جلا ہوا۔ فرعون ہامان اور قارون تین شخص ہیں جن کا نام لے کر ان کی مذمت کی گئی ہے۔ ان کا کوئی عزیز و محب یا ماننے والا دنیا میں موجود نہیں، جس کا دل ان کی مذمت پر دکھی ہو۔ یا وہ اپنی ہتک محسوس کرے۔

قرآن حکیم نے اپنے زمانے کے کسی بھی کافر کا نام لے کر اس کی مذمت نہیں کی۔ یہ ہے اس کی اخلاق آموزی۔" ابی لہب " سے کنایۃ " وہ شخص مراد ہے جو اسلام دشمنی میں اس حد تک بڑھا ہوا ہے۔ کہ اس کو ختم کرنے کے لیے اپنے مال و دولت کی بازی بھی لگا رہا ہے۔ اس کی بیوی اس کے غصّے کی آگ کو بھڑکاتی اور اِدھر اُدھر سے جھوٹی روایتوں کا ایندھن اس میں جھونکتی تھی۔

میاں دو کس جنگ چوں آتش است　　　سخن چین بدبخت ہیزم کش است　(سعدی)

دو شخصوں کے درمیان جنگ لڑائی ایک آگ ہے اور لگائی بجھائی کرنے والا بدبخت اس میں ایندھن ڈالتا ہے۔

عالم آخرت میں اس کی گردن میں زیور کے بدلے بٹی ہوئی رسّی ڈالی گئی جس کے سبب وہ عذاب میں گھسیٹی جا رہی ہے۔ یہ اُس " دین اللہ " کی مخالفت کا پھل ہے جس کا ذکر سورۂ سابقہ میں آیا ہے۔ دین اللہ کا ہوتا ہے کسی بشر کا نہیں، انبیاء اس کی پیروی سے نیکی میں اعلیٰ درجات حاصل کرتے ہیں۔ (ص ۲۷۰ و ۲۷۶)

الفلق

اس سورہ میں رسول کریم[1] کی زبان سے اقرار کرایا ہے کہ وہ بھی اللہ کی پناہ کے بغیر مخلوقات کے شر سے بچ نہیں سکتے ـــــ "ماخلق" تمام مخلوقات پر حاوی ہے۔ جس میں انبیاء بھی شامل ہیں۔ ان کے ساتھ ناجائز محبت (عقیدت) انسان کو حیوان سے بدتر بنادیتی ہے جو لوگ نبیوں کے "عبد" بنتے ہیں۔ وہ ان ضالین (گمراہوں) میں شامل ہو جاتے ہیں، جن کا ذکر سورۃ فاتحہ میں آیا ہے ـــــ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱) تو کہہ میں رب صبح کی پناہ میں آتا ہوں (تاریکی سے نور نکال کر سامنے لے آتا ہے۔ مٹی سے خوشبوئیں، رنگ اور لذتیں پیدا کرتا ہے، مایوسی سے نکال کر امید کی روشنی میں لاتا ہے مخلوقات کے ہوتے ہوئے لوگ دکھوں اور گمراہیوں میں مبتلا رہتے ہیں ہدایت کی توفیق اسی سے ملتی ہے)

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۲) (خدا کی پناہ کن چیزوں سے چاہی ہے؟) ان سب اشیاء کے شر سے جو اس (خدا) نے پیدا کی ہیں (خدا نے تو ہر شے کو احسن[2] بنایا ہے۔ لیکن اس تعالیٰ کی پناہ سے دور ہو جائیں تو تمام نیچر الجھنوں میں پھنسا دیتی ہے۔ انبیاء ورسل بھی اپنے نفس[3] کے شر سے خدا کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ کیونکہ "ماخلق" میں ہر انسان کا نفس بھی شامل ہے۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۳) (اللہ تعالیٰ کی پناہ کے بغیر تمام اشیاء میں شر کے پہلو پیدا ہو سکتے ہیں۔ تین چیزوں سے شر کا صدور خصوصاً زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کا ذکر خاص طور پر فرمایا ہے۔

۱۔ وہ شر جو ظاہری تاریکی سے پیدا ہوتے ہیں۔ چوروں، غضب خون مار نے والوں، سانپوں بچھوؤں اور درندوں کے خطرات۔

۲۔ باطنی تاریکی کے شر یعنی جہالت، توہمات، شہوات۔ عورتیں عموماً جھاڑ پھونک کراتی رہتی ہیں، حکیمانہ علاج معالجہ میں روک بنتی ہیں۔ ایک دوسری کو یہی ترغیب دیتی ہیں۔ جادوگرنیاں اپنے خیال فوائد کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ مضر صحت اور جنون پیدا

---

[1] غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مخلوقات میں کوئی نہیں جو رب کی پناہ کا بدل ہو سکے۔ بلکہ مخلوقات سے ایسے امکانات بھی وجود میں آتے رہتے ہیں کہ بقول شاعر یہ کہنا پڑتا ہے۔

مرا بخیر تو امید نیست شر مرساں"

[2] اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (سجدہ)

[3] وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِيْ (یوسف۔ ۵۳) - قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ (قصص- ۱۶)

کرنے والی چیزیں لوگوں کو کھلا دیتی ہیں[1]، بھوت پریت کے تصرفات کی قائل ہو کر شرک پھیلاتی ہیں۔ یہ سب توہمات کے شر ہیں —— شہوت کی تاریکی کے شر یہ ہیں کہ بعض عورتیں مردوں کے پختہ عزائم کو بدل دیتی ہیں۔ وہ ان کے دام میں گرفتار ہو کر عہد و پیمان سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ بد رسموں کے ارتکاب پہ مردوں کو مجبور کر دیتی ہیں۔ حکام کے پاس پہنچ کر ان کے انصاف میں مخل ہوتی ہیں۔[2] ایسے کاموں میں عورتوں کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ چونکہ اس قسم کی عورتیں سراپا فتنہ و شر ہوتی ہیں، اس لیے ان پر "آل" لایا گیا ہے۔

۲۔ وہ شر جو غصہ اور کینہ کشی سے پیدا ہوتے ہیں۔ حاسد دوسروں کی نعمت کا زوال چاہتا ہے۔ جس وقت وہ اپنے دل میں حاسدانہ منصوبے تیار کرتا ہے۔ اس کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ (۴) اور مردوں کے پختہ ارادوں میں پھسپھسانے والیوں کے شر سے (جن کی للچاہٹ سے مردوں کے پکے ارادے اور عہد بھی متزلزل ہو جاتے ہیں ..... حکام بھی اپنی بیویوں اور معشوقاؤں کی جادو بھری آواز سے متاثر ہو کر ظلم پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (۵) اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔ (قرآن کی تصریحات کے مطابق جادو صرف ایک دھوکا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جو ساحر آئے ان کے کرتبوں کو قرآن نے نظر فریب چال قرار دیا ہے جس کی حقیقت کچھ نہیں۔ ساحر کسی کو بیمار نہیں بنا سکتا۔ الا یہ کہ کوئی شخص خود ہی اپنے وہم اور خوف سے مریض بن جائے۔

جس ذات بابرکات پہ قرآن نازل ہو کیا وہ مسحور ہو سکتی ہے؟ افسوس ہے کہ بخاری میں نبی کریمؐ کو سخت جادو زدہ قرار دیا ہے اور ان آخری دو سورتوں کی شان نزول یہی بتائی ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ لوگ ظالم ہیں۔ جو رسول کریمؐ کو جادو زدہ کہتے ہیں۔ جس شخص کا دماغ جادو کے زیر اثر مریض ہو گیا ہو اس کی پیش کردہ وحی پہ کیا اعتماد ہو سکتا ہے؟ —— اس مقام پر جن آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى (طٰہٰ ۔ ۶۹) ان (ساحروں) کا بنایا ہوا تو جادوگر کا فریب ہے۔ اور جادوگر جہاں بھی ہو اس کا بھلا نہیں ہوتا۔ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (بنی اسرائیل ۔ ۴۷) ظالم لوگ (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم ایک جادو زدہ شخص کے کہنے پر چلتے ہو۔

---

[1] امرتسر میں مسجد والی کٹڑہ خزانہ کا امام اور قبرستان بابا کا سنگھ کا ایک گورکن خاکی تعویذ وغیرہ کا پیشہ کرتے تھے۔ مختلف دواتوں کی سیاہی میں خاص خاص ادویہ (سم الفار وغیرہ) ملا رکھتے تھے۔ بعض عورتیں اپنے کسی دشمن (سوکن یا شوہر وغیرہ) کی شکایت کرتیں تو وہ تعویذ دیتے کہ پانی میں گھول کر پلاؤ۔ پینے والا بیمار ہو کر موت کا نوالہ بن جاتا۔ اس طرح ان کا کاروبار خوب چمکا ہوا تھا۔

[2] ہم نے امرتسر ہی میں ہندو مسلم فسادات کے دوران یہ بھی دیکھا کہ متمول ہندو غریب مسلمانوں پہ ظلم ڈھاتے۔ پھر خوبرو عورتیں حکام کے پاس بھیج کر مسلمانوں ہی کو گرفتار بھی کرا دیتے تھے۔ آج کل یہودی عربوں کو مغلوب رکھنے کے لیے دوسرے ذرائع کے علاوہ ٹریننگ پائی ہوئی حسیناؤں سے بھی بڑا کام لے رہے ہیں۔

سورہ مُجادلہ[1]

ایک عورت کا رسول کریمؐ سے مجادلہ

مُجادِلہ کے معنی ہیں جھگڑنے والی عورت —— ایک عورت نے ظہار کے متعلق حضرت رسول کریمؐ سے جھگڑا کیا۔ باہم کئی سوال و جواب ہوئے۔ جب وہ آپؐ کی باتوں سے مطمئن نہ ہو سکی تو اللہ تعالیٰ کے حضور شکایت کرنے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے جو سمیع و بصیر ہے۔ اس کی فریاد سنی اور اس کے حق میں فیصلہ نازل فرمایا —— جیسا کہ ارشاد ہے۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (مجادلہ آیت ۱)

اللہ نے اس عورت کی بات سن لی (یعنی قبول فرمائی) جو تیرے ساتھ اپنے شوہر کے متعلق جھگڑتی تھی اور (تجھ سے مطمئن نہ ہو کر) اللہ کی طرف شکایت کرتی تھی۔ اور اللہ تم دونوں کے سوال و جواب کو سنتا تھا بلاشبہ اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

اس واقعہ سے رسول کریمؐ کی بے نفسی اور خشوعِ قرآنی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ آپؐ اپنی بات کو مثل قرآن نہیں جانتے تھے۔ مومنوں کو بھی معلوم تھا کہ رسول کریمؐ کے ساتھ کسی دینی معاملے میں عورتوں تک کو بھی جھگڑنے اور سوال و جواب کرنے کا حق حاصل ہے۔ صرف ایک خدا کی ہی ذات ہے جس پر کوئی سوال نہیں ہو سکتا۔

لَا يُسْـَٔـلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔــلُوْنَ (انبیاء۔ ۲۳)

اس حقیقت کو عالم آشکار کرنے کے لیے اس سورۃ کا نام ہی "مجادلہ" رکھ دیا گیا۔

"تَحَاوُرَكُمَا" کے لفظ سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عورت رسول کریمؐ سے جس بات پر جھگڑ رہی تھی۔ اس کے متعلق حضورؐ سے کئی سوال و جواب ہوئے۔ اگر وہ مومنہ صحابیہؓ رسول کریمؐ کی ہر دینی بات کو وحی سمجھتی تھی تو کیا وہ وحی پر بار بار اعتراض کر رہی تھی؟ اگر وہ رسول کریمؐ کے فیصلے کو وحی سمجھتی تھی تو اللہ تعالیٰ کے حضور رسولؐ کے فیصلے کے خلاف شکایت کیوں کی؟ اور اللہ تعالیٰ نے نبوی فیصلے کے خلاف اس عورت کی بات کی تائید کیوں فرمائی!

صاحبِ وحی رسول کو ان لوگوں کے ساتھ مشورہ کرنے کا حکم ہے۔ جن پر وحی نازل نہیں ہوتی تھی۔ مشورے والی بات رسول کریمؐ

---

[1] کتاب صفحہ ۵۹۲ تک شائع ہو چکی تھی کہ سورۂ مجادلہ تا زلزال کا گم شدہ مسودہ مل گیا۔ جو آخر میں ملحق ہے۔ ع۔ ع

کی زبان سے نقل کر دی الٰہی نہیں ہو جاتی تھی۔ منزل ہفتم صفحہ نمبر،،

اُسوۂ حسنہ

قرآن حکیم سے ثابت ہے کہ ،، اسوۂ حسنہ ،، کی تخصیص حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے۔ بلکہ نبی کے علاوہ غیر نبی کا اسوہ بھی حسنہ ہو سکتا ہے ساسی اگر قرآن حکیم اس کی تصدیق کر دے تو وحی کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا! ——

لَقَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ..... (ممتحنہ ۲۰)

مسلمانو! تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھ والوں (کی عملی زندگی) میں نیک نمونہ ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور تمہارے غیر اللہ معبودوں سے الگ ہیں .....

مسلمانوں کو حکم ہے کہ اس مشترکہ اسوہ کی پیروی کریں۔ پھر اس کو کہاں سے تلاش کریں۔ یہ مشکل بھی قرآن نے خود ہی حل کر دی کہ قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں اسی آیت میں شرح اسوۂ بھی آگئی اسی طرح رسول کریمؐ کا اسوہ بھی قرآن نے خود بیان کر دیا۔ (منزل ہفتم صفحہ نمبر ۹۲)

مسیحؑ کی آمد ثانی

عیسائی اور عیسائیوں کے زیر اثر مسلمان بھی اس بات کے قائل ہیں کہ مسیحؑ آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قیامت سے پہلے تشریف لائیں گے اور ساری دنیا پر حکومت کریں گے وغیرہ وغیرہ

لیکن انجیل اور قرآن دونوں کے بیانات کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے واقعی اپنی دوبارہ آمد اور جاہ و جلال کی پیش گوئی کی تھی۔ جو واقعہ صلیب سے کچھ عرصہ بعد پوری ہوئی ان کو جاہ و جلال حاصل ہوا اور ان کے دشمن مغلوب و ذلیل ہوئے۔ ذیل میں اس کی تصریح دیکھئے۔

انجیل متی باب ۱۶ آیت ۲۷، ۲۸ میں حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں :-

" ابن آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آئے گا اس وقت ہر ایک کو اس کے کاموں کے مطابق بدلہ دے گا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو یہاں کھڑے ہیں، ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ جب تک ابن آدم (مسیحؑ) کو اس کی بادشاہی میں آتے نہ دیکھ لیں گے موت کا مزہ نہ چکھیں گے "

یہی مضمون مرقس باب ۹ آیت ۱ میں وارد ہوا ہے :

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسیحؑ کی آمد ثانی ان کے بعض حاضرین و سامعین کی زندگی میں وقوع پذیر ہو گی۔ اور شاہانہ ٹھاٹھ کے

ساتھ ہو گی۔

اب قرآنی بیان سنیے!

...... المسیح عیسی ابن مریم وجیھا فی الدنیا والاخرۃ ومن المقربین (آل عمران ۴۵)

۔ مسیح عیسیٰ بیٹا مریم کا رتبے والا دنیا اور آخرت میں اور اللہ کے مقربوں میں" (شیخ الہند)

وجیھا فی الدنیا والاخرۃ کہہ کر اطمینان کر دیا کہ خدا اس کو نہ صرف آخرت میں بلکہ دنیا میں بھی بڑی عزت و وجاہت عطا کرے گا (عثمانی)

وجاہت یا وجیہ کا ترجمہ بھی قرآن حکیم ہی سے پوچھ لیجیے!

حضرت موسیٰ کے متعلق ارشاد ہے: وکان عند اللہ وجیھا (احزاب: ۶۹)

اور تھا (موسیٰ) اللہ کے نزدیک آبرو والا (شیخ الہند)

موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے نزدیک "وجیہ" فرمایا ہے۔ مسیح کو صراحت کے ساتھ دنیا اور آخرت میں دونوں میں وجیہ کہا ہے ان کی وجاہت ظاہر ہے کہ ملک و مال اور لاؤ لشکر والے فرعون کے مقابلے میں معجزانہ طور پر کامیاب ہوتے ہیں اور وہ اپنے تمام حشم خدم سمیت فلک کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ ایسی ہی وجاہت مسیح کو حاصل ہوئی ان کے دشمن مغلوب ہوئے اور وہ اپنے انصار کے تعاون سے غالب و فاتح ہوئے۔ انجیل اس غلبے اور کامرانی کی خبر تو دیتی ہے۔ لیکن اس کے وقوع کے متعلق خاموش ہے۔ قرآن کھلے لفظوں میں اس تاریخی واقعہ کو آشکار کرتا ہے۔

یا ایھا الذین امنوا کونوا انصار اللہ کما قال عیسی ابن مریم للحواریین من انصاری الی اللہ قال الحواریون نحن انصار اللہ فامنت طائفۃ من بنی اسرائیل وکفرت طائفۃ فایدنا الذین امنوا علی عدوھم فاصبحوا ظھرین۔ (صف ۱۴،۱۳)

مسلمانو! اللہ کے مددگار بن جاؤ ــــ جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا کہ اللہ (جہاد فی سبیل اللہ) کی طرف کون میرا مددگار ہے؟ حواری بولے ہم اللہ کے (بارے میں) مددگار ہیں۔ پھر بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور ایک (دوسرا) گروہ کافر ہوا پھر ہم (خدا) نے ان کی مدد کی جو ایمان لائے ان کے دشمنوں کے مقابلے میں پھر وہ فتح یاب ہوئے۔

آیت ۱۴ میں "کما" کا لفظ غور طلب ہے یہ کاف تشبیہ یعنی اصحاب محمد و اصحاب عیسیٰ دونوں کی کامیابی ایک دوسرے کے مشابہ ہونی چاہیے یعنی دونوں اپنے اپنے رسولوں کی زندگی میں فاتح و کامران ہوتے ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ عیسیٰ کے بعد ان کے حواری کامیاب ہوئے یہ "کما" ان کی تائید نہیں کرتا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں!

یہ بات کہ مسیح جانکنی سے گھبرا گئے تھے قطعاً غلط ہے۔ شریروں نے ان کو مصلوب کی مانند بنا دیا (شبہ لھم۔ نساء ۱۵۷) ان کے شاگرد انہیں اٹھا کر ایسی جگہ لے گئے جہاں خدا تعالیٰ نے (صلیب کے زخموں سے) شفا بخشی۔ پھر اپنے پیروؤں کو ساتھ

لے کر ـــــ کسی شہزادہ کی مدد حاصل کر کے یہود کی طرف آئے ۔پس بنی اسرائیل کا ایک طائفہ ایمان لایا اور ایک طائفہ اسی طرح کفر پر اڑا رہا
اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ان کے دشمنوں کے مقابلے میں مدد دی ۔مسیح کے پیرو غالب ہوئے اس بیان سے ثابت ہے کہ مسیح یقیناً
جائز جنگ کے حامی تھے ــــــ لوگو! مسیح حسب وعدہ دوبارہ آ چکے ہیں ۔اب عالم آخرت سے واپس نہیں آئیں گے ۔متی ۱۶ / ۲۷، ۲۸
اور مرقس ۹/۱ سے اس کا صریح ثبوت ملتا ہے ۔

اس وقت مسیح کا آنا سزا دینے کے لیے جلالی (مجاہدانہ) رنگ میں تھا ۔

(منزل ہفتم ۔تمہید تفسیر سورۂ "صف"، صفحہ ۹۹)

یوم الجمعہ

یوم الجمعہ کی تعیین میں خواجہ صاحب منفرد رائے رکھتے ہیں ۔

"یوم الجمعہ" کے معنی ہیں "اکٹھ" (یعنی اجتماع) کا دن ۔کوئی سا دن جس میں اکٹھ سے فائدہ اٹھایا جائے ۔قرآن مجید سے پہلے عربی دواوین (اشعار وغیرہ) میں یوم الجمعہ کسی خاص دن کا نام نہیں ہے جس کو ہم آجکل یوم الجمعہ کہتے ہیں ۔قدیم لغات میں اسے "یوم العروبہ" کہا جاتا تھا ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے ،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (جمعہ ۔۹)

اے ایمان والو! جب تمہیں اکٹھ کے روز نماز کے لیے (صبح یا شام یا کسی اور مناسب وقت میں منتظمین کی طرف سے) پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف جلدی سے آؤ اور بیع کو چھوڑ دو اگر تمہیں علم ہے تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے ۔

آیہ مبارکہ سے صاف ظاہر ہے کہ اکٹھ دن کا تقرر منتظمین کا کام ہے ۔خواہ وہ ہفتے میں اکٹھ یا جماعت کے لیے ایک دن مقرر کریں یا زیادہ ۔ضرورت ہو تو ہر روز بھی اجتماع کے لیے بلا سکتے ہیں ۔دوپہر سے پہلے بلائیں یا بعد ۔وقت کی اطلاع دینا ان کے لیے لازم ہے ۔

یہود نے سبت کو مذہبی تقدس دے کر اس کے خلاف کرنے والوں کو قوم سے خارج کرنے کی دھمکی دی وہ ظاہری رسوم کو حقیقی اصلاح وحکمت پر ترجیح دیتے تھے ۔

رسول کریمؐ معقول اور نیک کام کو جہاں دیکھتے پسند کرتے تھے ۔تمام نیک کام صلوٰۃ میں داخل ہیں ..... انصار نے اپنی مرضی سے یوم الجمعہ کا تقرر کیا اور دو رکعتیں پڑھیں اور وعظ کیا ۔حضورؐ نے اسے اچھا جانا ..... بلکہ اللہ تعالیٰ نے سورہ جمعہ اور بہت سی آیات اُتار کر ان کی عمدہ دعاؤں کی اور نیک باتوں کی تصدیق کر دی .... خدا تعالیٰ کی طرف سے سبت جیسے تقررات کو دائمی اصول

بنانا ترجیح بلا مرجح اور خلاف حکمت ہے ..... (منزل ہفتم صفحہ نمبر ۱۰۲ ، ۱۰۲ تفسیر سورۃ جمعہ)

ازواج النبیؐ اور طلاق

رسول کریمؐ نے اموال غنیمت مستحقین میں تقسیم کیے تو ازواج مطہرات نے بھی اپنے لیے سامان آرائش کا مطالبہ کیا اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (احزاب ۳۰)

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی (جنسی میلان) اور اس کی آرائش چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ سامان دوں اور تمہیں حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دوں (بیت نبوت میں اس کی امید نہ رکھو) اس کی بجائے کس چیز کی چاہت کی اجازت ہے؟ اگلی آیت اس پر روشنی ڈال رہی ہے۔

وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا (ایضاً ۳۱)

اور اگر تم اللہ اور اس کے پیغام لانے والے اور آخرت کے گھر کا ارادہ کرتی ہو (عام مومنات کی طرح) تو بلا شبہ اللہ نے تم میں سے نیکو کاروں کے لیے اجر عظیم تیار کیا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ بیت نبوی میں رہنے کے لیے شرائط ایمان کی تکمیل و تعمیل اہم وار جح ہے تا کہ وہ نبیؐ کی اندرونی زندگی کی پاکیزگی کی اپنے پاکیزہ اعمال کے ذریعے گواہ بن سکیں ___ اگر وہ نبیؐ کی زندگی میں الگ ہونا چاہیں تو اس کی واضح اجازت ہے۔ لیکن انؐ کی وفات کے بعد نکاح ثانی ناجائز ہے۔ اس شرط کا تسلیم کرنا بھی انؓ کی پاک باطنی، نیک نفسی، بلکہ ضبط نفس کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ نبیؐ کے لیے بیویوں کو طلاق دینا ہمیشہ حلال رہا ہے تا کہ وہ اس احتمال و امکان کو پیش نظر رکھیں اور اللہ، رسول اور آخرت کے نصب العین کو نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

ان کڑی شرائط کے باوجود انہوں نے رسول اللہؐ سے الگ ہونا گوارا نہ کیا۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے خود ہی انہیں الگ کیا تو وہ سخت غمناک ہوئیں۔ جب حضورؐ نے انہیں واپس بلا لیا تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔

وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ تَقَرَّ أَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ۔ (احزاب: ۵۱)

اور جس (بیوی) کو تو (رسول) نے الگ کر دیا اسے واپس لینے کا تجھے اختیار ہے اس سے قریب ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غمگین نہ ہوں اور تو نے جو کچھ انہیں دیا۔ اس پر سب کی سب راضی رہیں۔

اس سے پہلے ہم "ازواج النبیؐ" کے عنوان سے مفصل لکھ چکے ہیں۔ یہاں اس کی طرف مختصراً اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی

ایک مومنات نے اپنا نفس مہر کے بغیر نبیؐ کو بخش دیا۔ لیکن جب تک آپ شرف قبول عطا نہ فرمائیں یہ بخشنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سیرت نویسوں نے ان موہوبات کو ازواج میں شامل کر کے تعداد کو بڑھا دیا ہے۔ مفسرین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضورؐ نے چار بیویوں کو اپنے پاس رکھا تھا وہ ان کے نام بھی بتاتے ہیں۔

سورۂ طلاق اور تحریم یکے بعد دیگرے متصل ہیں دونوں کا آغاز "یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ" سے ہوتا ہے سورۃ طلاق میں نبیؐ اور مومنین کو یکساں طلاق کی اجازت دی گئی ہے اس کا اثر ازواج مطہرات پر یہ ہو سکتا تھا۔ کہ وہ طلاق سے محفوظ رہنے کے لیے مقاصد نبوت (اللہ رسول، آخرت) کی صراط مستقیم پر قائم رہیں۔

رسول کریمؐ نے اس اجازت کے خلاف ازواج مطہرات کی رضا مندی کے لیے اپنی ذات پر طلاق کو حرام ٹھہرا لیا۔ اور قسم بھی کھالی۔ اللہ تعالیٰ نے قسم کا کفارہ دینے کی تاکید فرمائی۔ اور اپنے رسولؐ کے لیے ایسی عورتوں کو طلاق دینے کی اجازت قائم رکھی جو مطلوبہ معیار پر پوری نہ اتریں۔

کوئی رسول قصداً احکام الٰہی کے خلاف نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ منصب رسالت کے لائق نہیں رہتا۔ البتہ فہم وحی میں تسامح کا امکان ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تسامح سے بچا کر واضح کر دیا کہ بتقاضائے بشریت ہے اصل و بنیاد قرآن حکیم ہے۔ اس سے تجاوز کی کسی کو اجازت نہیں۔ اس وجہ سے اس سورۃ کا نام ہی "تحریم" رکھا گیا (کہ حضورؐ نے ایک حلال امر کو اپنے لیے حرام ٹھہرا لیا)

خواجہ صاحب سورۂ کے بین السطور سے یہ مطلب نکالتے ہیں کہ

کسی منافق عورت کے بہکانے پر بعض ازواج نے جاہلیت کی کوئی رسم اپنے گھر میں انجام دی اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی کی خاطر اس رسم کا ذکر نہیں فرمایا۔ لیکن رسول کریمؐ کو کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا آپؐ نے ایک بیوی کو رازدارانہ کہا کہ "میرا نام لیے بغیر اپنی طرف توجہ دلا کر بیت نبوی میں تمہارا قیام نیکی میں نمونہ اور نبیؐ کی اندرونی زندگی کی پاکیزگی کی گواہ بننے کے لیے ہے اس گھر میں کسی خلاف قرآن رسم کی اجازت نہیں۔ ایسی خطا سے توبہ کرو اور آئندہ کے لیے محتاط رہو۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ تم پر طلاق کی نوبت آ جائے۔"

وہ بیوی خود اس رسم میں شامل تھی اور نادم بھی تھی لیکن طلاق کا لفظ اسے ناگوار گذرا اس نے غصے سے مغلوب ہو کر دوسری

ص۱ ایسا علم ضروری نہیں کہ وحی کے ذریعے ہو۔ عام ذرائع و قرائن سے جو علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ بھی اصلاً اللہ تعالیٰ کی توفیق و مشیئت اور قواعد و قانون کے مطابق ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا سکھایا ہوا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔ مَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ ..... مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ (مائدہ ۴) شکاری جانوروں کو تم سکھاتے ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو تعلیم دی ہے۔ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ (بقرہ ۔۲۸۲) کاتب کو جیسے اللہ نے تعلیم دی ہے۔ اس کو (معاملہ) لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے اللہ کی طرف سے ایسی تعلیم وحی میں داخل نہیں۔ اسی طرح نبیؐ کو قرآن سے باہر جو علم حاصل ہوتا ہے وہ وحی نہیں۔ اگرچہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہو۔

بیویوں سے کہہ دیا کہ بے شک ہم نے اس گھر میں بغرض اصلاح رہنا قبول کیا ہے لیکن طلاق کی دھمکی ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے۔ جب یہ گرما گرم باتیں ہو رہی تھیں۔ رسول کریمؐ کسی ضرورت سے اندر آنے والے تھے۔ آپ کے کان میں بھنک پڑ گئی۔ آپ نے اندر آنا مناسب نہ سمجھا۔

طلاق کی دھمکی سے خفا ہو کر وہ بیویوں نے کھانا پینا بند کر دیا۔ آپؐ نے اس ناراضی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا۔ کہ ہم یہاں اصلاح کے لیے بیٹھی ہیں۔ لیکن بشر سے کبھی غلطی بھی ہو ہی جاتی ہے۔ آئندہ کے لیے ہم وعدہ کرتی ہیں کہ آپ کے مشورے کے بغیر گھر میں کوئی نیا کام نہیں کریں گی۔ لیکن طلاق کا اشارہ بھی ہمیں شاق گزرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم قابل اعتماد نہیں۔ آپ اپنی ذات کے لیے طلاق کو حرام قرار دے لیں تو ہم راضی ہیں ـــــ حضورؐ نے ان کے اس عہد و پیمان پر مطمئن ہو کر قسم کھالی اور طلاق کو اپنے لیے حرام کر لیا۔ اس طرح گھر کی فضا درست ہو گئی اور بھوک ہڑتال کا خاتمہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے اس قسم کا کفارہ ادا کرا دیا۔ اور واضح کر دیا کہ اللہ کی حلال کردہ چیز (طلاق) کو حرام قرار دینا ٹھیک نہیں۔ اگر ازواج مطہرات اپنے عہد و پیمان پر قائم رہیں۔ تو طلاق کی نوبت ہی نہیں آسکتی۔ چنانچہ انہوں نے حضورؐ کی حیات مبارکہ اور وفات کے بعد تک زندگی بھر اس عہد کو نہایت خوبی سے نباہ دیا۔

سورہ طلاق میں عام مومنوں کے لیے طلاق کی کراہت مترشح ہے۔ سورہ تحریم میں طلاق کے متعلق رسول خداؐ کی خصوصیت ظاہر فرمائی گئی ہے۔ اس سے دونوں سورتوں میں ربط و تعلق واضح ہوتا ہے اور ساتھ ہی سورہ کی شان نزول بھی قرآن ہی نے بتا دی اس کے برعکس روایتی شان نزول میں شہد نہ پینے یا ماریہ قبطیہ کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لینا۔ محض لغو ہے جو ازواج مطہراتؓ اور حضورؐ دونوں فریقوں کی شان کے منافی ہے۔ اور قرآن حکیم کے خلاف ہے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ـــــ ازواج کی رضامندی چاہتے ہوئے حلال چیز کو حرام کیوں کیا؟ ـــــ اب آپ ایک بیوی سے نہ ملنے یا ایک دوسری بیوی کے ہاں جا کر شہد نہ پینے کی قسم کھا لیتے ہیں۔ تو ان بے چاریوں کی رضامندی کیسے حاصل ہو گی؟ اسی بات سے اس شان نزول کی لغویت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ آپؐ نے مطلق شہد کو اپنے لیے کیوں حرام کر لیا؟ کیا آپ اس بیوی (زینب) کو یہ نہیں کہہ سکتے تھے" آئندہ عمدہ شہد منگوایا کرو یہ شہد بدبودار ہے؟ ـــــ اور کیا حضورؐ کو بدبودار شہد کی شناخت نہیں تھی؟ ان آیات کا تفسیری ترجمہ از خواجہ مرحوم ملاحظہ فرمائیے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ـــــ اے نبی! تو اپنی بیویوں کی رضامندی چاہتا ہوا کیوں اس چیز کو (یعنی طلاق کو جس کا ذکر سابقہ سورت میں آ چکا ہے) حرام کرتا ہے؟ اور (اللہ سے بخشش مانگ) اللہ غفور رحیم ہے (آیت ۱)

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ۔

اللہ تمہارے لیے تمہاری (ایسی) قسموں کا کھولنا مقرر کر چکا ہے اور اللہ تمہارا مولیٰ (و حاکم) ہے اور وہی اصل علیم۔ اصل حکمت

کا ہے (آیت ۲)

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۖ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (آیت ۳)

(اس آیت بارہ میں ایک حدیث نبوی کا بیان ہے جو راز کے طور پر ایک بیوی سے کہی گئی۔ ایسی رازدارانہ بات یا حدیث وحی الٰہی نہیں ہو سکتی وحی کو واضح طور پر علی الاعلان بیان کرنے کا حکم ہے)

اور جب اس نبی نے اپنی کسی بیوی کو ایک حدیث (بات) راز کے طور پر کہی پھر جب اس بیوی نے اس بات کی خبر کر دی (راز کھول دیا) اور اللہ نے (یہ واقعہ) نبی پر ظاہر کر دیا تو اس (نبی) نے اس کے ایک حصے کو جتلایا اور ایک حصے سے اعراض کیا۔ لہٰذا جب اس (نبی) نے اس (بیوی) کو اس (افشائے راز) کی خبر دی تو وہ بولی تجھ کو اس کی خبر کس نے دی! (اس کا خیال تھا کہ ہم میں سے کسی نے چغلی کھائی ہے۔ تو) رسول کریم نے فرمایا کہ نہیں بلکہ کسی اور ذریعے سے) علم والے، خبردار نے مجھے اس کی خبر دی ہے۔

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ۔ (آیت: ۴)

(جن دو بیویوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا انہیں تنبیہ کی کہ) اگر تم دونوں اللہ کے حضور توبہ کرو (تو بہتر ہے) اس لیے کہ تم دونوں کے دل کج ہو چکے ہیں اگر تم دونوں اس (رسول) کے مقابلے میں ایک دوسرے کی مدد کرو گی تو (تمہارے باطنی شاہد بننے کی کوئی ضرورت نہیں اللہ اور جبریل اور مومنوں میں سے جو صلاحیت اختیار کرنے والا ہے۔ وہ بھی گواہ بن سکتا ہے، اور فرشتے دلوں میں صداقت ڈالنے والے نبی کی ظاہری و باطنی زندگی کی پاکیزگی اور منصب رسالت کے گواہ بن سکتے ہیں تمہاری شہادت ایک مزید شہادت ہے اگر ہو تو بہتر ورنہ ضروری نہیں جیسا کہ فرمایا)

بلاشبہ اللہ اس (رسول) کا دوست ہے۔ اور جبریل اور مومنوں میں سے جو جو صلاحیت والا ہے (صالح کے مضاف ہونے کے سبب و۔ل موصول کا اڑ گیا۔ جیسا کہ "علی الوارث مثلہ" میں وارث سے مراد ہر وارث ہے) اور فرشتے بھی اس کے بعد مددگار ہیں (فرشتے دلوں میں ہمیشہ قرآن کی صداقت پیدا کرتے رہیں گے)

عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا۔ (آیت: ۵)

اس (نبی) کا رب قریب تھا کہ اگر یہ تم (سب) کو طلاق دے دیتا (جیسا کہ اس نے تنبیہاً کہا تھا) تو وہ (خدا) اسے تم سے بہتر بیویاں بدل دیتا جو مسلم، مومن، فرمانبردار، تائب، عابد، روزہ دار، بیوہ اور کنواریاں ہوں۔

(یہ آیت خواجہ صاحب کے بیان کردہ سورتیں اور شان نزول کی تائید میں برہان قاطع ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

دیگر مومنات نبیؐ کی بیویوں سے اسلام، ایمان، قنوت، توبہ، عبادت زہد، بیوگی اور بکارت میں بہتر ہوسکتی ہیں۔ یہ آٹھ صفات ہیں، آٹھویں لفظ "ابکارا" سے قبل واو عاطفہ لائی گئی ہے جیساکہ سورہ توبہ رکوع ۱۴ میں فرمایا ہے۔

اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ۔

(اس آیت میں بھی آٹھویں صف سے واو عاطفہ شروع ہوتی ہے۔ اور آٹھویں اور نویں صفتوں پر لائی گئی ہے۔ لیکن پہلی سات صفات اس سے خالی ہیں اس کو واو ثمانیہ کہتے ہیں) منزل ہفتم تفسیر سورہ تحریم صفحہ ۱۲۲ تا ۱۲۹)

خُدا، مادہ اور رُوح

قدیم ترین آریہ مت کا عقیدہ ہے کہ خدا، مادہ اور روح تینوں قدیم ازلی ہیں ان کا خالق کوئی نہیں۔ خدا نے مادہ و روح کو جو ہمیشہ سے موجود چلے آرہے ہیں اپنے تصرف میں لاکر بیشمار قسم کی مخلوقات بنائیں۔ وہ ان کا خالق نہیں صرف ان کے واسطے سے اپنی صنعت گری کا کمال ثابت کرنے والا ہے۔ جیسے کمہار کہ مٹی پہلے سے موجود ہے اپنی صفت سے اس کو برتنوں کی شکل میں لے آتا ہے ــــ خواجہ صاحب نے آیہ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ وہ (خدا) بڑی برکت والا ہے، جس کے ہاتھ (قبضۂ قدرت) میں حقیقی بادشاہت ہے وہ ہر شئے پر قادر ہے ــــ خواجہؒ نے اس پر ایک مختصر لیکن عمیق ودقیق مقالہ لکھا ہے اس کی تلخیص ملاحظہ فرمایئے۔

آریہ صاحبان کہتے ہیں کہ مادہ و روح کسی فرق کے بغیر خدا تعالیٰ کے ساتھ واجب الوجود کی حیثیت سے قائم، باقی، ازلی اور ابدی ہیں۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ خدا نے ان خزائن پر قبضہ کرلیا اور وہ ان کی مدد سے کائنات کی تخلیق پر قادر ہوگیا۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ مختلف قسم کے ابداع وایجاد کی قدرت نہیں رکھتا تو وہ حقیقی بادشاہ اور بے احتیاج قادر مطلق کیسے ہوسکتا ہے؟

اگر مادہ و ارواح اور مکان و زمان اور ان کے گُن (صفات) کرم (افعال) سبھاؤ (مزاج و خاصیت) اور وہ قوانین جن کی مطابقت سے یہ آپس ہی ترکیب پاتے ہیں اور ان تناسلت کا تقرر جن کی موافقت سے یہ ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے حکیمانہ ارادے کے مطابق خلق کئے گئے تو ان سب (مادہ، روح، زمان، مکان) کا مخلوق ہونا اور اللہ تعالیٰ کے حکم و مشیئت کے مطابق اپنے اپنے مفوضہ کام انجام دینا ثابت ہوتا ہے حقیقی حاکمیت اور قدرت مطلقہ کا یہی اقتضا ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی سورتوں کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ تمام اشیائے کائنات اللہ تعالیٰ کی تسبیح کا اظہار و اعلان کررہی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کا مبدعِ[1] و خالق نہیں اور وہ از خود خدا ہی کی طرح ہمیشہ سے موجود و واجب الوجود ہیں تو اپنے موجود ہونے سے کس

---

[1] نیست کو ہست کرنے والا ــــ امکان کو وجود بخشنے والا

خدا کی تسبیح کا ثبوت دے رہی ہیں؟

مفردات (عناصر وارواح، زمان و مکان) کے گُن، کرم اور سبھاؤ میں جو حکیمانہ ترتیب و تناسب ثابت ہے اگر یہ کسی حکیم کا فعل نہیں تو کس کی کاریگری ہے؟ کیا انہوں نے خود اپنے اندر یہ صفات و خواص پیدا کر لیے ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو مرکبات کی ترتیب و ترکیب کے لیے بھی خدا تعالیٰ کی کیا ضرورت ہے؟ اگر ان اشیاء کی ابتدائی ترتیب کا خدا تعالیٰ کی حکمت و قدرت سے کوئی تعلق نہیں تو لازم ہے جب خدا تعالیٰ کی فعلیت کا اظہار ان میں تصرف کرنے کے بعد ہوا تو اس کو ان کی خصوصیات کی اسی طرح پیروی کرنی پڑی جس طرح انسان کرنے پر مجبور ہے۔ مثلاً انسان مٹی، پانی یا لکڑی سے وہ چیزیں نہیں بنا سکتا جو لوہے، تانبے وغیرہ سے بناتا ہے ضرورت ہے کہ وہ مٹی سے وہی شے بنانے جو بن سکتی ہے۔ پانی سے وہی کام لے جو اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ ناک کان کی جگہ اور کان زبان کی جگہ کام نہیں دے سکتا۔ انسان اس قانون کی پیروی پر مجبور ہے۔ اگر خدا بھی بنے بنائے مواد اولیہ کو مختلف سانچوں اور شکلوں میں ڈھالتا ہے۔ تو انسان اور خدا میں کیا فرق رہ گیا۔ اس میں بڑے یا چھوٹے کاریگر ہونے سے شرک دور نہیں ہو سکتا۔ بوریا باف اور حریر باف دونوں بافندے ہی کہلائیں گے۔ ایسا اعتقاد رکھنے والے اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت، قدرت کمال اور حاکمیت مطلقہ کے راز سے واقف نہیں ہو سکتے۔

عناصر وارواح و زمان و مکان اور ان کے گن، کرم اور سبھاؤ مناسب حدود میں رکھے گئے ہیں اگر یہ واجب الوجود ہیں تو کسی دوسری ذات کے مطیع نہیں ہو سکتے۔ جو ان کی حدود مقرر کرے۔

کیا یہ چیزیں اس لیے موجود چلی آ رہی ہیں۔ کہ خدا کو ان کی احتیاج ہے اور وہ ان کے بغیر اپنی کسی صفت و خوبی (خلق و صنع وغیرہ) کا اظہار نہیں کر سکتا۔ کیا ایسی ہستی کو حقیقی بادشاہ، حاکم اور قادر تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

خدا ایک ہے اور وہ تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے (الحمد للہ) اس کی کوئی حد بندی نہیں کر سکتا۔ (جیسا کہ آریہ کر رہے ہیں) کامل مطلق صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اگر دو ہوں تو ان میں سے ایک کا وجود لغو ہے۔ اور لغو ہونا کامل مطلق کی صفت نہیں بن سکتا۔

کامل مطلق محض ذہنی وجود نہیں۔ ذہنی وجود لازماً کسی ذہن پر منحصر ہوتا ہے۔ اور جو کسی دوسری شے پر منحصر ہو۔ وہ کامل مطلق نہیں ہو سکتا۔ اور کامل مطلق کسی کے زیر اثر ہونے کے سبب مجبور بھی نہیں اس کا کامل مختار ہونا ضروری ہے۔

علتیں تین ہوتی ہیں۔ مادی، فاعلی اور غائی ——— اس کائنات کی علت مادی امکان (ہو سکنا) ہے جو قدرت (کر سکنے) کی متقاضی ہے اور یہ قدرت الٰہی (کر سکنا) علت فاعلی ہے۔ اور حکمت خداوندی علت غائی کو ظاہر کرتی ہے جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے کمال کے خلاف ہیں ان کا وجود ممتنع ہے جو محال ہے۔ "شئے" کے معنی "چاہنا" ہے (شاء، یشاء، مشیت) جو اشیاء اللہ تعالیٰ کی

صلہ جیسے کرسی کی علت مادی لکڑی، علت فاعلی بڑھئی اور علت غائی اس پر نشست ہے

صفات کمالیہ کے اقتضا سے وجود میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر قادر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی صفت قدرت کے ساتھ "شے" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ (اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ) خدا تعالیٰ مریض نہیں ہو سکتا بے حیائی کا حکم نہیں دے سکتا۔ (لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ) اس لیے کہ یہ اس کی شان کے شایاں نہیں۔ ہاں اس ارادے کے لیے کوئی روک نہیں اس کی مرضی کو کوئی ٹال نہیں سکتا اس کے احکام کو کوئی توڑ نہیں سکتا اس کے مجرم کے لیے کہیں پناہ نہیں نیچر میں مقابلہ و تصادم جاری ہے غالب مغلوب پر فتح پاتا ہے لیکن یہ فتح بھی ضیاع و نقصان کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ فاتح و مفتوح دونوں تھک جاتے ہیں۔ چور ہو جاتے ہیں۔ زخم اور چوٹ سے دوچار ہوتے ہیں۔[1] خدا تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ تمام ظالم و معاند فراعنہ و نمارده اکٹھے ہو کر اپنی طرف سے اس کا مقابلہ کریں تو اس کی قدرت، ارادہ، علم اور حکم پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ مخلوقات کا عدم و وجود، اطاعت و عصیان اس کی ذات کے لیے یکساں ہے۔ اس کے حضور غیب و شہادت میں کوئی فرق نہیں۔ مرکز ارض کا ذرہ اس کے سامنے اسی طرح عیاں ہے۔ جس طرح ماؤنٹ ایورسٹ جو زمین کے اوپر ہے۔ اس کے سمع و بصر اور علم (سننے، دیکھنے، جاننے) پر روک نہیں۔ لہٰذا اس کی قدرت پر بھی کوئی بندھ نہیں باندھا جا سکتا کہ صرف بنی بنائی اشیاء میں تصرف کر سکتا ہے اور از سر نو نہیں بنا سکتا۔ ایسے خیالات و عقائد جو اللہ تعالیٰ کی ذات میں نقص، مجبوری، کمزوری، بیماری اور بدی کا اثبات کرتے ہیں۔ اس پر صادق نہیں آ سکتے وہ حقیقی بادشاہ، قادر مطلق اور کامل مطلق ہے۔ (منزل ہفتم۔ تفسیر سورہ ملک صفحہ ۱۲۹ تا ۱۳۱)

توحید الٰہی کے اثبات میں یہ خلوص، گرم جوشی اور حکیمانہ استدلال مفسر رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت فکری کی برہان قاطع ہے۔ رَفَعَ اللہُ دَرَجَاتِہٖ فِیْ جَنَّاتِ النَّعِیْمِ وَیَغْفِرُ لِکَاتِبِہِ الْمُذْنِبِ الذَّلِیْلِ الْحَقِیْرِ ــــ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۔

ذو المعارج

(پچاس ہزار سال کا ایک دن)

معارج کے معنی ہیں سیڑھیاں۔ ذو المعارج کے معنی ہیں۔ مناسب ترتیب کے ساتھ درجہ بدرجہ کام کرنے والا ...... اللہ تعالیٰ ذو المعارج ہے۔ وہ مخلوق کو درجہ بدرجہ اعلیٰ ارتفاع تک پہنچانا چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو امکان سے ــــ پھر مادہ اور روح سے ــــ اور درجہ بدرجہ نطفہ سے پیدا کیا اور موجودہ ارتفاع تک پہنچایا۔ وہ تعالیٰ نئے نئے سیارے پیدا کرتا اور مشارق و مغارب[2] کی تربیت کرتا ہے۔ وہ انسان کی بہتری چاہتا ہے۔

---

[1] ویت نام اور امریکہ دونوں ہی کا بہت برا حال ہوا۔ برسوں اپنے زخموں کو چاٹتے رہیں گے۔

[2] اشارہ اسی سورہ کی آیت ۴۰ کی طرف۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ۔

لیکن انسانی اکثریت کی منفی مساعی ارتفاع میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں اور وہ اپنے روحانی و اخلاقی امراض میں مبتلا ہو کر جہنم کے ہسپتال میں داخل کی جاتی ہے۔

زمین سورج کے گرد تقریباً بیضوی شکل میں چکر لگاتی ہے۔ وہ کبھی سورج کے قریب آجاتی ہے اور کبھی دور چلی جاتی ہے جیسا کہ سورہ تکویر[1] سے ظاہر ہوتا ہے۔ زمین کے قرب و بعد کے مقامات بدلتے رہتے ہیں۔ اگر زمین کے قرب و بعد کو ایک خط سے جو سورج کے مرکز سے گذرے، ملایا جائے تو یہ خط تقریباً ایک لاکھ سال میں ایک چکر لگاتا ہے۔ ان میں سے پچاس ہزار سال کو دن اور پچاس ہزار سال کو رات سمجھو۔ یہ بیت المعمور دن کو آباد ہوتا ہے اور رات میں نئی پیدائش کے سامان کئے جاتے ہیں۔

اس پچاس ہزار سال کے دن میں فرشتے یعنی کارکنان قدرت روحوں کو لے کر خدائے تعالیٰ کے حضور میں عروج پاتے رہتے ہیں۔ اکثر دفعہ زلزلوں، وباؤں، سیلابوں، غرقابیوں، جنگوں وغیرہ کے ذریعے بہت سی روحیں عالم آخرت میں پہنچتی ہیں۔ کفار کو ایسے تقاضے بعید از عقل معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بات آسان ہے ۔۔۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا۔ آیت ۴ سورہ المعارج (اس (خدا) کی طرف فرشتے اور روحیں ایسے دن میں عروج پاتے رہتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار سال چلی آتی ہے (اس عروج سے اللہ تعالیٰ کے درجہ بدرجہ کام کرنے کا علم حاصل ہوتا ہے) پس تو صبر جمیل اختیار کر (اللہ کے وعدوں پر بھروسہ رکھ۔ بے چینی اور جلد بازی سے احتراز کر)

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا (آیت: ۵) (بلاشبہ یہ کافر اس (عذاب آخرت) کو دور دیکھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھتے ہیں۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۙ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (آیت: ۸، ۹) (کیا ان کافروں نے ایسے عذابوں کے نمونے نہیں دیکھے؟ اگر یہ توبہ نہ کریں تو وہ عذاب قریب ہے) جس دن آسمان (کسی آتش خیز پہاڑ کے پھٹ جانے سے)

---

[1] سورہ تکویر آیت ۱۵، ۱۶ ۔۔۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۔۔۔ میں گواہی میں پیش کرتا ہوں دوڑنے والے سیاروں کو ۔۔۔ سیدھا چلنے والوں۔ دیکھنے والوں کو (یہ وہ سیارے ہیں جن کی چال کا افق مبین آسمان کے کھلے کنارے پر دیکھا جانا سہل ہے)

تمام سیارے جو کسی مرکزی ستارے کے گرد گھومتے ہیں ان کی چالوں میں کئی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً جب زمین سورج کے قریب آتی ہے تو بہت تیز ہو جاتی ہے۔ پھر سیدھی چلتی ہے۔ پھر ہلکی ہوتی اور ٹھیک جاتی ہے یہی حال دوسرے بہت سے سیاروں کا بھی ہے۔ دم دار سیاروں میں ان تغیرات کا اختلاف اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ سورج کے قریب وہ تیز چلتے ہیں۔ پھر سیدھی چال اختیار کرتے ہیں۔ بعض ان میں سے دوسرے شمسی نظاموں میں جا کر چھپ جاتے ہیں۔ ان کی رفتاروں سے اس عالم میں بڑے بڑے اختلافات پیدا ہوتے ہیں رات اور دن کا اختلاف بھی اس کی شہادت دیتا ہے۔ (منزل ہفتم ۔۔۔ تفسیر سورہ تکویر صفحہ ۲۱۲ تا صفحہ ۲۱۴)

گلے ہوئے تانبے (کے رنگ) کی طرح ہو جاتا ہے۔ اور پہاڑ اون کی طرح (اڑنے والے) ہو جاتے ہیں۔
وَلَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا (آیت ۱۰) اور کوئی دوست کسی دوست کو نہیں پوچھتا۔
منزل ہفتم تفسیر معارج صفحہ ۴۹ ۱۵۰ و ۱۵۰)

سورۂ جنّ

جن اور سورہ جن کے متعلق مفسرین نے ایسی باتیں لکھی ہیں جو صرف خوش اعتقادی سے تعلق رکھتی ہیں۔ عقل و بصیرت ان سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ خواجہ صاحب نے اپنے انداز میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ جن کی حقیقت سے متعلق پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ غیر مرئی ابلیسی جن بدی کے محرکات میں سے ہیں۔ اور صاحب اختیار جن جو مومن و کافر و منافق بننے میں مختار ہیں۔ وہ انسان ہی کا ایک حصہ ہیں لغت کی رو سے جن "ناس" میں داخل ہیں صحف سماوی "ناس" ہی کی ہدایت کے لیے اترے ہیں۔

اَنْزَلَ التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِیْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ (آل عمران : ۳)
تورات، انجیل اور فرقان سب (ناس) انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوئے۔
قرآن "بیان للناس" ہے۔
هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًی وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ (آل عمران ، ۱۳۸)
یہ (قرآن) انسانوں کے لیے بیان ہدایت اور نصیحت ہے۔

جن قرآن پر ایمان لائے۔ ان کے لیے حلال و حرام، نکاح و طلاق ستر و پردہ کے وہی احکام اور قاعدے ہیں۔ جو قرآن میں ہیں — "حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ" کے حکم[1] میں وہ دوسرے صحابہؓ کے ساتھ شامل ہو کر جنگ کرتے تھے۔ رسول کریمؐ کے پاس اپنے مقدمے بھی لاتے تھے۔ سورہ الرحمن میں کھجوریں، پھل، کشتیاں جہنم کے آلام اور جنت کے انعام جن و انس دونوں کے لیے یکساں ہیں۔ جن و انس ایک ہی نوع کی اناث کی بکارت کو زائل کر سکتے ہیں۔

لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ (الرحمن : ۷۴)

تمام رسول بشر یا رجل (مرد) تھے۔ زمین میں فرشتے بس رہے ہوتے تو فرشتہ رسول بن کر آتا (بنی اسرائیل : ۹۵) موسیٰ و محمد (علیہما السلام) دونوں بشر تھے۔ از روئے قرآن دونوں ہی قوم جن کی طرف بھی مبعوث ہو کر آئے تھے۔ رسول اسی نوع سے ہوتا ہے جس کی طرف وہ بھیجا جاتا۔ اسی کی زبان میں وحی لاتا ہے۔ لہٰذا جن کی بشریت اور رسولؐ کی بشریت میں کوئی تفاوت ممکن نہیں۔ نوع بشر کا کوئی فرد کسی دوسری نوع کے لیے اپنے کاروبار میں نمونہ (اسوہ حسنہ) ہرگز نہیں بن سکتا — خواجہ صاحب نے اس سورہ کی آیات کے ربط

---

[1] مومنوں کو جنگ کی ترغیب دے۔

میں بھی مفسرین سے اختلاف کیا ہے۔ اور ایک لطیف نحوی بحث کر کے اپنی تحقیق کو ثابت کیا ہے اہلِ علم ملاحظہ فرمائیں:۔

ترجمہ سورۃ میں مفسرین نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ اور مضمون سورہ کو غلط ملط کر دیا ہے۔ قولِ جن "وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (جن۔۲) پر ختم ہو گیا ہے آگے کا بیان اَنَّ اور اِنَّ سے شروع ہوتا ہے اَنَّ کا عطف اس آنّہٗ پر ہے جو "قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ" کے ساتھ آیا ہے۔ لیکن مفسرین نے ان آیات کے دو یا تین حصے کر دیئے ہیں "وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۱۵) تک آیات پر اَنَّ مفتوحہ آیا ہے ان کو قولِ جن میں شامل کرتے ہیں۔ اور "فَقَالُوْٓا" (۱) کے آگے جو اِنَّ مکسورہ ہے اُن سب کا عطف اسی اِنَّ پر کرتے ہیں۔ حالانکہ سب مفسرین اس بات کے قائل ہیں کہ قالوا کے آگے اَنَّ مفتوحہ نہیں آسکتا۔ اس الجھن کو سلجھانے کے لیے انہوں نے اس جگہ "اخبروا" محذوف نکالا ہے لیکن آگے چل کر وَاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا اور وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ (جن: ۱۸) کے اَنَّ کا عطف اس اَنَّ مفتوحہ پر کیا ہے جو قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ (جن ۱۸) کے ساتھ آیا ہے۔ یہاں اخبروا کے فعل کو جسے پہلے محذوف نکالا تھا اڑا دیا ہے اور ان کا عطف پہلے انّہٗ پر کیا ہے جو قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ (جن ۱) کے ساتھ آیا ہے۔ آگے چل کر زمانہ حال کے ایک مفسر انّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ (جن: ۱۹) کو پھر قولِ جن بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں، "وایضاً قالت الجن لقومھم انہ لما قام عبد اللہ محمد علیہ السلام الخ"

یہ حال جو مفسرین نے اس سورہ میں اَنَّ مفتوحہ کا کیا ہے جس جملے پر اَنَّ مفتوحہ آئے۔ وہ جملہ اس اَنَّ مفتوحہ کے ساتھ مل کر کلام تام نہیں رہ سکتا۔ ایسا کلام اس اَنَّ مفتوحہ کی شمولیت کے ساتھ قالوا کا مقولہ نہیں بن سکتا جس مفسر نے ایسا کیا ہے۔ سخت ٹھوکر کھائی ہے یہ مفسر اخبروا وغیرہ کی زیادت کو تکلف کہتے ہیں بعض مفسرین اَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ (جن: ۷) کو بھی اقوالِ جن سے نکال کر اُوْحِيَ اِلَيَّ (جن: ۱) کے تحت لاتے ہیں۔[1]

اس نحوی بحث کے بعد خواجہ صاحب تفسیر کی طرف توجہ کرتے ہیں:۔

جن وہی لوگ ہیں جن کو کاہن کہتے ہیں۔ جو اپنے مریدوں کو بھی کاہن بننے کی ترغیب دیتے تھے اور خود الگ مقامات پہ بیٹھ کر اپنی توجہ جمانے تھے (كُنَّا نَقْعُدُ۔ جن۔ ۹) اور مسمریزم کے معمول کی حالت بنانے۔ پھر جو تخیلات پیدا ہوتے ان کو عالم ارواح سے حاصل شدہ خبریں سمجھتے تھے اور اپنے خیالی فرشتوں کو تسخیر کرتے تھے۔ جن کو وہ خوبصورت دیویاں سمجھتے ہیں قریش کا ان کے متعلق یہی خیال تھا۔ (وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا۔ صافات: ۱۵۸) خدا اور جن کے درمیان رشتہ بنا رہے تھے) مراقب بیٹھنے کی جگہیں زمین ہی میں ہو سکتی ہیں (مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ۔ جن: ۹) آسمان میں گھسنے کی جن اور انس کو ہرگز اجازت و مجال نہیں يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا ..... لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (الرحمٰن: ۳۳) اے جن و انس کی ایک معاشرت والی جماعت

---

[1] قدیم مفسرین اور نحویوں کو بھی اس مقام پر مشکلات پیش آئی ہیں اور ان میں بھی اختلاف فہم پایا جاتا ہے خواجہ صاحب نے اپنے فہم کے مطابق الگ راہ نکالی ہے۔ جو قابل غور ہے۔

کے لوگو! تم زمین و آسمان کے کناروں سے گھس نہیں سکتے مگر دلیل کے ساتھ، زمین میں آگ، دھواں اور پگھلا ہوا تانبا اور آسمان میں شہاب ثاقب اور شعلے وغیرہ مانع ہوں گے۔ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ (ایضاً: ۳۵) یہ غیب کی خبریں سننے اور بتانے کے مدعی لیس دار مٹی کی مخلوق ہیں۔ کوئی الگ نوع نہیں۔ إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ (صافات: ۱۱) انہی پر شہاب ثاقب گرتے ہیں...... مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (ایضاً: ۱۰)

رسول کریمؐ کے عہد سعادت عہد میں گرنے والے ستاروں کی بارش ہوئی، جیسا کہ اب بھی دنیا کے مختلف مقامات میں ایک صدی کے اندر تین دفعہ بارش ہوا کرتی ہے۔ اگست اور نومبر میں بھی شہاب ثاقب بکثرت ٹوٹا کرتے ہیں۔ ان کا زمین پہ گرنا بھی ثابت شدہ امر ہے۔ رسول کریمؐ کے زمانے میں آسمانی پتھروں کے گرنے سے بعض کاہن لقمہ اجل ہو گئے تھے اور اکثر گھبرا کر بھاگ نکلے تھے۔ ایسے وقت بھاگنے والوں کو سخت چوٹیں بھی لگ جاتی ہیں وہ غیب بینی کے مدعی تھے۔ اس آسمانی سنگ باری نے ان کی تمام شیخی کرکری کر دی۔ یہ شیطانی کھیل ہے۔ کوئی شیطان (کاہن) "ملاء اعلیٰ" کی باتیں نہیں سن سکتا۔ ایسے لوگ بات سننے سے محروم و معزول ہیں ـــــ إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ (شعراء: ۲۱۲) جس طرح مشرک توحید سے بھاگتے ہیں۔ وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا (بنی اسرائیل: ۴۶) اسی طرح شیطان خناس بھی کلام توحید سے بھاگتا ہے۔ شیاطین جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں۔ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (شعراء: ۲۲۱، ۲۲۲) جن و انس کے سینوں میں خناس ہی وسوسے ڈالتا ہے۔ الْخَنَّاسِ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (الناس: ۵، ۶) اس سے ثابت ہوا کہ "خناس" جس طرح انس سے الگ ہے اسی طرح جن سے بھی علیحدہ ہے۔

پوری زمین کو الارض کہا جاتا ہے اور کسی خاص خطہ، زمین پہ بھی الارض کا اطلاق ہوتا ہے اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ (یوسف: ۵۵) فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ (یوسف: ۸۰) ان دونوں آیتوں میں الارض سے مراد خاص ارض مصر ہے ـــــ اسی طرح اسماء سے مراد پورا آسمان یا بعض حصہ آسمان بھی ہو سکتا ہے۔ زمین آسمان میں حرکت کر رہی ہے کبھی آسمان کے ایک حصے میں ہوتی ہے اور کبھی دوسرے حصے کو جا چھوتی ہے۔ اس حرکت کے سبب ہم بھی آسمان کے مختلف حصوں کو چھوتے رہتے ہیں۔ إِنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ (جن: ۸) کے معنی ہیں ہم نے آسمان کے اس حصے کو چھوا ہے اس معنی میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ مفسرین کا یہ کہنا کہ ریاضت و کشف سے آسمان کو ٹٹولا ہے۔ یا آسمان سے قریب ہو کر گویا اس کو ہاتھ سے چھو لیا ہے محض تاویل و تکلف ہے۔

نظام شمسی میں جس طرح بڑے بڑے سیارے حرکت کرتے ہیں اسی طرح چھوٹے پتھر بھی متحرک ہوتے ہیں۔ سورج کے گرد شہاب ثاقب کے کئی جھنڈے سفر کرتے ہیں اپنے دور میں کہیں پھیلے ہوئے اور کہیں مجتمع پائے جاتے ہیں۔ زمین اپنی حرکت کے دوران ان کے دائروں میں سے گذرتی ہے تو وہ کشش زمین کے سبب، زمین کی طرف کھچے آتے ہیں اور رگڑ سے جل اٹھتے ہیں۔ جب زمین کسی بڑے اجتماع کے قریب پہنچتی ہے تو زمین پہ ان کی بارش ہونے لگتی ہے۔ رسول کریمؐ کے عہد میں یہ شہاب کثرت سے گرے تھے ان کا گرنا اکثر دیکھا گیا۔ بڑے بڑے عجائب گھروں میں ان کے بقایا آج تک موجود ہیں۔ (منزل ہفتم، تفسیر "جن" صفحہ ۱۵۸ تا ۱۶۰)

جی تو چاہتا ہے۔ کہ پوری سورۃ جن کا تفسیری ترجمہ بھی یہاں نقل کر دیا جائے تاکہ ربط آیات اور قریب الفہم مفہوم بھی سامنے آ جائے لیکن اختصارِ مقام اجازت نہیں دیتا۔ اللہ کرے کبھی پوری تفسیر کی طباعت کا موقع آئے تو اہلِ نظر و بصیرت کو معلوم ہو جائے کہ بے مثل مفسرؒ نے کیسے کیسے بے نظیر نکتے کتاب اللہ سے اخذ کئے ہیں۔

جہنم کے انیس فرشتے

سورۂ مدثر میں جہنم کے انیس فرشتوں کا ذکر ملتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس پر نہایت لطیف و عمیق کلام کیا ہے ــــ خواجہ صاحب کے غور و تحقیق کا نتیجہ بھی قابلِ قدر اور لائق توجہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (مدثر: ۳۰) اس (جہنم) پر انیس (اصناف کے ملائکہ یعنی کارکنانِ قدرت) ہیں۔

انسان میں حیوانی و طبعی انیس قویٰ ہیں جن سے انسانی عقل مدد لیتی ہے۔ اگر یہ قوتیں غلط استعمال سے مریض ہو جائیں تو عقل بھی متاثر ہوتی ہے اور عمل بھی درست نہیں رہتا۔ سقر (دوزخ) میں جو کہ ایک ہسپتال ہے۔ انیس قسم کے معالجات ہوتے ہیں۔ ہر محکمہ پر انیس قسم کے (اسپشلیسٹ) معالج ہیں جو بحکم الٰہی چیر پھاڑ کرتے ہیں غالباً وہ قوتیں حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ حواس خمسہ ظاہرہ ـ یعنی باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ

۲۔ حواس خمسہ باطنہ ــــ یعنی حسِ مشترک، واہمہ، متخیلہ، متصرفہ، حافظہ

۳۔ قوتِ شہویہ، قوتِ غضبیہ ــــ یہ بارہ قوائے حیوانیہ ہیں۔

۴۔ طبعی قویٰ سات ہیں ــــ یعنی جاذبہ، ماسکہ، ہاضمہ، دافعہ، غاذیہ، نامیہ، مولدہ۔

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً ۙ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا ...... وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْبَشَرِ (مدثر: ۳۱)

عیسائی اناجیل اربعہ کے علاوہ کئی اور اناجیل بھی رکھتے تھے۔ جو ابتدائی صدیوں میں گم ہو چکی ہیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جہنم پر سات کارکن ہیں ــــ قریش کہتے تھے کہ ہمارے پہلوانوں کے آگے انیس فرشتے کیا چیز ہیں؟ جواباً فرمایا۔

اور ہم نے آگ والوں کو فرشتے بنایا (نصاریٰ کی دیکھئے کہ فرشتوں کو الٰہ بھی سمجھتے اور کمزور و ناقابلِ مقابلہ بھی مانتے تھے جہنم میں وہی انکو عذاب بھی دیں گے) اور ہم نے ان (فرشتوں) کی گنتی کو کافروں کے لیے ایک آزمائش بنایا ہے (وہ انیس نہیں بلکہ انیس قسم کے ملائکہ ہیں) تاکہ اہلِ کتاب کو یقین آ جائے اور مومنوں کے ایمان میں اضافہ ہو...... (فرشتے اور نیکی و بدی کے جرمز (جرثومے) اس قدر ہیں کہ) تیرے رب کے لشکروں کو اس (رب) کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جہنم کا یہ ذکر نوعِ بشر کے لیے ایک نصیحت ہے۔ (اس آیت سے یہ معلوم ہوا جن بھی نوعِ بشر میں داخل ہیں اور جہنم کا ذکر ان کے لیے بھی نصیحت ہے)

كَلَّا وَالْقَمَرِ (مدثر:۳۲) ——— (انیسؔ کا عدد سن کر سمجھتے ہیں کہ ہم جہنم سے بچ جائیں گے اس عالم میں بہت سی اشیاء جو انسان کے اختیار سے باہر ہیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک پر بھی غالب نہیں آسکتا۔ زمین کا قریبی کرہ چاند زمین کا تابع ہے۔ اس کی رفتار میں کون فرق پیدا کر سکتا ہے۔ چاند کے ساتھ انیسؔ کے عدد کا خاص تعلق ہے۔ انیسؔ برس میں قریباً سوا گھنٹے کے فرق سے خسوف و کسوف کا وہی حساب پھر جاری ہو جاتا ہے۔ اس عدد کے ذریعے چاند کی پہلی رات بھی دریافت ہو سکتی ہے۔

رات جب ختم ہونے لگتی ہے تو سورج افق سے انیسؔ درجے نیچے ہوتا ہے ——— پھر زمین ان انیسؔ درجوں کو طے کرتی ہوئی صبح کو زیادہ سے زیادہ روشن کرتی جاتی ہے۔ وَالَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ۝ (مدثر ۳۳، ۳۴) رات انیس درجے پر ختم ہو چکتی ہے اس لیے اس کے ساتھ "إذ ادبر" لایا گیا ہے اذ ماضی کے لیے خاص ہے لیکن صبح انیسؔ درجوں میں بتدریج روشن ہوتی ہے یہ فعل روشنی ایک حد تک جاری رہتا ہے اور رات کے بعد ہوتا ہے۔ اس لیے صبح کے ساتھ "اذا اسفر" کے لفظ آئے ہیں" اذ "اور" اذا" میں یہ نکتہ آخری مفسر رحمۃ اللہ کی خصوصیت ہے۔

مذکورہ بالا تمام منظم و باقاعدہ تغیرات انسانی اختیار سے باہر ہیں۔ لہٰذا جہنم اور اس پر متعین فرشتوں سے چھٹکارا پانے کا دعویٰ بھی باطل ہے (منزل ہفتم تفسیر مدثر صفحہ ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸)

دس مرتبہ "ویل"

سورہ مرسلات میں "ویل للمکذبین" کی دس مرتبہ تکرار کی حکمت بیان فرماتے ہیں۔

۱۔ اچانک اور بے خبر پکڑے جانے پر حسرت و مایوسی۔

۲۔ کسی طویل انتظار کے بغیر، دنیوی ہلاکت کے ساتھ ہی اخروی عذاب (أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ ۝ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ ۝ كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ فیصلے کا دن مجرمین کی ہلاکت کے ساتھ ہی آجاتا ہے۔

۳۔ اس دن کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ اس عاجزانہ حالت پر تیسرا ویل ہے۔

۴۔ روح و نسمہ کثیف مادی جسم سے الگ ہو کر اللہ کے حضور پیش ہوتا ہے اس وجہ سے احساس عذاب بڑھ جاتا ہے۔

۵۔ امراء سہ شاخہ خیموں اور شاندار محلوں پر فخر کرتے ہیں۔ خوبصورت زرد اونٹوں کی قطاروں پہ نازاں ہیں۔ بعد مرگ انہیں سہ شاخہ سایہ ملتا ہے۔ جو آگ کا جاذب ہے اور اس سے محل ایسے بڑے بڑے شعلے نکلتے ہیں۔ گویا کہ زرد اونٹوں کی قطاریں ہیں۔ (انْطَلِقُوا إِلَىٰ ظِلٍّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ ۝ إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝ كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝) (مرسلات ۳۰ تا ۳۴)

۶۔ گرفت کے وقت دہشت کے سبب گویائی سلب ہو جاتی ہے۔ عذر بہانے کا کوئی موقع نہیں رہتا۔ (هَٰذَا يَوْمُ لَا يَنطِقُونَ

وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ (ایضاً ۳۵-۳۶)

۷- اگلے وقتوں کے لوگ آخرت میں پہنچ چکے ہیں بعد والے (قریش وغیرہ) بھی ان کے ساتھ مل جائیں گے پچھلوں سے کہا جاتا ہے کہ اگلوں کی مدد سے کوئی داؤ کر سکتے ہو تو کر لو سو وہ کچھ نہیں کر سکیں گے جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ (۳۸ تا ۴۰) لہٰذا ویل ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔

۸- مکذبین، متقین و محسنین کا مذاق اڑاتے تھے کہ ان حقیر لوگوں پر خدا کبھی رحمت نہیں کرے گا آخرت میں جب خود عذاب میں گرفتار ہوتے اور اہل ایمان واحسان کو بہشتی نعمتوں میں دیکھتے ہیں۔ تو سخت شرمندہ ہوتے ہیں۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ...... الخ لہٰذا یہ بھی مکذبین کے لیے ویل ہے۔

۹- مجرموں سے کہا جاتا ہے کہ دنیا میں کچھ کھا پی لو۔ پھر تمہارے لیے سخت عذاب اور ویل ہے۔

۱۰- آخری دسواں اور اصل ویل یہ ہے کہ وہ خدا کے حضور جھکنا اور فرمان بردار ہونا نہیں چاہتے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۔ فَوَيْلٌ ......) منزل ہفتم تفسیر مرسلات صفحہ ۱۹۱، ۱۹۲)

نیوٹن سے بہت پہلے قرآن نے کہا

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا (مرسلات - ۲۵)

زمین اپنے تمام مادّے کو اپنے مرکز کی طرف سمیٹنے والی ہے۔ کشش زمین اسی کا نام ہے..... جب تک روح و نسمہ کا تعلق زمینی مادّے سے رہتا ہے وہ اس کو اپنے مرکز کی طرف سمیٹے رکھتی ہے بوجھل پہاڑ اور ہلکا پانی بھاپ اور غبار بن کر بھی زمین کی گرفت سے نہیں نکلتے ـــــ مادہ زندہ صورت میں ہو یا مردہ شکل میں زمین اس کو سمیٹنے والی ہے ـــــ چاند بھی زمین کی اسی قوت سے زمین کے قابو میں ہے۔ اسی سے سیارات کا قیام ہے اور ان کی رفتاریں قائم ہیں زمین سے چاند سورج کا فاصلہ دیگر قواعد کے علاوہ اس قوت سے بھی دریافت کیا جا سکتا ہے...... یہ تمام باتیں اس بات پر غور کرنے سے واضح ہو جاتی ہیں۔ کہ زمین اپنے مرکز کی طرف دیگر مادیات کو سمیٹنے والی ہے۔ (منزل ہفتم۔ مرسلات صفحہ ۱۹۴)

نبا عظیم

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ؕ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (النبا ۱ تا ۳) آپس میں کیا پوچھتے ہیں؟ پوچھتے ہیں اس بڑی خبر سے متعلق جس میں وہ مختلف ہیں ـــــ مفسرین کے نزدیک بڑی خبر یا نبا عظیم قیامت ہے۔ خواجہ صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ اس سے مراد "توحید" ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

اسلام کا اصل مقصود ذات باری ہے۔ اسلام کے نزدیک "النبا العظیم" توحید الٰہی ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا مُنْذِرٌ - وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ
قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ - أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ (ص - ۶۵ تا ۶۸)

(اے رسول!) تو کہہ دے کہ سوائے اس کے نہیں میں تو ایک ڈرانے والا ہوں اور اللہ کے سوا جو اکیلا ہی غالب ہے کوئی اور معبود نہیں وہ آسمانوں اور زمین اور ان کے فی مابین علائق کا رب ہے وہ اصل غالب، اصل بخشنہار ہے تو کہہ دے یہ نبأ عظیم یعنی بڑی خبر ہے۔ تم اسی سے منہ موڑنے والے ہو۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نبأ عظیم ہے۔ (منزل ہفتم ص ۱۹۶)

قیامت موت کے بعد ہی

خواجہ صاحب ابدی سزائے جہنم کے قائل نہیں۔ وہ کفر و شرک، فسق و عصیان وغیرہ کو مرض سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ خود قرآن نے کئی جگہ کہا ہے۔ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (البقرہ ۱۰ وغیرہ) اور مرض انسان کی اصل فطرت نہیں بلکہ فطرت پر عارضہ جو عارضی ہوتا ہے اور ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ اس کا علاج یہاں توبہ و استغفار اور اصلاح و تزکیہ سے ہوتا ہے اور بعد موت جہنم کے ہسپتال میں اس کے ثبوت میں وہ بہت سی آیات پیش کرتے ہیں، دیکھئے منزل ہفتم ص ۱۹۸

کافر ہو یا مومن عطائے ربانی کا دروازہ کسی پر بند نہیں كُلًّا نُّمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (بنی اسرائیل: ۲۰) کفار کے قیام جہنم کی مدت صحت مند ہونے تک ہے۔ اسی لیے دو جگہ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ اور إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ فرمایا ہے۔ (ھود ۱۰۷ - انعام ۱۲۸) اسی سورہ (نبأ - ۲۳) میں لٰبِثِيْنَ فِيْهَا أَحْقَابًا۔ فرمایا ہے احقاب - حُقُبٌ کی جمع ہے اس کے معنی ابدیت ہرگز نہیں۔ اگر ابدیت ہو تو جمع کی کیا ضرورت ہے خود قرآن اس کی محدودیت کو واضح کر رہا ہے۔ جناب موسیٰ اپنے سفر کی مدت بتاتے ہیں۔ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا (کہف: ۶۰) یعنی میں حقبوں تک سفر جاری رکھوں گا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابد تک ہمیشہ ہمیشہ چلتا ہی رہوں گا۔ یہاں ایک غیر معین مدت مراد ہے۔ جیسا کہ امام راغب کہتے ہیں:۔

والصحیح ان الحقبۃ مُدّۃ من الزمان مبھمۃ۔ اس کے ساتھ ہی خواجہ رحمۃ اللہ مفسرین کے اس عقیدہ سے بھی انکار کرتے ہیں کہ مرنے والے ہزار ہا سال قبروں یا عالم برزخ میں رہتے ہیں اور آدمؑ سے آخری انسان تک سب ایک ہی وقت روز محشر زندہ ہو کر عدالت عالیہ میں پیش ہوں گے اور پھر جنت یا جہنم ابدی میں داخل کئے جائیں گے۔ وہ قیامت کبریٰ کے قائل ہیں۔ جیسا کہ قبل ازیں پچاس ہزار سال کے ایک یوم کی تفسیر میں آچکا ہے۔ لیکن ہر مرنے والے شخص یا انبوہ و جماعت کی قیامت سے پہلے منتقل بتاتے ہیں اس کے ثبوت میں بہت سی آیات پیش کرتے ہیں:۔

ملاحظہ خالدین فیہا ما دامت السماوات والارض الا ما شاء ربک - خالدین فیہا الا ما شاء اللہ۔

۱۔ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ (انبیاء ۱:) لوگوں کے حساب کا وقت نزدیک آ گیا۔ موت کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ شائد ابھی آ جائے یا دس بیس برس کو آ سکے لیکن لوگوں کی خیال قیامت کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ شائد قیامت قریب ہو۔

۲۔ لعل الساعۃ قریب (شوریٰ ۱۷) یا ہو سکتا ہے کہ قیامت قریب ہی ہو۔

۳۔ عسیٰ اَنْ یَکُوْنَ قَرِیبًا (بنی اسرائیل ۵۱) یا رسولؐ سے کہلوایا جائے کہ میں نہیں جانتا کہ وہ قریب ہے، یا خدا اس میں کچھ دیر کر دے۔

۴۔ قُلْ اِنْ اَدْرِیْ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَہٗ رَبِّیْ اَمَدًا (الجن ۲۵) اس کے متعلق آیات ذیل بھی دیکھئے۔

۵۔ وَلَوْ تَرٰی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْھِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمُ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْھُوْنِ ..... (انعام ۹۳) اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں۔ آج تم کو بدلے میں ملے گا ذلت کا عذاب۔
دیکھئے یہاں موت، بدلہ اور عذاب بالکل ساتھ ہی ساتھ آئے ہیں۔

۶۔ اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْہُ رُسُلُنَا وَھُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ۝ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ مَوْلٰھُمُ الْحَقِّ ..... (انعام: ۶۱) جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچے تو ہمارے فرشتے اس کو قبضے میں لے لیتے ہیں۔ پھر پہنچائے جاتے ہیں (مرنے والے) اللہ کی طرف جو ان کا سچا مالک ہے — یعنی موت کے ساتھ ہی اللہ کے حضور پیشی ہو جاتی ہے۔

۷۔ اِنَّمَا یُؤَخِّرُھُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْہِ الْاَبْصَارُ ۝ مُھْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِھِمْ لَا یَرْتَدُّ اِلَیْھِمْ طَرْفُھُمْ وَاَفْئِدَتُھُمْ ھَوَآءٌ (ابراہیم ۴۲) ان کو مہلت دیتا ہے اس دن تک کہ آنکھیں پھٹی رہ جائیں گی، دوڑتے ہوں گے، اوپر اٹھائے ہوئے اپنے سر ان کی نظر اپنی طرف ہٹ آئے گی اور ان کے دل اڑ رہے ہوں گے — یہاں بھی موت اور قیامت کی مواتا کی متصل ہے۔

۸۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ ..... فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا (نحل: ۲۸) ملائک جب ظالموں کی جان نکالتے ہیں ..... (انہیں کہا جاتا ہے) داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں، سدا رہو اس میں —
یعنی ادھر جان نکلی۔ ادھر جہنم میں داخلے کا حکم ہوا۔

۹۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْکُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّۃَ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (ایضاً: ۳۲) پاک لوگوں کی جان قبض کرتے وقت فرشتے کہتے ہیں "سلام تم پر، داخل ہو جاؤ جنت میں بدلہ ہے اس کا جو تم عمل کرتے تھے — دیکھئے! یہاں بھی جنت اور موت میں کوئی بُعد نہیں۔

۱۰۔ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ ..... (آل عمران ۱۷۰) (اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے) خوش ہیں اس (نعمت) پر جو اللہ نے ان کو (قتل ہو جانے کے بعد) عنایت فرمائی — اپنے فضل سے — اور جن (مومنین، مجاہدین) کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور وہ بھی (آخرت میں) ان تک نہیں پہنچے۔ ان کی طرف سے بھی

خوشیاں منانے ہیں کہ وہ بھی ایمان و جہاد کی بدولت ان سے جنت میں آملیں گے) ـــــ دیکھا آپ نے! یہاں عام مترجمین بھی ماضی و حال ہی میں ترجمہ کرتے ہیں۔ یعنی قتل ہوئے اور انعام یافتہ ہوئے اور اپنے رفقائے جہاد کے بارے میں سرور ہو رہے ہیں۔

۱۱۔ قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ (یٰس: ۲۷)
ایک ناصح مشفق کو لوگوں نے نہایت بے دردی سے شہید کر ڈالا ـــــ ادھر شہادت واقع ہوئی ادھر سے حکم ملا کہ فوراً[1] بہشت میں داخل ہو جا۔ (اب وہ بہشت میں بول رہا ہے) کاش میری قوم کے لوگ جانتے کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا، اور عزت والوں میں (شامل) کر دیا ـــــ اس آیت میں مفسرین و مترجمین مجبور ہیں کہ موت یا قتل کے بعد فوراً ہی بہشت میں داخلہ تسلیم کرلیں۔

۱۲۔ فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ ... فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ ...... وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ (الواقعہ ۸۳ تا ۹۴) (خلاصہ مفہوم) جب جان کنی کی حالت طاری ہوتی ہے پاس بیٹھے ہوئے عزیزوں میں سے کوئی مرنے والے کو بچا نہیں سکتا۔ اگر وہ (اللہ کے) مقربوں میں سے ہے تو جنت کی نعمتیں اور عیش و راحت حاصل کر لیتا ہے اگر دوسرے درجے والے اصحاب یمین میں سے ہے تو بھی کوئی کھٹکا نہیں[2] اور اگر جھٹلانے والوں، گمراہوں میں سے ہے۔ تو اس کی ضیافت جلتے پانی سے اور اس کا قیام آگ ہی ہے ـــــ جان کنی کی حالت ختم ہوئی تو جزا و سزا سامنے آگئی۔

۱۳۔ ...... إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ (قیامہ ۲۶ تا ۳۰) جان کنی کے وقت جب ڈاکٹر، طبیب عاجز آجاتے ہیں۔ تو جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈوں کی سوجھتی ہے کہ شاید اسی طرح بچ جائے مرنے والا سمجھ چکا ہے کہ عزیزوں سے جدائی کا وقت آپہنچا ہے۔ یا روح و بدن کی جدائی ہے۔ سکرات موت کی سختی سے ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ لپٹ جاتی ہے۔ اب بندہ تیرے رب کی طرف کھینچا جا رہا ہے ـــــ یعنی ادھر مرا، ادھر رب کے حضور پہنچ گیا۔

۱۴۔ قِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِينَ۔ (تحریم ۱۰) نوح و لوط علیہا السلام کی خائنہ بیویوں کے متعلق فیصلہ صادر ہو گیا کہ آگ میں داخل ہو جاؤ، داخل ہونے والوں کے ساتھ یعنی سب لوگ جو اپنی اپنی موت کے بعد آگ میں داخل ہوتے جا رہے ہیں تم دونوں بھی ان کے ساتھ جہنم واصل ہو جاؤ ـــــ مولانا عثمانی اعتراف کرتے ہیں کہ "عام دوزخیوں کے ساتھ ان کو (بیویوں) کو بھی اللہ نے دوزخ میں دھکیل دیا" یہ قصہ بھی ماضی میں ہو چکا۔

---

[1] یہ الفاظ مولانا عثمانی رح کے ہیں۔

[2] یہ لفظ عثمانی رح سے لیے ہیں۔

وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ (ایضاً ۳۵-۳۶)

۷- اگلے وقتوں کے لوگ آخرت میں پہنچ چکے ہیں بعد والے (قریش وغیرہ) بھی ان کے ساتھ مل جائیں گے پچھلوں سے کہا جاتا ہے کہ اگلوں کی مدد سے کوئی داؤ کر سکتے ہو تو کر لو وہ کچھ نہیں کر سکیں گے رجَمَعْنٰکُمْ وَالْاَوَّلِیْنَ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ کَیْدٌ فَکِیْدُوْنِ) (۳۸ تا ۴۰) لہٰذا ویل ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔

۸- مکذبین، متقین ومحسنین کا مذاق اڑاتے تھے کہ ان حقیر لوگوں پر خدا کبھی رحمت نہیں کرے گا آخرت میں جب خود عذاب میں گرفتار ہوتے اور اہل ایمان واحسان کو بہشتی نعمتوں میں دیکھتے ہیں۔ تو سخت شرمندہ ہوتے ہیں۔ ان المتقین فی ظلال وعیون ...... الخ لہٰذا یہ بھی مکذبین کے لیے ویل ہے۔

۹- مجرموں سے کہا جاتا ہے کہ دنیا میں کچھ کھا پی لو۔ پھر تمہارے لیے سخت عذاب اور ویل ہے۔

۱۰- آخری دسواں اور اصل ویل یہ ہے کہ وہ خدا کے حضور جھکنا اور فرمان بردار ہونا نہیں چاہتے۔

(وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ۔ فویل......) منزل ہفتم تفسیر مرسلات صفحہ ۱۹۱، ۱۹۲

نیوٹن سے بہت پہلے قرآن نے کہا

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا (مرسلات-۲۵)

زمین اپنے مثل مادے کو اپنے مرکز کی طرف سمیٹنے والی ہے۔ کشش زمین اسی کا نام ہے..... جب تک روح ونسمہ کا تعلق (یعنی مادے سے رہتا ہے وہ اس کو اپنے مرکز کی طرف سمیٹے رکھتی ہے بوجھل پہاڑ اور ہلکا پانی بھاپ اور غبار بن کر بھی زمین کی گرفت سے نہیں نکلتے ــــ مادہ زندہ صورت میں ہو یا مردہ شکل میں زمین اس کو سمیٹنے والی ہے ــــ چاند بھی زمین کی اسی قوت سے زمین کے قابو میں ہے۔ اسی سے سیارات کا قیام ہے اور ان کی رفتاریں قائم ہیں زمین سے چاند سورج کا فاصلہ دیگر قواعد کے علاوہ اس قوت سے بھی دریافت کیا جا سکتا ہے...... یہ تمام باتیں اس بات پر غور کرنے سے واضح ہو جاتی ہیں۔ کہ زمین اپنے مرکز کی طرف دیگر مادیات کو سمیٹنے والی ہے۔ (منزل ہفتم۔ مرسلات صفحہ ۱۹۴)

نبا ءِ عظیم

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۚ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (النبا ۱ تا ۳) آپس میں کیا پوچھتے ہیں؛ پوچھتے ہیں اس بڑی خبر سے متعلق جس میں وہ مختلف ہیں ــــ مفسرین کے نزدیک بڑی خبر یا نبا عظیم قیامت ہے۔ خواجہ صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ اس سے مراد "توحید" ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

اسلام کا اصل مقصود ذات باری ہے۔ اسلام کے نزدیک "النبا العظیم" توحید الٰہی ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

کہ "ہر کفر کہ کہنہ شد مسلمانی شد"

۲۰۔ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ ..... اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ (مومن : ۶) قوم نوح اور دوسری مکذب قوموں کا ذکر ہے) پھر میں (اللہ) نے ان کو پکڑ لیا پھر میرا سزا دینا کیسا ہوا۔ اور اسی طرح تیرے رب کی بات منکروں پر ثابت ہو گئی کہ وہ آگ والے ہیں ــــ یعنی یہ گرفت اور عذاب ثابت شدہ اور بیتی ہوئی حقیقت ہے۔

۲۱۔ قَالُوا ائْتُوا بِاٰبَآئِنَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ..... (جاثیہ ۲۵-۲۶)
منکرین کہتے ہیں ــــ اگر تم (مسلمان) سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو لے آؤ ــــ تو کہہ دے کہ اللہ ہی تم کو زندگی بخشتا ہے۔ پھر موت دیتا ہے۔ پھر جمع کرتا جاتا ہے۔ قیامت کے دن کی طرف جس میں کوئی شک نہیں ــــ یعنی اول زندگی ــــ دوم موت ــــ سوم قیامت ــــ اس درمیان میں کوئی لا انتہا مدت نہیں ــــ سورہ نباء کے آغاز میں دو مرتبہ فرمایا۔ "كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ" عن قریب جان لیں گے۔ یعنی دنیا میں شرک کی سزا۔ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ "پھر عن قریب جان لیں گے یعنی آخرت میں شرک کی سزا ــــ دونوں جگہ "س" یعنی عن قریب یکساں آیا ہے۔ دونوں سزائیں قریب ہیں دور نہیں۔ پھر اس پر بس نہیں کی ــــ سورہ کے اخیر میں مزید تکرار فرمائی اور عذاب آخرت کی قربت سے ڈرا دیا۔

۲۲۔ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا (نباء : ۴۰) بلاشبہ ہم نے تم کو قریب کے عذاب سے ڈرا دیا ہے جس دن آدمی دیکھ لیتا ہے۔ جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا اور کافر کہتا ہے۔ اے کاش میں مٹی ہوتا (بے روح ہوتا اور عذاب کا مستحق نہ بنتا)

۲۳۔ ایک مقام اور ملاحظہ فرمائیے ــــ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ...... (مومن ۱۷، ۱۸) اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے (ہزار ہا برس کی تاخیر نہیں ہوگی) اور نزدیک آنے والے دن سے ان کو ڈرا دے جب کہ دل (خوف اور گھبراہٹ سے دھڑک کر) گلوں تک آ پہنچیں گے غم سے بھرے ہوئے ــــ وہ نزدیک آنے والا دن کونسا ہے؟ ساتھ ہی بتا دیا کہ جب روح جسم سے نکل رہی ہوگی ان تمام آیات کریمہ کا منشا یہی ہے کہ دوبارہ جی اٹھنے (بعث) کا وقت موت کے بعد ہی آ جاتا ہے بعض آیات سورہ نباء جن سے قیامت کبریٰ مراد لی جاتی ہے۔

۱۔ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا (۱۷) فیصلے کا دن وقت مقررہ پر (موت کے ساتھ ہی ہوتا آیا ہے)
يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا (۱۸) جس دن بگل میں پھونکا جاتا ہے (یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آتا ہے) سو تم (اس دن) فوج در فوج آتے ہو (ہر روز خدا تعالیٰ کے حضور گروہ گروہ کرکے آتے ہیں لیکن پیشی ہر ایک کی تنہا تنہا

ہوتی ہے۔ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا (طٰہٰ: ۹۵)

۲۔ فُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا (۱۹) — اور نوح علیہ السلام کے وقت اور دیگر اوقات میں بھی آسمان کھولا گیا اور دروازے دروازے ہوگیا (بارش کی کثرت سے اور بجلیوں وغیرہ کے گرنے سے بہت سی قومیں ہلاک ہوئیں۔ وہ بھی موت کے ساتھ ہی پیش کی گئیں۔ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ (قمر ۱۱) أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا (نوح ۲۵)

۳۔ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا۔ (۲۰) اور پہاڑ بھی اڑائے گئے۔ سو وہ ریت ہوگئے (بہت سی قومیں بڑے زلزلوں سے ہلاک ہوئیں وہ بھی مرنے ہی یوم الفصل میں پہنچیں) (منزل ہفتم۔ تفسیر "نبار" صفحہ ۱۹۶ تا ۲۰۳)

راجفہ

سورہ نازعات میں لفظ "راجفہ" کے معنی مترجمین نے بھونچال کئے ہیں اور "تتبعها رادفہ" سے بھونچال کی تکرار مراد لی ہے اور اسے قیامت کبریٰ پر منطبق کیا ہے۔ خواجہ رحمۃ اللہ دوسری راہ اختیار کرتے ہیں۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ (نازعات ۶) جب ہلنے والی شئے ہلتی ہے (یعنی جسم ہی موت کے وقت کس کش پیدا ہوتی ہے اور جان ٹوٹتی ہے)

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ (۷) پھر پیچھے ہو پڑتی ہے ہو پڑنے والی (یعنی موت آجاتی ہے)

الطآمۃ الکبریٰ

اسی سورہ میں الطامۃ الکبریٰ سے مراد قیامت کبریٰ لی گئی ہے خواجہ صاحب لکھتے ہیں۔

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ (۳۴) سو جب غالب ہو جانے والی بڑی مصیبت آتی ہے (ظاہر ہے کہ یہ مصیبت، مصیبت الموت ہے۔ جیسا کہ خود قرآن نے کھول کر بتا دیا ہے ..... فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ (مائدہ ۱۰۶)

الساعۃ

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا (۴۲) لوگ تجھ سے اس (موت) کی گھڑی کی بابت پوچھتے ہیں کہ کب اس کو واقع ہونا ہے؟

یہ تو کوئی نہیں جانتا کہ کب اور کہاں مرے گا؟ پھر تیرا (نبی کا) اس سے کیا تعلق؟ اس کا آخری فیصلہ تیرے رب کی طرف ہے ۴۳، ۴۴۔ مَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ (لقمان ۳۴)

(منزل ہفتم تفسیر نازعات صفحہ ۲۰۷)

سورہ نور آیت ۳۹ وَاللّٰهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ کی تفسیر میں مولانا عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ...... "دوپہر کے وقت جنگل میں پیاسے کو دور سے پانی دکھائی دیا اور وہ حقیقت میں چمکتی ہوئی ریت تھی پیاسا شدت تشنگی سے بے تاب ہو کر وہاں پہنچا دیکھا تو پانی وانی کچھ نہیں تھا ہاں ہلاکت کی گھڑی سامنے کھڑی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ عمر بھر کا حساب لینے کے لیے موجود تھا چنانچہ اسی اضطراب و حسرت کے وقت اللہ نے اس کا حساب ایک دم چکا دیا کیونکہ وہاں حساب کرتے کیا دیر لگتی ہے ہاتھوں ہاتھ عمر بھر کی غفلتوں اور شرارتوں کا بھگتان کر دیا۔"

تکویر شمس اور زلزلہ

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (تکویر: ۱) جب سورج لپیٹا جاتا ہے (اور اس کی روشنی میں کمی آ جاتی ہے یہ کمی داغوں کے بڑھ جانے سے پیدا ہوتی ہے یہ داغ وسیع ہو کر سورج کو لپیٹ لیتے ہیں)

وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ (۲) اور جب ستارے میلے ہو جاتے ہیں۔ سورج کی روشنی کم ہو جانے سے، وہ ستارے جو اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ گدلے ہو جاتے ہیں یہی حال دوسرے سورجوں اور ان کے نظاموں کا ہوتا ہے۔ روشنی کی کمی سے زمین کی مقناطیسیت میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اور کہیں نہ کہیں زلزلے کا موجب بن جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۳) اور جب پہاڑ (بصورت زلزلہ) اڑائے جاتے ہیں①②۔

---

① خواجہ صرف کتابی ناقل و عالم ہی نہیں تھے۔ مختلف علوم میں عملی مہارت بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ کے سوانح نگار خواجہ ضیاء اللہ مرحوم لکھتے ہیں۔ "سنہ ۱۹۰۵ء میں آپ (خواجہ) نے سنا کہ سورج میں ایک بہت بڑا سیاہ داغ پڑ گیا ہے تو آپ نے بعض احباب دائرہ سے ذکر کیا کہ ایک خوفناک زلزلہ کا خطرہ ہے۔ چنانچہ ۴ اپریل ۱۹۰۵ء کو بہت بڑا بھونچال آیا۔ اس واقعہ کے بعد آپ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کو اتنا عرصہ پیشتر اس قیامت خیز زلزلے کا علم کیسے ہوا؟ تو فرمایا، مجھے وحی و الہام نہیں ہوا۔ اور نہ اس پیشگوئی میں میری کوئی خصوصیت ہے۔ یہ قرآن مجید کی خوبی ہے۔ اس میں بے شمار علمی حقائق بھرے پڑے ہیں۔ پھر آپ نے یہ آیات (تکویر) تلاوت کیں اور کہا کہ ــ چونکہ آفتاب میں داغ پڑنے کی اطلاع ملی تھی اس لیے قرآن کے مندرجہ بالا بیان کے پیش نظر مجھے خیال ہوا کہ خوفناک زلزلہ آئے گا۔ ..... قرآن مجید میں ایسے کروڑوں علم بھرے پڑے ہیں۔ وَرَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (حیات احمد الدین۔ حصہ اول ص ۲۰۸)

② راقم الحروف نے خواجہ صاحب کی زبانی سنا تھا کہ یہ بات آپ کو امریکہ کے کسی اخبار سے معلوم ہوئی تھی، وہاں کے کسی ہیئت دان نے سورج کا معائنہ کر کے داغ کی پیمائش بھی لکھی تھی۔ کتنے ہزار میل تھا۔ راقم کو صحیح یاد نہیں رہا خواجہ صاحب کو صحیح یاد تھا۔ رحمۃ اللہ۔ ستمبر ۶۳ء کی غالباً ۲۰ تاریخ کو ریڈیو پاکستان کراچی کی نشریات "بزم طلبہ" میں سائنس کی خبروں میں بتایا گیا کہ سورج میں طوفانی شعلے اٹھتے اور تغیرات ہوتے ہیں تو متعلقہ سیارے ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور کرہ ارض میں زلزلے آتے ہیں یہ بات جو سائنس کو آج معلوم ہوئی۔ قرآن نے ۱۴ صدی ہ

سورہ انفطار اور ردّ تناسخ

آریہ (ویدک دھرم کے ماننے والے) کہتے ہیں کہ یہ دنیا گذشتہ جونٌ (زندگی) کے کرموں (کاموں) کی جزاو سزا کے لیے دار الجزاء ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ دار الجزاء اس سے ماوریٰ ہے، جہاں مالک و مختار صرف خدا ہے۔ اور کسی کوئی اختیار نہیں ـــــ یہ دنیا کیوں دارالجزاء نہیں؛ ـــــ بوجوہ ذیل:۔

اول:۔ دنیا میں جب کوئی زلزلہ، طوفان، وبا اور جنگیں برپا ہوتی ہیں تو نیک و بد یکساں ہلاک ہو جاتے ہیں لہٰذا ظالموں کی سزا اور مظلوموں کی تلافی اور جزا کے بے فیصلے کا دن دنیا سے ماورا کا ہونا چاہیے۔

دوم:۔ دنیوی احوال و اختلاف کو آریہ گذشتہ جنموں (جنون) کے اختیاری کرموں (اعمال) کا نتیجہ کہتے ہیں ـــــ لیکن جانوروں کے افعال جو خارجی تحریک سے مجبورانہ صادر ہوتے ہیں انکو گذشتہ اختیاری افعال کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔

نیز آریہ کہتے ہیں کہ مرد، عورت، ریگستانی، کوہی، چمستانی وغیرہ باشندوں، زمین والوں، مریخ و مشتری والوں، ان کے قدوں، شکلوں، رنگوں، دماغی ساختوں، طبائع، مزاجوں اور خواہشوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں یہ سب ان کے گذشتہ اختیاری افعال کا ثمرہ ہیں۔ یہ یقیناً غلط نظریہ ہے جو بوجوہ ذیل۔

ا۔ بقول آریہ ـــــ خدا اور بے شمار ارواح اور لا انتہا مادی ذرّات ازل سے موجود چلے آرہے ہیں خدا ہمیشہ سے کامل و مطلق ہے اور ارواح نیک و بدبختی چلی آرہی ہیں ـــــ مادہ علم و عقل سے خالی ہے ان تینوں (خدا، روح، مادہ) میں جو اختلاف ہے کیا اس کا باعث بھی جونیں ہیں۔ معاذ اللہ کیا خدا پہلے کسی اور جون میں تھا۔ جس کے ثمرے میں کامل مطلق بنا۔ اور مادہ اور دیگر نباتات و ابدان کن کرموں کی وجہ سے بے علم و بے عقل رہ گئے؟

ب۔ مجبور مادے میں رنگا رنگی موجود ہے۔ اس میں بہت سے عناصر ہیں وہ کہیں لعل و جواہر اور معمولی پتھر ہے۔ کہیں آگ، ہوا، پانی اور مٹی ہے۔ کہیں سورج، چاند اور زمین کی شکل میں ہے کہیں نبات و حیوان ہے الغرض بے شمار تغیرات کا باعث ہے جب بنیادی تغیرات کا موجب مادہ ہے تو لازماً نباتات بھی مختلف ہوں گے اور اس سے بنے ہوئے حیوان بھی علیٰ ہذا القیاس ـــــ جب اختلافات کثیرہ کا باعث مادے کا بنیادی اور ضروری اختلاف ہے تو ان کو اختیاری کرموں کا نتیجہ کہنا کیسے صحیح ہوگا؟

ج۔ مرد کے ساتھ عورت اور عورت کے ساتھ مرد کا وجود لازم ہے اور مردوں عورتوں میں ان کے لائق اختلافات کا ہونا

٭ پیشِ نظر بنائی اور ماہرِ قرآن نے تقریباً پچاس سال قبل سمجھ کر بیان کی اور قرآن کے اعجاز اور خدائی تصنیف ہونے پر ایک حیرت انگیز دلیل قائم کی۔

ٌ ہنود کے عقیدے کے مطابق انسان کی ۸۴ لاکھ زندگیوں میں سے ایک زندگی کو "جون" کہا جاتا ہے۔ جو وہ نجات پانے کے لیے بدل بدل کر دنیا میں آکر گذارتا ہے۔

حکمت کے عین مطابق ہے۔ تاکہ ایک دوسرے سے مستفید ہو سکیں ـــــ اگر تمام عورتوں کی شکل ایک جیسی ہوتی تو ماں، بہن بیٹی، بیوی میں تمیز کیسے ہوتی۔ اگر ان کی آوازیں بھی یکساں ہی ہوتیں تو پہچان کا ذریعہ کیا ہوتا؟ ایسے اختلافات خدا تعالیٰ کی قدرت، رحمت اور حکمت کو ثابت کرتے ہیں۔ اور نہایت ضروری ہیں۔ لہٰذا یہ اختیاری کرموں کا پھل نہیں ہو سکتے۔

د۔ انسان اپنی ضروریات میں دوسروں کا محتاج ہے۔ مکان کے لیے مٹی کھودنا، اینٹیں اور چونا بنانا، پتھر تراشنا، پٹڑیاں اور سلیں تیار کرنا، پانی لانا، شہتیر، تختیاں بنانا، معماری اور مزدوری کر ان میں سے ہر کام کے لیے الگ کاریگر کی ضرورت ہے۔ باربرداری کے لیے گھوڑے گدھے، اونٹ، ہاتھی وغیرہ درکار ہیں۔ ان کی نگرانی کے لیے الگ الگ ماہر ہونے چاہئیں لوہے، لکڑی وغیرہ کی تیاری کے لیے، سورج، چاند، سیارے، زمین ہوا پانی آگ اور ہر ذرّہ مخلوق کا وجود لا بدی ہے اسی طرح ہر چھوٹے سے چھوٹے کام میں تمام رنگا رنگ کائنات کی موجودگی درکار ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید فلک درکار اند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری (سعدی)

یہ نہایت ضروری اختلافات اس حکیمانہ ترتیب کے ساتھ اختیاری کرموں سے کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔

ھ۔ اگر دکھ (جس کی وجہ سے آریہ تناسخ کو مانتے ہیں) کے خیال کو الگ کر دیا جائے تو باقی تمام اختلافات کا جونوں کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں ایک ہی گھر میں ایک شوہر، ایک بیوی، بیٹا اور بیٹی ہے۔ نیز ایک گائے اور کتا ہے۔ شوہر ذوق مطالعہ میں خوش ہے۔ بیوی زیور و لباس سے راضی، گائے گھاس سے مطمئن، کتا ہڈیوں پر قانع چوکیداری کے لیے آمادہ۔ بیٹا، بیٹی کھلونوں سے خوش۔ کوئی نمکین چیز پسند کرتا ہے۔ کوئی میٹھی کوئی کھٹی وغیرہ وغیرہ ؎

نگاہ اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

آریہ کہتے ہیں کہ کوئی بچہ بیمار پیدا ہوتا ہے کوئی تندرست کوئی راجہ کے گھر میں جنم لیتا ہے کوئی کنگال کے ہاں۔ چونکہ خدا عادل ہے اور دکھ سکھ کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے۔ دکھی بچے نے پہلی جون میں گناہ کئے ہیں جس کی سزا اس جون میں بھوگ[ط] رہا ہے۔ اور سکھی نے کوئی نیکی کمائی ہے۔ جس کا پھل یہاں کے سکھ میں ملا ـــــ یہ بات بوجوہ ذیل غلط ہے۔

ا۔ فطرت ہر شے کو ترقی دینا چاہتی ہے۔ ضرورت اور طلب ایجاد کی ماں ہے۔ دکھ ضرورت اور طلب کو بیدار رکھتا ہے۔ ترقی کے لیے دکھ ایک حد تک ضروری عنصر ہے۔ جننے والی عورت درد زہ کے بعد ہی صحیح طور پر بچہ جن سکتی ہے دکھ ناموافق مواد کی مدافعت کرتا ہے۔ بول و براز بھی کسی قدر تکلیف ہی سے رفع کئے جاتے ہیں۔ کھانے کا لطف بھوک کی تکلیف ہی سے ملتا ہے۔ تمام قدرتی تکالیف ارتقا میں معاون ہوتی ہیں۔

(سردی گرمی، بارش، دھوپ وغیرہ کی تکالیف سے بچنے کے لیے انسان کو لباس، مکان بستیوں اور شہروں کی ضرورت

ط برداشت کر رہا ہے۔

محسوس ہوئی ۔بلند و بالا عمارات نہیں ۔سائنس کی تمام ایجادات انسان ہی کی کسی نہ کسی تکلیف کو دور کرنے اور اس کو سکھ صحت اور اطمینان پہنچانے کے لیے منظرِ عام پہ آئیں اور آتی رہیں گی۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان کے اندر بیٹھا ہوا شیطان کسی نعمت کے غلط استعمال سے اس کو مصیبت اور پھر جہنم میں پہنچا دے ــــ یہ سطور مرتب کی طرف سے ہیں۔

ب۔ انسان خود بھی سنیاس (ترکِ دنیا) کماتا ، برت (روزہ) رکھتا ۔تحقیقات کے لیے دور و دراز کے سفر کرتا نفس پر قابو پانے کے لیے ریاضتیں کرتا اور تکلیفیں اٹھاتا ہے اور بھی کئی قربانیاں کرتا ہے تاکہ ادنیٰ اسے اعلیٰ درجات پہ پہنچے ان کا کوئی تعلق جونوں سے نہیں ۔

ج ۔ یہ دنیا دار الفصل (آخری فیصلے کی کچہری) نہیں ۔یہاں ظالم و مظلوم یکساں پس جاتے ہیں رحم دل انسان کے ذریعے کئی لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے باہم مل کر رہنے اور رشتہ داریوں کے سبب ایک کے نقصان کا اثر دوسرے تک پہنچتا ہے ۔مندرجہ ذیل مثالوں پہ غور کیجئے !

پہلی مثال :۔ ایک لڑکا بیمار ہوا ۔بقول آریہ کوئی بدکار روح اس مریض جسم میں قید ہوئی ہے ۔ایک لائق ڈاکٹر کے علاج سے وہ تندرست ہو گیا ۔کیا اس ڈاکٹر کے اختیاری فعل سے بدروح کو نکال کر نئی نیک روح کو اس میں داخل کیا گیا ؟ اور پہلی بدکار روح کو دوسرے مریض بدن میں قید کیا گیا ہے؟ یا مذاق ہے ؟ کیا کوئی آریہ اس طرح روحوں کے رد و بدل ہونے کا ثبوت دے سکتا ہے ؟ کیا عاقل بالغ انسان اسی طرح بدلائے نہیں جا سکتے ؟ کیا ان کے علوم اور یادداشتوں سے روحوں کی اس تبدیلی کا پتہ چل سکتا ہے ؟ کیا روحیں یہ اعتراف کرتی ہیں کہ ہماری شخصیت میں تبدیلی آ گئی ہے ؟

اگر ڈاکٹر نے بدکار روح کو صحت مند کر دیا تو گویا اس نے خدائی سزا کو بدل دیا کیا ایسی دنیا دار الفصل ہو سکتی ہے ؟

دوسری مثال : ایک مہارانی کو حمل ہوا ۔بقول آریہ ایک سعید روح اس کے پیٹ میں آئی اگر اس کی اختیاری بد پرہیزی سے رحم کے اندر بچے کو نقصان پہنچ جائے تو آریہ کی رائے بدل جائے گی یا اگر مہاراجہ شرارت و ظلم کی بنا پر کسی دوسرے والئی ملک سے جنگ چھیڑ دے اور اس کے ہاتھوں شکست کھا کر مارا جائے اور مہارانی گرفتار ہو کر اس کی باندی بن جائے تو اس کے پیٹ کے بچے کے متعلق آریہ کی رائے بد سے بدتر ہوتی جائے گی یا وہ رانی غصے میں آ کر کسی کو قتل کر دے اور کالے پانی کی سزا پائے اور وہاں بچہ جنے تو آریہ اپنی رائے بدلتے جائیں گے یہ نہیں مانیں گے کہ کہاں کا جرم بچے کو اس عمر قید میں لے آیا ۔

د ۔ عادل حاکم اثبات جرم کو مجرم پر واضح کر کے سزا دیتے ہیں وہ خوب جان لیتا ہے کہ مجھے فلاں جرم کے عوض سزا ملی ہے ۔لیکن حیوانوں یا دکھ میں مبتلا انسانوں کو کچھ خبر نہیں کہ انہوں نے سابقہ جون میں کیا جرم کیا تھا جس کی سزا اس دنیا میں پا رہے ہیں ۔ پاگل انسان جب مدت کے بعد صحت پاتا ہے تو زمانہ صحت کی اکثر باتیں اسے یاد آتی ہیں سابقہ علم جو جنون میں غائب ہو گیا تھا پھر حاضر ہو جاتا ہے ــــ یہ کیسا اندھیر ہے کہ مجرم کو اس کے جرم کی اطلاع و خبر نہ ہو اور وہ سزا بھگت رہا ہو ۔یہ دلیل خواہ مخ

نے اس آیت سے حاصل کی ہے۔
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ (انفطار - ۵) یعنی ہر شخص (مجرم) کو اس کے اگلے پچھلے تمام گناہوں کا علم ہوتا ہے۔ اس کو پوری طرح قائل کر کے سزا کے قابل ٹھہرایا جاتا ہے۔

سوم :- دین ومذہب کا تعلق عاقل انسانوں سے ہے۔ بے جان نباتات اور بے عقل حیوانات سے نہیں امکان سے خارجی ممکنات کا ظہور ہوتا ہے۔ بے جان (جمادات) کے بعد نشو ونما والے (حیوانات) پیدا ہوتے ہیں منظم نشو ونما کے بعد حرکت ارادی اور پھر عقل واختیار کی بنیاد رکھی جاتی ہے لہذا انسان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے ان سب مدارج کا موجود ہونا لازم ہے۔ ورنہ انسان کی ضروریات حیات کہاں سے پوری ہوں گی اسی طرح حیوان سے پہلے نبات وجماد کی موجودگی اس کی ضروریات زندگی کے لیے لازم ہے پھر ان سب پر مقدم اور ضروری ہوا اور پانی ہیں۔ اسی طرح مسلسل امکان محض تک پہنچ جائیے کائناتی اختلاف عین حکمت پر مبنی نہایت اہم اور اٹل ہے۔

اب سوچئے کہ کیا قبل انسان کی مخلوق بھوگ یونی (سزا میں مبتلا) ہو سکتی ہے؟ کوئی عقل اسے قبول کر سکتی ہے؟ جب کہ انسان کی منزل تک پہنچنے کے لیے وہ سب ضروری مراحل ہیں۔

آریہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے انسان بنتا ہے پھر اس کے کرموں (افعال) کے نتیجے میں نبات وحیوان وجود میں آتے ہیں۔ مذکورہ دلیل کے سامنے اس نظریے کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

آریہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جاندار دو قسم کے ہیں ایک کرم یونی (فاعل مختار) جو عاقل وبالغ انسان ہیں۔ اور اس میں دونوں باتیں بیک وقت موجود ہیں۔

۱۔ گذشتہ کرم (عمل) کے لحاظ سے بھوگ یونی (سزائی حالت) اور - (۲) اختیاری افعال آئندہ جون (جنم) کی تیاری کے لیے۔

انسانوں کے علاوہ دوسری قسم ان جانداروں کی ہے جو آبی مخلوقات، ہوائی پرندے، خشکی کے جانور وغیرہ وغیرہ میں ان کی اقسام وشمار حد وحساب سے باہر ہیں اور یہ سب بھوگ یونی یعنی سزا پانے والے پاپی انسان ہیں بلکہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کرم یونیوں (انسانوں) کی تعداد ہمیشہ قلیل رہتی ہے اور سزا میں پھنسے ہوئے حشرات الارض چرند پرند وغیرہ کی گنتی کسی گنتی میں نہیں آسکتی۔ پانی کے ایک قطرے میں دو کروڑ جاندار، نجاست کے صرف ایک ڈھیر میں دنیا بھر کے انسانوں سے زیادہ مچھر۔ غلاظت خور جانوروں کی تعداد ہمیشہ انسانوں سے ہزار ہا گنا زیادہ ہونی لازم ہے اور پھر عاقل وبالغ انسان خود بھی بھوگ یونی (سزا میں) ہیں۔ لہذا تمام جاندار بھوگ یونی ہیں اور بقول آریہ بھوگ یونی، کرم یونیوں سے نکل کر آتے ہیں۔ غور فرمائیے۔ کرم یونیوں اور بھوگ یونیوں کا یہ تناسب کسی طرح سمجھ میں آسکتا ہے؟ نتیجہ صاف ہے کہ تناسخ کا چکر محض باطل ہے۔ اصل چیز ارتقاء ہے۔ اسی لیے اللہ کی عدالت، رحمت، حکمت اور قدرت کے تمام ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔

ایک شخص مکار ہے دوسرا خونخوار ہے انسانی حالت میں رہ کر وہ اپنی اصلاح بھی کر سکتے ہیں لیکن اگر پہلے کو لومڑی کی

جون میں اور دوسرے کو بھیڑیئے کی جون میں ڈالا جائے تو وہ فطرتاً اور مجبوراً مکار و خونخوار نہیں گے۔ ان کی مکاری و خونخواری مُن نہیں جبلت ہو گی اس کے بغیر وہ اپنی روزی اور زندگی کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ ادنیٰ کو اعلیٰ کی طرف ترقی دینا، گرے ہوئے کو اٹھانا خوبی ہے اور ارتقار کا تقاضا ہے۔ نہ کہ گرتے کو اور گرانا اور گرائے رکھنا۔

کوئی انسان سورج، سیاروں، زمینوں، ہواؤں، گرمی، سردی اور نباتات کے بغیر نہ موجود ہو سکتا ہے اور نہ کچھ کر سکتا ہے اور کوئی حالت و موقع ایسا نہیں کہ جہاں ان تمام کا یکساں اثر ہو پس لازم ہوا کہ انسان مختلف اثرات کو قبول کرتے ہیں ایسے بے شمار فطری اختلافات سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ان کو یونی چکر یا تناسخ کے سر تھوپنا عقل و تجربہ کے سراسر خلاف ہے۔

اگر سابقہ کرم (عمل) ہی تغیرات احوال کا باعث ہے تو خدا تعالیٰ کے وجود کی ضرورت ہی کیا ہے یہ چکر کرموں کے سبب سے ہیں اور کرم چکر کے سبب اس سے دور پیدا ہو گا اور خدا کے دخل کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ معاذ اللہ۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی ضروریات کے لیے بار برداری اور سواری کے جانور بنائے انسان اس قابل نہیں کہ دور دراز کے سفر بڑے بڑے بوجھوں کو اٹھائے ہوئے کر سکے حیوانوں کے بغیر دودھ، شہد، مشک، موتی، مونگا، لاکھ اور ریشم ایسی ضروری اشیاء حاصل نہیں ہو سکتیں اگر یہ سب بدکار روحوں کی شرارت و گناہ کی سزا کا فیضان ہیں تو پھر کیا انسان کو گناہ اور گنہگاروں کی سزا کا شکر گزار ہونا چاہیئے؟

یہ دلیل خواجہؒ نے سورۂ انفطار کی آیات ذیل سے حاصل کی ہے ذیل میں ان کے ترجمہ و تشریح کے ساتھ:

یَا أَیُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (۶) (انسانی ارتقار کو بطور دلیل پیش فرمایا ہے کہ جزاء و سزا کے لیے بطور تناسخ پیچھے بے جانے کی ضرورت نہیں۔ انسانی جماد، نبات اور حیوان کے بعد پیدا ہوتا ہے یہ سب پہلے بنائے جاتے ہیں قطعاً غلط ہے کہ انسان ہی پاپ (گناہ) کی سزا بھگتنے کے لیے لوٹ کر نبات و حیوان کی صورت میں واپسی اختیار کرتا۔ یہ مشاہدہ تناسخ کی بیخ کنی کر دیتا ہے اس لیے فرمایا)

اے انسان! تجھے تیرے لطف و کرم کرنے والے رب کے ساتھ کس چیز نے دھوکے میں مبتلا کر دیا؟ (تو خود اپنے کرموں ہی کا خیال رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے بے خبر ہے) الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ (۷) جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔ (منزل ہفتم صفحہ ۲۱۶ سے صفحہ ۲۲۵)

شرح صدر نہ کہ شق صدر

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (۱) کیا ہم نے تیرے رفاہ کے لیے تیرا سینہ نہیں کھول دیا؟ (استفہام انکاری ہے یعنی کھول دیا ہے۔ اور تیرا حوصلہ فطرت فراخ کر دیا ہے) (دین اسلام کے اصل و بنیاد ہونے کے لیے تیرے سینے کو فراخی اور لذت بخشی۔

شرح صدر کا ذکر قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے عام مومنوں کے شرح صدر کا بیان بھی نازل ہوا ہے أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ

فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (زمر: ۲۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سچے مسلمان کا سینہ اللہ تعالیٰ نے قبول اسلام کے لیے کشادہ کر دیا ہے اسے صداقت اسلام میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا اور نہ اس کے احکام پر عمل کرنے میں کوئی انقباض۔ موسیٰ علیہ السلام بھی دعا کرتے ہیں۔ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ (طٰہٰ: ۲۵) اے میرے رب میرا سینہ کشادہ کر دے یعنی حلیم و بردبار اور حوصلہ مند بنا دے کہ خلاف طبع بات سے جلد خفا نہ ہوں اور ادائے رسالت میں جو سختیاں پیش آئیں ان سے نہ گھبراؤں بلکہ کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے برداشت کروں (عثمانی)

اسی طرح کافروں کے سینے کفر کے لیے کھل جاتے ہیں مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ (نحل ۱۰۶) جو کھلے دل سے منکر ہوا تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے۔

ان آیات میں کسی مفسر نے نہیں لکھا کہ سینہ چاک کر کے اس میں اسلام یا کفر بھر دیا جاتا ہے پھر اسے سی دیا جاتا ہے لیکن اس قسم کا افترا رسول کریم ؐ پر روا رکھا گیا کہ "ظاہری طور پر بھی فرشتوں نے متعدد مرتبہ آپ ؐ کا سینہ چاک کیا"۔ (عثمانی رح) (منزل ہفتم صد ۲۵۷)

زلزال

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۱) جب زمین اپنے بھونچال سے ہلائی جاتی ہے۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (۲) اور زمین اپنے (مدفون) بوجھوں کو باہر نکال دیتی ہے۔ زمین اس وقت تہ و بالا ہو جاتی ہے۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا (۳) اور انسان (حیران و پریشان ہو کر) کہتا ہے کہ اس (زمین) کو کیا ہو گیا۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا (۴) اس دن یہ (زمین تہ و بالا ہو کر اور اپنے اندرونی طبقات کو ظاہر کر کے) اپنی خبریں دیتی ہے (یہ خبریں نیچ رہنے والے یا پیچھے آ کر بسنے والے لوگ حاصل کرتے ہیں طبقات الارض سے زمین کی بہت سی تاریخ کا پتا لگایا جاتا ہے۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (۵) یہ خبریں زمین دیتی ہے) اس لیے کہ تیرے رب نے اس (زمین) کے قاعدے (اور آئندہ کام دینے کے لیے (اس میں) وحی کی ہوئی ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ (۶) اس دن وہ (مرنے والے) لوگ الگ الگ ہو کر آخرت میں) نکل جاتے ہیں تاکہ انہیں ان کے عمل دکھلائے جائیں (انسان کا احساس بڑھ جانے سے سب اعمال سامنے آ جاتے ہیں)۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (۷) سو جو شخص ذرہ برابر بھلائی کرتا ہے اسے دیکھ لیتا ہے

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۸) اور جو شخص ذرہ برابر شرارت کرتا ہے، اسے دیکھ لیتا ہے (انسان خیر و شر کو

ؐ اب تو ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ اور ٹیلی ویژن نے ان آیات کریمہ کی مجسم تفسیر انسان کے سامنے پیش کر دی ہے۔ جس خدا نے انسان ؐ

پہچانتا ہے۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (بقرہ ۲-۲۵۶) لوگوں نے فرضی اور خیالی خیر و شر پیدا کرلی ہیں۔ بعض لوگ پیر پرستی، تعزیہ پرستی اور قبر پرستی کو بھی خیر جانتے ہیں۔ معاذ اللہ (منزل ہفتم ص۶۶۵)

النّاس

سورہ سابقہ میں جسمانی اور نفسانی شر سے پناہ مانگی ہے۔ اس آخری سورہ میں روحانی شر اور ضرر سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی ہے یہ ضرر بہت بڑا ضرر ہے پہلے شر کے متعلق اللہ تعالیٰ کے ایک صفاتی نام کی پناہ چاہی ہے (رَبِّ الْفَلَقِ) اور اس سورۃ میں تین اسمائے صفات کی پناہ میں آنا سکھایا ہے۔

رَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، اِلٰهِ النَّاسِ۔ رب جو پرورش کا کفیل ہے۔ لوگ اس پر اعتماد نہ کرکے اولاد (لڑکیوں) کو ہلاک کردیتے تھے بادشاہ حفاظت و انتظام پر قدرت رکھتا ہے بدامنی پھیلانے والے اس صفت کے برعکس چلتے ہیں۔ اِلٰہ النّاس کی صفت شرک کی ہر قسم کی قاطع ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱) تو کہہ میں آدمیوں کے رب کی پناہ میں آتا ہوں

مَلِكِ النَّاسِ۔ (۲) آدمیوں کے بادشاہ کی (پناہ میں)

---

۴ کو یہ قدرت بخشی ہے کہ وہ الفاظ و اعمال دونوں محفوظ کرکے قائل و عامل کے سامنے اس طرح رکھ دے کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات کو اپنے کانوں سن لے اور اپنے کیے ہوئے کام (اچھے برے) کو اپنی آنکھوں سے ہوتا ہوا دیکھ لے۔ کیا وہ خود ایسی قدرت نہیں رکھتا کہ روز جزا مجرموں کو ہمارے کرتوت اس طرح دکھا دے کہ ہمارے مکرنے یا انکار کرنے کے لب بند ہو جائیں۔ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

اس موقع پر آیہ ذیل کو سامنے لے آئیں تو کلام اللہ کے کلام اللہ ہونے کی اور زیادہ واضح تر دلیل مہیا ہو جاتی ہے۔

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (النور-۲۴)

آخرت کے دن ان کی زبانیں بول کر ان (مجرموں) کے خلاف شہادت دیں گی اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کے شاہد بن جائیں گے۔

یعنی مجرم یوں اور ظاہر کرنا نہ چاہے گا۔ مگر خود زبان اور ہاتھ پاؤں بولیں گے اور ان میں سے ہر عضو اس عمل کو ظاہر کردے گا۔ جو اس کے ذریعے سے کیا گیا تھا۔

(شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رح)

اِلٰہِ النَّاسِ (۳) آدمیوں کے معبود کی (پناہ میں)
مِن شَرِّ الوَسوَاسِ الخَنَّاسِ (۴) وسوسے ڈالنے والے (مصیبت میں مبتلا کرکے خود) چھپ جانے والے کے شر سے۔
اَلَّذِی یُوَسوِسُ فِی صُدُورِ النَّاسِ (۵) جو آدمیوں (یعنی جن وانس) کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ (کن آدمیوں کے سینوں میں؟)
مِنَ الجِنَّۃِ وَالنَّاسِ (۶) جو جنوں اور انسانوں سے ہیں۔
(جن خاص ہے ناس سے جیسے اس آیت - اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَھُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّھِمْ (یونس-۲) میں "الذین امنو" الناس سے باہر نہیں۔ قرآن پاک میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

تمت بالخیر